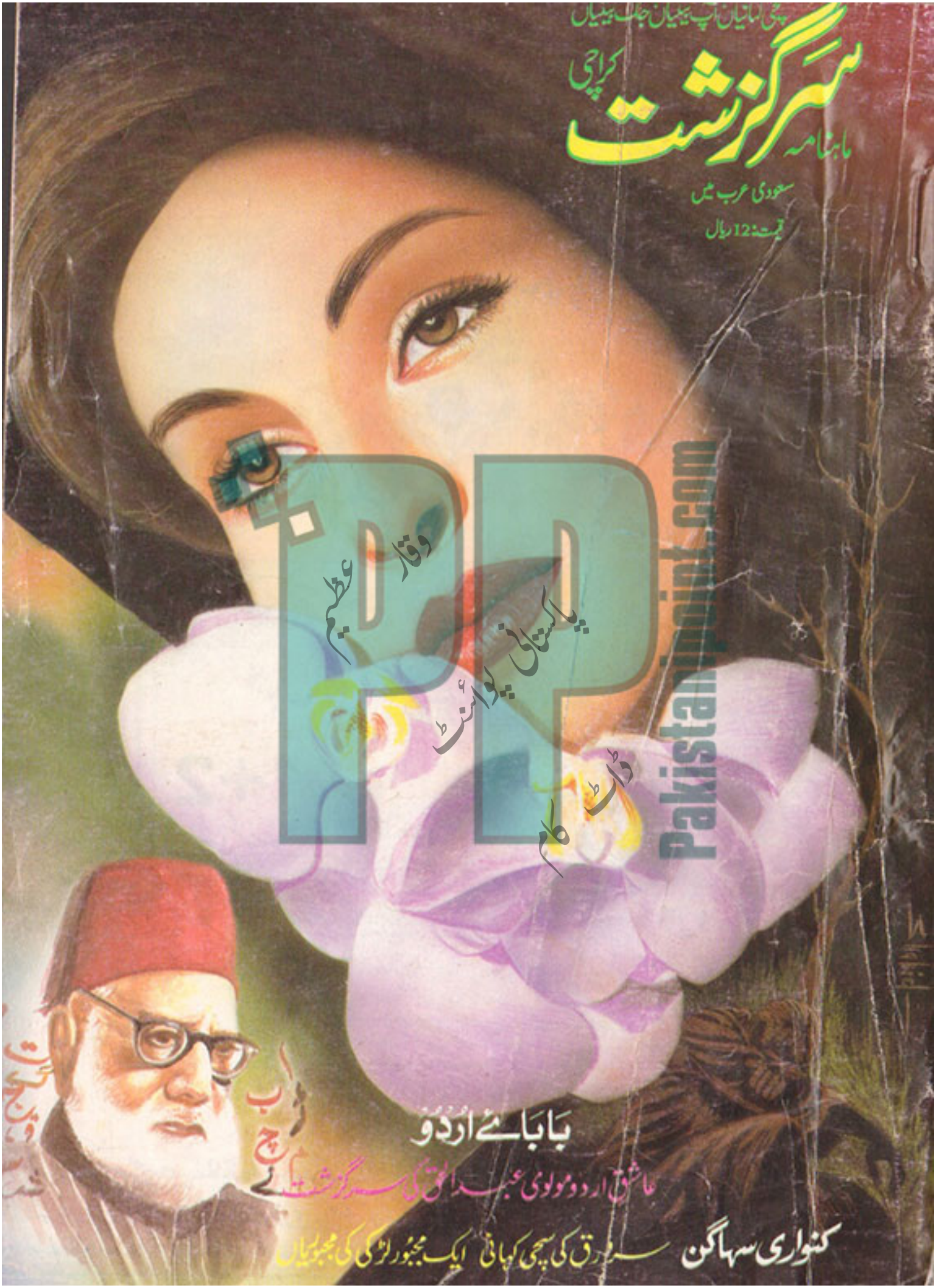

سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
سعودی عرب میں
قیمت: 12 ریال
بابائے اردو
عاشقِ اردو مولوی عبدالحق کی سرگزشت
کنواری سہاگن
سرورق کی سچی کہانی ایک مجبور لڑکی کی مجبوریاں
Pakistanipoint.com
وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

صفحہ	عنوان	مصنف	زمرہ	تعارف
11	سرگزشت	ادارہ	شخصیات	ایک صفحے میں مکمل، مختصر مختصر۔ ایک نادرِ روزگار کا تعارفِ خاص
12	شہرِ خیال	معراج رسول	گفت و شنید	آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے، آپ کے سوال۔
18	بابائے اردو	ڈاکٹر ساجد امجد	زبان و ادب	اردو زبان کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے والے مولوی عبدالحق کی سرگزشت
59	کروڑوں کا آدمی	اے ایس صدیقی		برونائی کے سلطان کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات کی جھلک
61	آدم خور	اقبال کاظمی	شکاریات	اس شیرنی کے شکار کا ماجرا جو آدم خور بن گئی تھی۔ ایک دلچسپ تحریر
74	نشانِ منزل	شمس کاشمیری	کشمیر	اس منزل کا انتظار جس کی تلاش میں پچاس سال سے زیادہ گزر چکے!
103	ماورائی حملہ	عکس پشول	پُراسرار	ایک لڑکی کو پیش آنے والے حیرتناک واقعات، وہ کسی نادیدہ حملے کا شکار تھی
111	عذابِ جنگ	پروین زبیر	جنگِ ویت نام	جنگِ ویت نام کے دوران میں قید ہونے والے امریکی سپاہی کی بپتا
129	مشکوک کردار	احمد صغیر صدیقی	تاریخ	تاریخ کے صفحات میں گم اس بیوی کا قصہ جس کی وفا آج تک مشکوک ہے
132	فلمی الف لیلہ	علی سفیان آفاقی	فلم و صحافت	فلم اور صحافت کی ان کہی کہانیاں، نامور حسین و رنگین فنکاروں کے قصے
157	حنوط	مزنی احمد خان	مصریات	قدیم مصری تہذیب کی ایک روایت کے بارے میں مختصر مگر اہم معلومات
159	صحرانورد	کاشف زبیر	مہم جوئی	تن تنہا صحرائے صحارا کو عبور کرنے والے ایک مہم جو کا احوال
172	تاوان	طاہر جاوید مغل	سماجیات	حالات کی گردش سے برسرِپیکار ایک خدائی فوجدار کے حیرت انگیز کارنامے
214	کنواری سہاگن	خالد شاکر	سچ بیانیاں	اس سہاگن کا قصہ جو پہلے دن سے شوہر کی بے اعتنائی کا شکار تھی
227	اللہ والا	یوسف کریمی		مذہب سے گہری وابستگی رکھنے والے ایک نوجوان کے روز و شب کا احوال
239	آنکھوں دیکھی	عاصم بختیار		اس محبت کے انجام کی روداد جو دو دلوں میں زور و شور سے موجزن تھی
249	نئی زندگی	حجاب ان عدیل		ایک بے سہارا لڑکی کا المیہ، وہ حالات کی سفاکی کا شکار ہو گئی تھی
259	قیامت تک	سرور اکرام		محبت کے لافانی جذبے کا انمٹ نقش، دو محبت کرنے والوں کی کہانی
269	دشمن دوست	عمر ایاز		معاشرتی اتار چڑھاؤ کے پس منظر میں ایک سبق آموز آپ بیتی
283	عقب زن	سلمان ارشد		دو سہیلیوں کا قصہ، ایک دوسری کی شادی کرانے جا رہی تھی مگر...
295	غصہ حرام	ثمینہ سحر		اس بہو کا احوال جس نے اپنی ساس کی گردن توڑ دی تھی
305	کارِ دشوار	منظلی امام		بچوں کو گود لینے کے خواہشمندوں کے لیے ایک قابلِ توجہ تحریر،
309	کامیاب کیس	عبدالحمید شاہ		دو خاندانوں کے درمیان محاذ آرائی کا چشم کشا تماشا!
	پارچے	ادارہ و قارئین	اقتباسات	دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر دلچسپ معلومات آپ کی تفریحِ طبع کے لیے بطورِ خاص

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جوہر شناس

سرگزشت

وہ یونان کا ایک چھوٹا سا ساحلی شہر تھا جہاں کے رہنے والے سب کے سب تاجر تھے۔ تاجرانہ سوچ تھی اس لیے ان لوگوں کا واحد مقصدِ حیات دولت کمانا تھا۔ یونان کے اور علاقوں کی طرح یہاں کے لوگ فلسفے اور سائنس کو ایک بے کار شے سمجھتے تھے۔ خود اس کا باپ بھی بہت بڑا جاگیردار اور نہایت دولت مند شخص تھا لیکن اُسے نہ زمینوں سے غرض تھی نہ جاگیروں سے بلکہ وہ ان لوگوں کی کوششوں پر ہنستا تھا جو دولت پیدا کرنے کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے اور سب کا یہی حال تھا‘ اس لیے وہ پورے شہر پر ہنستا تھا لیکن سب مل کر اس پر ہنستے تھے۔ اس کے رشتے دار اسے طعنے دیتے تھے کہ وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے اور ابھی تک اسے دولت کمانے کا شعور نہیں آیا۔

اسے کچھ کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی لیکن جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تو اسے اس دولت مند شہر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے تمام جاگیریں اور زمینیں اپنے بھائیوں میں بانٹ دیں اور خود نقد روپیہ لے کر تحصیلِ علم کے لیے سیاحت پر نکل گیا‘ جب وہ طویل سیاحت کے بعد وطن واپس آیا تو اس کی جوانی بڑھاپے کی منزلوں میں داخل ہو چکی تھی اور وہ بجا طور پر یہ کہنے کا حق دار تھا ”میرے ملک میں مجھ سے بڑا کوئی سیاح نہیں۔ میں دنیا کے دُور دراز گوشوں تک پھرا ہوں۔ میں نے اتنے زیادہ ملک دیکھے ہیں‘ اتنے زیادہ داناؤں سے کسبِ علم کیا ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔“

اب وہ ایسا بوڑھا مفکر تھا جو اپنے ہم وطنوں کی ہوسِ مال و زر کو ایک ایسی نظر سے دیکھتا تھا جس میں رحم بھی تھا اور حقارت بھی۔ اس کے ہم وطن اسے دیوانہ اور مجنوں سمجھتے تھے۔ اس سے بڑی دیوانگی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ایک شخص اپنا تمام سرمایہ سیاحت میں صرف کر دے اور پھر واپس آ کر بھی کوئی مفید کام کرنے کے بجائے سارا وقت بے کار باتوں پر سوچ بچار کرتا رہے اور اپنی اس خراب حالت پر خوش بھی ہو۔

”سیاحت کے دوران میں اس کی دماغی حالت بگڑ گئی ہے۔“ یہ خیال اہلِ شہر ہی کا نہیں‘ اس کے رشتے داروں کا بھی تھا چنانچہ اس کے شافی علاج کے لیے یونان کے مشہور طبیب بقراط کو بلایا گیا۔

بقراط اس کے علاج کے لیے آیا تھا لیکن اس سے ملنے کے بعد جب واپس جانے لگا تو اس کی حیثیت ایک عقیدت مند کی ہو چکی تھی۔ وہ اہلِ شہر سے یہ کہتا ہوا رخصت ہوا کہ جو شخص اسے دیوانہ سمجھتا ہے‘ اسے خود اپنے دماغ کا علاج کرانا چاہیے۔

اب لوگ اسے جادوگر کہنے لگے جس نے بقراط جیسے دانش مند کو بھی اپنے سحر میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ نہ جادوگر تھا نہ دیوانہ‘ وہ ایک سائنس داں تھا جس نے دنیا کے سامنے پہلے پہل ”ایٹم“ کا نظریہ رکھا۔ اس نے بتایا کہ دنیا چھوٹے چھوٹے ناقابلِ تقسیم ذرّوں یعنی ا-ٹموں سے بنی ہے۔ یونانی زبان میں ایٹم کے معنی ہیں ”نہ تقسیم ہونے والا۔“

اس نے یہ بھی بتایا کہ انسانی روح بھی ا-ٹموں سے بنی ہوئی ہے۔ جب یہ ایٹم انسانی بدن سے نکل جاتے ہیں تو انسانی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی حال جانوروں کا ہے۔

اس زمانے میں تجربات اور مشاہدات کے لیے لیبارٹریز کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس نے محض اپنی قوتِ فکر سے ”ایٹم“ کے وجود کو معلوم کیا جس کی تصدیق تقریباً دو ہزار سال بعد تجربے اور مشاہدے سے ہوئی اور اسی نظریے پر جدید کیمیا کی بنیاد پڑی۔

موجودہ زمانے میں وہ تمام سائنٹیفک تحقیقات جو ”ایٹم“ پر ہو رہی ہیں اور جس کے حیرت انگیز نتائج ایک عالم کو مبہوت کیے ہوئے ہیں‘ اس تمام تحقیقات کی داغ بیل اسی عظیم مفکّر کے ہاتھوں آج سے دو ہزار سال پہلے پڑ چکی تھی۔

وبائی امراض کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ فضا سے آئے ہوئے بعض ا-ٹموں سے پیدا ہوتے ہیں جنہیں وہ امراض کے ایٹم کہتا تھا۔ اس نظریے میں وبائی امراض کے جراثیم کے وجود کی ایک جھلک نظر آتی ہے جس کی دریافت موجودہ دور میں عمل میں آئی۔ گویا جراثیم کی موجودگی کی طرف بھی اسی کے نظریے نے توجہ دلائی۔

اس عظیم مفکّر کا نام دمقراط تھا۔ جب وہ ۴۶۰ ق م میں پیدا ہوا تو وہ ایک دولت مند باپ کا بیٹا تھا۔ جسے دنیا میں کسی شے کی کمی نہیں تھی لیکن جب بانوے سال کی طویل عمر پا کر ۳۶۸ ق م میں فوت ہوا تو تنگ دستی کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا لیکن اس حالت میں بھی وہ ان لوگوں پر ہنس رہا تھا جو دولت ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔

بابائے اردو

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

یہ ممکن نہیں کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی پر بات ہو اور مولوی عبدالحق کا نام درمیان میں نہ آئے۔ کیونکہ کہ تن تنہا اس راستے میں جتنا طویل اور کٹھن سفر انہوں نے طے کیا، وہ کسی اور کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ مولوی صاحب اردو زبان کے ان چاہنے والوں میں سے تھے جنہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا ہی اردو کی ترقی کو بنا لیا تھا۔ ساری زندگی اس کے سوا اور کوئی کام نہ کیا۔ بقول مولانا غلام رسول مہر "مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند، گراں مایہ اور پائیدار ہیں کہ آج پاک و ہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم و ادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا" یہی امتیازی خصوصیات انہیں "بابائے اردو" کا خطاب دلا گئیں۔

محسنِ اردو، عاشقِ اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سرگزشت

اکمن بکمن ڈھائی چکوتا
اگلے پھولے، بگلے پھولے
پھول پھول کی باڑیاں
راجا گیا دلی۔ وہاں سے لایا سات کٹوری
ایک کٹوری ٹوٹ گئی
راجا کی ماں روٹھ گئی۔

بچوں نے اس کے آنگن کے چاروں کونے اپنی آوازوں کے شور سے آباد کیے ہوئے تھے لیکن وہ خود اپنی ماں کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔

"بیٹا، جاؤ تم بھی کھیل لو۔ دیکھو، سب بچے کھیل رہے ہیں" اس کی ماں کے پاس آئی ہوئی محلے کی ایک عورت نے کہا۔

اس تقاضے کا اثر یہ ہوا کہ ابھی تک تو وہ صرف بیٹھا ہوا تھا، اب اس نے ماں کے دوپٹے کو بھی زور سے پکڑ لیا کہ کہیں یہ خاتون اسے زبردستی یہاں سے نہ اٹھا دیں۔

"نہیں بھئی، عبدی کو کچھ نہ کہو۔ اس کا دل کسی کھیل میں نہیں لگتا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"بہن، لڑکا ذات ہے۔ کھیلنے کودنے سے ہاتھ پاؤں سیدھے ہوتے ہیں۔ کوئی لڑکی ہے جو تمہارے کولھے سے لگی بیٹھی رہے گی۔"

"کیا کروں بہن! اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اس کا دل نہیں لگتا کسی کھیل میں۔ مجھے تو حیرت ہے یہ مکتب کیسے چلا جاتا ہے۔"

"اسے پڑھنے میں کیسا ہے؟"

"میں کیا جانوں مگر اتنا ہے کہ مکتب پابندی سے جاتا ہے۔ گھر میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھتا ہی رہتا ہے۔"

"چلو اس طرف سے تو کان ٹھنڈے ہیں ہمارا والا تو پڑھنے کا چور ہے۔"

"نہیں بہن! میرا عبدی پڑھنے میں بڑا تیز ہے۔"

"مری چکی میں کالا کالا دانا
چکی گھمر گھمر۔
چکی گھمر گھمر"

بچوں کی آوازیں بڑھتی ہی جارہی تھیں لیکن وہ اب بھی ہر شور سے بے نیاز کسی سوچ میں گم تھا۔

گلیوں میں کھیلنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور خصوصاً چراغ جلنے کے بعد اس لیے بچے گھروں میں کھیلتے تھے۔ کبھی ایک گھر میں چوکڑی جمتی کبھی دوسرے گھر میں۔ عبدالحق کی ماں ذرا نرم طبیعت کی تھیں اس لیے بچے اکثر یہیں آکر شور مچاتے

تھے۔

اس کی ماں کو کتنا ارمان ہوتا تھا کہ وہ اپنے عبدی کو کھیلتے ہوئے دیکھے لیکن اسے کھیلوں سے کوئی رغبت ہی نہیں تھی۔

شروع شروع میں بچوں نے اسے بہت تنگ کیا۔ اسے لڑکی ہونے کے طعنے دیے لیکن اسے ان کھیلنے والوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ والدین اپنے بچوں کو کھیلنے سے روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا پھر آہستہ آہستہ وہ بھی چپ ہو گئے۔ وہ ماں کے آنچل میں چھپ کر بڑا ہونے لگا۔

اس کا نام اس کے باپ نے عبدالحق رکھا تھا لیکن وہ اپنے بھولپن کی وجہ سے عبدی بن کر رہ گیا تھا۔

○☆○

شیخ علی حسین سرکاری ملازم تھے اور میرٹھ کے قریب ہاپوڑ میں مقیم تھے۔ عبدالحق کی پیدائش بھی یہیں ہوئی تھی۔ اس خاندان میں تمام بچوں کے نام "حسن" پر رکھے جاتے تھے لیکن شیخ علی حسین کے پیر و مرشد نے انہیں ہدایت کی تھی اپنے بچوں کے نام "حق" پر رکھیں چنانچہ انہوں نے بڑے بیٹے کا نام ضیاء الحق رکھا اور دوسرے بیٹے کا نام عبدالحق۔

سرکاری ملازمت کی وجہ سے شیخ علی حسین کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ جب ان کا تبادلہ پنجاب ہوا تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ اکیلے نہ جائیں بلکہ بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں۔

"اس کا ذہن اچھا ہے۔ پنجاب میں تعلیمی ماحول ملے گا اور پھر میری نگرانی بھی رہے گی" شیخ علی حسین نے کہا۔

"سوچ لیں۔ آپ وہاں رہ بھی سکیں گے۔ میں تو کہتی ہوں یہ تبادلہ منسوخ کرالیں۔" ان کی بیوی نے کہا۔

"میں نے کوشش کی تھی لیکن عبدی کی ماں تم تو جانتی ہو نوکری آخر نوکری ہوتی ہے۔ مجھے جانا پڑے گا اور اتنی دور میں تم لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

سب تیاری مکمل ہو گئی اور عبدالحق کو والدین کے ساتھ فیروزپور آنا پڑا۔ اس کے بعد گوجرانوالہ تبادلہ ہو گیا جہاں اس نے مشن ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

اب اس کی عمر ایسی نہیں رہی تھی کہ گھر میں بند ہو کر رہے یا ماں کا آنچل تھام کر چلتا رہے۔ کم از کم اس کے والد یہ ضرور چاہتے تھے کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ اس کے لیے انہوں نے یہ ترکیب نکالی کہ اسے ساتھ لے کر اپنے دوستوں کے پاس جانے لگے تاکہ اس کا حجاب دور ہو اور اسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آجائے۔ عبدالحق کو بھی یہ تفریح اچھی لگی۔ نئے نئے لوگوں سے سابقہ پڑنے لگا اور پھر ہر جگہ اس کی خاطر مدارات بھی ہوتی تھی۔

ایک روز وہ کسی وکیل صاحب کے دیوان خانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی گرما گرمی کے بعد اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب جو باتیں ہو رہی تھیں، وہ اس کے لیے بڑی دلچسپ تھیں۔

"جناب، وہ اب مسلمان کہاں ہے۔ وہ تو نیچری ہیں نیچری۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔"

"گردن مروڑی مرغی کھاتے ہیں اور انگریزوں کے برتن میں کھاتے ہیں۔ کیا اب بھی آپ انہیں مسلمان کہیں گے۔"

"انہوں نے رسالہ لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ انگریزوں کے ساتھ کھایا جا سکتا ہے۔"

"ان کے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان کے کفر کے فتوے تو عرب شریف کے علما تک نے دے دیے۔ اب کیا گنجائش رہتی ہے۔"

"کچھ بھی ہو، چاہے وہ خود مسلمان نہ ہوں لیکن ان کے دل میں مسلمانوں کے لیے درد بہت ہے۔ علی گڑھ میں [illegible] اور کالج کھولا ہے تاکہ مسلمان بچے انگریزی تعلیم حاصل کریں۔"

"یہی تو خرابی کی سب سے بڑی جڑ ہے۔ اب مسلمان بچوں کو انگریز بنایا جائے گا۔ ان کے دین میں خرابی پیدا کی جائے گی۔ غضب خدا کا! اب مسلمان بچے کوٹ پتلون پہننے لگے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ۔ وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے دن رات ایک کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں۔"

"کیسے مان لوں۔ وہ حج کرنے نہیں گئے، انگلستان چلے گئے۔ یہ ہے ان کا اسلام۔"

"وہ اگر انگلستان گئے تو وہ بھی مسلمانوں کے لیے گئے۔"

"آپ پر تو سرسید کا بھوت سوار ہے۔ آپ تو یہی کہیں گے۔"

"اس کا لوہا تو انگریز بھی مانتے ہیں۔ سنا ہے ان کے مرنے کے بعد ان کا سر انگریز لے جائیں گے کہ بھئی، اس سے عقل مند آدمی ہم نے نہیں دیکھا۔"

"[illegible] کا انکار کیوں کر رہے ہیں۔ ابھی لے جائیں۔ [illegible]"

[illegible] بھی ختم ہونے والی نہیں تھی اس لیے جب تلخی [illegible] گئی تو صاحبِ خانہ نے مداخلت کر کے اس گفتگو کو [illegible]۔

[illegible] پہلا موقع تھا جب عبدالحق نے سرسید احمد خان کا نام [illegible]۔ وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن جو [illegible] اس نے سنی تھی، اس کے بعد اسے ان کی شخصیت [illegible] ہو گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ وہ ضرور کوئی عظیم [illegible] ہوگی اسی لیے اتنے لوگ اس کے خلاف ہیں۔

اس وقت ہندوستان کی قومی زندگی اس بیمار کی طرح [illegible] رہی تھی جو موت کے منہ سے نکل آیا ہو لیکن اس کی زندگی کو اپنے مسیحاؤں کا کمال سمجھنے کے بجائے تقدیر کا تماشا سمجھ رہا ہو۔ جنگِ آزادی کی شکست کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ کہنے کو دو دہائیاں گزر گئی تھیں لیکن [illegible] گہرے تھے کہ بھرنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ہر وہ [illegible] انگریزوں کا دوست تھا انہیں اپنا دشمن نظر آتا تھا۔ سرسید کی انگریز دوستی نے سب کو ان کا دشمن بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے ہر طبقے میں سرسید کا نام موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ ان کی نسبت کفر و الحاد کے فتوے عام تھے۔

ایک مرتبہ اس نے سرسید کا نام سن لیا تو بار بار یہ نام سامنے آنے لگا۔ کہیں تعریفوں کی صورت میں، کہیں برائی کی شکل میں۔ وہ اس نام کو جتنا جتنا سنتا جاتا تھا، اتنی ہی عقیدت بڑھتی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خود اس کے والد سرسید کے حق میں تھے، خلاف نہیں تھے۔ خاص طور پر سرسید کی تعلیمی خدمات کے وہ بہت معترف تھے۔

وہ دن اس کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع کرنے آیا تھا جب وہ اپنے ایک ہم جماعت کے گھر گیا۔

"تم بہت پڑھاکو ہو نا۔ آؤ تمہیں ایک چیز دکھاؤں" اس کے دوست نے کہا اور اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا "یہ میرے والد کا کتب خانہ ہے۔ دیکھو، کتنی کتابیں ہیں یہاں۔"

عبدالحق کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ اتنی کتابیں ایک جگہ رکھی ہوئی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ یہ سب کتابیں اٹھا کر وہ اپنے گھر لے جائے۔ اتنی کتابیں پڑھنے کے بعد وہ کتنا بڑا آدمی بن جائے گا۔

حیرت کے حصار سے باہر آیا تو اس نے ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ ایک الماری میں کچھ رسائل رکھے تھے جن پر بنے ہوئے بیل بوٹوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک رسالہ اٹھا لیا۔ بیل بوٹوں کے درمیان جب اس کی نظر تحریر پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "تہذیب الاخلاق۔"

"یہ تو سرسید احمد خان کا رسالہ ہے جو وہ علی گڑھ سے نکالتے ہیں" عبدالحق نے اپنے دوست سے کہا۔

"ہوگا۔ مجھے کیا، یہ سب تو ابا کے ہیں۔"

"کمال ہے۔ تمہارے گھر میں ہیں اور تم انہیں پڑھتے نہیں۔ تم نے تو سرسید کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔"

"نام تو سنا ہے۔"

"میں نے بھی بس نام ہی سنا ہے۔ کبھی انہیں دیکھا نہیں" عبدالحق نے بڑی ندامت کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ساتھ رسالے کے اوراق بھی پلٹتا رہا۔ "یار، یہ ایک رسالہ میں لے جاؤں؟"

"نہ بابا نہ۔ ابا تو میری کھال کھینچ لیں گے۔"

"میں پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ پھر تم اسے یہیں رکھ دینا۔"

وہ لڑکا کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر اسے عبدالحق

"سوانحی خاکہ"

نام	عبدالحق
والد	شیخ علی حسین
بھائی	شیخ ضیاء الحق، شیخ احمد حسن
مولد	ہاپوڑ، ضلع میرٹھ
تعلیم	علی گڑھ (بی اے) ۱۸۹۴ء
اعزازی ڈگری	ڈی لٹ الٰہ آباد یونیورسٹی
	ڈی لٹ علی گڑھ یونیورسٹی
ملازمتیں	ہیڈ ماسٹر، مدرسہ آصفیہ
	ہوم سیکریٹریٹ میں مترجم
	مددگار، ڈائریکٹر تعلیم
	ڈائریکٹر سررشتہ تالیف و ترجمہ
	پرنسپل عثمانیہ کالج، اورنگ آباد
	صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ
	سیکریٹری انجمن ترقی اردو ۱۹۱۲ء تا ۱۹۳۹ء
	صدر انجمن ترقی اردو ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۱ء
پیدائش	۲۰ اگست ۱۸۷۰ء
وفات	۱۶ اگست ۱۹۶۱ء۔ کراچی

کی معصوم صورت پر رحم آگیا۔
"واپس کردو گے نا؟"
"ہاں بھئی۔ واپس نہیں کروں گا تو دوسرا رسالہ کیسے ملے گا۔"

اس لڑکے نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک ساتھ دو رسالے چپکے سے اس کے حوالے کردیے "اس میں کیا لکھا ہے، ذرا مجھے بھی بتانا۔"

اب وہ وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے رسالے بغل میں دبائے اور اس خزانے کو لے کر گھر پہنچ گیا۔ اس کے لیے یہ خزانہ ہی تو تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کے لوگ اتنے خلاف ہیں، وہ اپنی تحریروں میں کیا لکھتا ہے۔

پہلے ہی رسالے میں سرسید کے دو مضامین شامل تھے۔ اس کی تو دونوں مٹھیاں چاندی کے روپوں سے بھر گئیں۔ اس نے جلدی جلدی دونوں مضامین پڑھ ڈالے۔ یہ دنیا ہی اور تھی۔ یہ جہان ہی دوسرا تھا۔ جو کچھ کہنے والے کے دل میں تھا، وہ اب اس کے دل میں اُتر رہا تھا۔ اس نے اب تک جو دو چار کتابیں پڑھی تھیں، ان مضامین کی زبان ان سے بالکل مختلف تھی۔ سادہ اور عام فہم الفاظ تھے۔ طرزِ ادا ایسی کہ پڑھتے رہیے اور جی نہ بھرے۔ لفظوں کے طوطا مینا نہیں بنائے گئے تھے۔ سارا زور اظہارِ مطلب پر تھا۔ کہیں کہیں شوخی اور ظرافت بھی اپنے پَر پھیلائے بیٹھی تھی۔ خیالی جادوگری نہیں، حقیقت کا طلسم تھا جس کے حصار میں اس مضمون کا ایک ایک لفظ تھا۔ عقلی دلائل سے ایک ایک بات کو سمجھایا گیا تھا۔

اس مضمون کو ختم کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ آنکھیں کھولیں تو یوں لگتا تھا جیسے اندھیرے سے روشنی میں آگیا ہو۔ اچھا تو اس لیے لوگ ان کی برائی کرتے ہیں۔ نئی باتیں بڑی دیر میں حلق سے نیچے اترتی ہیں۔ یہ بڑی عمر کے لوگ ان نئی باتوں کو کہاں قبول کرنے والے۔

اس کے بعد اس نے ایک مضمون مولوی چراغ علی کا پڑھا۔ یہ مذہبی نوعیت کا مضمون تھا۔ زبان قدرے مشکل تھی لیکن پھر بھی اس نے جیسے تیسے اس مضمون کو ختم کر ہی لیا۔

اس دن کے بعد سے اسے چسکا سا پڑ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جتنے پرچے، اسے ملے اس نے پڑھ ڈالے۔ اس پر حیرت کے دروازے کھلتے جا رہے تھے۔ یہ کیسا آدمی ہے جو کبھی تاریخ پر لکھتا ہے کبھی مذہب پر۔ کبھی ادب پر کبھی سماجی مسئلے پر قلم اٹھاتا ہے اور ہر جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ سب سے زیادہ جس بات نے اسے متاثر کیا، وہ ان مضامین کا تحقیقی مواد تھا۔ وہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ سرسید کوئی بات تحقیق کیے بغیر نہیں لکھتے۔ اسے یقین آگیا کہ تحقیق، تلاش اور جستجو کے بعد ہی وہ اعتماد پیدا ہوتا ہے جو لکھنے والے کے قلم میں طاقت پیدا کردیتا ہے۔ کسی چھپی ہوئی بات کو ظاہر کرنے ہی میں نیاپن ہے اور یہ تحقیق کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

ان رسالوں کو پڑھ پڑھ کر اسے بھی شوق ہونے لگا تھا کہ وہ بھی کچھ لکھے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جب بھی کچھ لکھے گا پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھے گا جس طرح سرسید اور ان کے ساتھی لکھتے ہیں۔

ان پرچوں کے ذریعے اسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ علی گڑھ میں سرسید نے ایک اسکول اور کالج قائم کیا ہے۔ اس کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ سرسید کے اسکول میں تعلیم حاصل کرے لیکن باپ سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ علی گڑھ ہے کہاں۔ اگر دور ہے تو وہ وہاں کس طرح جاسکے گا۔

اس نے گوجرانوالہ مشن اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا تھا کہ شیخ علی حسین کا تبادلہ دوبارہ ہاپوڑ ہوگیا۔ اب انہیں عبدالحق کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ ان کی اس پریشانی کو خود عبدالحق نے دور کردیا۔

"آپ مجھے علی گڑھ کے مدرسے میں داخل کرادیجیے۔ کالج بھی وہیں ہے۔ اسکول سے نکل کر کالج میں پہنچ جاؤں گا۔ آج کل سب لوگ وہیں پڑھنے جارہے ہیں۔ سنا ہے وہاں کے طالب علم کو نوکری بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔"

اس نے ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی تاکہ والد پر زیادہ سے زیادہ اثر ہو اور وہ داخلے کے لیے رضامند ہوجائیں۔

"تم نے وہاں کے متعلق اتنی معلومات کہاں سے جمع کرلیں" والد نے پوچھا۔

"میں نے تہذیب الاخلاق کے کچھ پرچے پڑھے تھے۔ یہ معلومات وہیں سے حاصل کی ہیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو۔ نئے زمانے کی تعلیم تمہیں وہیں سے مل سکتی ہے لیکن علی گڑھ دور بہت ہے۔ تمہیں گھر سے دور، بورڈنگ میں رہنا ہوگا۔ بس چھٹیوں میں گھر آیا کرو گے۔"

"کیا مضائقہ ہے۔ آدمی تو کام کا بن جاؤں گا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔ دیکھو، میں چند دوستوں سے مشورہ کرکے کوئی فیصلہ کرتا ہوں۔"

عبدالحق دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ابا کے دوست [illegible] دیں۔

شیخ علی حسین فیصلہ کرچکے تھے۔ چند دوستوں نے مخالفت بھی کی لیکن وہ عبدالحق کو لے کر علی گڑھ پہنچ گئے۔ داخلہ بھی ہوگیا اور انگریز ہیڈ ماسٹر مسٹر ہورسٹ کی عنایت سے بورڈنگ ہاؤس میں کمرا بھی مل گیا۔

شیخ علی حسین اسے وہاں چھوڑ کر ہاپوڑ واپس آگئے اور وہ اس طلسم خانے میں گم ہوکر رہ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آگیا ہو۔ یہاں کے طالب علم ان کی عادات اور شرارتیں اور مصروفیات۔ اساتذہ، ڈائننگ ہال اور اس کے کھانے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ ایک حسین خواب کی طرح تھا۔ سب سے خاص بات جو اسے یہاں نظر آئی، قومیت کا احساس تھا۔ یہاں ہندوستان کے ہر علاقے اور ہر صوبے کے طالب علم تھے۔ سب اردو بولتے تھے اور بے تکلف بولتے تھے۔ کسی کو یہ خیال تک نہیں تھا کہ وہ کس علاقے اور کس صوبے کا ہے۔ ہندو ہے یا مسلمان۔ سب بھائیوں کی طرح تھے۔

استادوں کا رویہ ہر طالب علم کے ساتھ ایسا برادرانہ اور مشفقانہ تھا کہ کمزور سے کمزور طالب علم میں پڑھنے کا حوصلہ بیدار ہوجاتا تھا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ایک بڑا خاندان ہے جو ایک عمارت میں رہ رہا ہے۔

سب سے پہلے اس کا سابقہ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر ولایت حسین سے پڑا۔ چونکہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی انہی کے ذمے تھی اس لیے بورڈنگ ہاؤس میں مقیم لڑکوں کے ساتھ وہ خاص شفقت سے پیش آتے تھے۔ چند ہی دنوں میں عبدالحق کی سنجیدگی اور طالب علمانہ روش نے انہیں اچھا خاصا متاثر کردیا۔

وہ ریاضی کے استاد تھے۔ ایک دن عبدالحق کسی وجہ سے ان کا کام کرکے نہیں لایا۔ بہت خفا ہوئے۔

"میں تو تمہارا بھاٹ بنا ہوا ہوں اور جگہ جگہ تمہاری تعریف کرتا پھرتا ہوں۔ اور تم میرا ہی کام کرکے نہیں لاتے۔"

یہ سمجھانے کا ایسا طریقہ تھا کہ عبدالحق آئندہ شکایت کا موقع ہی نہ دے سکا۔ اسے یہ غیرت آتی تھی کہ وہ استاد ہوکر میری تعریف کرتے ہیں۔ میں اگر خود کو اس تعریف کا اہل ثابت نہ کرسکوں تو یہ کتنے شرم کی بات ہے۔

دوسرے معلم جن سے وہ متاثر ہوا مولوی خلیل اللہ تھے۔ وہ عربی کے استاد تھے۔ چھوٹا قد۔ ٹخنوں سے اونچا شرعی پاجاما۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہتی۔ مطالعے کے بے حد شائق۔ ان کی یہی ادا عبدالحق کے دل میں اتر گئی۔ اسے خود بھی پڑھنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہ تھا۔ ان کی جوہر شناس آنکھوں نے بہت جلد عبدالحق کا انتخاب کرلیا۔

"تم نے فارسی کا مضمون کیوں لیا۔ عربی کیوں نہیں لی" ایک دن انہوں نے پوچھا۔ "عربی پڑھ لو۔ یہ تمہارے کام آئے گی۔"

"مڈل تک تو میں نے عربی پڑھی ہے لیکن اب فارسی لے لی۔ عربی کیسے پڑھ سکتا ہوں۔"

"پڑھ کیوں نہیں سکتے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ تم میرے پاس آجایا کرو۔"

وہ بورڈنگ ہاؤس ہی میں رہتے تھے اس لیے ان کے پاس جانا مشکل نہیں تھا۔ ان کا کمرا پکی بارک اور کچی بارک کے درمیان تھا۔

وہ اس وقت کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنی تو انہوں نے کتاب آنکھوں سے ہٹالی۔

"کون ہے بھائی۔ کوئی ملازم ہے تو ذرا چلم بھر کرلادو۔ طالب علم ہو تو اندر چلے آؤ۔"

عبدالحق نے جھانکنے کے انداز میں اندر دیکھا۔ ان کی

چند قابلِ ذکر تصانیف

۱۔ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر
۲۔ مرحوم دلی کالج
۳۔ سرسید احمد خاں حالات و افکار
۴۔ چند ہم عصر
۵۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ
۶۔ نصرتی
۷۔ مقدماتِ عبدالحق۔
۸۔ پاکستان میں اردو کا المیہ
۹۔ تنقیداتِ عبدالحق۔
۱۰۔ خطباتِ عبدالحق۔

○☆○

نظر کچھ کمزور تھی اس لیے پہچان نہیں پا رہے تھے۔

"بھئی، کیا چوروں کی طرح جھانک رہے ہو۔ کون ہو بولتے کیوں نہیں۔"

"میں ہوں عبدالحق!" اس نے کہا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔

"ارے، یہ تو تم ہو۔ آؤ بیٹھو، ادھر آجاؤ۔" انہوں نے کتابیں سمیٹ دیں اور وہ دری پر بیٹھ گیا۔

"میاں عبدالحق، یہ لڑکے بڑے شریر ہوگئے ہیں۔ میں نے کچھ آم منگائے تھے۔ کمرے میں رکھ کر چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو سب آم غائب ہیں۔ کم بختوں نے آم کھائے تو کھائے گٹھلیاں بھی اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ میں نے یہ آم باغ میں بونے کے لیے منگائے تھے۔"

عبدالحق کو ہنسی تو بہت آئی لیکن ان کے سامنے ہنسنا بے ہودگی تھی اس لیے چپ بیٹھا رہا۔

"بھئی تم کیسے لڑکے ہو۔ اتنی اچھی بات سن کر بھی تمہیں ہنسی نہیں آئی۔ اتنی سی عمر میں فلسفی ہوگئے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"آپ کا نقصان ہوگیا۔ میں ہنس کیسے سکتا ہوں۔"

"نقصان کیسا۔ لڑکوں کی شرارت تھی۔ میں تو خود بہت دیر تک ہنستا تھا۔ اس عمر میں شرارت کرتے ہوئے لڑکے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ٹھہرو! میں تمہارے لیے کھیر لاتا ہوں۔ کل ہی گھر سے آئی ہے۔"

انہوں نے کھیر کا پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھنے لگے۔

"آپ نے کہا تھا عربی پڑھوں۔ اسی کے لیے حاضر ہوا تھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"ارے ہاں، وہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ چلو الف لیلہ سے شروع کرتے ہیں۔ اس کی زبان سادہ ہے اور قصے دلچسپ ہیں۔ تمہارا خوب دل لگے گا۔"

اس دن کے بعد سے وہ ان کے پاس پڑھنے کے لیے جانے لگا۔ ان کے پڑھانے کا انداز ایسا دل نشین تھا کہ بہت جلد وہ اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے لگا۔

اسکول کے بعد جب وہ کالج میں آیا تو قابلیت کے اعتبار سے عام طالب علموں سے کہیں آگے تھا۔ کالج میں پہنچتے ہی استادوں کی آنکھ کا تارا بن گیا۔

اسکول کے برعکس، کالج کے تمام اساتذہ ایک دو کو چھوڑ کر انگریز تھے لیکن سب پر مشرقی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ پروفیسر آرنلڈ ہمیشہ عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا و قبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا۔

کالج کے ہنگامے، اسکول سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ان ہنگاموں سے بے خبر اپنی کتابوں میں گم تھا۔ کالج یونین کے جلسے اور ہنگامے طلبہ کی توجہ کو تقسیم کرنے کے نہایت دل نشین ہتھیار تھے۔ بڑے بڑے پڑھاکو لڑکے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے لیکن اسے کوئی جلسہ اپنی طرف نہ کھینچ سکا حتیٰ کہ کالج میں قائم ادبی انجمنوں سے بھی وہ دور ہی دور رہا۔

البتہ جب پروفیسر آرنلڈ نے ایک انجمن "اخوان الصفا" قائم کی تو اس نے ایک مضمون "سینٹ پال" پر پڑھا۔ یہ مضمون اتنا کامیاب ہوا کہ اس دن کے بعد سے لڑکے اسے سینٹ پال کہنے لگے۔ وہ اس خطاب کا حق دار بھی تھا۔ کالج کی ہر رنگین صحبت سے بے نیاز، ہر وقت اپنی کتابوں میں غرق۔

اس نے "اخوان الصفا" میں دو ایک مضامین اور پڑھے تو اس کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ مضامین ہرگز کسی طالب علم کی کاوش معلوم نہ ہوتے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ تو اس جوہر قابل کے پرستاروں میں شامل ہوگئے۔ اس دن تو وہ حیران رہ گیا جب وہ خود چل کر اس کے کمرے میں آئے۔

"میں شام کی سیر کے لیے جا رہا تھا۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ شام کے وقت چہل قدمی کیا کرو۔ صحت کے لیے مفید ہوتا ہے۔"

وہ جیسا بیٹھا تھا اسی طرح ان کے ساتھ ہولیا۔ سیر کیا تھی، یہ بھی تدریس کا ایک ذریعہ تھا۔ راستے بھر علم و ادب پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔

"آج کل کیا کر رہے ہو؟ کچھ لکھ رہے ہو؟" پروفیسر آرنلڈ نے پوچھا۔

"ان دنوں بابیوں کے مذہب پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بڑا تحقیقی مزاج پایا ہے۔ بھئی، تمہیں اس کا خیال کیسے آیا اور پھر اس پر کتابیں کہاں سے مل گئیں؟"

"کچھ مسالا اِدھر اُدھر سے جمع کیا ہے۔ کچھ چیزیں اور ملنے کی امید ہے۔ پھر لکھنا شروع کر دوں گا۔"

"کچھ چیزیں میرے پاس بھی ہیں۔ وہ میں تمہیں فراہم کر دوں گا۔"

دوسرے دن پروفیسر آرنلڈ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے چند نمبر اسے بھیجے جن میں آرنلڈ نے بابی مذہب پر چند مضامین لکھے تھے۔

اس کے تحقیقی شوق نے ایسی شدت اختیار کی کہ جب کالج کا کتب خانہ کم پڑ گیا تو اس نے دوسرے کتب خانوں کا

[illegible] اس نے کہیں سے اورنگ آباد کے پن چکی والے کتب خانے کا ذکر سنا تھا۔ اسے دھن سوار ہوگئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کتب خانے تک پہنچ جائے۔ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ اورنگ آباد تک ریل بھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے یہ سفر احمد نگر کے راستے سے طے کیا لیکن افسوس! اس نے اس کتب خانے کا ذکر تو کہیں پڑھ یا سن لیا تھا لیکن یہ خبر اس تک نہیں پہنچی تھی کہ یہ عظیم کتب خانہ کب کا لٹ چکا۔ چند مخطوطات کے سوا کچھ بھی اسے دیکھنے کو نہیں ملا۔

تحقیق کے اس شوق نے اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ بنا دیا تھا۔ علی گڑھ کالج، صرف مسلمانوں کی تعلیم ہی کا مرکز نہیں تھا، کھیلوں میں سب سے آگے تھا۔ شام کے وقت کھیل کے میدان لڑکوں سے بھرے ہوتے تھے۔ کچھ کھیلتے تھے کچھ صرف دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے اساتذہ بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔ کئی مرتبہ اس کے ساتھیوں نے اسے بھی مجبور کیا لیکن کھیلوں سے نفرت اس کا شوق تھا جو اب تک قائم تھا۔ اس کی تو دنیا ہی اور تھی۔

مسٹر تھیوڈر بیک کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے نئے نئے آئے تھے۔ نوجوان تھے اس لیے طلبہ میں جلد ہی گھل مل گئے۔ عبدالحق پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی لیکن وہ اس کی اس بات سے بہت نالاں تھے کہ وہ کوئی کھیل نہیں کھیلتا۔ وہ اس سے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ کوئی کھیل کھیلا کرے لیکن یہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن وہ پکڑا گیا۔ مسٹر بیک خود اسے لینے اس کے کمرے میں آگئے۔

"کمال ہے! اس وقت تم اپنے کمرے میں بند بیٹھے ہو۔ چلو میرے ساتھ فیلڈ میں چلو۔"

"سر! مجھے کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں ہے۔"

"رغبت ہوگی کیسے۔ کبھی تم وہاں گئے ہی نہیں۔ یاد رکھو، ذہنی صحت کے لیے کھیل بھی بڑے ضروری ہیں۔"

"میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا کہ کھیل کے میدان کا رخ کروں۔"

"وقت نکالنا پڑتا ہے، چلو میرے ساتھ۔"

"اچھا سر، کل ضرور وقت نکال لوں گا۔"

"تم یہ سنہری اصول تو جانتے ہوگے کہ آج کا کام کل پر نہیں ٹالنا چاہیے۔ آج ہی چلنا ہوگا۔"

اب مزید بحث کرنا گستاخی ہوتا۔ وہ پرنسپل ہو کر اسے بلانے آئے تھے۔ اسے جانا پڑا۔ وہ گراؤنڈ میں چلا تو گیا تھا لیکن برابر اس فکر میں تھا کہ موقع ملے اور وہ یہاں سے فرار ہو۔ آخر اسے موقع مل گیا۔ مسٹر بیک کسی سے گفتگو میں مصروف ہوئے اور وہ وہاں سے کھسک لیا پھر یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہا کہ مسٹر بیک اسے لے جاتے اور وہ انہیں غچا دے کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

چھٹیوں کے دن آئے تو وہ بڑا پریشان ہوا کہ ہاپوڑ جا کر اتنے دن تک کیا کرے گا۔ اس پریشانی کا حل کسی نے اسے یہ بتایا کہ لائبریری سے کتابیں مستعار لے لے اور گھر بیٹھ کر پڑھے۔ یہ کام پروفیسر آرنلڈ کے سپرد تھا اس لیے اس کی ہمت ہوگئی۔ اکثر طالب علم کتابیں مستعار لے جاتے تھے۔ اس نے مطلوبہ کتابوں کی فہرست تیار کی اور پروفیسر آرنلڈ کے پاس پہنچ گیا۔

"تمہیں بڑی ہوس ہے۔ اتنی ساری کتابیں کیسے پڑھوگے؟" انہوں نے لمبی چوڑی فہرست دیکھ کر اس سے کہا۔

انہوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت ساری کتابیں ایسی تھیں جو وہ پڑھ نہیں سکا تھا۔ وہ کتابیں دیکھ کر خود پر قابو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا جی تو بس یہ چاہتا تھا کہ کتابوں ہی میں رہے۔ کتابوں ہی میں سوئے، کتابوں ہی میں اٹھے۔

سرسید احمد خان کو دیکھنے اور ملنے کے مواقع بھی اسے اسی کالج میں میسر آئے۔ کالج نیا نیا قائم ہوا تھا۔ بہت سے کمروں کی ابھی بنیادیں ہی پڑی تھیں۔ باغ وغیرہ لگائے جا رہے تھے۔ سرسید کا معمول تھا کہ صبح کو کالج کی عمارت، باغ وغیرہ دیکھنے آتے تھے۔ وہ انہیں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے بھاری بدن اور بڑھاپے کے باوجود پودوں کو پانی دیتے تھے۔ دھوپ میں کھڑے ہو کر مزدوروں کو ہدایات دیتے تھے۔ انہیں دیکھ کر یہ عقیدہ اس کے دل میں راسخ ہوگیا تھا کہ بڑا آدمی بننے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام کام اور صرف کام۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

کانفرنس ہال میں ہونے والے جلسے بھی اس کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کرتے تھے۔ ان جلسوں میں مسلم اکابرین شریک ہوتے تھے جنہیں قریب سے دیکھنے اور ملنے کے مواقع اسے حاصل ہوئے۔ انہی جلسوں کے طفیل اسے سرسید کی قربت حاصل ہوئی۔ یہیں اس نے حالی کو دیکھا۔ انہی جلسوں کی بدولت وہ ہندوستان کی سیاسی حالت سے واقف ہوا۔

علی گڑھ صرف تعلیمی درس گاہ نہیں تھی، تہذیبی مرکز

بھی تھا اور تربیتی ادارہ بھی۔ وہ نہایت خاموشی سے یہاں کی ایک ایک بات اپنے لہو میں اتار رہا تھا۔

سرسید سے ابھی دور دور کی ملاقات تھی لیکن سرسید کی عقابی نگاہوں نے اس کا انتخاب کرلیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوچلی تھیں۔ وہ اس مرتبہ گھر نہیں گیا تھا۔ کالج ہی میں رہ کر کتب خانے کی کتابیں چاٹ رہا تھا۔ ایک دن سرسید نے اسے حکم دیا کہ ان کے کتب خانے کی کتابیں بہت بے ترتیب رکھی ہیں، انہیں آکر کسی وقت ترتیب سے لگادو۔ ایک تو کتابیں اور وہ بھی سرسید کے کتب خانے کی۔ اس کے تو من کی مراد پوری ہوگئی۔ اس بہانے وہ سرسید کے کتب خانے کو بھی دیکھ لے گا۔ وہ اپنے لڑکپن کے اس دور کو یاد کررہا تھا جب اس نے اس عظیم ہستی کا صرف نام سنا تھا اور وہ بھی اچھے لفظوں میں نہیں۔ اس نے فوراً ایک اور لڑکے کو ساتھ لیا اور ان کے کتب خانے میں پہنچ گیا۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے بیٹھ جاتا لیکن انہیں ترتیب سے رکھتے ہوئے وہ ایک ایک کتاب کو نظروں میں رکھتا جارہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑی تو یہاں سے لے لے گا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ سرسید اسی کمرے میں ایک طرف تخت پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی بغل میں ان کا پوتا مسعود (سرراس مسعود) لیٹا تھا۔

وہ اسے سلانے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ تھا کہ سونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ اتنے میں انہوں نے اپنی بھاری آواز میں اسے لوری سنانی شروع کی۔ ان کی آواز ایسی گرج دار اور بے ہنگم تھی کہ عبدالحق کو اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ دونوں لڑکے دوسرے دروازے سے باہر بھاگے اور ہنسی کا خزانہ باہر جاکر لٹادیا۔ یہ محض ہنسی کی بات تھی لیکن جب عبدالحق نے غور کیا تو سرسید کی شخصیت کا ایک دوسرا روپ سامنے آیا۔ ان کے سینے میں کیسا نرم اور مخلص دل چھپا ہوا ہے۔ ایک بچے کو خوش کرنے کے لیے انہوں نے اپنی حیثیت کا بھی خیال نہیں کیا۔ شاید یہی درد پوری قوم کے بچوں کے لیے ان کے دل میں تھا۔

گرمیوں کی چند دوپہروں میں یہ کام نمٹ گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سرسید سے اس کی قربت بڑھ گئی۔ وہ کام میں مصروف ہوتا اور بیچ بیچ میں سرسید اس سے باتیں بھی کرتے جاتے۔ اس کے علمی ذوق نے سرسید کے دل میں جگہ بنالی۔ اب وہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ انہیں اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھتا۔ ان سے ہم کلام ہوتا۔ لکھنے پڑھنے میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان سے سیکھتا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ سید محمود (سرسید کے بیٹے) ہائی کورٹ الہ آباد سے استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگئے۔ معلوم ہوا چیف جسٹس، ہائی کورٹ الہ آباد سے ان بن ہوگئی تھی۔ لہٰذا ملازمت چھوڑدی۔ ایک دن عبدالحق، سرسید احمد خان سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچا تو سید محمود سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئے۔ یہ اس کوٹھی کا سب سے بڑا کمرا تھا۔ لیکن نہایت بے ترتیب۔ ہر طرف کاغذات اور کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"تمہاری قابلیت کے بہت چرچے ہونے لگے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ کیا کہتا۔ ہنس کر چپ ہوگیا۔ سید محمود نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"جانتے ہو، یہ کاغذات کیوں بکھرے ہوئے ہیں۔ اور میں کیا لکھ رہا ہوں۔"

"یقیناً کوئی اہم تالیف ہوگی جو آپ اتنے مستغرق ہیں۔"

"چیف جسٹس، الہ آباد نے گورنمنٹ کو میرے خلاف ۷۵ صفحے کی رپورٹ لکھ کر بھیجی ہے۔ میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔ کم از کم پانچ سو صفحے لکھوں گا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کوئی اہم تالیف سپرد قلم کررہے ہیں۔"

"کئی اور کام بھی پیش نظر ہیں جنہیں مکمل کرنا ہے" کچھ دیر توقف کرنے کے بعد انہوں نے کہا "تمہیں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا۔"

"میں ان قانونی پیچیدگیوں کو کیا سمجھوں گا۔"

"تم حوالے تلاش کرسکتے ہو۔ اقتباسات کی نقل کرسکتے ہو۔"

"ہاں، یہ کام تو میری طبیعت کے ہیں۔"

"سہ پہر کو آجایا کرو۔ میرا کچھ کام ہلکا ہوجائے گا۔"

وہ ہر شام ان کے ساتھ گزارنے لگا۔ کام کرتے کرتے رات ہوجاتی تو وہ اسے رات کے کھانے کے لیے روک لیتے۔ کھانے پر سرسید بھی ہوتے۔ کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو بھی چلتی رہتی۔

یہ کالج کی کلاسوں سے الگ ایک درس گاہ تھی جہاں وہ تعلیم حاصل کررہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے وہ کچھ سیکھ لیا تھا جو بڑی بڑی کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

ان صحبتوں کی بدولت اسے سرسید اور سید محمود کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے کام کرنے کے طریقوں سے واقفیت ہوئی اور اس نے اپنے مستقبل کے لیے

اپنے ذہن میں ایک خاکہ تیار کرلیا۔

انہی صحبتوں میں اسے ان تمام لوگوں سے ملنے کا موقع ملا جو سرسید کے رفقا میں تھے۔ یہیں اس کی ملاقات مولانا الطاف حسین حالی سے ہوئی۔ یہ ملاقات اس طرح ہوئی جیسے دو ہم خیال روحیں آپس میں ملتی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ کسی تقریب میں شریک تھا۔ اس تقریب میں مجرا بھی ہونا تھا۔ اسے مجرے کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا لیکن جب سب بزرگ بیٹھ چکے اور طوائف ناچنے کے لیے کھڑی ہوئی تو اس نے جانا کہ مجرا یہ ہوتا ہے۔

فجر کی اذان میں کچھ دیر باقی تھی۔ صبح صادق کا سماں تھا کہ طوائف نے ایک عجیب و غریب چیز چھیڑدی۔

ان اشعار کا جادو تھا یا طوائف کی درد بھری آواز یا پھر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی کا اثر۔ ہر آنکھ سے آنسو رواں ہوگئے جیسے رات بھر کی غفلت کے بعد کسی نے عاقبت یاد دلادی ہو۔

اس وقت اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کلام کس کا ہے۔ بعد میں جب اس نے دو چار کتابیں پڑھ لیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ مسدس حالی کے بند تھے جو اس طوائف کے ہونٹوں سے ادا ہورہے تھے اور سننے والوں کے دلوں میں اتر رہے تھے۔ آج اس کلام کا خالق اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ سرسید کی کوٹھی میں بہت سے اکابرین سے ملا تھا لیکن حالی کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے یہ شخص اس کے اندر جذب ہوتا جارہا ہے۔ اس وقت جتنے ستارے آسمانِ ادب پر فروزاں تھے، اس نے سب سے زیادہ روشنی اس ستارے میں دیکھی۔ سرسید ادیب سے زیادہ مصلح تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی شخصیت میں زیادہ جاذبیت نہیں تھی۔ آزاد کی ادبی شخصیت میں دل کشی تھی مگر تابناکی نہ تھی۔ شبلی کے مزاج میں بڑی حد تک انانیت کا دخل تھا۔ ان کی خود پرستی عبدالحق کے مزاج کے برخلاف تھی۔ حالی کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اس کا اپنا مزاج مجسم ہوکر سامنے آگیا ہے۔ وہ ان سے متاثر نہیں ہوا بلکہ گرویدہ ہوگیا۔

حالی نہایت سادہ طبیعت تھے۔ عبدالحق بھی سادہ مزاج اور نیک سرشت تھا۔ حالی کی سرشت میں غرور کا شائبہ تک نہیں تھا۔ فراخ دل تھے اور اپنے سے چھوٹوں کی تعریف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ عبدالحق بھی منکسرالمزاج اور کشادہ دل واقع ہوا تھا۔ حالی شہرت کے طلب گار نہیں تھے۔ عبدالحق بھی یہی چاہتا تھا کہ شہرت سے دور رہ کر بس سرجھکا کر کام کرتا رہے۔ پھر اس میں اور سرسید میں سب سے بڑا اتحاد یہ تھا کہ حالی بھی سرسید کے عقیدت مند تھے اور خود وہ بھی۔ پہلی ہی ملاقات میں حالی کا احترام جو اس کے دل میں تھا، محبت میں تبدیل ہوگیا۔

حالی ان دنوں کالج کی عمارت ہی میں مقیم تھے۔ لہٰذا وہ ان کے پاس جانے لگا۔ حالی ان دنوں "حیاتِ جاوید" کی تالیف میں مصروف تھے۔ اور ساتھ ہی "یادگارِ غالب" کو بھی ترتیب دے رہے تھے۔

وہ جب حالی کے پاس پہنچا تو ان کے دل پر بھی یقیناً وہی اثر ہوا جو اس نے محسوس کیا تھا۔ انہوں نے کچھ اپنے مزاج اور کچھ اس کی پیاس کے مطابق اس کے ساتھ ایسا مشفقانہ رویہ اختیار کیا کہ اس کی گرویدگی شیفتگی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ کام کرتے ہوئے ان کے انہماک کو دیکھتا۔ ایک ایک حوالے کے لیے وہ جتنی محنت اور چھان پھٹک کرتے، اسے ملاحظہ کرتا۔ ان کے طرزِ اسلوب کو بار بار ذہن میں بٹھاتا۔ ایک خاموش تربیت تھی جس سے وہ گزر رہا تھا۔

حالی سے ملاقات کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ لاشعوری طور پر اس کے اندازِ تحریر پر حالی کی پرچھائیاں پڑنے لگیں۔ اس نے بھی حالی کی طرح سادگی، سلاست، روانی اور صفائی کو اپنی نثر کا خاصہ بنالیا۔ عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ کی جگہ ہندی الفاظ نے لے لی۔

"جس میں سنورنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اس میں بگڑنے کے بھی لچھن ہوتے ہیں۔"

(زبانِ اردو پر سرسری نظر)

حالی کی طرح اس نے بھی محاورات کے فطری استعمال پر زور دینا شروع کردیا جس سے اس کی نثر میں ایک نئی شان پیدا ہونے لگی۔ متانت اور سنجیدگی کی فضا خود بخود اس کی نثر میں پاؤں پھیلانے لگی۔ حالی کی طرح اس کا مزاج بھی سائنسی ہوتا چلا گیا۔ عبارت آرائی اور رنگینیٔ کلام سے کام لینے کے بجائے اپنے نظریات کو صحیح اور جچے تلے الفاظ میں پیش کرنے کا عادی ہوگیا۔ غرض یہ کہ جب وہ مولانا حالی کی بزم سے اٹھا تو بہت کچھ لے کر اٹھا۔

اردو کے بہترین مضمون پر ایک تمغا لارڈ لیس ڈاؤن ملا کرتا تھا۔ جب یہ تمغا اسے ملا تو صاف ظاہر ہونے لگا کہ اردو کی تاریخ میں ایک بڑے ادیب کا اضافہ ہونے والا ہے۔ سرسید احمد خان نے اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے پرچے "تہذیب الاخلاق" میں بھی کام لینا شروع کردیا تھا۔

علی گڑھ کالج کہنے کو ایک محدود عمارت تھی لیکن اس محدود دنیا میں ایک لامحدود دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں تعلیم، تہذیب اور سیاست کے پھول کھلتے تھے۔ یہاں سے اٹھنے والی

آواز تمام مسلمانوں کی آواز بن جاتی تھی۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کی جولانگاہ تھی یہ عمارت۔ بیدار ذہنوں کی پرورش گاہ تھی یہ عمارت۔ یہاں پہنچ کر مٹی، سونا اور سونا کندن بنتا تھا۔

عبدالحق نے اس دانش کدے میں اپنی زندگی کے چھ سال بسر کیے اور چھ صدیوں کا تجربہ لے کر گھر لوٹ آیا۔

سرسید احمد خان جیسا مصلح اعظم اور ہمہ گیر انسان، ہندوستان تو ہندوستان دنیا میں اپنی مثال آپ تھا۔ عبدالحق نے اسی عظیم انسان کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اس کو اٹھتے بیٹھتے، لکھتے پڑھتے دیکھا تھا۔ کس طرح ممکن تھا کہ نوجوان عبدالحق کے دل میں کام کرنے کی لگن، پابندی وقت کا خیال، نفاست پسندی، اعلانِ حق میں بے باکی اور جرأت کا خیال پیدا نہ ہوتا۔

اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کی بقا، اردو کی ترقی میں مضمر ہے۔ کوئی زبان محض زبان نہیں ہوتی بلکہ اس قوم کی تاریخ، اس کا کلچر اور اس کی تہذیب ہوتی ہے۔ اگر اردو زبان ہاتھ سے گئی تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ ہندی، اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء ہی میں سر اٹھا چکا تھا۔ سرسید نے اسے دبانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی لیکن اب بھی یہ جھگڑا مختلف صورتوں میں سر اٹھاتا رہتا تھا۔ نوجوان عبدالحق کو احساس تھا کہ یہ جھگڑا وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا۔ اس طوفان کے سامنے بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ ادب محض عیاشی نہیں، قومی خدمت بھی ہے۔ سرسید کے بعد ایک سپاہی کی ضرورت ہے جو اردو کے دفاع کا سپاہی ہو۔

وہ ان خیالوں کو اپنے ذہن میں سجائے اپنے وطن ہاپوڑ میں بی اے کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ہاپوڑ کا پہلا نوجوان تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور سراپا اردو بن کر زندہ رہنا چاہتا تھا۔

یہ زمانہ اس کے لیے نہایت جذباتی تھا۔ خیالوں کے ہجوم اسے گھیرے ہوئے تھے اور وہ اس بھیڑ میں اپنے لیے راستہ بنانے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اس کے والدین اس کا مستقبل اس کی شاعری میں تلاش کر رہے تھے۔ خیال یہی تھا کہ وہ شادی سے کیوں انکار کرے گا۔ اس لیے اس سے پوچھنے کی کسی نے ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

اس کی بہن کی شادی ہاپوڑ کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اسی گھرانے کی ایک لڑکی اس کے لیے پسند کر لی۔

"ہم چاہتے ہیں، اب تمہاری شادی کر دی جائے۔" اس کے والد نے کہا۔

وہ باپ کے سامنے تو زبان نہیں کھول سکا لیکن ماں کے سامنے پہنچ کر اس نے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"اوئی بچے، شادی کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ کرنے کو ہوتا ہے؟"

"ابھی تو میری نوکری کا بندوبست بھی نہیں ہوا ہے۔" اس نے دوسرا بہانہ کیا۔

"گھر میں کیا کھانے کو نہیں ہے۔ بس تو شادی کر لے۔ نوکری ہوتی رہے گی۔"

"اماں، تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ تمہارے باپ کا حکم ہے۔ انہیں منع کرنے کی مجھ میں تو ہمت ہے نہیں۔"

ان میں منع کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن وہ انہیں بتا تو سکتی تھیں کہ عبدالحق تیار نہیں ہے۔

دوسرے ہی دن اس کے باپ نے اسے اپنے حضور طلب کر لیا۔

"سنا ہے، آپ شادی کرنا نہیں چاہتے۔"

"فی الحال نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں؟"

"میری زندگی کسی ڈھب پر تو آ جائے۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ہمیں یہ خوشی دینا ہی نہیں چاہتے۔ جب ہماری آنکھیں بند ہو جائیں گی، اس وقت کرو گے شادی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"یہی بات ہے۔"

"دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس گھر میں میری بہن بیاہی گئی ہے۔ اسی خاندان کی لڑکی سے میرا شادی کرنا مناسب نہیں۔"

"اچھا جی، تو اب آپ چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ نامناسب ہے۔ شادی ابھی ہو گی اور جہاں ہم کہتے ہیں وہیں ہو گی۔"

اب مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ نہ انکار کیا نہ اقرار، بس خاموش ہو گیا۔ ماں خوش

ہوگئی کہ بیٹا مان گیا۔ عبدی بھائی کی شادی ہو رہی ہے' دوسرے کہتے رہے' وہ سنتا رہا۔

جیسے جیسے شادی کا دن قریب آرہا تھا' اس پر گھبراہٹ طاری ہوتی جارہی تھی۔ کیا میں اسی لیے علی گڑھ گیا تھا کہ واپس آکر شادی کے بندھن میں جکڑ دیا جاؤں۔ پھر اسی طرح زندگی گزارنے لگوں جس طرح ہندوستان کے لاکھوں لوگ گزار رہے ہیں۔ سیکڑوں عزائم اس کے سینے میں مچل رہے تھے جنہیں وہ ایک ایک کر کے مرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

اب جبکہ شادی ہو ہی رہی ہے تو بیوی کو دینے کے لیے کوئی تحفہ بھی تو ہو۔ وہ تحفہ خریدنے کے لیے میرٹھ چلا گیا۔ واپس آیا تو چاندی کی کٹاؤ دار ڈبیا اس کی شیروانی کی جیب میں پڑی تھی۔ اس ڈبیا میں سچے آب دار موتی چم چم چمک رہے تھے۔

روایتی گھرانوں کی طرح روایتی دھوم دھام سے برات روانہ ہوئی۔ گیس کے ہنڈوں کی جگ مگ کرتی روشنی میں طوائفیں خوب ناچیں۔

دلہن گھر آگئی۔ عبدی بھائی کی شادی ہوگئی۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ ولیمے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رات آگئی۔ دلہن اپنے کمرے میں بیٹھی' اس کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھی۔ اس کے جی میں جانے کیا آئی کہ موتیوں کی ڈبیا شیروانی کی جیب میں ڈالی اور غسل خانے کے دروازے سے نکل کر فرار ہوگیا۔

پکڑے جانے کے خوف نے اسے گھر سے بہت دور بمبئی پہنچا دیا۔

وہ کسی منزل اور ارادے کے بغیر بمبئی آگیا تھا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ کچھ پیسے جیب میں ہیں۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی تجارت کی جائے تو اس بڑے شہر میں کاروبار خوب چمکے گا۔ اس ارادے کے بعد وہ کاروبار کے انتخاب کے لیے بمبئی کے بازاروں کا گشت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی ملاقات محسن الملک سے ہوگئی۔ جو سرسید کے ساتھیوں میں تھے اور اب ریاست حیدر آباد میں معتمدِ مال تھے۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ علی گڑھ میں عبدالحق سے ان کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں لہٰذا دیکھتے ہی پہچان لیا اور اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔

محسن الملک کو ہنسی آگئی جب انہیں اس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ تجارت کرنا چاہتا ہے۔

"تجارت تمہارے بس کا روگ نہیں۔ ہر نوکری تم کر نہیں سکتے۔ کر بھی لی تو دفتر کے بابو ہو کر رہ جاؤ گے۔ نوکری ایسی ہونی چاہیے جہاں تمہارے جوہر چمکیں۔"

"ایسی نوکری مجھے کون دے گا؟"

"ریاستِ حیدر آباد میں آج کل اہلِ علم کی بے حد قدر دانی ہو رہی ہے۔ تم فوراً حیدر آباد چلے جاؤ۔"

"یہ آپ نے اور اچھی کہی۔ وہاں کون ہے جو مجھے جانتا ہے۔"

"میں تو جانتا ہوں۔ بھئی' تم میرا رقعہ لے کر جاؤ گے۔ جاتے ہی نوکری مل جائے گی۔"

محسن الملک نے ایک خط وقار الملک مولوی مشتاق کے نام لکھ کر انہیں دے دیا۔ وہ اس سفر کی طرف روانہ ہوگیا جہاں آبلوں کا امکان تو تھا لیکن انہی آبلوں میں بابائے اردو کی زندگی پوشیدہ بھی تھی۔

محسن الملک کی سفارش ہو اور نوکری نہ ملے' یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مدرسۂ آصفیہ میں بطور ہیڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوگیا۔

یہ نوکری اس اعتبار سے تو جاذبِ نظر نہیں تھی کہ لکھنے پڑھنے یا تحقیق و تنقید کے مواقع ملتے لیکن قدم جمانے کے لیے کسی کاروبار یا تجارت سے بہتر سہارا تھا۔ انہیں اس وقت ایسے ہی کسی سہارے کی ضرورت تھی۔

حیدر آباد کی علمی فضا اور قدر دانی نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ معمولی سی ہیڈ ماسٹری کی توقیر ہی کیا لیکن جس طرح حیدر آباد کے علمی حلقوں اور اہلِ اقتدار نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس سے اسے اندازہ ہوگیا کہ اس ریاست میں آگے بڑھنے کے بہت مواقع ملیں گے۔

وہ ایک دن اپنے سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اسے وہ ڈبیا نظر آگئی جس میں موتی رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس ڈبیا کو دیکھتا رہا۔ کئی منظر آنکھوں کے سامنے آئے اور اوجھل ہوگئے۔ میرے گھر والوں کو تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اسے وہ دلہن یاد آگئی جسے وہ چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ اب تک میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ اس کے تو پاؤں سُن ہوگئے ہوں گے۔ اس کا انتظار اب ختم ہو جانا چاہیے۔ اس نے طلاق نامہ لکھا اور گھر کے پتے پر روانہ کر دیا۔

یہ ملازمت کرتے ہوئے اسے چار سال ہوگئے تھے۔ یہ مدت اس جیسے لائق آدمی کے لیے' اعلیٰ حلقوں میں اپنی جگہ بنانے کے لیے کم نہیں ہوتی۔ پھر نہ گھربار کی فکر تھی نہ بال

ان کی۔ اسے اپنی اہمیت منوانے کی فرصت خوب مل رہی تھی۔

وہ ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ افسر بار جنگ' افواجِ آصفیہ کے سپہ سالار اس سے ملاقات کے لیے آئے۔ جلد ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ وہ ایک ماہ نامہ "افسر" نکالنا چاہتے تھے۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ اردو میں رسائل کی بہت کمی ہے۔ اردو کی ترقی کے لیے رسائل کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ان کے ذریعے لکھنے والوں کو تحریک ملے گی۔ اردو کے ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوگا لیکن یہ چونکہ بھاری پتھر ہے اس لیے لوگ چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔" عبدالحق نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"یہ بھاری پتھر آپ کو اٹھانا ہوگا۔"

"مجھے؟"

"جی ہاں' اس کے مدیر آپ ہوں گے۔ اس کے لیے آپ سے زیادہ مناسب آدمی اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

"میں اپنی مصروفیت کا بہانہ کر سکتا تھا لیکن یہ اردو کا معاملہ ہے اس لیے انکار نہیں کروں گا۔"

اب وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ رسالہ "افسر" کو بھی ایڈٹ کرنے لگا۔ پیاسے کو چند قطرے پانی کے مل گئے۔ اس کام سے اسے ذہنی مناسبت تھی۔

اس کی محنت سے یہ رسالہ ایک معیاری رسالے کے روپ میں ظاہر ہوا۔ خود اس کے لیے بھی مفید ثابت ہوا۔ اس کی ابتدائی نگارشات اسی پرچے میں شائع ہوئیں۔ چیزوں کو جانچنے اور ان پر تبصرے کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہوئی۔

اس پرچے میں کام کرتے ہوئے اسے بہ مشکل ایک سال گزرا ہوگا کہ اسے ہوم سیکریٹری عزیز مرزا نے طلب کر لیا۔ انہیں اپنے دفتر کے لیے ایک مترجم کی ضرورت تھی۔ عبدالحق سے بہتر آدمی اس کام کے لیے بھی کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اسی دفتر میں وہ دس سال تک کام کرتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر محکمۂ تعلیم کو یاد آگیا۔ ۱۹۱۱ء میں اسے ڈائریکٹر تعلیم کے مددگار کے طور پر بلا لیا گیا۔ ایک سال بعد اسے صوبہ اورنگ آباد کا انسپکٹر آف اسکولز بنا دیا گیا لہٰذا اسے اورنگ آباد جانا پڑا۔

○☆○

۱۹۰۲ء میں دلی میں شاہی دربار ہوا تھا۔ اس وقت لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی اپنا

نوجوان دلوں کے لئے
ایک خوبصورت کتاب

"رنگ چاہت کے"

انجم انصار کے کھٹے، میٹھے، تیکھے اور چنچل افسانوں کا مجموعہ "رنگ چاہت کے" بہت محدود تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ آج ہی منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ یا کسی بھی طریقے سے کتاب کی قیمت بھیج کر "رنگ چاہت کے" فوری منگوالیں۔

پاکستان میں کتاب کی قیمت
مع محصول ڈاک -/150 روپے۔

غیر ممالک میں کتاب کی قیمت 15 ڈالر

لاہور۔ فون نمبر۔ 7230423 (042)

پتا
ساگر پبلشرز۔ 7A۔ لوئر مال۔
داتا دربار روڈ۔ لاہور۔ 54000

سالانہ جلسہ کیا۔ اس کانفرنس نے اپنی قرارداد میں چار ذیلی شعبے قائم کیے۔ ایک مدارس کا، دوسرا اصلاحِ تمدن کا۔ تیسرا تعلیمِ نسواں کا اور چوتھا اردو کا جو انجمن ترقیِ اردو سے موسوم ہوا۔ پروفیسر آرنلڈ اس کے صدر اور مولانا شبلی پہلے سیکریٹری منتخب ہوئے۔

مولانا شبلی نے استعفیٰ دے دیا تو دسمبر ۱۹۰۵ء میں ان کی جگہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی سیکریٹری منتخب ہوئے۔ جلد ہی پروفیسر آرنلڈ انگلستان واپس چلے گئے۔ ارکانِ انتظامی بھی تقریباً سب کے سب حیدر آباد دکن میں تھے اس لیے انجمن کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہ دے سکے۔ انجمن صرف کاغذ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ بالآخر وہ اپنے عہدے سے دست بردار ہو گئے۔ ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا کو نیا سیکریٹری بنایا گیا۔ ان سے بڑی امیدیں تھیں لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔

۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں ہوا۔ اس اجلاس میں یہ بات سب نے محسوس کی کہ ترقیِ اردو کا شعبہ لاوارث بچے کی طرح کسی سرپرست کی تلاش میں ہے۔

کانفرنس کے سربراہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں نے سیکریٹری کے عہدے کے لیے مولوی عبدالحق کا نام پیش کیا۔ ان کی خدمات اور صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے بالاتفاق ان کے نام کی منظوری دے دی گئی۔

عبدالحق چونکہ ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد میں مقیم تھے اس لیے انہوں نے اپنا صدر دفتر وہیں قائم کیا۔

وہ اس انتظار میں تھے کہ جب دفتر منتقل ہوگا تو نہ جانے کتنا بھاری سامان اترے۔ گھر میں جگہ بھی ہوگی کہ نہیں۔

"دفتر کا سامان آگیا ہے" قاصد نے اطلاع دی اور وہ بھاگم بھاگ مکان کی طرف گئے۔

"کہاں ہے سامان؟"

"یہ کیا پڑا ہے۔"

ایک پرانا صندوق تھا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات، ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام۔ یہ تھی کل کائنات جس کے سہارے انہیں اردو کی جنگ لڑنی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا یہی تھا۔ اسی میں گزارہ کرنا تھا۔ انہوں نے صندوق ایک کونے میں رکھا اور سوچنے بیٹھ گئے کہ اب انہیں کیا کرنا ہوگا۔

کئی مشکلیں ایک ساتھ آگئی تھیں لیکن سب سے بڑی مشکل سرمائے کی فراہمی کی تھی۔ انہیں سرسید یاد آگئے جو بات بات پر چندہ جمع کرنے نکل کھڑے ہوتے تھے اور آخر اتنے بڑے کالج کی عمارت کھڑی کرلی۔ مجھے بھی چندے کی مہم شروع کرنی چاہیے۔ انہوں نے سوچا لیکن یہ سوچتے ہی خود سے شرم آنے لگی۔ کسی کے سامنے ہاتھ کیونکر پھیلاؤں گا۔ چندہ مانگنے کے لیے ایک خاص طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں جہاں جاؤں گا، مروت غالب آجائے گی۔ وہ ڈھٹائی کہاں سے لاؤں گا جو چندہ مانگنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

ان میں ساری صلاحیتیں تھیں لیکن چندہ مانگنے کی صلاحیت خود میں نہیں پاتے تھے لیکن معاملہ انجمن کا اور اردو کی بقا کا تھا۔ دو ہی راستے تھے۔ وہ دفتر بند کردیں یا چندہ مانگنے نکل کھڑے ہوں۔ آخر انہوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔ سنت گھر سے چلتی ہے۔ انہوں نے اپنا کل سرمایہ انجمن کی نذر کردیا۔ ہمدردوں کی صدائیں آنے لگیں۔

"مولوی صاحب نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آخر وہ اپنا ذاتی سرمایہ اس قدر بے دردی سے کیوں خرچ کر رہے ہیں۔"

مولوی صاحب دنیا کی اس ہمدردی سے قطعی خوش نہیں ہوئے بلکہ جھنجلا اٹھے اور پھر جو جواب انہوں نے دیا صرف وہی دے سکتے تھے۔

"یہ تم نے کیا کہا، میں اپنا ذاتی روپیا بے دردی سے کیوں خرچ کر رہا ہوں، تمہارے بھائی یا بھتیجے پر خدانخواستہ کوئی آفت پڑے تو کیا تم اس کی مدد نہ کرو گے اور کیا ایسے وقت میں تم روپے کا منہ دیکھو گے۔ میرا تعلق انجمن سے ایسا ہی ہو گیا ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے جدا نہیں سمجھتا اور انشاء اللہ یہ تعلق جب تک دم میں دم ہے ایسا ہی قائم رہے گا خواہ میں سیکریٹری رہوں یا نہ رہوں۔"

اس عزم اور ہمت سے کام کیا جائے تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایک دروازے پر گئے۔ ہر دروازہ کھٹ کھٹایا۔ ان لوگوں کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا جن سے ملنا بھی وہ عار سمجھتے تھے۔ کہیں سے صاف جواب ملا، کہیں سے جھولی بھر گئی۔

ان کی محنت اور جاں فشانی سے انجمن کے مرجھائے ہوئے پودے میں جان پڑنی شروع ہو گئی۔ عبدالحق کے ذاتی مراسم اور نیک نامی کی بدولت مملکتِ آصفیہ نے فیاضانہ مدد کی۔ اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی قبول کی اور بارہ سو روپے سالانہ منظور ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں یہ رقم پانچ ہزار سالانہ ہو گئی۔ فرماں روائے بھوپال نے پچاس روپے ماہانہ منظور کیے۔ مستقل ارکانِ اعانت کی تعداد ۹۴ تک پہنچ گئی۔

[illegible] اور بمبئی میں انجمن کی شاخیں اور کتب خانے قائم ہو گئے۔ انجمن کا دفتر ایک پرانے صندوق سے نکل کر [illegible] آگیا۔

○☆○

کسی زبان کی خدمت کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو زبان کی ثقافتی اہمیت سے واقف ہوں جو یہ جانتے ہیں کہ زبان کے آئینے میں ان گنت تجربات، نئے نئے [illegible] نظر آتے ہیں۔ قوم کی ترقی کا اندازہ اس قوم کی ترقی [illegible] کیا جاتا ہے۔

پہلی صورت پر عمل کرنے والے تو بہت تھے مگر دوسری صورت سے سامنے آنے والا کوئی نہیں تھا۔ قدرت نے عبدالحق کی صورت میں ایک آدمی انجمن کے سپرد کردیا جس نے زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زبان کی ترویج و اشاعت میں وقف کردیا۔ وہ دشمنوں کی پروا کی نہ پاؤں کے آبلوں کی۔ اس کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ خطابت کے سہارے دلوں کو گرمایا۔ انشا پردازی کے ذریعے ذہنوں کو جلا بخشی۔ اپنی فوج کے لیے مزید سپاہی تیار کیے۔ الغرض وہ سب کچھ کیا جو ایک رہنما کو کرنا چاہیے۔ یہ کام ہرگز اکیلے آدمی کے بس کا نہیں لیکن جب تک وہ اکیلا تھا، سب کام اکیلے ہی کیے۔ پھر یہ ہوا کہ لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا۔

ترقی یافتہ زبان کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس میں اعلیٰ درجے کا ادب موجود ہو۔ اس زبان نے زمانے کے سرد و گرم زیادہ سے زیادہ دیکھے ہوں اور اس میں ہر موضوع پر کتابیں وافر مقدار میں ہوں۔ اردو کے پاس یہ سب کچھ تھا لیکن پردۂ حجاب میں تھا۔ تاریخِ ادب کے کئی سو سال گمنامی کی مٹی میں دفن ہو گئے تھے۔ عبدالحق برسوں سے اس شہر میں آباد تھے جہاں یہ خزانے دفن تھے۔ انہیں اس کا شعور تھا لیکن وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے۔ یہ کام ایک دو دن کا تھا بھی نہیں کہ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہو جاتا۔ اس کے لیے بڑے صبر و استقلال کی ضرورت تھی۔ وہ بھی انتظامی اور مالی امداد ہی میں الجھے ہوئے تھے۔ ذرا فراغت ملی تو انہوں نے ذاتی رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر آباد دکن کے علمی خزانوں کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ قدیم اردو کے مخطوطات نہ جانے کہاں کہاں دبے پڑے تھے۔ انہیں تلاش کیا۔ دولت خرچ کی، خوشامدیں کیں۔ تعلقات استعمال کیے اور قلمی نسخے حاصل کرلیے۔

"ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح کی۔۔ لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لیے گزشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں۔ اس لیے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بے کار ہو گئی ہیں اس کے بدلنے اور ترک کرنے میں اور جو کار آمد اور مفید ہیں، ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہیے۔"

(اقتباس خطبات)

"تصویر جس قدر بڑی شاندار اور نفیس ہوتی ہے، اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے تاکہ اس کے خط و خال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صانع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں۔ موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی اور بے غرض بھی۔ ایک مدت کے بعد جب مخالفتوں اور حمایتوں کا غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔"

(تمہید، سوانحِ سرسید)
ازمولوی عبدالحق

"قومی زبان کی اہمیت اور قوت کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔ اس کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر محاورہ اور روزمرہ۔ اس کی ہر ترکیب ہماری تہذیب ہمارے ادب اور ہماری معاشرت کی جڑوں اور ریشوں تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کے پیچھے ہماری تاریخ و تہذیب کا ایک بڑا سلسلہ ہے جس کی تہ میں ہماری زندگی کے نقوش کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔"

(عبدالحق)

ان مخطوطات کو پڑھنا، سمجھنا اور مصنفوں کے حالات کی چھان بین کرنا ایک اور وقت طلب مسئلہ ہے۔ اس کے لیے صبرِ ایوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخطوطات کے رسمِ خط سے آگاہی بھی ایک خاص فن ہے۔ مصنفین کی عمر اور مخطوطات کے زمانۂ تصنیف و کتابت کا تعین بڑی تحقیق اور

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

علمی بصیرت چاہتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے نہایت جاں فشانی سے ان قلمی نسخوں کو جمع کیا اور نہایت کاوش سے ان کا مطالعہ شروع کردیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ساون کب آیا، سردی کب گزر گئی۔ انہیں اب یہ احساس ہوتا تھا کہ قدرت نے انہیں شادی کے بکھیڑے سے دور کیوں رکھا۔ گھرداری میں گھر کر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ ان پوشیدہ کارناموں کو ظاہر کیسے کیا جائے۔ باقاعدہ تصنیفات شائع کرنے کے لیے وقت اور پیسا درکار تھا اور اس وقت مقصود صرف اتنا تھا کہ ان قدیم ادب پاروں کی طرف اہلِ ادب کی توجہ دلائی جائے۔ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے ایک رسالہ نکالنے کی ٹھانی۔ اس کے ذریعے ان کی نگارشات بھی شائع ہوسکتی تھیں اور انجمن کے لیے آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتا تھا۔

رسالے کا نام کیا ہو؟ اس میں سوچنے کی بات ہی نہیں تھی۔ انہوں نے غور کیے بغیر اس کا نام "اردو" رکھ دیا۔ وہ یہ سب کچھ اُردو کے لیے ہی تو کر رہے تھے۔ ان کے تو کوئی اولاد بھی ہوتی تو ہر اولاد کا نام وہ اردو ہی رکھتے۔

رسالہ اردو کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔ اس شمارے میں انہوں نے اس عزم کا اظہار کردیا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے۔

"بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساطِ قدردانی تک نہیں پہنچا۔ بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شائع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔"

"قلم کا مسافر آبلہ پا نہ ہو تو یہاں وہ منظر نظر آئیں گے جن کا لطف اٹھانے اور بیان کرنے کو اک عمر چاہیے۔ بہت سے خزانے ایسے ہیں جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں اور جنہیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔"

"میں چاہتا ہوں یہ رسالہ اردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالا مال ہو کہ شائقینِ ادب اسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں۔"

ان کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ ان کی چشمِ تحقیق نے نایاب گنج ہائے گراں مایہ، بہ پردۂ خفا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جس سے بلاشبہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں کئی صدی کا اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے اردو زبان کی نشوونما، رسم الخط، زبان و ادب پر خود بھی عالمانہ مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔

اب رسالہ اردو کے ذریعے ایک ایسا میدان ان کے ہاتھ لگ گیا تھا جہاں ان کا تحقیقی شوق پاؤں پھیلا سکتا تھا۔

جنوری ۱۹۲۲ء میں انہوں نے رسالہ اردو میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی کلیات پر ایک مقالہ شائع کیا۔ محمد علی کی کلیات پر سیر حاصل بحث کی۔ اس کے علاوہ نمونۂ کلام بھی شائع کیا خوبیوں کو گنوایا اور محاسن اجاگر کیے۔

اس مضمون کے شائع ہوتے ہی اردو زبان و ادب سے شغف رکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہیں پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اکبر و جہانگیر کے اس ہم عصر نے پچاس ہزار کے قریب اشعار چھوڑے ہیں۔

اب تک محمد حسین آزاد کے کہنے کے مطابق ولی دکنی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر قرار دیا جاتا تھا۔ اس تحقیقی مقالے نے نہ صرف یہ سہرا ولی کے سر سے اتار دیا بلکہ اردو شاعری کی تاریخ کو دو سو سال آگے بڑھا دیا۔ یہ زبانِ اردو کے سلسلے میں ایک انقلاب انگیز انکشاف تھا۔

اسی طرح انہوں نے سلطان قلی قطب شاہ کے دور کے ایک نثرنگار اور شاعر ملا وجہی کی کتاب "سب رس" کا تعارف کرایا اور اس پر شاندار مقدمہ تحریر کیا۔

اس مقالے کی اشاعت سے قبل یہ سمجھا جاتا تھا کہ شاہ فضل اللہ فضلی کی "وہ مجلس" اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء میں "سب رس منظوم" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ وجہی کی "سب رس" اتنی مقبول ہوئی کہ شاہ حسین ذوقی اور مجری نے سب رس کے قصے کو منظوم کیا۔ اسی بہانے انہوں نے ان دونوں مصنفین کے بارے میں نہایت تحقیقی معلومات فراہم کیں۔

قدیم اردو پر ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رسالہ اردو کے ذریعے پڑھنے والوں تک پہنچ رہا تھا اور اردو کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

سیکڑوں ایسے شاعر و ادیب جو گمنامی میں تھے ان کی کوششوں سے منظرِ عام پر آتے چلے گئے۔ قدیم اردو کا پورا خزانہ انہوں نے کھنگال ڈالا۔

ان کی سعی و تلاش نے نہ صرف اردو ادب کی تاریخ کو کئی صدی اُدھر تک وسیع کردیا، گیارھویں صدی ہجری کے بجائے ساتویں صدی ہجری میں اسے بولتے ہوئے سنادیا۔

انہوں نے انجمن اور دوسرے اداروں یا اشخاص کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں پر بلند پایہ مقدمات لکھے۔ ان مقدمات کے ذریعے دنیا کو یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف ایک محقق ہی نہیں، تنقید نگار بھی ہیں۔

حالی اردو کے پہلے سوانح نگار تھے اور عبدالحق ان کے [illegible] لہٰذا انہوں نے بھی سیرت نگاری کے کئی نمونے [illegible] ان افراد کے بارے میں لکھا جو ان کے مشاہدے میں آئے تھے اور اس خوبی سے لکھا کہ ان کے یہ خاکے اردو ادب کا مستقل حصہ بن گئے۔ جو کچھ کہا بے لاگ انداز میں کہا۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں [illegible]۔ ان خاکوں میں بھی ان کا تحقیقی مزاج کارفرما نظر آتا [illegible] شخصیت کے ہر اچھے، بُرے پہلو تک ان کی نظر جاتی [illegible] مرعوب ہونا ان کی فطرت ہی میں نہیں تھا لہٰذا ان کے یہ خاکے قصیدے کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ آدمی کتنا ہی بڑا ہو ان کے خاکوں میں آدمی ہی نظر آتا ہے۔

ان خاکوں کی زبان بھی تنقیدی مضامین سے مختلف تھی۔ الفاظ، ترکیبیں اور محاورے ان کے تابع فرمان نظر آتے تھے۔ عبارت میں متین، باوقار، پُرشکوہ فارسی اور عربی لفظوں کے شانہ بشانہ ایسے لفظ بھی صف بستہ نظر آتے تھے جنہیں [illegible] ادیب محض بولی ٹھولی سمجھ کر نظرانداز کردیتے ہیں۔ ان خاکوں نے انہیں محقق اور تنقید نگار سے ہٹ کر [illegible] ادیب کی صف میں لا کھڑا کیا۔

غرضیکہ ان کی کاوشوں نے انہیں محقق، مؤرخ، ناقد، ماہرِ تعلیم، ماہرِ لسانیات، ادیب کے روپ میں پیش کیا لیکن ان سب پر حاوی اُن کی وہ خدمات تھیں جو وہ اردو کے فروغ کے لیے کر رہے تھے۔

انجمن کا کام اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے اب علیحدہ مکان کی ضرورت تھی۔ لہٰذا وہ دفتر سمیت "نادر منزل" منتقل ہوگئے۔

یہ ایک پہاڑی نما ٹیکری پر بنی ہوئی نہایت شاندار کوٹھی تھی۔ گیٹ اور کوٹھی میں آدھ فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ سڑک ایک بہت بڑے لان کے ساتھ گھومتی ہوئی پورچ تک آتی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں پھولوں سے بھری ہوئی۔ لان کے اوپر ایک طرف بہت بڑا گھنا برگد کا درخت جس کے چاروں طرف چڑیوں کا پنجرہ۔

اندر داخل ہوجائیے تو پہلے بڑا ڈرائنگ روم پھر ایک بڑا ہال کمرا جس میں دیوار کے چاروں طرف کتابوں کی بہت اونچی اونچی الماریاں۔ درمیان میں ایک لمبی میز اور بہت سی کرسیاں۔ اس کے ساتھ ایک اور کمرا جو ان کا اپنا دفتر تھا۔ ہر طرف کتابوں کی اونچی الماریاں۔ ایک طرف لکھنے کا ڈیسک۔ کچھ فاصلے پر ایک آرام دہ کرسی جس کے قریب پیچوان (حقہ) رکھا ہوا۔ ایک طرف چھوٹی سی میز پر چائے کی پتی کے ڈبے پیالیاں اور چائے دان۔

تین کمرے کاتبوں کے لیے مخصوص تھے۔ فرش پر جاجم بچھی ہوئی۔ پیلے رنگ کے کاغذ ہر طرف بکھرے ہوئے۔

ایک کمرا ان کے سونے کے لیے مخصوص تھا۔ ایک مسہری اور لوہے کی کیبنٹ کے علاوہ یہاں بھی کتابوں کی چھوٹی چھوٹی الماریاں تھیں۔

اسی طرح چند اور کمرے تھے جو انجمن میں کام کرنے والوں کے تھے۔ مثلاً عابد حسین، احتشام الحق، اختر حسین رائے پوری وغیرہ۔

یہ کوٹھی واقعی انجمن اردو کے شایانِ شان تھی جس میں کام کے وقت صرف کام ہوتا تھا۔ دفتری اوقات کے بعد ملنے والے آجاتے تھے لیکن دراصل یہ بھی ایک قسم کا کام ہی تھا کیونکہ یہ دوست بھی کسی نہ کسی ادبی نکتے پر بحث کرنے کے لیے ہی جمع ہوتے تھے۔

"چند اقتباسات"

"جو نہ سمجھنا چاہے، اسے کون سمجھا سکتا ہے۔"

(خطبات)

"آنکھوں کے اندھے کو انگلی پکڑ کر رستہ دکھا سکتے ہیں لیکن عقل کے اندھے کے لیے رہنمائی کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی۔"

(خطبات)

"زندگی بسر کرنا اور اسے صحیح طور سے برتنا ہی خود ایک بڑی نیکی ہے اور یہ تعلیم ادب کی اصل غرض و غایت ہے۔"

(خطبات)

"عقیدت اور محبت آدمی کو اندھا کردیتی ہے۔ تنقید نظر نیچی کرلیتی ہے اور انصاف ادھر منہ پھیر لیتا ہے۔"

(تنقیداتِ عبدالحق)

"اپنے سہارے آپ کھڑا ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔"

(چند ہم عصر)

"ہر دور کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس تقاضے کو سمجھنا اور سمجھ کر اپنے ماحول اور حالات کی رو سے اپنی تنظیم کرنا اس کارزارِ حیات میں سنبھلے رہنے اور کامیاب ہونے کے لیے ضروری ہے۔"

(چند ہم عصر)

مولوی عبدالحق نے ہر بڑے آدمی کی طرح ایسے لوگ تیار کرلیے تھے جو ادبی کاموں میں ان کی معاونت کرسکیں۔ خود بھی سخت محنت کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی یہی توقع کرتے تھے۔ کسی رو رعایت کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے غصہ ور اور اکل کھرے مشہور ہوگئے تھے حالانکہ اندر سے بہت نرم بھی تھے۔

مولوی صاحب کی نگرانی میں انجمن نے ترقی کے کئی زینے طے کرلیے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں انجمن کی شاخیں قائم کردی گئیں۔ ان شاخوں کے زیرِ نگرانی اردو مکتب اور کتب خانے کھولے گئے۔ اس ذریعے سے بہت سے ناخواندہ لوگوں نے اردو زبان سیکھی اور بعض ایسے علاقوں میں اردو کو پہنچایا گیا جہاں اس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔

سرمائے کی فراہمی ہوتے ہی عبدالحق نے انجمن کی مطبوعات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اہم ادبی کتابوں کو مرتب کروا کے شائع کیا۔ بہت سی اہم اور نادر کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ اس طرح معلوم ہوا کہ اردو زبان ہندوستان کی علاقائی زبان کی طرح کم مایہ نہیں۔ انجمن کے اس اقدام کی وجہ سے اردو ادب اور زبان کی تاریخ میں نمایاں تبدیلی بلکہ انقلاب رونما ہوا۔

انجمن نے اردو زبان کی تہی دامنی کو ختم کرنے کے لیے علمی و فنی کتابوں اور عالمی ادبیاتِ عالیہ کے تراجم کی طرف بھی توجہ کی۔ ایک ایسا انگریزی' اردو لغت بھی تیار کیا جس نے مترجمین کی مشکل کو آسان کردیا۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو وضع کیا گیا۔

ان کی کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے حکومتِ حیدر آباد نے اردو زبان کی جدید و مکمل لغت کی تالیف ان کے سپرد کی۔ یہ کام اتنا بڑا تھا کہ برسوں کی محنت درکار تھی کیونکہ مولوی صاحب کے الفاظ میں۔

"ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ہوگا کہ وہ کب' کس وقت اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے اور اس کے کون کون سے معانی متروک ہوئے اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنی پیدا ہوئے۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کی تحقیق کر کے یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کی صورت وہی ہے یا بدل گئی۔"

ظاہر ہے ان خطوط پر ایک جامع لغت کی ترتیب کس قدر دشوار اور محنت طلب امر تھا مگر مولوی عبدالحق نے بڑی حوصلہ مندی سے اس کام میں ہاتھ ڈالا۔ ہندی اور سنسکرت کے ماہرین کا تقرر عمل میں آیا۔ نظم و نثر کی مستند کتابوں سے اسناد ڈھونڈنے کے لیے کئی اصحاب کو مقرر کیا۔

اب تک دنیا انہیں ایک محنتی کارکن اور محقق کے طور پر جانتی تھی لیکن اس لغت کی تیاری کے مرحلوں کے دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے ماہرِ لسانیات بھی ہیں۔ الفاظ کی ساخت' ارتقائی تغیرات مرکبات و محاورات' لفظوں کے خاندان اور ان کے سفر پر ان کی نگاہ بہت گہری ہے۔ بات یہ تھی کہ وہ اردو کے عاشق تھے اور عاشقوں کے لیے پہاڑ کھود کر نہر نکالنا ناممکن نہیں ہوتا۔

انہوں نے معالج کا نہیں مسیحا کا کام انجام دیا۔ وہ مصنف جو معنوی طور پر مرچکے تھے' انہیں زندگی عطا کی۔ متعدد قدیم و نایاب تذکروں کا کھوج لگا کر انہیں ترتیب دیا۔ بیسیوں دکنی مخطوطات کو گم نامی کے عمیق غاروں سے نکال کر زندگی کی دھوپ سے آشنا کیا۔

ان کی ان کاوشوں نے اس عام نظریے کو باطل کردیا کہ اردو لشکری زبان ہے اور جس نے مغل سلاطین خاص کر شاہجہاں کے عہد میں جنم لیا۔ انہوں نے بابر کی آمد سے بھی سو برس پہلے کی کتابیں دریافت کیں۔

ان کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کی بہبود و ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی اور ترویج پر ہے۔ ملک کے سیاسی حالات بھی اس طرف جارہے تھے کہ آئندہ اردو پر برا وقت آنے والا تھا۔ اس صورتِ حال میں ضروری تھا کہ ذریعۂ تعلیم اردو ہو تاکہ اردو ایک زبان نہیں' مجبوری بن جائے لیکن یہ اس وقت ہو سکتا تھا جب کوئی ادارۂ تعلیم ایسا بنایا جائے جہاں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو۔ اس کام کی توقع غیروں سے رکھنا فضول تھا اور یہ کام تھا بھی ایسا کہ حکومتی امداد کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں ہر مضمون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ یہ کام حکومت ہند نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ انہیں..... حکومت حیدر آباد کی ادب نوازی سے امید تھی کہ وہ یہ بارِ گراں اٹھا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار مختلف حلقوں میں کرنا شروع کردیا۔ وہ اس وقت انسپکٹر آف اسکولز تھے اور تعلیم کا وسیع تجربہ رکھنے کی وجہ سے ان کی بات میں وزن ضرور تھا۔

سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ وزیر تھے۔ سیاہ سفید کے مالک تھے۔ ریاست کے مالک تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ علم و ادب کے شائق تھے۔ عبدالحق نے یہ

ہٹلر کے عقائد اور نظریات

[illegible] اصلاح کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قوم کی تہذیب اور مالی انتظام میں جو بنیادی خلل ہے اسے دور کیا جائے۔ [illegible] خلل ایسا ہے 'انسان کا تنزل لازمی نتیجہ ہے۔ خود یہ خلل اگر انسان کو ذلیل نہیں کرتا تو کم از کم ذلت کے راستے پر ضرور [illegible] کیا وجہ ہے کہ حکومت سے مزدور طبقے کی دشمنی دور نہیں کی جاسکتی؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حکومت مزدور کی [illegible] کے اسباب شناخت کرنے میں ڈگمگاتی ہے۔ جب تک حکومت کو پہلے یہ سمجھ نہ آجائے کہ مزدور کیوں اس کے دشمن [illegible] دشمنی کے اسباب کو پوری سختی کے ساتھ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں [illegible] اگر یہ نکتہ سمجھ لیں کہ قوم کو خیرات کی نہیں 'مساوات کی ضرورت ہے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ قوم کی زبوں حالی [illegible] دور کی جاسکتی ہے۔ اول تو یہ کہ قوم میں باہمی ذمے داری کا شدید احساس پیدا کر کے ان بنیادوں کی اصلاح کی جائے [illegible] ترقی کا دارومدار ہے۔ دوسرے یہ احساس پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بغیر کوئی رحم کیے قوم کے جسم سے وہ تمام پھوڑے [illegible] کاٹ کر پھینک دینی چاہئیں جن کا علاج ناممکن ہے۔

آفتاب احمد نصیر' کورنگی کراچی

[illegible] ان کے سامنے رکھا۔ انہیں بھی اسی طرح تعجب ہوا اس طرح دوسروں کو ہوتا تھا۔

"[illegible] نہیں سمجھتا کہ یہ ممکن ہوگا۔ اردو سے محبت الگ [illegible] اس محبت کو اندھا نہیں ہونا چاہیے۔"

"نواب صاحب! میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ آپ کی ریاست اگر مالی معاونت کرتی ہے تو پھر یہ کسی طرح مشکل نہیں۔"

"مولوی صاحب! کسی مدرسے میں بچوں کو اُردو میں سبق یاد کرا دینا الگ بات ہے اور اس زبان میں اعلیٰ تعلیم دینا دوسری بات ہے۔"

"جناب' اردو کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ اب سے کچھ ہی برس پہلے تک یہ کہا جاتا تھا کہ اُردو کے پاس اتنا سرمایۂ الفاظ نہیں کہ اس میں ہر قسم کے موضوعات کو بیان کرنے کی طاقت ہو لیکن آپ نے دیکھا سرسید مرحوم نے اس خیال کو باطل کردیا۔ اب کوئی یہ نہیں کہتا۔ اب یہ کہا جارہا ہے کہ اردو میں تعلیم نہیں دی جاسکتی۔"

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو سرسید یہ کام پہلے ہی کرچکے ہوتے۔"

"ان کے زمانے کی ضرورت دوسری تھی۔ ویسے ایک ورنیکلر یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ ان کے ذہن میں تھا ضرور۔ میری ان سے کئی مرتبہ اس موضوع پر بات ہوئی تھی۔"

"میں آپ جیسا لائق تو نہیں کہ بحث میں آپ سے جیت سکوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ہر مضمون پر اردو میں کتابیں موجود نہیں۔ خاص طور پر سائنس کا میدان تو بالکل خالی ہے۔"

"میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتا ہوں لیکن کتابیں مہیا کی جاسکتی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"ہم دوسری زبانوں سے تراجم کرسکتے ہیں۔ لائق لوگوں سے نئی کتابیں لکھوا سکتے ہیں۔"

"اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔"

"میں بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ کام کل ہی ہو جائے گا۔ آپ ڈول تو ڈالیں' ابتدا تو کریں۔"

"اساتذہ کہاں سے لائیں گے؟"

"اساتذہ کو بے شک دہری محنت کرنی پڑے گی۔ ان کی تربیت کسی دوسری زبان کے ذریعے ہوئی ہے لیکن یہ وقت تھوڑے دن رہے گی۔ ان کے پڑھائے ہوئے طالب علم جب فارغ التحصیل ہوں گے تو ہمیں اساتذہ کی کمی قطعی محسوس نہیں ہوگی۔"

"اگر ابتدا میں کالج قائم کریں اور پھر یونیورسٹی تک پہنچیں؟" سر اکبر حیدری نے کہا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہونا چاہیے۔"

"محسن الملک ہیں۔ سر راس مسعود ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کر دیکھیے۔"

"میں ان حضرات سے بات کرچکا ہوں۔ انہیں بھی ابتدا میں کئی شبہات تھے لیکن میں سب رفع کرچکا۔ ویسے ان سے اور بات کرلی جائے گی۔ سرکاری منظوری کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا اور یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں حضور نظام کے روبرو یہ منصوبہ رکھ دوں گا۔ آگے ہماری قسمت۔"

"منصوبہ ان کے سامنے رکھنا نہیں ہے' سفارش کرنی ہے۔ میں انکار نہیں کر سکوں گا۔"

"مولوی صاحب' آپ ہیں بڑے ضدی۔ سمجھئے یہ کام ہوگیا۔"

ریاستی کاموں میں دیر تو لگتی ہے۔ بہت دن بیت گئے لیکن نتائج اچھے ہی نکلے۔ جامعہ عثمانیہ کی تیاری اور کتب کی فراہمی کے لیے ان ہی کے مشورے سے دارالترجمہ کا قیام عمل میں آگیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ ہندوستان بھر سے مشہور اہلِ قلم کو مدعو کیا گیا۔ مولوی صاحب اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ جوش ملیح آبادی' جلیل مانک پوری' مرزا ہادی رسوا' فرحت اللہ بیگ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے باکمال حیدر آباد میں آبسے۔

کتب کی فراہمی آسان کام نہیں تھا لیکن دو سال کی قلیل مدت میں نصابی کتابیں تیار ہو گئیں۔

جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا تھا لہٰذا وہ اورنگ آباد واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں عثمانیہ کالج کا پرنسپل مقرر کردیا گیا۔

انجمن کا کام بڑھتا جارہا تھا۔ لغت کی تیاری کے لیے بھی انہیں بہت سارا وقت پس انداز کرنا ہوتا تھا۔ ایسے میں ملازمت کا بار اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا لیکن اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ حکومت حیدر آباد بھی ان کی اہلیت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس لیے فراغت کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اس نے کئی مرتبہ ملازمت کو خیرباد کہنے کا ارادہ کیا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ہتھ کڑی ان کے ہاتھ میں ڈال دی گئی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پنشن لے لی۔ اب وہ آزاد تھے۔ اپنا تمام وقت انجمن کے سپرد کرسکتے تھے لیکن یہ آزادی زیادہ دن نہیں چل سکی۔ سر اکبر حیدری ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے آگئے۔

"جامعہ عثمانیہ کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"آپ دیکھ رہے ہیں حالات کیا رخ اختیار کررہے ہیں۔ اردو کو ہندو دشمنی کا سامنا ہے۔ مجھے اس کا دفاع کرنا ہے۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ اس لیے میں نے ملازمت ترک کی ہے۔ آپ پھر مجھے اسی خارزار میں لے جانا چاہتے ہیں۔"

"میں آپ کو جہاں لے جانا چاہتا ہوں وہ آپ ہی کا لگایا ہوا پودا ہے۔ اس کی سیرابی بھی آپ ہی کی ذمے داری ہے۔"

"اس کے لیے اب بہت سے لوگ ہیں لیکن جو کام میں کررہا ہوں' وہ میں ہی کر سکتا ہوں۔"

"میں نے کب کہا کہ آپ اپنا کام چھوڑ دیں۔"

"بے شک آپ نے نہیں کہا لیکن میں بقیہ عمر اورنگ آباد میں گزارنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی آب و ہوا مجھے راس آگئی ہے۔"

"دیکھ لیجیے مولوی صاحب! ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔ میں نے آپ کی بات فوراً مان لی تھی۔ اب آپ کی باری ہے۔ جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ اردو ایک عدد صدر کا انتظار کررہا ہے اور وہ آپ ہیں۔"

اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ انکار کرتے۔ وہ صدرِ شعبہ اردو ہو کر حیدر آباد آگئے۔

○☆○

ہندی' اُردو کا جھگڑا سرسید کی زندگی ہی میں سر اٹھا چکا تھا۔ حالات بدلے تو اس جھگڑے نے ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ اب اس کے سیاسی مقاصد بھی تھے۔ واردھا اسکیم کے نام پر اردو اور اسلامی ثقافت کے خلاف سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔ گاندھی جی کی حمایت اور اردو دشمنی نے عام ہندوؤں کو بہت پُرجوش بنادیا تھا۔ رسم الخط بدل دینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ اردو کو محض مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اسے مٹادینے کی باتیں ہورہی تھیں۔ مسلمانوں میں [illegible] شدید ردِعمل تھا۔ چنگاریاں بھڑکنے کے لیے تیار تھیں۔ انہی دنوں عثمانیہ کالج میں کالج ڈے منایا گیا۔ عبدالحق نے اس موقع پر ایسی جذباتی اور دل سوز تقریر کی کہ طلبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک جوشیلے نوجوان یوسف نے نعرہ لگایا۔

"بابائے اردو' زندہ باد۔"

اس نعرے کے لگتے ہی ہزاروں آوازیں گونجنے لگیں۔

"بابائے اردو زندہ باد۔"

اس موقع کی خبر اورنگ آباد کے ایک اخبار میں شائع ہوئی' سرخی تھی۔

"بابائے اردو کا' کالج کے طلبہ سے خطاب۔"

اس خبر کا لگنا تھا کہ یہ خطاب پورے برصغیر میں پھیل گیا۔ اب وہ جہاں جاتے اسی نام سے پکارے جاتے۔

یہ خطاب محض جذباتی نعرہ نہیں تھا۔ عبدالحق اس کے بجا طور پر اہل تھے۔ دنیا کی کسی زبان کی تاریخ میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جس نے اپنی تمام زندگی زبان کی خاطر معرکہ آرائیوں میں گزار دی ہو۔ عبدالحق یہی کررہے تھے لہٰذا یہ لقب ان پر جچنے لگا۔ اب وہ بابائے اردو تھے۔ بڑوں کے لیے بھی چھوٹوں کے لیے بھی۔

[illegible] اردو کے خلاف باقاعدہ مورچا قائم کیا گیا۔ [illegible] اور ودیا مندر اسکیم کے تحت ہندی کو [illegible] کا آغاز ہوا۔ یہ ایسی سازش تھی کہ اگر [illegible] خلاف ہوائی مورچا قائم نہ کیا جاتا تو اردو کا [illegible] میں پڑجاتا۔ یہ مسئلہ نہ تو بظاہر سیاسی تھا نہ [illegible] رہنمایانِ ہند خاموش تھے جبکہ گاندھی جی ان [illegible] کے شریک ہورہے تھے۔ گاندھی جی نے [illegible] اور لسانیات کو ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی تو سارا [illegible] میں تقسیم ہوگیا۔ ایک طرف اردو کے حامی تو [illegible] اردو کے طرف دار پیدا ہوگئے۔ ہندی کے [illegible] طاقت ور تھے کیونکہ گاندھی جیسی بڑی [illegible] ان کی رہنمائی کررہی تھی۔

اب مولوی عبدالحق کی باری تھی۔ اب تک انہوں نے [illegible] کتابوں پر نظریں جمائی ہوئی تھیں' اب ایک [illegible] جنگ سے سابقہ تھا۔ اب تک بے جان حروف [illegible] تھے لیکن اب شعلے اگلتی ہوئی زبانوں سے [illegible] اب ملک گیر دورے کرکے اردو کی اہمیت کو ثابت [illegible] انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی راج کے [illegible] کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے [illegible] کو انگریزی زبان میں تعلیم دے کر ان کی قومی اور [illegible] خصوصیات کو ختم کردیا۔ اب یہی کھیل ہندو ہمارے [illegible] کھیلنا چاہتا ہے۔

انہوں نے کمرِ ہمت باندھی اور ایک ایک شہر میں جاکر اردو کی اہمیت پر تقریریں کیں۔

"کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ گاندھی وغیرہ نے فرمایا کہ اردو زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور حکومت کے زور سے پھیلی' وہ نہ صرف اس زبان کی تاریخ سے ناواقف ہیں بلکہ اصولِ لسانیات سے بھی ناآشنا ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی سرکاری اور درباری اور دفتری زبان آخر تک فارسی رہی۔"

"یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اہلِ پنجاب کو یہ دعویٰ ہے کہ اردو کا بیج اس خطے میں اپجا' اہلِ دہلی کا خیال ہے کہ یہ دہلی اور اس کے قرب وجوار کی زبان تھی جو بن سنور کر اردو کہلائی۔ صوبہ متحدہ والے کہتے ہیں کہ میرٹھ اور اس کے پاس کے دیہات کی بولی پر فارسی کی قلم لگائی گئی اور اس سے اردو پیدا ہوئی۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں یہ کچی دھات تھی۔ ہم نے اسے نکھارا' سنوارا اور بنایا۔ اہلِ دکن کا

"چند آرا"

"مولوی عبدالحق کا اصل کارنامہ لسانی حیثیت کا ہے۔ اردو کے قدیم تذکرے' دواوین اور نثر کی اہم کتابیں جو ناپید تھیں' وہ مولوی صاحب کی بدولت سامنے آئیں۔"

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

"اردو کے محسنوں اور مخلص خادموں کی فہرست مختصر نہیں' اچھی خاصی طویل ہے۔ سیکڑوں ناموں سے متجاوز اور خدمات کے لحاظ سے ایک سے بڑھ کر ایک۔ پھر بھی اگر مجموعی طور پر کسی ایک کو محسن اعظم کا لقب دیا جاسکتا ہے تو وہ ذات بلا اختلاف بابائے اردو مولوی عبدالحق ہی کی ہو سکتی ہے۔"

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

"ملک کے پورے طول وعرض میں' جس میں اردو زبان بولنے والوں کی تعداد کروڑوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس کی خدمت کرنے والوں کی تعداد اگر مولوی عبدالحق نہ ہوتے تو صفر ہوتی۔ انہوں نے اردو کی تاریخ کئی سو سال آگے بڑھادی۔ ادب اور تاریخ ادب پر تحقیقی مضمون لکھے۔ اردو کے قواعد کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ اردو لغت' اردو تذکرے اردو کے پرانے دیوان اور اردو میں نئے علوم کی عمدہ کتابیں چھپوائیں۔"

(سید سلیمان ندوی)

"مولوی عبدالحق کے کارنامے اس درجہ بلند' گراں مایہ اور پائدار ہیں کہ آج پاک وہند کے آسمان کے نیچے کوئی دوسرا شخص علم وادب اور زبان کے دائرے میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور جس دور سے ہم گزر رہے ہیں' اس میں مولانا جیسے کسی دوسرے فرد کا پیدا ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔"

(غلام رسول مہر)

"مولوی صاحب کی اردو نثر بہت حد تک سرسید اور حالی کے طرزِ تحریر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی طرح وہ بھی سادگی اور سلاست کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی پختگی پائی جاتی ہے۔ جس میں دلی کی ٹکسالی زبان کا خاص طور سے رنگ جھلکتا ہے۔"

(ڈاکٹر ابو سعید نورالدین)

○☆○

دعویٰ ہے کہ اس زبان نے ادبی شان یہاں پیدا کی۔ بہار والے چاہیں تو وہ بھی دکن کی طرح اس بات کا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ اس سے اردو کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور قبول عام ہی سب سے قوی دلیل اور سب سے بڑی پسند ہے۔"

"قومیت کے لیے، یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔ یہ دلوں کو جوڑتی ہے اور بے گانوں کو یگانہ بنادیتی ہے۔ اردو نے بہ درجہ کمال یہ خدمت انجام دی ہے۔"

مولوی صاحب نے اپنی تقریروں کے ذریعے اردو کی فضیلت کو ثابت کیا۔ متنازع مسائل کو اس خوبی سے سلجھایا کہ دودھ اور پانی الگ الگ نظر آنے لگا۔ انہوں نے یہ پیغام گھر گھر پہنچادیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس پر ہر قوم کا برابر کا حق ہے لیکن بعض لوگ محض مسلمان دشمنی میں اردو کی مخالفت کرکے ہندی کا ڈھونگ رچارہے ہیں۔

ان تقریروں سے مخالف صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ نتیجے کے طور پر انہوں نے بھی اپنی کوششیں تیز کردیں۔ اسی حساب سے عبدالحق کو بھی پینترے بدل بدل کر حملے کرنے پڑے۔

انجمن کی جب بنیاد رکھی گئی تھی تو اس کا مقصد ادبی اور علمی قرار دیا گیا تھا۔ یعنی ترجمے، ترتیب و تالیف کے ذریعے اردو زبان کے ادبی و علمی سرمائے میں اضافہ کرنا۔ اس مقصد کی پابندی کی جارہی تھی۔ کبھی ہندی یا کسی دوسری زبان کی مخالفت نہیں کی گئی لیکن جب اردو کی ترقی مخالفوں کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جانے لگے تو مجبوراً مدافعت کرنی پڑی۔ اردو کی محبت میں وہ بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکراگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ترقی اردو کی تحریک آگ کی طرح پھیل گئی۔ بنگال، بہار، یوپی، سندھ، کشمیر، گوالیار، رانچی، جنوبی بہار، مدراس، آندھرا، ارکاٹ، ملیبار، تامل ناڈو، ٹرانکور تک اپنے خطبات اور تقریروں کا جال پھیلادیا اور راس کماری تک جاکردم لیا۔ لوگ محاورے کے طور پر کشمیر تا راس کماری تک کا فقرہ کہا کرتے تھے، عبدالحق نے اسے حقیقت کردکھایا۔

○☆○

اختر حسین رائے پوری کی شادی کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ وہ اپنے طور پر لڑکی کے والد کو خط لکھ چکے تھے۔ لڑکا خود پیغام بھیجے۔ یہ عجیب سی بات ضرور تھی لیکن جرأت مندانہ تھی۔ لڑکی کے والد نے اس جرأت کو پسند ضرور کیا لیکن صاحب زادے کس خاندان سے ہیں، کیسے ہیں یہ بھی تو معلوم ہو۔ جب معلوم ہوا کہ موصوف عبدالحق کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں۔ وہی ان کے سب کچھ ہیں تو انہوں نے بھی ایک خط مولوی عبدالحق کے نام لکھ دیا۔

کچھ دن بعد مولوی صاحب کا خط لڑکی کے والد کو موصول ہوا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

"ان تمام نوجوانوں میں جن سے زندگی بھر میرا سابقہ رہا، ان میں یہ قابل ترین ہیں۔ یہ صرف انگریزی اور اردو ہی کے اچھے عالم نہیں بلکہ سنسکرت، ہندی، بنگلہ اور گجراتی زبانوں کا بھی علم رکھتے ہیں۔ انتہائی مہذب، شائستہ اور روشن خیال ہیں۔ فی الحال وہ میرے ساتھ اردو لغت کے کام میں مصروف ہیں۔

میں ان کے خاندان کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ والد سے کوئی تعلق نہیں مگر اس میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں بلکہ سوتیلی والدہ کا ہاتھ ہے۔

میری رائے تو یہ ہے کہ آپ کو اس معاملے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔"

○☆○

لڑکی کے والد نے واقعی کوئی تامل نہیں کیا۔ بابائے اردو کی گواہی بہت تھی۔ انہوں نے پہلی فرصت میں رضامندی کا خط لکھ دیا۔

مزید خطوں کے تبادلے کے بعد شادی کی تاریخ ۲۹ دسمبر ۳۵ء قرار پاگئی۔

اس شادی کی خبر سنتے ہی مولوی صاحب کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ عموماً انہیں جھگڑالو اور غصہ ور سمجھا جاتا تھا لیکن جب اختر رائے پوری کی برات لے کر علی گڑھ گئے تو اسٹیشن پر اترتے ہی اختر کے دوستوں کے ساتھ مل کر ان کی تک بندیوں کے ہم نوا ہوگئے۔

للا روپیہ لائیو ہے
للا کی شادی کردیں گے
کردیں بھئی کردیں گے

مجاز کی شوخیاں مشہور تھیں۔ ممکن ہے مولوی صاحب ان شوخیوں کو پسند بھی نہ کرتے ہوں لیکن اس وقت وہ متانت بھول کر لڑکوں میں لڑکے بنے ہوئے تھے۔

دلہن کے گھر پہنچے تو براتیوں کے لیے خیمے لگے ہوئے تھے۔ سب کے خیمے الگ الگ تھے۔ قریب ہی امرود کا باغ

تھا۔ غالباً یہ مجاز ہی کی شرارت ہوگی کہ خیموں میں ٹھہرنے کے بجائے امرود کے باغ میں بسیرا کیا۔ مولوی صاحب یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ۔ سب نے طرح طرح کے بول گھڑ کر گانا شروع کردیا اور مولوی صاحب انہیں ڈانٹنے کے بجائے ہنس ہنس کر دہرے ہوئے جارہے تھے۔ آخر ڈھونڈ پڑی کہ براتی کہاں گئے۔ گانے کی آواز سے معلوم ہوا کہ براتی تو باغ میں ہیں۔ انہیں وہاں سے بلایا گیا کہ مہمانوں سے ملاقات تو ہوجائے۔

ایک بجے کہا گیا کہ کھانے کے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ کھانے کا کمرا بہت بڑا تھا۔ چوبیس آدمیوں کی میز لگی ہوئی تھی۔ بیرے سفید وردی اور اونچی کلاہ میں کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ سرخ وردی میں بینڈ والے منتظر کھڑے تھے کہ کھانا شروع ہو تو وہ دھن چھیڑیں۔ جیسے ہی مہمانوں نے کھانا پلیٹوں میں نکالا نفیری بجنے لگی۔ مولوی صاحب کو پھر شرارت سوجھی۔

"بھئی' اس توں توں پی پی میں کھایا تو کچھ جائے گا نہیں تو چلو پی ہی لیں" یہ کہہ کر سامنے رکھی ٹماٹر ساس کی بوتل کھول کر غٹ غٹ پینے لگے۔ ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ آئے ہوئے دوستوں نے بھی یہی کیا۔ آخر بینڈ والوں کو باہر بھیجا گیا تب جاکر انہوں نے کھانا شروع کیا۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مولوی صاحب تھوڑی دیر کے لیے بچے بن گئے ہیں۔ یہ ان کی خوشی کی انتہا تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں اور ان کی خوشیوں میں کس طرح شریک ہوتے ہیں۔

مغرب کے بعد نکاح تھا۔ نکاح کے دوران میں بھی وہ اسی طرح شرارتیں کرتے رہے۔ آخر اللہ اللہ کرکے ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہوا۔

"میں ایک سہرا لکھ کر لایا ہوں۔ پیشِ خدمت ہے" کسی صاحب نے کھڑے ہوکر کہا۔

"سہرا آپ کس خوشی میں پڑھیں گے" مولوی صاحب نے اپنی کراری آواز میں کہا "خوش ہونے کے حق دار ہم ہیں کہ دلہن لے جارہے ہیں۔ ہم سہرا خود لکھ کر لائے ہیں" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجاز اور ساغر نظامی کو اپنے پاس بلالیا۔ سب ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور سہرا گانا شروع کردیا مولوی صاحب تال دیتے جارہے تھے۔

اک بنجارا یار ہمارا
پھرتا تھا یوں مارا مارا
جیسے ہو اک مرغ بے چارا
ڈھونڈے سہارا دڑبے کا
یہ کیا تم نے دل میں ٹھانی
لکھ ڈالی سب رام کہانی
مندر کی مندر کی
بن کھلونا بھائی تماشا
آگے تانگا پیچھے گھوڑا
خاکی وردی ہاتھ میں ڈنڈا
تن کے چلے ہے دلہن کا باوا

یہ سب بابائے اردو کی تک بندی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایسا متین بوڑھا' سب کے ہنسنے کا ایسا سامان کرے گا۔ اپنے رعب اپنے وقار تک کو داؤ پر لگادے گا۔

یہ ہنسی نہیں تھی' ان کے اندر چھپے ہوئے وہ ارمان تھے جو وہ اردو کو پالنے پوسنے میں فراموش کرچکے تھے۔ وہ ایک شادی سے بھاگ چکے تھے لیکن کہیں اور شادی کرسکتے تھے لیکن انہوں نے تو انجمن سے شادی کرلی تھی۔ اسی کو تکیہ بنائے بیٹھے تھے۔ اب جو ایک موقع ملا تو مولوی صاحب پھٹ پڑے۔ انہیں بزرگ بنا کر لایا گیا تھا لیکن ان کے اندر چھپا ہوا لڑکا ان کے ساتھ آگیا تھا۔

ان کا ڈنکا اس وقت پورے ہندوستان میں بجتا تھا۔ ہر طرف ان کی شہرت پھیلی ہوئی تھی۔ رعب و دبدبہ طاری رہتا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل بچے بنے ہوئے تھے۔ ہائے انسان! اس کی مصروفیات اور اس کے عہدے کا بھرم کیا سے کیا بنادیتا ہے کہ ہنسنے کے لیے بھی اسے وقت نہیں ملتا اور جب ہنستا ہے تو لوگ اسے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی عجوبہ۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بال سفید ہیں تو کیا ہوا' روشن آنکھوں میں شفقت کے دیے تو جل رہے ہیں۔

کئی دن کی مہمان داری کے بعد حیدر آباد کے لیے روانگی کا وقت آگیا۔ اسٹیشن پہنچے۔ ریل آکر رکی۔ چار سیٹر ایک ڈبا بک کرایا گیا تھا لیکن جب اندر گئے تو یہ چھ سیٹر نکلا۔ ایک بنگالی جوڑا اپنے دو عدد بچوں کے ساتھ پہلے ہی سے براجمان تھا۔ یہ دیکھ کر مولوی صاحب کا پارا چڑھ گیا۔

"یہ ہاشمی فرید آبادی بھی فضول سے آدمی ہیں۔ بکنگ ان کے ذمے کی تھی۔ حضرت نے یہ بکنگ کرائی ہے۔"

ہاشمی صاحب نے بکنگ کرائی تھی لہٰذا انہی پر غصہ اتارا جارہا تھا۔ بہرحال اب کیا ہوسکتا تھا سامان رکھ دیا گیا۔

تین سیٹیں نیچے کی ان کے پاس تھیں۔ چوتھی پر وہ دو

بنگالی بچے اور اوپر کی دو سیٹوں پر دونوں میاں بیوی۔

ریل ایک جھٹکے سے چل پڑی تھی' اچانک حمیدہ (دلہن) کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے میکے سے کتنی دور جارہی ہے۔ ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ کھڑکی سے سر باہر نکال کر رونے لگی۔ مولوی صاحب کی مشفق آنکھوں سے یہ منظر چھپا نہ رہ سکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حمیدہ کے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔

"بھئی ہم کو سمندر' دریا اور جھرنوں کا پانی بہت اچھا لگتا ہے مگر یہ آنکھوں کا بہتا پانی قطعی پسند نہیں۔ سر اندر کرو اور اپنے ڈبے کی آب و ہوا اور دیگر ہم سفروں پر غور کرو۔ اب ہمیں ان سے نمٹنا ہے۔"

وہ بے چاری کچھ بھی نہیں سمجھ سکی کہ نمٹنے سے کیا مطلب ہے۔ کیا جھگڑا کریں گے؟ اس نے آنسو پونچھے اور سر اندر کرلیا۔ مولوی صاحب نے چپکے سے اختر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں ہنسنے لگے۔ اس کے بعد مولوی صاحب اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔ اچانک دونوں بچوں کی زوردار چیخیں سنائی دیں۔ اوپر سے بچوں کے باپ نے بنگالی میں کچھ پوچھا۔ بچوں نے بنگالی ہی میں جواب دیا اور ساتھ ہی مولوی صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ مولوی صاحب مزے سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد بچے پھر زور سے چیخے۔ اس مرتبہ وہ اختر کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ حمیدہ نے دیکھا' وہ دونوں ہاتھ کے پنجے بنائے' منہ ٹیڑھا ترچھا کرکے بچوں کو ڈرا رہے تھے۔ حمیدہ حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟

"بڑا شاب! آپ کیا کرتا ہے۔ بچوں کو کیوں ڈراتا ہے۔ کیا آپ پاگل آدمی ہے؟" اوپر سے اس بنگالی نے پوچھا۔

"اور کیا۔ باہر ڈبے پر لکھا نہیں دیکھا کہ اس ڈبے میں دو پاگل بھی سفر کریں گے" مولوی صاحب نے کہا اور اب وہ بچوں کے بجائے ماں' باپ کو ڈرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اختر اور مولوی صاحب ہولناک آوازیں بھی نکالنے لگے۔

وہ بنگالی جوڑا جھٹ نیچے اترا' دونوں بچوں کو سینے سے لگایا' سامان سمیٹا اور دروازے کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔

ریل رکی۔ وہ دونوں دروازہ کھول کھٹاک سے' بچوں کو لے کر اتر گئے۔

اختر اور مولوی صاحب بچوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اب حمیدہ کی سمجھ میں آیا ورنہ وہ تو خود انہیں پاگل سمجھنے لگی تھی۔

ڈبا خالی ہوتے ہی مولوی صاحب کو اپنا حقہ یاد آگیا۔ تمباکو کی خوشبو پورے ڈبے میں پھیل گئی۔

بڑے چاؤ سے بیاہ کرلائے۔ بزرگوں کی طرح کوٹھی کا ایک ایک کمرا دکھایا۔ اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلائی۔ گھر کی بڑی بوڑھیوں کی طرح چابیاں بہو کے ہاتھوں میں تھمادیں۔

"سب نوکروں کی تنخواہیں دینا اور بشیر کو کھانا پکانے کو بتادیا کرنا۔"

انہوں نے اپنی دانست میں گھرداری نئی آنے والی کے سپرد کردی اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

کام کے وقت کام' کھیل کے وقت کھیل۔ یہ اصول ان کا ہمیشہ سے تھا۔ نئی آنے والی سے پہلے کھیل کے وقت بھی کام ہی ہوتا تھا لیکن اب انہیں یہ احساس بھی تھا کہ حمیدہ دن بھر کے سناٹے سے بور ہوجاتی ہوگی لہٰذا کچھ کھیل بھی ہونا چاہیے۔ ایک دن جو آئے تو تین بڑے چھوٹے بنڈل ہاتھوں میں۔ ایک میں تین عدد بیڈ منٹن کے بلے' ایک میں دو گڈی تاش اور ایک میں پچیسی کی بساط اور کوڑیاں۔

"یہ بیڈ منٹن تین آدمی کیسے کھیل سکتے ہیں؟ ہاں تاش کھیلے جاسکتے ہیں" حمیدہ نے کہا۔

"لیکن ہمیں تو تاش آتے نہیں۔ چلو تم مجھے اور اختر کو سکھاؤ۔"

"کیا آپ دونوں تاش کھیلنا نہیں جانتے؟"

"جن کے پاس فاضل وقت ہوتا ہے وہی ایسے کھیل کھیلا کرتے ہیں۔"

بہرحال عقل و فکر کی یہاں کیا کمی تھی۔ چند ہی ہاتھ کھیلے ہوں گے کہ کھیل پر حاوی ہوگئے۔ جتنا کھیلا گیا' کھیلے پھر دامن جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔

"بھئی' ایک بات کا خیال رہے۔ کسی کے سامنے بھول کر بھی مت کہہ بیٹھنا ورنہ پورے شہر میں مشہور ہوجائے گا کہ مولوی عبدالحق تاش کھیلتے ہیں۔"

حمیدہ کے آجانے کے بعد رات کا مطالعہ ہی موقوف ہوگیا تھا۔ غصہ یہاں بھی اپنا کام دکھارہا تھا۔ کھیل کھیل میں ایسے غصے میں آتے کہ روز تاش کی ایک گڈی پرزوں میں تبدیل ہوجاتی۔

حمیدہ کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتے۔ جو وعدہ کرتے اسے پابندی سے پورا کرتے جیسے پوری عمر گھرداری میں گزری ہے۔

ایک مرتبہ حمیدہ اختر سے کسی بات پر خوش ہوئے۔ ناشتے کے بعد اپنے کمرے کی کیبنٹ سے ایک ڈبیا نکال کر لائے۔ پرانی ہوگئی تھی لیکن پھر بھی نہایت خوب صورت لگ رہی تھی۔

حمیدہ نے اسے کھولا تو اس میں بارہ عدد مٹر کے دانوں

کے برابر سچے آب دار موتی تھے۔
"سچ سچ بتایئے۔ آپ نے کس کے لیے یہ ڈبیا اور موتی لیے تھے؟" حمیدہ نے انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا۔
"تم نے یہ کیوں پوچھا؟" ان کی آنکھوں میں اداسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔
"ڈبیا بہت پرانی جو ہے۔"
"تم نے سچ کہا۔ کسی کو دینے کے لیے بہت عرصہ پہلے لیے تھے، لیکن دیے نہیں۔"
"کیوں؟"
"اس کو اس قابل نہ سمجھا۔ جب سے یہ ڈبیا یونہی پڑی رہی۔ کچھ خیال ہی نہیں آیا۔"
انہیں انجمن کے عشق میں بہت سی باتوں کا خیال نہیں آسکا تھا اور زندگی گزرتی جارہی تھی۔
اس ڈبیا نے شاید ان کا کوئی زخم تازہ کردیا تھا کیونکہ اس روز وہ شام کی سیر کو بھی نہیں گئے۔ ان کے معمول میں فرق آجائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔
۱۹۳۵ء ہی کا سال تھا کہ کنہیا لال منشی (غذائی وزیر) مولوی عبدالحق سے ملنے حیدر آباد آئے۔
"مولوی صاحب! زبانوں کا جھگڑا بہت ہوچکا۔ اب کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ سب مل کر بیٹھ جائیں۔" کنہیا لال نے باتوں باتوں میں کہا۔
"میں تو ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ زبانوں کے مسئلے جھگڑوں سے طے نہیں ہوتے۔ زبانیں تو محبتوں کی سفیر ہوتی ہیں" عبدالحق نے کہا۔
"بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ بس اسی لیے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ ہم ایک ایسی انجمن بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر زبان کے ادیب شریک ہوں تاکہ ایک دوسرے کے ادب کے حالات اور معلومات سے واقف ہوسکیں۔"
"بڑا اچھا خیال ہے آپ کا۔ اس طرح ساری غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔ ویسے ایک بات بتادوں کنہیا لال جی۔ یہ جھگڑا ادیبوں کا ہے بھی نہیں۔ سب ایک دوسرے کے ادب کا احترام کرتے ہیں۔ یہ تو اب سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔"
"برابر کہا آپ نے۔ اسی لیے ہم نے سوچا ہے کہ اس کے سالانہ جلسے میں صدارت گاندھی جی کی رکھیں گے۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں؟"
"چلیے، یہ بھی کردیکھیے۔"
"آپ کے پاس میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن جایئے۔"
"میری جان کو ویسے ہی بہت آزار لگے ہوئے ہیں۔"
"یہ ایک ادبی معاملہ ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں جو چیز طے ہوگئی اسے سب مسلمان مان لیں گے اس لیے آپ کا ہونا ضروری ہے۔"
"لیکن یہ بھی تو سوچیے کہ میں جس بات کو نہیں مانوں گا پھر آپ کتنا ہی زور لگائیں مجھ کوئی نہیں مانے گا۔"
کنہیا لال یہ سن کر خفیف سی ہنسی ہنسنے لگے۔ عبدالحق نے اس کا رکن بننا منظور کرلیا۔
وہ کنہیا لال کو رخصت کرکے واپس آئے تو اچھے خاصے پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کی پریشانی کا اظہار اس سے ہورہا تھا کہ کوٹھی سے پھاٹک تک جانے والی سڑک پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔
"آپ کے مہمان تو رخصت ہوگئے۔ اب آپ کو کس کا انتظار ہے" ان کے ایک دوست نے ان سے پوچھا جو ابھی ابھی ان سے ملنے آئے تھے۔
"آنے والے وقت کا انتظار ہے۔"
"میں سمجھا نہیں۔"
"اردو کے خلاف ایک اور سازش کی چال چلی گئی ہے۔ نام یہ ہے کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن در اصل یہ ہمیں رام کرنے اور الجھانے کی ایک ترکیب ہے۔ گاندھی بڑا عیار ہے بالکل لومڑی کی طرح۔ اس انجمن کے ذریعے یہ بتایا جائے گا کہ اردو کی طرح ہر زبان کا ادب اہم ہے۔ سب برابر ہیں۔ بھئی، کسی کا اردو سے کیا مقابلہ۔ خیر دیکھا جائے گا۔"
تھوڑی ہی دیر میں ان کی پریشانی دور ہوگئی۔ وہ پہلے کی طرح نارمل ہوگئے لیکن اتنا غصہ پھر بھی رہا کہ آتے ہی دفتر والوں پر برس پڑے۔
"بس بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔ کام کی پوری پابندی ہونی چاہیے۔ جس بات کے اوقات ہیں اس میں فرق نہ آئے۔"

○☆○

اس نئی انجمن کا نام اکھل بھارتیہ ساہتیہ پرشد تھا۔ نام ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کن لوگوں کی انجمن ہے اور اس کے کیا عزائم ہوسکتے ہیں۔ اس انجمن نے اپنا اجلاس ناگپور میں منعقد کیا۔ وہ چونکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا لہٰذا وہ بھی اس میں شریک ہوا۔
گاندھی جی اپنی مخصوص وضع قطع میں لپٹے لپٹائے [illegible] رونق افروز ہوئے۔ عبدالحق کو گاندھی [illegible] کی توقع نہیں تھی۔ وہ ۱۸۶۷ء سے ہندی کو [illegible] کی کوشش کررہے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب [illegible] مسلمانوں کے تمدن کی سب سے بڑی علامت اردو کو ختم [illegible] کیا جائے گا، قدیم ویدک تمدن کا فروغ پانا مشکل ہے۔ [illegible] کی زندگی سے لےکر اب تک یہ مسئلہ کل ہند سیاسی مسئلہ [illegible] تھا۔ اس کا مظاہرہ اس اجلاس میں بھی ہورہا تھا۔
انجمن کا نام چونکہ "اکھل بھارتیہ پرشد تھا" اس لیے [illegible] میں سب سے پہلے تو یہی مسئلہ اٹھا کہ "پرشد" کی زبان کیا ہوگی؟
مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔ پھر گاندھی جی نے کہا۔
"مولوی جی سے پوچھو۔ یہی اردو کے بہت بڑے نیتا ہیں۔"
"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ہندوستانی ہوگی" مولوی عبدالحق نے اردو کا نام براہِ راست لینے کے بجائے کہا۔
"آپ ہندوستانی کیوں تجویز کرتے ہیں؟" گاندھی جی [illegible] پوچھا۔
"اس لیے کہ کانگریس کا یہ ریزولوشن ہے کہ کانگریس کی اور ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ نیز کانگریس کے آئین کی دفعہ ۲۱ میں صاف طور پر یہی درج ہے۔"
"اس کا مطلب یہ نہیں ہے" گاندھی نے لاجواب ہوتے ہوئے پینترا بدلا۔
"آپ کے نزدیک کیا مطلب ہے؟"
"ہندی!" گاندھی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔
"ہر دس سال کے بعد مطلب بدلتا گیا تو کام کیسے چلے گا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی کا مطلب وہ زبان جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اور وہ اردو ہے۔ اس کو ہم نئے نام ہندوستانی سے بھی پکار سکتے ہیں۔"
"آپ جو بھی مطلب لیں۔ میں اس کا مطلب ہندی لیتا ہوں۔"
"اس طرح تو آپ ہندی کو اردو کے مقابل کھڑا کردینا چاہتے ہیں جو جھگڑے کا باعث بنے گا۔"
"جھگڑے کی بات ہی نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندی چلے گی۔"
"ہندوستانی بھی چل سکتی ہے۔"
"تو پھر یوں کیے لیتے ہیں کہ اس کا نام ہندی ہندوستانی رکھے دیتے ہیں۔"
"اچھا یہ بتایئے، ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے؟" عبدالحق نے پوچھا۔
"وہ زبان جو کتابوں میں ہے بول چال میں نہیں۔"
"بہت خوب! اور ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"
"وہ زبان جو بول چال میں ہے کتابوں میں نہیں۔"
"تو پھر ہندی ہندوستانی زبان کیا ہوئی؟"
"وہ زبان جو آگے چل کر ہندوستانی ہوجائے گی۔" گاندھی نے کہا۔
"جب ہندوستانی پہلے سے موجود ہے تو پھر پچاس سال اور انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
اس سوال پر گاندھی جھنجلا گئے "میں ہندوستانی نہیں چھوڑ سکتا" انہوں نے نہایت غصے سے کہا۔
"جب آپ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم اردو کیوں چھوڑدیں؟"
"مسلمان چاہیں تو اردو رکھ لیں" گاندھی نے کہا "یہ ان کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔"
بحث اتنی تلخ ہوگئی تھی کہ تمام ارکان حیرت سے عبدالحق کا منہ تک رہے تھے۔ گاندھی سے ٹکرانے کا حوصلہ بڑے بڑے لیڈروں کو نہیں تھا اور عبدالحق کے تیور یہ بتارہے تھے کہ ابھی تو کچھ نہیں ٹکرانے کا مرحلہ تو آئے گا۔
"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ کیا یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسلمان یہ لکھ کر دے دے کہ میری زبان ہندی ہوگی، میرا رسم الخط ناگری۔ میں اپنی زبان اور کلچر کا کبھی مطالبہ نہیں کروں گا۔"
"ہم کچھ نہیں چاہتے لیکن پرشد کی زبان ہندی ہندوستانی ہوگی۔"
"یہ انجمن اس لیے بنائی گئی تھی کہ ہر زبان کے ادیب مل کر بیٹھیں گے لیکن ہندوستان کی سب سے بڑی زبان کے خلاف زہر اگلا جارہا ہے، لہٰذا میں استعفیٰ دیتا ہوں۔"
ان کا یہ استعفیٰ محض ساہتیہ پرشد سے علیحدگی نہیں تھی بلکہ گاندھی سے نبرد آزما ہونے کا اعلان تھا۔ اس اعلان کی گونج بڑی دور تک سنائی دی۔
ہندی ہندوستانی کا نعرہ چل نکلا تھا۔ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہہ کر گاندھی نے نفرت کا بیج بودیا تھا۔ جہاں جہاں کانگریسی حکومتیں تھیں، اردو کی مخالفت سرکاری سطح پر کی جارہی تھی۔ اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے علی گڑھ میں ایک کل ہند اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس

کانفرنس میں دوسرے مسئلوں کے علاوہ ایک مسئلہ یہ قابلِ غور تھا کہ انجمن کا مرکزی دفتر کہاں قائم کیا جائے؟ کیونکہ حیدر آباد میں رہ کر اردو کی مدافعانہ جنگ نہیں لڑی جاسکتی تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ دہلی موزوں ترین مقام ہے۔

○☆○

"مولوی صاحب، آپ کی طرف سے بڑے پریشان ہیں۔ ان کو ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ پریشان ہیں" ایک دن حمیدہ نے اپنے شوہر اختر حسین رائے پوری سے پوچھا۔

"پریشان اس لیے ہوں کہ انہیں کیسے بتاؤں۔ میں دہلی جاکر اپنا اخبار نکالنا چاہتا ہوں اور مجھے خبر ہے وہ اجازت نہیں دیں گے۔ ان کی تنہائی کا خیال بھی آتا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلے رہ جائیں گے۔"

"پہلے بھی تو۔۔۔"

"اس وقت کی بات اور تھی۔ تمہارے آنے کے بعد وہ بہت مگن رہنے لگے ہیں۔"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ پہلے میں بات کروں گی۔ ان کو جو ایک دھکا سا لگے گا اور غصہ بھی آئے گا۔ اس کو آپ نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر دو ایک روز بعد آپ بات کر لیجیے گا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔"

اختر مطمئن ہوگیا۔ حمیدہ نے وعدے کے مطابق مولوی صاحب سے ذکر چھیڑ دیا۔

"ہمارے دہلی جانے سے آپ کو رنج ہوگا۔ اختر اس لیے پریشان ہیں۔"

"میرے رنجیدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو خود انجمن کو دہلی منتقل کرنے کے مراحل میں ہوں۔ ساری کارروائیاں ہوجائیں پھر تینوں ساتھ چلیں گے۔"

"آپ کو تو ابھی سال سوا سال لگ جائے گا۔ اتنے عرصے میں ہم اخبار جمالیں گے۔ پھر آپ کے پاس ہوں گے۔"

"اور اتنے عرصے میں یہاں کیا جھک مارتا رہوں گا" انہوں نے جھلا کر کہا۔

ان کی محبت تھی جو اختر اور حمیدہ کو یہاں سے جانے نہیں دے رہی تھی لیکن بالآخر نم آنکھوں کے ساتھ انہیں اجازت دینی پڑی۔

○☆○

کُل ہند اردو کانفرنس منعقدہ علی گڑھ کے فیصلے کے مطابق انجمن کے دفتر کو دہلی منتقل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے نئی دہلی کی ایک کوٹھی القریش کرائے پر لی گئی اور پھر چند ماہ بعد ہی ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی (نمبر ایک دریا گنج) کرائے پر لے لی گئی۔

اس دوران میں کانگریس کی عبوری وزارتوں نے اپنے عمل سے اردو کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا شروع کردیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے اردو کی مخالفت بہار سے شروع کی تھی لیکن سی پی کی زمین اردو، ہندی، تنازعے کا مرکز بن گئی۔ سی پی میں کانگریسی عبوری حکومت نے ودیا مندر اسکیم کا زبردستی نفاذ چاہا۔ عبدالحق نے شدید مخالفت کی۔ فوری طور پر اپنے دست راست حکیم اسرار کی قیادت میں ناگپور سیکریٹریٹ میں ایک وفد روانہ کیا۔ اس وفد کے مندرجہ ذیل مطالبات تھے۔

۱۔ ودیا مندر کا نام تبدیل کیا جائے۔ اگر نام رکھنا ہی چاہتے ہیں تو پڑھائی گھر رکھ لیں۔

۲۔ مسلمان بچوں کے لیے اردو تعلیم کا انتظام۔

۳۔ سی پی میں جو کتابیں رائج ہیں ان میں ہندو سورماؤں اور بزرگوں کا حال درج ہے۔ مسلم تہذیب اور بزرگوں کا نام تک نہیں۔ اس کمی کو پورا کیا جائے۔

۴۔ ودیا مندر اسکیم کی رو سے مدرسہ کھولنے کے لیے چالیس لڑکوں کی شرط ختم کی جائے۔ جہاں پانچ بچے بھی اردو پڑھنے والے ہیں، وہاں اردو رسم الخط میں بندوبست کیا جائے۔

گاندھی کے نام کھلا خط لکھا۔ "اگر مسلمانوں کی شکایات رفع نہ ہوئیں تو ان پر ان ہی کے حربے استعمال ہوں گے۔"

سی پی میں انجمن کے رضاکاروں اور کارکنوں نے سارے صوبے کا دورہ کیا۔ شہر شہر قصبہ قصبہ انجمن کی شاخیں، کتب خانے قائم کیے، مدارس قائم کیے۔ چھوٹا ناگپور میں عیسائیوں کا زور تھا۔ عبدالحق نے انہیں اعتماد میں لے کر عیسائی بچوں کے لیے اردو مدرسے کھولے۔ اچھوتوں کے لیے بھی اردو مدرسے کھولے گئے۔ سی پی کے تمام کالجوں کے لیے اردو کی تدریس کے لیے لیکچرار مقرر کیے۔ ڈاک خانوں کے فارموں اور ریل کے ڈبوں پر اردو تحریر کی جانے لگی۔ عبدالحق ہی کی کوششوں سے سی پی اسمبلی میں اردو میں تقاریر کا آغاز ہوا۔ یہ شور اتنا مچا، مرہٹے اردو بولنے لگے۔ ناگپور اردو کا مرکز بن گیا۔

بنگال میں اردو تدریس کا انتظام نہیں تھا۔ وہ طلبہ جو دینی تعلیم کے لیے دلی میں مقیم تھے ان کے لیے عبدالحق نے مسجد فتح پوری میں دو کمرے کرائے پر لے کر شبینہ مدرسہ قائم کیا تاکہ یہ طالب علم اردو پڑھیں۔

اس علاقے میں تقریباً آٹھ لاکھ عربی النسل مسلمان آباد تھے۔ عبدالحق نے وہاں بھی مدرسے قائم کرائے۔

صوبوں کے ساتھ ساتھ ریاستوں میں بھی اردو کے خلاف جال بچھایا گیا تھا۔ عبدالحق نے اپنی تدبیروں سے اس جال کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ہر طرف اردو کا ڈنکا بجنے لگا۔

یہ کام یونہی نہیں ہوگئے۔ اردو کا یہ سپاہی ہر جگہ سینہ سپر رہا۔ کہیں کامیابی ہوئی کہیں ناکامی لیکن اس نے آس نہیں توڑی۔ وہ برابر کام میں لگا رہا۔ عمر ایسی تھی کہ آسائش کی ضرورت تھی۔ بہت سے علمی و ادبی کام ایسے تھے جنہیں بیٹھ کر کرنے کی ضرورت تھی لیکن وہ پورے ہندوستان میں مارا مارا پھرتا تھا۔ ہمدردوں کی ہمدردی اپنی جگہ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

"عربی کی ایک مشہور مثال ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا کردیتی ہے۔ مجھے اردو سے محبت ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ محبت جنوں کی حد تک ہے لیکن اس کے ساتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو سے میری وابستگی کا یہ سبب ہے کہ پوری قوم کی تہذیب و ثقافت، تصورات و نظریات اور اس کے عزائم اور حوصلوں سے ملتا ہے اور کون ایسا بدبخت ہوگا جسے اپنی قومی روایات اور تہذیبی اقدار سے محبت نہ ہوگی۔"

اب وقت آگیا تھا کہ انجمن ترقی اردو کے اہتمام و انتظام میں برطانوی ہند کے کسی موزوں مقام پر ایک اردو یونیورسٹی قائم کی جائے چنانچہ ۱۹۴۰ء میں ناگ پور کے کھلے اجلاس میں اردو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں اتفاقِ رائے سے اس کی تجویز پاس ہوئی۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کی اس اہم اور تاریخی تجویز کا ملک کے طول و عرض میں بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

وہ اس کانفرنس کے کامیاب انعقاد کے بعد دلی واپس آگئے۔ اب انہیں اردو یونیورسٹی کے لیے معتبر اصحاب کو اعتماد میں لینا تھا۔ انہوں نے اس کا آغاز قائداعظم محمد علی جناح سے کیا۔ انہوں نے قائداعظم کو اپنے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی زحمت دی۔

کھانے پر جہاں ہندوستان کی عمومی سیاست اور دیگر مسائل پر بات ہوئی، وہیں مجوزہ یونیورسٹی کا بھی ذکر آیا۔ قائداعظم نے اس سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

اردو یونیورسٹی ایک بڑا منصوبہ تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی فراہمی کا تھا۔ وہ اس سلسلے میں کوششیں کرتے رہے لیکن مصیبت یہ تھی کہ اردو کے کام میں قدم قدم پر روڑے اٹکائے جارہے تھے اور انہیں ہر اس جگہ پہنچنا ہوتا تھا جہاں ان کی ضرورت ہو۔ آئے دن دوروں پر رہنا پڑتا تھا۔ ایک چومکھی لڑائی تھی جسے وہ لڑ رہے تھے۔ تصنیف و تالیف کے شغل کو بھی بالائے طاق نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس پُر آشوب دور میں بھی "ہماری زبان" جاری کیا۔ اب کام کرنے والے بہت تھے لیکن نگرانی تو انہی کو کرنی تھی۔ ان سب کاموں کی بدولت یونیورسٹی کا کام بہت سست روی سے چل رہا تھا۔

اسی دوران میں یہ خیال آیا کہ دلی میں انجمن کی اپنی عمارت ہو۔ اس کام کے لیے انہوں نے چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ اپنی کل پونجی ۵۶ ہزار روپے چندے میں دے دیے اور قطعۂ زمین حاصل بھی کرلیا۔

انجمن کے دفتر (دریا گنج) میں بڑی رونق رہنے لگی تھی۔ ہروقت مہمانوں سے کمرے بھرے رہتے تھے۔ ان میں مسلم لیگی بھی تھے، کانگریسی بھی۔ خلافت کمیٹی والے بھی تھے اور کمیونسٹ بھی۔ کونسلوں کے ممبر بھی تھے اور لیڈر بھی۔ اہلِ علم بھی تھے اور طالب علم بھی۔ گاندھی جی کے معتقد بھی اور ان کے مخالف بھی تھے۔ یہ گرم بازاری نتیجہ تھی بابائے اردو کی مقبولیت اور ان کے خلوص کا۔ ان کی مخالفت کرنے والے بھی ان کے خلوص سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی تک یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "مولوی عبدالحق نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی ہے۔"

اتنی بھیڑ اور چہل پہل میں کام کرتے رہنا کچھ انہی کا حصہ تھا۔ سچ ہے محبت انسان کو اندھا ہی نہیں بہرا بھی کردیتی ہے۔ وہ اسی بھیڑ میں بیٹھے بڑے اطمینان سے کام کرتے رہتے تھے۔

وقت بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آزادی کے دن قریب آرہے تھے۔ گاندھی جی کے سامنے اب اردو سے بھی بڑے مسائل تھے لیکن زبان کے نام پر نفرت کے جو بیج انہوں نے بُو دیے تھے، ان کی فصل تیار ہونے لگی تھی۔

چودھویں جولائی ۱۹۴۷ء کا دن تھا۔ وہ حسبِ معمول اپنے کمرے میں حسبِ معمول کام کررہے تھے کہ اُن کے ایک مہمان جو کئی روز سے انجمن کے دفتر میں ٹھہرے ہوئے تھے، کمرے میں داخل ہوئے۔

"تیار ہوجایئے۔ آپ کو میرے ساتھ حیدر آباد چلنا ہے۔"

"ایسی کیا وحشت ہے؟"

"میں آپ کا ٹکٹ خرید چکا ہوں۔ کل صبح کی فلائٹ ہے۔"

ان کی قسمت میں بھلائی تھی کہ جی میں آگئی۔ حیدر آباد کا نام سن کر جی للچا گیا۔ رضامندی ظاہر کردی اور دوسرے دن کی فلائٹ سے وہ حیدر آباد، دلی سے دور چلے گئے یا قدرت نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا۔

حیدر آباد میں کچھ کام تھے انہیں نمٹاتے نمٹاتے آخر اگست آگیا۔ ۳۰ ستمبر کی شام کو وہ بھوپال کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے بذریعہ جہاز دلی جانے کا ارادہ تھا۔

بھوپال پہنچ کر معلوم ہوا کہ دلی کے حالات بہت خراب ہیں۔ ابھی وہاں جانا خلافِ مصلحت ہوگا۔ آخر یہ طے پایا کہ بھوپال میں قیام کرکے کچھ دن انتظار کیا جائے اور اسے رکنا پڑا۔

تین چار روز کے بعد ہی جو خبریں آئیں وہ بے حد پریشان کن تھیں۔ محلے کے محلے اجڑ گئے تھے۔ خون پانی کی طرح ارزاں تھا۔ پاکستان بنانے کی پاداش میں مسلمانوں کو تہِ تیغ کیا جارہا تھا۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ کسی غیبی طاقت نے اسے دلی سے حیدر آباد بھیج دیا تھا ورنہ اس پر تو پاکستان سے ہمدردی ہی کا نہیں اردو کی حفاظت کا الزام بھی آتا۔

میری انجمن! اپنی ذات کا خیال آتے ہی اسے انجمن کا خیال آگیا۔ میرے دفتر پر کیا بیتی ہوگی۔ اردو سے میری محبت کا بدلہ انجمن کے بے جان در و دیوار سے نہ لیا گیا ہو۔ میں یہاں ہوں لیکن میرے اہل کار تو دفتر ہی میں ہوں گے۔ الٰہی خیر کیجیو۔

کہیں سے اڑتا ہوا ایک خط بھوپال پہنچ گیا "بلوائیوں نے انجمن کے مکان پر حملہ کیا۔ تمام سامان اور مال و اسباب لوٹ لیا۔ مکان کھلا پڑا ہے اور اللہ کی امان میں ہے۔ ظالم بلوائیوں نے ایک کاتب اور اس کے بیوی بچوں کو قتل کر ڈالا۔ باقی ملازمین اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔"

خط کیا تھا، کرب و بلا کا اطلاع نامہ تھا۔ انسانی جانوں سے بھی زیادہ وہ قیمتی اور نادر کتابیں تھیں جو اس نے برسوں کی محنت کے بعد جمع کی تھیں۔ انسان تو ایک مرتا ہے لیکن ایک نایاب کتاب کا مٹ جانا، پورے دور کا فنا ہو جانا ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ خود جائے اور دیکھے کہ کیا رہا، کیا کھویا، کیا بچا لیکن احباب پھر مانع آئے کہ یہ وقت دلی جانے کا نہیں۔ دلی میں کسی کو خط لکھا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا کہ یہ وقت اس مقتل میں آنے کا نہیں خصوصاً بابائے اردو کا۔ قوم پرست ہندو، اردو کے حوالے سے اس کے خون کے پیاسے ہیں۔ ناچار دل مسوس کر رہ گیا۔

کتب خانہ لٹ جانے کا ایسا صدمہ ہوا کہ وہ صاحبِ فراش ہوگیا۔ غصہ تھا کہ بخار کی شکل اختیار کر گیا۔ انگلیاں لکھنے کی عادی تھیں اور اب لکھنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بجز اس کے کہ اِدھر اُدھر خط لکھ کر حالات دریافت کرتا رہے۔ پھر اسے کچھ کام یاد آگئے۔ بھوپال میں خالی پڑے پڑے دل ڈوبنے لگا تھا۔ بخار سے نجات پاتے ہی وہ حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں جو کام باقی رہ گیا تھا، اسے نمٹنے میں لگ گئے۔

دلی بدستور مصائب کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ خوں ریزی کا بازار گرم تھا۔ ایسا بازار جس کے سامنے نادر شاہ کا قتلِ عام اور غدر کے مظالم ہیچ تھے۔ گاندھی جی کے جلسوں میں نہ عبادت کا تقدس باقی رہ گیا تھا نہ روحانیت کی روشنی۔ گاندھی جی ہر اس جگہ پہنچتے تھے جہاں درندگی برہنہ ہو کر ناچ رہی تھی لیکن اس وقت جب سب کچھ لٹ چکا ہوتا تھا۔ ان کے یہ دورے سیاسی چال سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

آخر کار نو نومبر ۱۹۴۷ء کو انہیں ابوالکلام آزاد کی وساطت سے دلی جانا نصیب ہوا۔ دوسرے ہی دن وہ انجمن کا مکان دیکھنے دریا گنج پہنچ گئے۔

"کس دل سے آئے ہیں ہم کچھ دل ہی جانتا ہے۔"

وہ سب سے پہلے اس کمرے میں گئے جہاں وہ کام کرتے تھے یہاں کا نقشہ ہی دوسرا تھا۔ کبھی یہاں کتابوں کی متعدد الماریاں ہوتی تھیں۔ کھلی الماریوں کے علاوہ دو بڑی فولادی الماریاں تھیں جن میں خاص خاص نادر قلمی نسخے اور قدیم فرامین اور کاغذات اور بعض نامور اشخاص مثلاً ناسک، غالب، سرسید، حالی، اقبال، تیج بہادر سپرو وغیرہ کے خطوط اور اسی قسم کی بیشتر نادر اشیا تھیں۔ اس کے علاوہ کئی بڑے صندوق تھے جن میں ان کے تیار کردہ نوٹس اور واقعات سے متعلق یادداشتیں، اردو، ہندی تنازعے سے متعلق بہت سے قدیم کاغذات اور بہت بڑا حصہ اردو لغات کے صاف کیے ہوئے مسودوں کا تھا۔

اب ان الماریوں اور صندوقوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ کچھ صندوق جو نئے اور اچھے تھے، غائب تھے۔ غالباً لٹیرے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کتابوں کے صفحات کچھ پھٹے کچھ ثابت اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ انہی صفحات پر پاؤں رکھتا، بچاتا کھانے کے کمرے میں گیا کیونکہ دو مقفل الماریاں وہاں بھی تھیں۔ شاید وہ بچ گئی ہوں؟ لیکن یہ محض اس کی خوش فہمی تھی۔ ان الماریوں کا بھی وہی حشر ہوا تھا۔ ان الماریوں میں قلمی بیاضیں تھیں لیکن اب ان کے پھٹے

[illegible] اس طرح بکھرے پڑے تھے جیسے پت جھڑ کے [illegible] کے پتے۔

مالک مکان نے کرائے کے لالچ میں یہ مکان بھارت [illegible] کو دے دیا تھا لہٰذا کمرے خالی کرنے کے لیے [illegible] کمروں کی بیش قیمت کتابیں اور کاغذات [illegible] کی طرح صحن میں پھینک دیے تھے۔ بہت سے [illegible] اور کچھ آنے جانے والوں کی روندن میں [illegible] کوئی چیز کسی کو پسند آئی، وہ اٹھا کر چل دیا۔

[illegible] کے کمرے رسالوں اور اخباروں سے پٹے پڑے تھے۔ مالک مکان نے ان کمروں کو خالی کرنے کے لیے یہ اخبار اور رسائل باورچی خانے، غسل خانوں اور گودام میں [illegible]۔

[illegible] خانے کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا یہاں بھی [illegible] قدم آئے تھے۔ الماریوں کی کتابیں درہم برہم [illegible] زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ الماریوں کے تالے [illegible] تھے۔

وہ جب انجمن [illegible] لے کر حیدر آباد سے دہلی آئے تھے [illegible] مال گاڑی کے کئی ڈبے سامان سے بھر گئے تھے۔ اور اب اس سامان کا جو حشر ہوا تھا اس کے سامنے تھا۔ میرا قصور؟ قصور تو ان لاکھوں عزیز جانوں کا بھی نہیں تھا جو ظلم و جبر کا شکار ہو گئیں۔ قصور تو ان عورتوں کا بھی نہیں تھا جن کی بے حرمتی ہوئی۔ ان معصوم بچوں کا بھی نہیں تھا جن کے [illegible] کر دیے گئے۔ جب ان بے قصوروں کا یہ حشر ہوا تو پھر اس سامان کے لٹ جانے کا کیا افسوس! وہ یہی سوچتے ہوئے راستے بھر اور جلے مکانوں کو دیکھتے ہوئے اپنی قیام گاہ پر لوٹ آئے۔

چودھری رحم علی، محمد یعقوب، رفیق الدین احمد اور ایسے [illegible] ہم درد ان کے ساتھ تھے۔ ان سب نے یہ طے کیا کہ جو ہو گیا اس پر افسوس کرنا اور حوصلہ ہارنا بے کار ہے۔ اب یہ کیا جائے کہ جو کتابیں بچ گئی ہیں، انہیں یکجا کیا جائے۔ ردی سمیٹ لی جائے۔ شاید کچھ کام کی چیزیں بچ گئی ہوں۔

وہ دوسرے دن پھر انجمن کے دفتر پہنچ گئے۔ ردی کے انباروں کا ایک ایک کاغذ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کتاب کا کوئی کاغذ ایک جگہ، کوئی دوسری جگہ ملا۔

پہلے ہی دن اندازہ ہو گیا کہ اس کام میں تو کئی مہینے لگ جائیں گے۔ اتنے عرصے تک مولانا ابوالکلام آزاد کے گھر مہمان رہنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نظام پیلس کے گیسٹ ہاؤس میں اٹھ گئے۔

ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا۔ بعض نسخوں کے کاغذات مختلف جگہوں سے ملے مگر پھر بھی ناقص رہے۔ بعض کے حصے پھٹے ہوئے ملے۔

ایک ایک کاغذ کو دیکھنا، اسے پڑھنا۔ پھر جوڑ سے جوڑ ملانا۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ صبح سے شام تک کرنے کے بعد کپڑے اور صورتیں گرد سے اٹ جاتی تھیں۔ پھر بھی ایک کونا صاف نہیں ہوتا تھا۔

نظام پیلس میں گئے ہوئے ابھی چار ہی روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا۔ حیدر آباد سے کوئی وفد آرہا ہے اس لیے گیسٹ ہاؤس خالی کرنا پڑے گا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ کوئی مکان مل جائے یا کوئی اور صورت ٹھہرنے کی نکل آئے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

انجمن کی شاخیں سارے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پاکستان کے لیے نیا مرکز قائم کیا جائے۔

نظام پیلس سے اٹھنا پڑا تو انہوں نے یہ سوچا کہ کراچی جا کر وہاں کے لیے نئے مرکزی دفتر کا انتظام کرلیا جائے۔

دہلی کے دفتر میں ردی کی چھٹائی کا کام جاری تھا کہ وہ کراچی کے لیے روانہ ہوگئے۔

کراچی میں پیر الٰہی بخش ان کے شفیق کرم فرما تھے لہٰذا ان کے ہاں قیام کیا۔

۱۹۳۶ء میں جب علی گڑھ میں کل ہند اردو کانفرنس ہوئی تھی اور انجمن کے مرکزی دفتر کے لیے نام تجویز کیے گئے تھے تو علامہ اقبال نے لاہور کا نام پیش کیا تھا لیکن اس وقت یہ دفتر دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد عبدالحق کو اقبال کی یہ تجویز یاد آئی۔ انہوں نے شاعرِ مشرق کے اس خواب کو تعبیر عطا کرنے کا فیصلہ کیا اور چاہا کہ مرکزی دفتر لاہور میں ہونا چاہیے۔ انہوں نے وزیر مہاجرین میاں افتخار الدین احمد کو خط لکھا۔

"ہم سب کی رائے یہ ہے کہ اب انجمن کا صدر مقام لاہور ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے ہندوؤں نے جو عمارتیں اور پریس وغیرہ چھوڑے ہیں، ان کی تقسیم عمل میں آرہی ہے۔ اگر آپ کے توسط سے ہمیں کوئی اچھا پریس اور مکان مل سکتا ہے ہم بہ خوشی اسے خریدنے کے لیے تیار ہیں۔"

اس خط کا جب انہیں کوئی جواب نہیں ملا تو وہ خود لاہور گئے اور میاں بشیر احمد کو یاد دہانی کرائی۔ انہوں نے لاہور کے ممتاز اور با اثر ادیبوں کو مدعو کیا۔ یہاں کچھ ایسی باتیں ہوئیں

جن سے تاثر ملتا تھا کہ یہ حضرات نہیں چاہتے کہ انجمن یہاں آئے۔

اس طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد کراچی ہی ایک ایسا شہر تھا جو انجمن کے دفتر کے لیے مناسب تھا۔ اب یہاں کوئی موزوں مکان ڈھونڈنے کی ضرورت تھی۔ مکان کی تلاش سید بشیر علی کے ذمے تھی۔ وہ کئی روز تک کراچی کی سڑکیں ناپتے رہے۔ دن بھر میں جو مکان دیکھتے رات کو بیٹھ کر اس پر تبصرے ہوتے۔ ہر مکان میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آتی تھی۔ بالآخر ایک سہ منزلہ مکان کا انتخاب ہوگیا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پر مہاجرین کا قبضہ تھا۔

جب اس کا ذکر کراچی کے میئر حکیم محمد احسن سے ہوا تو انہوں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ یہ عمارت مہاجروں سے خالی کروائی جائے۔

"شاردا مندر کی عمارت خالی پڑی ہے۔ آپ اسے الاٹ کرالیں۔"

شاردا مندر گجراتیوں کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ یہاں بارہ سو کے قریب طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ دفتر کے لیے اس سے بہتر عمارت دوسری نہیں ہوسکتی تھی۔ عبدالحق نے اس کے معائنے کے بعد رضامندی ظاہر کردی اور یہ عمارت انجمن ترقی اردو کے نام الاٹ ہوگئی۔

احباب کا اصرار تھا کہ وہ یہیں رک جائیں۔ ہندوستان میں اب اردو کا کوئی مستقبل نہیں لیکن وہ دلی جانے کے لیے بے چین تھے۔

"ہندوستان میں ہمارے لاکھوں، کروڑوں بھائی اس زبان کے بولنے والے ہیں۔ ان کی خدمت کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔"

آخر وہ نہ مانے اور جنوری ۱۹۴۸ء میں بذریعہ ہوائی جہاز دلی روانہ ہوگئے۔ انہیں یہ اطمینان ہوچکا تھا کہ کراچی میں مرکزی دفتر کا انتظام تو ہوہی چکا ہے۔

دلی میں ان کے دفتر میں ردی کی چھنٹائی کا کام ابھی تک جاری تھا لیکن اتنا کام ہوچکا تھا کہ نقصان کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اب جو غور کیا تو بہت سے مسودے تلف ہوچکے تھے۔ کچھ نامکمل رہ گئے تھے۔ دل پر ایک چوٹ سی لگی لیکن کس کس چوٹ پر کتنی دیر رویا جاتا۔ ابھی انہیں اپنے کام کو پھر سے جاری کرنا تھا "یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔"

وہ گاندھی سے مل کر اپنے آئندہ عزائم بیان کرنا چاہتے تھے۔ ان سے تحفظات کی ضمانت لینی تھی۔ انہیں یہ بتانا تھا کہ ہندی اردو تنازعہ اب ختم ہوچکا۔ اردو والوں نے پاکستان حاصل کرلیا، ہندی والوں نے ہندوستان۔ اب جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ وہ یہیں رہ کر ادبی کام کرتے رہیں گے لیکن اسی روز انہوں نے برت (بھوک ہڑتال) رکھ لیا۔ پانچ روز بعد برت توڑ دیا لیکن کسی سے مل نہیں رہے تھے۔

وہ اپنے دیرینہ ساتھی کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے کہ گاندھی سے ملاقات واپسی میں ہوجائے گی۔ جو گلے شکوے ہیں، دور ہوجائیں گے۔

حالات نے ایک سال میں ایک صدی کی کروٹیں بدل لی تھیں۔ انقلاباتِ زمانہ نے کیا سے کیا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ عبدالحق کے نزدیک اب پہلے سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ اردو کا تحفظ کیا جائے اور اس کی حفاظت کا شعور بیدار کیا جائے لیکن یہ کام اب پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا تھا۔ کانگریس نے اپنی چند وزارتوں کے بل بوتے پر کیسا طوفان برپا کیا تھا۔ اب تو پورے ملک پر ان کی حکومت تھی۔ اب یہ جنگ شاید چند صوبوں تک محدود نہ رہے۔

ان نئے حالات میں نئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا تھا کہ انجمن کا صدر دفتر کہاں مناسب رہے گا؟ ۱۹۳۶ء میں حیدرآباد دکن کے مقابلے میں اس کے لیے دہلی کو مناسب سمجھا گیا تھا۔ اب اسے کہاں لے جایا جائے؟

ان مسائل پر غور کرنے کے لیے انہیں مشاورت کی ضرورت تھی۔ ان کی درخواست پر اولڈ بوائز لاج میں ہمدردانِ اردو کا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں کل پچیس حضرات تشریف لائے۔ یہ حضرات موجودہ حالات سے اتنے خوف زدہ اور سہمے ہوئے تھے کہ اپنی رائے دیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کوئی مخلص کھل کر رائے دینے کو تیار نہیں تھا۔

ہمدردی سب کو تھی لیکن ان سب نے آگ اور خون کے وہ تماشے دیکھے تھے کہ اردو کی بات کرنے کو بھی حکومت کی مخالفت تصور کررہے تھے۔ ابھی حکومت کی پالیسی کا بھی ٹھیک طرح اندازہ نہیں ہوسکا تھا اس لیے بھی کوئی رائے قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ اجتماع کے سامنے دونوں مسئلے رکھے گئے لیکن دونوں مسئلے تشنہ بحث کا شکار ہوگئے۔ گول مول لفظوں میں سب کا خیال یہی تھا کہ صدر دفتر دہلی ہی میں ہونا چاہیے۔ انجمن کا لائحۂ عمل کیا ہو؟ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ حکومت کی نیت کا علم تو ہو۔

اب جو کچھ کرنا تھا خود عبدالحق کو کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ واپس جاکر وہ گاندھی سے ملیں گے۔ ان کی غلط فہمیاں دور کریں گے اور اپنا لائحۂ عمل ان کے سامنے رکھیں لیکن اب اس مسئلے کو سیاست سے الگ کرنا ہوگا۔ انجمن کو اپنے لائحۂ عمل پر عمل کرتے ہوئے ادبی کاموں تک خود کو محدود کرنا ہوگا۔ انہیں امید تھی کہ گاندھی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور انہیں کام کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہندوستان میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو اردو بولتے ہیں۔ انجمن کی ضرورت تو بہرحال رہے گی۔

۲۸ جنوری کو وہ الٰہ آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں کچھ کام تھا۔ اس کے بعد انہیں دلی جاکر گاندھی سے ملاقات کرنی تھی۔

الٰہ آباد میں انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مکان پر قیام کیا۔

"مولوی صاحب، اب کیا سوچا" عبدالستار صدیقی نے ان سے پوچھا۔

"نقصان تو بہت ہوگیا ہے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کمر ٹوٹ گئی ہوتی لیکن میں انجمن کو نہیں چھوڑ سکتا، میں چھوڑ بھی دوں تو انجمن مجھے نہیں چھوڑے گی۔ زندگی بھر کا عشق ہے ڈاکٹر صاحب!"

"وہ تو ہے لیکن یہ آپ نے اپنے لیے کیا سوچا۔ اب ایک نہیں دو انجمنیں ہیں۔"

"میں مستقل ایک جگہ کا ہوکر نہیں رہنا چاہتا۔ میں دونوں ملکوں پر اردو کی ترویج کا عزم کیے ہوئے ہوں۔ اسی سلسلے میں گاندھی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کیا ہے؟"

"بس دو دن یہاں ٹھہروں گا۔ یکم فروری کو گاندھی جی سے ملاقات ہوگی۔"

انہوں نے پیر حسام الدین راشدی کو بھی لکھ دیا تھا "اب کوئی مناسب مکان مل گیا تو دفتر و کتب خانہ اس میں منتقل کرکے کراچی چلا آؤں گا۔ وہاں مجھے کسی علیحدہ مکان کی ضرورت نہیں۔ شاردا مندر میں رہ کر کام کروں گا اور رات کو وہیں پڑا رہوں گا۔ میرے پاس اب کیا ہے جو مکان کی ضرورت ہو۔ ایک بچھونا اور دو چار کپڑے ہیں اور بس۔ دوسرے مجھے تو دونوں ملکوں میں رہنا ہے۔"

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مغرب کا وقت ہوچکا تھا کہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے فرزند احمد صدیقی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"کسی نے گاندھی جی کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔"

"یاالٰہی خیر! اب مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ کیا انہیں ایک اور خون کا دریا پار کرنا ہوگا۔ اس قتل کا الزام بھی مسلمانوں ہی کے سر جائے گا۔" مولوی صاحب کی زبان سے بے اختیار یہ کلمات نکلے۔

جلد ہی یہ خبر آگئی کہ یہ کارنامہ کسی مسلمان کا نہیں۔ قاتل انہی کا ہم قوم تھا۔ ہندوستان کے مسلمان ایک بڑی آزمائش سے بچ گئے۔ مسلمان گھروں کے بجھے ہوئے چراغ پھر سے جل گئے لیکن عبدالحق کے دل کا اندھیرا پہلے سے بھی بڑھ گیا۔ گاندھی سے ملاقات کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ گاندھی ان کے مخالف ضرور تھے لیکن ان کے کام کی قدر بھی کرتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان سے مل کر انجمن کے بہت سے مسئلے حل ہوجائیں گے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

وہ ایک مرتبہ پھر دلی چلے گئے۔ یہاں انہیں انجمن کے لیے مکان تلاش کرنا تھا۔ کوچہ گردی آبلہ پائی بن گئی لیکن مکان کا انتظام نہ ہوسکا۔ کوئی ڈر کے مارے مکان دینے کو تیار ہی نہیں تھا۔

پنڈت کیفی، سرتیج بہادر سپرو، پنڈت کشن پرشاد کول، ڈاکٹر تاراچند جیسی ہستیاں زبان کے مسئلے پر ان کی ہم نوا تھیں لیکن مکان کے حصول میں کسی کی کوششیں بار آور نہیں ہورہی تھیں۔

زاہد حسین صاحب کا جن کے پاس ان کا قیام تھا، دلی سے کراچی تبادلہ ہوگیا۔ اب خود ان کے قیام کی کوئی صورت نہ رہی تھی لہٰذا انہیں بھی کراچی واپس آنا پڑا۔

یہاں آتے ہی وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا ڈول ڈالنا شروع کیا۔

انہوں نے بڑی امنگوں کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کو خط لکھا کہ وہ انجمن کا افتتاح اپنے دستِ مبارک سے فرمائیں۔ جس محبت سے انہوں نے خط لکھا، اسی محبت سے جواب آیا۔ قائداعظم نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور لکھا کہ آج کل بہت مصروف ہوں۔ سرحد کے دورے سے واپسی پر ۱۵ اپریل کے بعد کسی روز بڑی خوشی سے انجمن ترقیِ اردو پاکستان کا افتتاح کروں گا۔

کراچی میں انجمن کا کام آہستہ آہستہ جم رہا تھا لیکن ان کے دل کو دلی بے چین کیے ہوئے تھی۔ سوتے جاگتے وہیں کے خواب دیکھتے تھے۔ خاص کر اپنے کتب خانے کا خیال ستاتا تھا کہ کیسی کیسی کتابیں برباد ہوکر رہ گئیں۔

عمر کے آخری حصے میں اپنی علمی اور عملی سرگرمیوں کے بہترین مرکزوں سے جدائی۔ دلی کی ادبی محفلوں کا اجڑنا اور

سب سے بڑھ کر دریا گنج دہلی میں انجمن کے دفتر اور بیش قیمت کتب خانے کی تباہی ایسے صدمات نہیں تھے جو آسانی سے برداشت کیے جاسکتے۔ ان مستقل صدموں نے ان کی صحت پر نہایت ناگوار اثرات ڈالے۔ احباب کی یہ رائے قرار پائی کہ وہ تبدیلیِ آب وہوا کے لیے کوئٹہ چلے جائیں جہاں کی آب وہوا صحت کے لیے بے نظیر ہے۔

مستقل کام کرتے رہنے ہی میں ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ طبیعت کیسی ہی ناساز ہو، کام کیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ان کی نبض کتابوں کے ساتھ چلتی تھی۔ محض سیرو تفریح کے مواقع ان کی زندگی میں بہت کم آئے ہوں گے۔ ڈاکٹر لاکھ کہتے تھے کہ کام کی زیادتی سے گریز کریں لیکن بچپن سے اب تک کی عادت چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ وہ کوئٹہ تبدیلیِ آب وہوا کے لیے جارہے تھے لیکن کتابوں اور کاغذات کا انبار ان کے ہمراہ تھا۔

کوئٹہ میں ان کے لیے ایک نہایت عظیم الشان چنار کے درخت سے متصل کہ جس کی بلندی اور پھیلاؤ کو دیکھ کر قدرت کا تماشا نظر آتا تھا، ایک ڈیرا لگادیا گیا۔ وہ دن بھر اس درخت کے زیرِ سایہ بیٹھے کام کرتے رہتے اور اس شاندار درخت کی شوکت، عظمت اور گھنے سائے کا لطف اٹھاتے۔

ابھی کوئٹہ کی آب وہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بہ مشکل سولہ سترہ دن گزرے ہوں گے کہ کراچی سے یہ وحشت ناک خبر ان تک پہنچی کہ اگر وہ فوری طور پر دلی نہ پہنچے تو حکومت، انجمن ترقیِ اردو، ہند کو امداد بھی نہیں دے گی (جس کی منظوری ہوچکی تھی) زمین بھی ضبط کرلے گی اور کتب خانے سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ یہ خبر بعض نہایت معتبر اشخاص دلی سے لائے تھے۔ اس لیے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ طبیعت کی ناسازی میں پریشانی کا عنصر بھی شامل ہوگیا۔ وہ دوسرے ہی دن یعنی ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کو کراچی روانہ ہوگئے۔ تاکہ احباب سے مشورہ کرنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ احباب کا مشورہ یہ تھا کہ پہلے کوئی دلی جاکر تمام حالات معلوم کرے اس کے بعد وہ جائیں۔ اسے احباب کے مشوروں کے سامنے سر جھکانا پڑا۔

۱۱ ستمبر کی شب کو قائداعظم رحلت فرماگئے۔ ان کے ہاتھوں انجمن کے افتتاح کی حسرت ہی رہ گئی۔

ابھی وہ اس خبر سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ یہ خبر پہنچی کہ بھارت کی فوج حیدر آباد پر چڑھ آئی ہے۔ حیدر آباد میں انہوں نے اپنی عمر کے چالیس برس گزارے تھے۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں ان کی جوانی نے دن گزارے تھے اور پھر انہیں بوڑھا ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں انجمن ترقیِ اردو نے اپنے عروج کی منزلیں طے کی تھیں۔ پھر یہ خبر بھی آگئی کہ ہندی فوجیں حیدر آباد میں داخل ہوگئیں۔

یہ خبریں ان کے لیے صدمے سے کم نہیں تھیں لیکن اب تو وہ جیسے ہر صدمے کے عادی ہوگئے تھے۔ یہ صدمہ بھی بہت سے صدموں میں گھل مل گیا۔

وہ آخری کوشش کے طور پر ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دہلی گئے۔ پانچ اکتوبر کو وہ ابوالکلام آزاد سے ملنے ان کی قیام گاہ گئے۔ بڑے تپاک سے ملے لیکن بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کچھ فکر مند ہیں یا انہیں توقع نہیں تھی کہ عبدالحق ان سے ملنے آسکتے ہیں۔ ان کی مشہورِ زمانہ لب سوز چائے آگئی۔

"جی مولوی صاحب، کیسی گزر رہی ہے۔ پاکستان میں۔"

"جس کی ایک اولاد یہاں اور ایک وہاں ہو۔ اس کا دل ایک جگہ کیسے لگ سکتا ہے؟"

"دل تو لگانا پڑے گا" ابوالکلام آزاد نے کہا "یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کی ایک ٹانگ یہاں ہے اور ایک وہاں۔"

"میں دونوں جگہ کام کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان، ایران، چین، عرب اور انڈونیشیا وغیرہ میں۔"

"اور ملکوں کا تو میں کہہ نہیں سکتا لیکن یہاں آپ کے بارے میں بہت سی بدگمانیاں ہیں۔ یہاں آپ کا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔"

"ان بدگمانیوں کو دور کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ زبان اور کلچر جو پاکستان اور بھارت کی اکثر آبادی میں مشترک ہے، اس کے لیے پوری آزادی ہو خاص طور پر اردو کے لیے جو یہاں کے کروڑوں انسانوں کی زبان ہے۔"

"آپ کے کہہ دینے اور میرے مان لینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ خود ہی دیکھ چکے ہوں گے کہ انجمن کے لیے کوئی مکان تک دینے کو تیار نہیں۔ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک آپ ایک مشکوک آدمی ہیں۔"

غرض کچھ ایسی باتیں ہوئیں کہ وہ ان کی طرف سے مایوس ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب انہیں بعض دوسرے دوست یاد آئے جو ان کے قدرداں بھی تھے۔ ان کے ہم نوا بھی اور بااثر بھی تھے۔ وہ ڈاکٹر تارا چند سے ملے، ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کی۔ سب نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ مستقل طور پر پاکستان چلے جائیں۔

[illegible] حکومت کی نظروں سے پوشیدہ نہیں [illegible] باقاعدہ نگرانی کررہی تھی۔ [illegible] بزرگ ان سے ملنے آئے۔ [illegible] ہندوستان میں اردو کی حالتِ زار کا [illegible] میں اردو کی بابت پوچھا۔ مولوی [illegible] دوست بن جاتا تھا جو اردو کا دوست [illegible] مسلسل آنے لگے۔ کرید کرید کر مولوی [illegible] دریافت کرتے۔ اب ان سے کون ملنے کے [illegible] اب وہ کس سے ملنے جارہے ہیں۔ اگر [illegible] جواب ملا تو وہ کیا کریں گے؟ اگر وہ جواب ملا تو [illegible] کیا ہوگا۔ مولوی صاحب اپنی سادگی میں سب [illegible] بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سی آئی ڈی کا آدمی [illegible]

[illegible] اردو کو یقین تھا کہ حکومتِ ہندوستان اگر تعاون [illegible] دلی میں رہ کر بھی کام کرسکیں گے۔ وہ اب تک [illegible] کہ چونکہ اردو، ہندو اور مسلمانوں دونوں کی [illegible] قومی اثاثہ ہے اس لیے دہلی میں بیٹھ کر کام [illegible] نہیں لیکن حکومتِ ہند انہیں کسی [illegible] کو تیار نہیں ہورہی تھی۔ انہیں مجبور [illegible] انجمن سمیت اپنا بوریا بستر سنبھالیں اور [illegible] کی راہ لیں۔

انہیں اس مرتبہ کے دہلی کے قیام میں طرح طرح سے [illegible] جارہا تھا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ کسی [illegible] ملک کے جاسوس ہوں۔

کہیں نجات کی کوئی صورت نہیں تھی۔ جن پہ تکیہ تھا [illegible] وہ پتے بھی ہوا دینے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر ابوالکلام آزاد سے ملے۔

"میں انجمن کو کراچی لے جانے پر مجبور ہوں۔ بشرطیکہ [illegible] خانہ لے جانے کے ساتھ ساتھ مجھے وہ رقم بھی لوٹادی [illegible] جو انجمن نے حکومتِ ہند کو زمین کی قیمت میں ادا کی تھی۔"

ابوالکلام نے یقین دہانی کرائی لیکن اس کے برعکس ہوا [illegible] کہ انجمن کا دفتر سربمہر کردیا گیا اور رقم لوٹادینے کا وعدہ بھی وعدۂ معشوق ہوگیا۔

وہ بے یارومددگار دلی میں پڑا رہا کہ اپنا دفتر واگزار کرالے۔ ہر کوشش بے سود، ہر تدبیر بے کار گئی بلکہ اب تو انہیں یہ خدشہ ہونے لگا کہ کہیں اور کوئی الزام نہ لگ جائے۔ وہ تنگ آکر بھوپال چلے گئے۔ وہاں بھی تقریباً ایک ماہ گزار دیا اور بالآخر ناکام ونامراد ۲۴ جنوری کو بمبئی پہنچ گئے۔ کچھ کام تھے، وہ نمٹائے اور ۲۸ دسمبر کو بمبئی سے کراچی کے لیے جہاز میں سوار ہوگئے۔

رخصت اے ہندوستاں، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں

○☆○

ہندوستان میں رہ کر جتنا کام کیا تھا، ساری محنت اکارت گئی۔ کتب خانے کی ضبطی کا داغ الگ دل پر لگا پھر بھی دل کو تسلی تھی کہ اپنوں میں آگئے۔ یہاں اردو کے لیے جھگڑنا نہیں پڑے گا۔ یہاں کی زبان اردو ہوگی۔ انہیں ہر مشورے میں شریک کیا جائے گا، ان کی قدرومنزلت ہوگی۔

نئے سرے سے کام کا آغاز کرنا تھا لیکن سرمائے کی شدید کمی تھی۔ حکومتِ ہند نے انجمن کے سرمائے منجمد کردیے تھے۔

بہت بھاگ دوڑ کرنے کے بعد وہ کچھ سرمایہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ بیس ہزار حکومت پاکستان نے پچیس ہزار سالانہ ریاست خیرپور سے، پانچ ہزار کا عطیہ حکومت پنجاب نے اپنے بجٹ سے پچاس ہزار روپے انجمن کو دیے اور کام چل پڑا۔

انجمن کے ترجمان "قومی زبان، معاشیات، سائنس" وغیرہ کا اجرا ہوا۔ مطبوعات کا سلسلہ از سرِنو شروع ہوا۔ دس ہزار کتابوں کے ذخیرے سے لائبریری کھولی گئی۔

ان کا اب بھی یہی ایمان تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کا دارومدار اردو کی ترقی پر ہے۔ وہ جلد سے جلد پاکستان میں اردو کو انگریزی کا مقام دلوانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ عدالتوں کی زبان اردو ہو، اسمبلیوں کی زبان اردو ہو، دفتروں کی زبان اردو ہو۔ اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو تاکہ ایسے نوجوان تیار ہوں جو انگریزی کے محتاج نہ ہوتے ہوئے ملک کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے اردو کالج کھولا جس میں یونیورسٹی کے مضامین کی تعلیم اردو کے ذریعے دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا۔ اسی طرز کی یونیورسٹی وہ کراچی میں قائم کرنا چاہتے تھے جس کا پہلا زینہ یہ کالج تھا۔

اس کالج کے کھلنے کے بعد پہلی مرتبہ انہیں احساس ہوا کہ یہاں نہ کوئی خود کام کرنا چاہتا ہے نہ دوسرے کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ احساس اس وقت ہوا جب اس کالج کے الحاق کا مسئلہ آیا۔

کوئی یونیورسٹی اس کے الحاق کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل میں جان تھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے، حکومتی حلقوں میں ان کے اس کام کی بڑی پذیرائی ہوگی لیکن یہاں کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ محکمۂ تعلیم کے دفاتر کے چکر وہ اس طرح کاٹ رہا تھا جیسے کوئی اسے یہاں جانتا ہی نہ ہو۔ اس کا ماضی اور حال کسی کے سامنے ہی نہ ہو۔ سندھ یونیورسٹی نے نہ جانے کن مصالح کی بنا پر انکار کردیا۔ ایک طویل خط و کتابت کے بعد انکار ہوگیا۔ اب انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے خط و کتابت شروع کی۔ ان کا جواب یہ آیا کہ یہ کالج پنجاب یونیورسٹی کی حدود ارضی سے باہر ہے اس لیے الحاق ممکن نہیں۔

بہت ممکن تھا کہ وہ مایوس ہوکر اس منصوبے سے ہاتھ اٹھا لیتے لیکن مایوس ہونا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر کوششوں میں جُت گئے۔ آخر ایک طویل تگ و دو کے بعد وزیر خزانہ غلام محمد اور وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کی مدد سے سندھ یونیورسٹی نے الحاق منظور کرلیا۔

انجمن کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (۱۹۵۰ء) عبدالحق صدر بنے۔

پاکستان کے شب و روز سیاسی کمزوریوں میں بسر ہو رہے تھے۔ ہندوستان میں اردو، ہندی تنازع روبرو تھا۔ اب قومی زبان کا مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ ہرچند کہ بابائے قوم حضرت قائداعظم نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"اگر تم پاکستان کو قائم رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہو سکتی ہے۔ کوئی اور زبان نہیں۔"

اس فرمان کے باوجود بنگالیوں نے بنگالی کے حق میں آواز بلند کی۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ جو خالص لسانی اور ثقافتی تھا، سیاسی گتھیوں میں الجھا دیا گیا۔

اب مولوی عبدالحق کا سب سے بڑا مشن اردو کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان کا درجہ دلانا تھا۔ اس کا ثبوت وہ اردو کالج قائم کرکے دے چکے تھے کہ اردو میں ذریعۂ تعلیم بننے کی پوری صلاحیت ہے لیکن اہلِ اقتدار انگریزی سے گلوخلاصی کے لیے تیار نہیں تھے۔

انہوں نے اکابرین کی توجہ اس طرف دلانے کے لیے کراچی میں ایک اردو کانفرنس بلائی۔ اس کی صدارت عبدالرب نشتر نے کی۔ گورنر جنرل ناظم الدین نے اپنے خطبے میں مشرقی پاکستان میں اردو کی ترویج کے لیے تجاویز پیش کیں۔

اس کانفرنس میں عبدالحق نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ان کے عزائم کا پتا چلتا تھا کہ وہ تھکے نہیں ہیں۔ اس معاملے میں کتنے آگے جا سکتے ہیں۔

"کسی تحریک کو ہمدردوں کی ہمدردی اور مربیوں کی سرپرستی سے تقویت نہیں پہنچتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس تقویت کا راز بہت کچھ مخالفت میں ہے۔ مخالفت بیدار کرتی ہے۔ عملی قوت کو ابھارتی ہے۔ انسان کے ان جوہروں کو جلا دیتی ہے جو پہلے مدھم پڑے تھے۔ مخالفت درپردہ امتحان ہے۔ تحریک اگر حق پر ہے اور کام کرنے والوں میں خلوص اور استقلال ہے تو مخالفت دب جائے گی۔ اور تحریک سوبسوے کامیاب ہوگی۔ مخالفت نے پاکستان بنا دیا ورنہ کیا اتنی جلد بن جاتا اور مخالفت کے طفیل ہی اردو کو ترقی نصیب ہوئی۔"

انہوں نے مخالفت طلب کی تھی۔ مخالفت ملی اور خوب ملی۔

اس کے بعد سے وہ مسلسل اردو کا مقدمہ لڑتے رہے۔ ہندوستان میں اگر غیروں کا سامنا تھا تو یہاں اپنوں سے سابقہ پڑا جو زیادہ تکلیف دہ تھا۔ انہیں دکھ تھا تو یہ کہ یہاں بھی اردو کی اہمیت بتانی پڑ رہی ہے۔

"قومیت کے لیے یک رنگی کے لیے ہم خیالی کی اور ہم خیالی کے لیے ہم لسانی کی سخت ضرورت ہے جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیال کا رنگ ایک نہیں۔ جہاں خیال ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔"

انہوں نے کبھی کی کہی ہوئی باتوں کو دہرانا شروع کیا کہ وہی مسئلے اب یہاں بھی درپیش تھے۔ کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ کہنے میں کیسی بے دلی ہوتی ہے یہ وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس مرحلے سے گزرے ہیں لیکن وہ اس بے دلی میں بھی حوصلے اور عزم کا چمن کھلائے بیٹھے تھے۔ کبھی کنونشن بلاتے کبھی کانفرنس منعقد کرتے۔ کبھی سرکاری افسروں سے ملتے۔ ہر تقریر، ہر تحریر میں یہی کہتے رہے کہ اردو کو سرکاری زبان بناؤ۔

جب کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا تو کام کون کرتا۔ مالی امداد کی سخت ضرورت تھی لیکن ذرائع محدود سے محدود تر۔

ایک دن عجیب اتفاق ہوا۔ شام کی سیر ان کا معمول تھی۔ ایک دن وہ ٹہلنے کے لیے نکلے۔ سڑک کے کنارے کنارے پیدل چل رہے تھے۔ ادھر سے گورنر جنرل غلام محمد کی سواری آگے پیچھے جیپوں کے درمیان سڑک سے نکلی اور یکایک رک گئی۔ گورنر جنرل کار سے اترے اور ان کے پاس

"آپ یہ" انہوں نے مولوی عبدالحق کا ہاتھ پکڑا اور انہیں لے کر اپنی کار میں آگئے۔

انہوں نے راستے میں خود ہی انجمن کا ذکر چھیڑا۔ عبدالحق نے اپنی مشکلات سے انہیں آگاہ کیا اور اس حقیقت کے قائل ہوئے کہ اردو کے بڑے بڑے کام بغیر حکومت کی امداد کے نہیں ہوسکتے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ وزیرِ تعلیم فضل الرحمٰن کو بلا کر اس کے متعلق کچھ کہیں گے۔

غلام محمد نے اپنے وعدے کا اتنا پاس تو کیا کہ فضل الرحمٰن سے بات کی اور ان کی سفارش پر حکومت پاکستان نے ایک سو روپے ماہانہ کی پنشن منظور کی اور لکھا کہ یہ پنشن اردو کی لائق توصیف، خدمت کے سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو دی جاتی ہے۔

وہ یہ پنشن لینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ یہاں پاکستان کی خدمت کرنے کے لیے آئے تھے اس لیے نہیں آئے تھے کہ پاکستان پر بار بنیں لیکن بار بار کے تقاضوں کے بعد انہوں نے یہ کہہ کر اپنی ذاتی پنشن کو انجمن کے نام منتقل کردیا۔

"حکومت نے جو پنشن میرے لیے عطا فرمائی تھی وہ میں نے انجمن کو منتقل کردی۔ میں یا مجھ جیسے دوسرے افراد رہیں نہ رہیں، انجمن کا رہنا لازمی ہے۔ میں نے حقہ چائے وغیرہ ترک کردیے ہیں۔ اپنی ضرورتیں بہت کم کردی ہیں۔ کھانے کے لیے میں ۶۳ روپے ماہانہ رکھے ہوئے ہیں۔ چند روپے دھوبی حجام کے سمجھ لیجیے کپڑوں کی ضرورت ہے نہ جوتوں کی البتہ دو تین طالب علموں کو مدد دیتا ہوں، دیتا رہوں گا۔"

(خط بنام عبادت بریلوی)

اس طرح کوئی انجمنیں چلتی ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں میں کٹوتی کرکے بھی کتنا بچا سکتے تھے۔ ان کے پاس علم و ادب اصطلاحات و لغات کا ڈھیر رکھا تھا لیکن اشاعت کے لیے روپیا نہیں تھا۔ انہوں نے حکومت سے کچھ رقمی امداد طلب کی تاکہ تمام دفاتر اور عدالتی الفاظ و اصطلاحات کی ڈکشنری تیار ہوسکے لیکن اہلِ اقتدار کو اردو رائج ہی نہیں کرنی تھی تو ان اصطلاحات کی پروا کیوں ہوتی۔

۱۹۵۴ء میں ایک مرتبہ پھر انہیں اپنی محنت اکارت جاتی ہوئی نظر آئی۔ بابائے قوم کے فرمان کے برعکس یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک ملک میں دو قومی زبانیں ہوں گی۔

جس روز مجلس دستور ساز میں زبان کا مسئلہ پیش ہونے والا تھا، وہ انجمن کے دفتر سے پیدل روانہ ہوئے، ایک لاکھ کا مجمع ساتھ تھا۔ مئی کی گرمی میں تین میل کا فاصلہ طے کرکے یہ جلوس اس مقام تک پہنچ گیا جہاں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع ہے۔ پولیس اور مسلح فوج مشین گنیں اور ٹینک لیے کھڑی تھی۔ سارے شہر میں کامل ہڑتال تھی۔ لوگوں میں سخت اشتعال پھیلا ہوا تھا۔ یہ سب مولوی عبدالحق کی تحریری کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ عوام کو اسمبلی میں پیش ہونے والے دو لسانی بل کے بارے میں معلوم ہوسکا اور وہ بابائے اردو کی سربراہی میں اپنے گھروں سے اسمبلی تک آگئے۔

ہزاروں افراد ممنوعہ علاقے میں زبردستی داخل ہوگئے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ نہایت خون خرابہ ہوگا لیکن محمد علی بوگرہ کی دانش مندی یا سیاسی چال نے اس خطرے کو ٹال دیا۔ وہ اسمبلی سے باہر آکر مولوی صاحب سے ملے۔

"آپ ان سب لوگوں کو لے کر کیوں آئے ہیں؟"

"انہیں میں نہیں لایا، اردو کی محبت انہیں لے کر آئی ہے۔ حکومت کے ایک غلط فیصلے سے اختلاف انہیں یہاں لے کر آیا ہے۔ اب آپ کو ہوا کا رخ پہچان لینا چاہیے۔ اس ملک میں صرف اردو کو قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔"

"یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے جو گفت و شنید سے طے ہو سکتا ہے، احتجاج سے نہیں۔"

"کاش! یہ بات آپ پہلے سوچ لیتے۔ آپ نے تو اجلاس بلا لیا۔"

"دیکھیے تو اجلاس میں کیا طے ہوتا ہے۔ کیا خبر یہ بل پاس ہی نہ ہوسکے۔"

"اور اگر پاس ہوگیا؟"

"پھر ہمیں اور آپ کو اسمبلی کی رائے کا احترام کرنا ہوگا۔"

"ایسا بل پیش ہی کیوں کیا جائے، پہلے معاملہ صاف ہونا چاہیے۔"

ماخذات: بابائے اُردو، ڈاکٹر معراج نیر۔
ذکرِ عبدالحق، سید معین الرحمٰن
نقدِ عبدالحق
نقوش
نایاب ہیں ہم، حمیدہ اختر۔

○☆○

"آپ ان لوگوں سے کہئے کہ پُرامن طور پر اپنے گھروں کو چلے جائیں۔"

"کس ضمانت پر؟"

"ہم آپ سے مذاکرات کرنے کو تیار ہیں۔"

"تو پھر آج کا اسمبلی کا اجلاس برخاست کیجیے۔"

محمد علی بوگرہ اب بے بس ہوگئے۔ انہوں نے اجلاس ملتوی کرنے کا وعدہ کرلیا اور دوسرا دن عبدالحق سے گفتگو کرنے کا ٹھہرا۔

بابائے اردو نے اسی وقت مجمع کو اس فیصلے سے آگاہ کیا اور مجمع پُرامن طور پر منتشر ہوگیا۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق گفتگو بھی ہوئی۔ معاہدہ بھی لیکن عمل اس کے خلاف ہوا۔

○☆○

بہت دنوں سے ان کا ایک خواب تھا اور وہ یہ کہ جس طرح دنیا کی بڑی زبانوں میں یہ دستور ہے کہ ہر موضوع پر لکھی جانے والی مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست کتابی شکل میں شائع کی جاتی ہے، اسی طرح اردو کی کتابوں کی بھی ایک جامع فہرست ہونی چاہیے۔ ریسرچ کرنے والوں کو مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے کے بجائے محض "قاموس الکتب" کی ورق گردانی سے معلوم ہوجائے گا کہ فلاں موضوع پر کتنی کتابیں کس کس مصنف کی موجود ہیں۔

اردو جیسی بڑی زبان میں جس میں ہر موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہوں، ایسی فہرست کی تیاری آسان بات نہیں۔ اس کے لیے بڑے وسائل کی ضرورت ہے۔

عبدالحق نے اس منصوبے سے حکومت کو آگاہ کیا۔ وزارت تعلیم نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ پھر دل مسوس کر رہ گئے۔ البتہ انجمن میں اس فہرست کا کام چلتا ضرور رہا۔

انہی دنوں (۱۹۵۶ء) یونیسکو نے حکومت سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس اپنی زبان کی کوئی ببلوگرافی ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا تیار ہوسکتی ہے؟

اب وزارتِ تعلیم کو ان کی یاد آئی۔ وہی منصوبہ جو انہوں نے پیش کیا تھا، اب بیش قیمت نظر آنے لگا۔

"ہمارے تعلیم یافتہ لوگ عربی فارسی کتابوں کو مطلق قابلِ التفات نہیں سمجھتے۔ ہاں، اگر کوئی یورپین یا امریکی کسی کتاب یا ہمارے کسی قدیم نظریے کے متعلق کوئی تعریفی کلمہ کہہ دے تو وہ ان کے لیے وحی والہام ہوجاتا ہے۔"

اب وزارت تعلیم والے بھاگے ہوئے آئے۔ امداد دینے پر تیار ہوگئے اور رقم دے دی۔

ان ناقدریوں میں گھرا ہوا آدمی، اپنے مقاصد کے سامنے چٹان کی طرح کھڑا ہوا تھا، البتہ ان تجربوں نے اسے تلخ اور غصیلا ضرور کردیا تھا۔ بات بات پر بھڑک جانا ان کا مزاج بن گیا تھا۔ ان کے احباب اور ساتھ کام کرنے والے رفیق ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اس لیے تمام کام خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔

انہوں نے اس خیال سے کہ روز مرہ کے انتظامی جھگڑوں، حسابات اور پریس وغیرہ کی نگرانی سے نجات مل جائے اور وہ اپنی توجہ صرف ادبی کاموں کی طرف مبذول کرسکیں، جدید سیکریٹری، جوائنٹ سیکریٹری کا انتخاب کرایا۔ نئے خازن کا بھی انتخاب ہوا۔

وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اب کام اطمینان سے چلے گا مگر معاملہ برعکس نکلا۔ ان نئے آنے والوں نے غلط پروپیگنڈا اور سازش سے مجلس منتظمہ میں اپنی اکثریت بنالی اور تخریبی کارروائیاں شروع کردیں۔ الٹی سیدھی جو چاہتے، کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حالات ابتر ہوگئے۔ انجمن پانچ رسالے نکالتی تھی ان میں سے تین رسالے بند ہوگئے۔ مالی حالت اس حد تک ابتر ہوگئی کہ ملازمین کی تنخواہیں تک ادا کرنی مشکل ہوگئیں۔ انجمن چالیس ہزار کی مقروض ہوگئی۔

ادھر یہ بحرانی اور ادھر مجلس ناظمین اور عبدالحق کے درمیان اتنے اختلاف بڑھے کہ معاملہ الزام تراشیوں تک پہنچ گیا۔ انجمن کے وہ کارکن جن سے مولوی صاحب کو بڑی امیدیں تھیں، ان کے خلاف سازشوں میں شریک ہوگئے۔ ان کے خلاف پوسٹر چسپاں ہونے لگے، رکیک الزامات شائع ہونے لگے۔

ان کے قدیم ساتھی اور رفیق ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے اور وہ اکیلے ان کا ماتم کرنے اور پاکستان میں ٹھوکریں کھانے کے لیے رہ گئے۔

یہ ان کے لیے بڑی آزمائش کا دور تھا۔ ایک وقت وہ تھا کہ وہ گاندھی سے ٹکرا گئے تھے لیکن اب چھیاسی سال کی عمر میں وہ ایسے قضیوں کا بار اٹھانے کے لائق نہیں رہے تھے۔ ان کے حریف تازہ دم تھے اور بہت تھے۔ ان کے دماغ تخریبی جدتوں سے مالا مال۔ وہ بے دست وپا ہو کر رہ گئے۔ انجمن ان لوگوں کے تصرف میں آگئی جو حقیقی معنوں میں مولوی صاحب کے رفیق ومددگار نہیں تھے۔

مولوی صاحب کو یہاں تک اذیت پہنچائی گئی کہ ان پر کتب خانے کے دروازے بند کردیے۔ وہ تیسری منزل پر

[illegible] زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ بیمار تھے، بوڑھے [illegible] تھے لیکن سازشیں یہ کب دیکھتی ہیں۔

اس دور کے بابائے اردو کو دیکھ کر اکثر لوگ کہتے تھے، [illegible] آخری ایام کی تاریخ دہرائی جارہی ہے۔

○☆○

وہ لڑکی [illegible] وہ بڑے چاؤ سے کبھی اختر حسین رائے پوری کی دلہن بنا کر حیدر آباد لائے تھے اور اس کے آجانے [illegible] میں خوشیاں اتر آئی تھیں، ان سے ملنے آئی۔ اس لڑکی نے اس شیر جیسے انسان کو بے بسی کے ساتھ [illegible] دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اب آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"بھلا میں کہاں جاسکتا ہوں۔ میں تو ایک قیدی ہوں۔ اگر انجمن کو چھوڑ کر جاؤں تو جو میری نادر کتابیں اور قلمی [illegible] رہ گئے ہیں، وہ بھی شاید نہ رہیں۔"

وہ لڑکی سوچ میں پڑ گئی کہ یہ عظیم انسان، محسنِ قوم و [illegible] اردو کے قیدی ہوسکتے ہیں؟ ان کے چہرے پر تو میں [illegible] کبھی نہ دیکھی تھی۔

[illegible] اور یہ دھندلی اور پپوٹے پھولی آنکھیں تو [illegible] تصور میں بھی نہیں تھیں۔

اس لڑکی نے انہیں ہنسانے کے لیے حیدر آباد کی باتیں [illegible] جب وہ بیاہ کر آئی تھی اور مولوی صاحب اس کے لیے شفقت کا پیکر بن گئے تھے۔

جب وہ لڑکی چائے پی چکی تو مولوی صاحب نے کہا "اب جاؤ۔"

وہ لڑکی یہ سوچتی ہوئی ان کے کمرے سے نیچے اترنے والی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اپنے عظیم اور قوم کے محسن کو قیدی ہونے کا احساس دلایا ہوا ہے۔

○☆○

جس انجمن کو وہ دنیا کی نظر بچا کر لائے تھے اپنے ہی وطن میں تماشا بنی ہوئی تھی۔

ایک بھی ڈھنگ کا رفیق اس وقت ان کے ساتھ نہیں تھا جو حریفوں کو جواب دیتا جبکہ حریفوں میں کئی بڑے زوروں کے آدمی تھے۔ انہوں نے بعض سرکاری عمال کو بھی اپنے ساتھ ملایا ہوا تھا۔

ابنِ انشا اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھے اور اس محاذ پر انہوں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر مولوی صاحب کا ساتھ دیا بھی لیکن جب حریفوں نے ان کی خبر لینی شروع کردی تو وہ اپنی سرکاری ملازمت بچانے کے لیے اس سے الگ ہوگئے لیکن اس کا دکھ انہیں ہمیشہ رہا۔

"حریفوں نے ہمارے مولوی صاحب کو اتنی اذیت دی ہے کہ اگر دس سال جینا تھا تو دو سال جئیں گے غضب خدا کا انہیں لائبریری تک سے نکال رکھا ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت میں اگر کوئی نقص کی بات ہے بھی تب بھی ان کی خدمات، عمر اور عظمت کو دیکھتے ہوئے ایسا کرنا سخت زیادتی ہے۔"

(خط بنام خلیل الرحمٰن اعظمی)

یہ قضیہ شاید یوں ہی چلتا رہتا اور مولوی صاحب کی عمر تمام ہوجاتی کہ ملک میں جنرل ایوب خاں کا مارشل لا آگیا۔

قدرت اللہ شہاب ایوانِ صدر میں تعینات تھے۔ گلڈ وغیرہ کے سلسلے میں ابنِ انشا کی ملاقات جمیل الدین عالی کے توسط سے قدرت اللہ شہاب سے ہوئی۔

ملک میں مارشل لا تھا۔ مختلف اداروں کی چھان بین ہو رہی تھی۔ موقع غنیمت دیکھ کر ابنِ انشا نے قدرت اللہ شہاب کی توجہ انجمن کے معاملات اور بابائے اردو کی حالت کی طرف دلائی۔ ان کی کوششوں سے وفاقی وزارتِ تعلیم نے انجمن کے معاملے پر انکوائری کمیٹی بٹھادی۔

صدر ایوب کی ذاتی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی گئی۔ تمام حالات ان کے گوش گزار ہوئے۔ وہ خود بابائے اردو سے ملنے آئے۔ تمام روداد ان کی زبانی سنی۔

"مولوی صاحب تو اردو کے قائد اعظم ہوئے نا؟"

یہ ایسا تاریخی جملہ تھا کہ مولوی صاحب کے تمام آنسوؤں کی قیمت ادا ہوگئی۔

انجمن کے پرانے اراکینِ منتظمہ میں سے بیشتر انتقال

قطعہ تاریخِ وفات

جدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے
ہم اب فیض سے ان کے محروم ہیں
انہوں نے جو اُردو کی کی خدمتیں
وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں
یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید
کہ باغِ جناں میں وہ محروم ہیں
لکھا قادری نے یہ سالِ وفات
کہ تھے خادمِ قوم، مخدوم ہیں

۱۹۶۱ء

کر چکے تھے۔ چند بوڑھے اور غیر فعال' ایک دو' مولوی صاحب سے شدید اختلاف کے حامل چنانچہ صدر ایوب نے وہ پرانی برائے نام منتظمہ توڑ دی اور ایک دستوری کمیٹی بنا کر مولوی صاحب کو صدر و نگراں نامزد کر دیا۔

مولوی صاحب کو ان کی انجمن واپس مل گئی۔ دوستوں نے مبارک بادیں دیں لیکن اب تو وہ اس کشتی کی طرح تھے جسے سنبھلنے کی خوشی بھی نہیں تھی۔

اسی سال انہیں نشانِ قائد اعظم اور دس ہزار روپے نقد ملے جو انہوں نے انجمن کے فنڈ میں جمع کرا دیے۔

حکومت نے اردو ترقی بورڈ قائم کیا اور لغت کی ترتیب کے لیے ان سے درخواست کی۔ لغت سازی تو ان کا برسوں کا خواب تھا لہٰذا بخوشی اس کام کو اپنے ذمے لے لیا۔ یہ بھی اجازت ملی کہ اپنی پسند کے مددگار وغیرہ انتخاب کر لوں۔

اللہ نے ان کو ان کے صبر کا پھل نہایت شیریں عطا کیا اور وہ جی جان سے لغت سازی میں مشغول ہو گئے۔

○☆○

ایک خواب اور تھا جو انہیں رہ رہ کر یاد آتا تھا۔ یہ خواب تھا "اردو یونیورسٹی۔"

عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد انہیں پورا یقین تھا کہ شمالی ہندوستان میں یہ یونیورسٹی قائم ہو کر رہے گی لیکن ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ نوبت تقسیمِ ملک تک پہنچ گئی۔ بہت سوں کے بہت سے خواب پورے نہ ہو سکے تو یہ خواب کس گنتی میں تھا۔

پاکستان آنے کے بعد یہ قوی امید تھی کہ یہ تو اپنا ملک ہے۔ یہاں تو اسے عمل میں لانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن یہاں تو ہوا ہی دوسری چلنے لگی۔ قائد اعظم بہت جلدی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر اردو زبان کا طے شدہ مسئلہ ہی نزاعی مسئلہ بن گیا۔ ان کی ساری توانائیاں اس فتنۂ بیدار کو کسی نتیجے تک پہنچانے میں صرف ہونے لگیں۔ پھر خود انجمن کے اندرونی جھگڑوں نے انہیں ہلکان کر دیا۔

وہ عمر کے آخری حصے میں بھی اپنی صحت سے بے پروا ہو کر اردو یونیورسٹی کے لیے عملی جدوجہد میں مصروف تھے لیکن حسبِ دل خواہ تعاون نصیب نہ ہوا۔

طلبہ کی ایک تنظیم "بزمِ افروز" کی افتتاحی تقریب میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

"لوگ مجھے بابائے اردو کہتے ہیں لیکن پاکستان میں آ کر تو میں طفلِ اردو ہوں۔ وہ کام اب تم پورا کرو گے جسے میں پورا نہ کر سکا۔"

یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی تقریر جاری رکھ سکے۔

اس کے ایک سال بعد ۱۹۶۰ء میں اسی بزم کے طلبہ نے بابائے اردو کی اپیل پر یونیورسٹی فنڈ کے لیے ۲۷۰ روپے کا نذرانہ پیش کیا تو رقم لیتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر متعدد مقامات پر طلبہ نے اس فنڈ کے لیے رقم جمع کی اور بابائے اردو کے حضور پیش کی لیکن محض نذرانوں سے تو یونیورسٹیاں نہیں بنا کرتیں۔ صرف امیدوں سے تو چراغ روشن نہیں ہوا کرتے۔

وہ ہر چند یہ کہتے رہے کہ میں اب زندگی کی اس منزل میں ہوں جہاں کام سے زیادہ آرام کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اردو یونیورسٹی کا قیام اب میری زندگی کا مشن ہے اور اس مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں چاہے مجھے اس سے کتنی ہی تکلیف پہنچے لیکن اب عمر کی نقدی ختم ہونے کو تھی۔ نوّے سال کی عمر ہو چکی تھی۔ بیماریاں ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

اس مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ سنبھلنے ہی میں نہیں آتے تھے۔ ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اپنا علاج کرا سکتے۔ ۵ مئی ۱۹۶۱ء کو جناح اسپتال میں داخل ہو گئے۔

قاموس الکتب کی پہلی جلد مکمل ہو گئی تھی۔ اس میں ۱۷۶۷ کتب کی فہرست تھی۔ اسی بیماری کی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے اس پر مقدمہ تحریر کیا۔

جب حالت نہ سنبھلی تو ایوب خاں نے کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں علاج کی پیش کش کی۔ ۲۲ دن کو وہ پنڈی روانہ ہو گئے۔ دو ماہ کے مکمل علاج کے بعد ڈاکٹروں نے جگر کا سرطان بتایا۔

کراچی کے نیول اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۶۱ء کو اچانک طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔

۱۶ اگست کو صبح آٹھ بج کر ۴۵ منٹ پر آخری ہچکی کے ساتھ ان کی زبان سے "انجمن" کا نام ادا ہوا اور ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

انجمن ترقیِ اردو کے قدیم دفتر۔ شاردا مندر کی عمارت میں وہ آج بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔

زمانہ جب بھی لکھے گا زبان کی تاریخ
ترا خلوص ترا نام جگمگائے گا

▮▮▮

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اگر آپ کو سو سو روپے کی گڈیاں دی جائیں۔ آپ ایک منٹ میں کم از کم ساٹھ نوٹ گن لیں گے۔ یعنی چھ ہزار روپے۔ ایک گھنٹے میں تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے اور بارہ گھنٹے میں تینتالیس لاکھ بیس ہزار۔ اب ذرا حساب لگائیں اگر آپ کو پانچ کھرب پچھتر ارب روپے گننے کے لیے کہا جائے تو یہ کام کتنے وقت میں پورا ہو گا۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کام میں آپ کی عمرِ عزیز کا ایک بڑا حصہ ختم ہو جائے گا اور آپ جوان سے بوڑھے ہو جائیں گے۔

اب دوسری بات سنئے۔ یہ اتنی بہت سی دولت' ہم نے کئی حاکموں کے خزانوں کو یکجا کر کے بیان نہیں کی ہے۔ دنیا میں ایک ایسا شخص موجود ہے جس کے پاس اتنی دولت ہے اور نہ امریکا یا یورپ کا باشندہ نہیں ہے۔ کیا آپ اس شخص

دُنیا کے امیر ترین افراد کی فہرست بنائی جائے تو اس کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ صرف یہی نہیں کہ وہ دُنیا کا دولت مند ترین شخص ہے بلکہ اس کے اپنے ملک میں بھی دولت کی فراوانی ہے۔ لوگ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور یہ اس کی دانش مندانہ قیادت ہی کا کمال ہے۔

برونائی کے سلطان کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات وحالات

کروڑوں کا آدمی

اے ایس صدیقی

کا نام بتا سکتے ہیں۔ شاید نہیں تو چلیے سن لیں۔ اس انتہائی متمول شخصیت کا نام ہے۔ "ہز میجسٹی پڈو کا سری بیگندہ حاجی حسن البلقیہ معیزالدین وضع اللہ۔ظاہر ہے کہ یہ نام کئی افراد کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی فرد کا نام ہے۔ جب شخصیت بڑی ہے تو نام بھی ایسا ہے۔ یہ شخصیت کون ہے؟ شاید آپ نے جان ہی لیا ہو لیکن اگر نہیں جان سکے ہیں تو سن لیں یہ شخصیت "سلطان آف برونائی" کی ہے۔ یہ دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی دولت کا یہ تخمینہ ایک انگریزی جریدے "فارچون" میں پیش کیا گیا ہے۔ اس جریدے کا کہنا ہے کہ سلطان کی ذاتی دولت تقریباً ۲۵ بلین ڈالر ہے۔ اسی جریدے نے انہیں ایک سعودی شخصیت اور برطانیہ کی ملکہ الزبتھ سے بھی زیادہ دولت مند قرار دیا ہے جن کے پاس اندازاً دس بارہ بلین ڈالر کی ملکیت ہے۔

یہاں یہ جان لیں کہ خود سلطان کو اس جریدے کے بیان سے اختلاف ہے ان کا کہنا ہے کہ جو بات فارچون نے لکھی ہے، درست نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری دولت ان کی ذاتی نہیں ہے بلکہ اس کے مالک ان کے ملک برونائی کے عوام ہیں اور یہ انہی کی فلاح و بہبود کے لیے وقف ہے۔ وہ اس بات پر سخت معترض ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لیے انہیں خواہ مخواہ دولت مندوں کے گروپ میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔

سن ۱۵۲۱ء میں انتھونی نامی ایک پرتگیز سیاح نے سلطنت برونائی کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنے روزنامچے میں لکھا کہ برونائی دنیا کی امیر ترین سلطنت ہے۔ یہاں کا سب سے بڑا مذہب اسلام ہے۔ آج بھی یہ بات مُسلّم ہے کہ برونائی دنیا بھر کے امیر ملکوں میں سرِ فہرست ہے۔ اس حکومت کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔

سن ۱۹۶۷ء میں برونائی کے سابق حکمراں نے اپنے ۲۱ سالہ بیٹے کو تخت و تاج بخش دیا تھا۔ اس وقت موجودہ حکمراں برطانیہ کے ایک فوجی کالج میں طالب علم تھے۔ اس سے قبل کہ وہ کمیشن حاصل کرتے انہیں اپنے وطن لوٹنا پڑا تھا۔

ابتدا میں اس نوعمر بادشاہ کو انتظام سرکاری چلانے میں خاصی دقت کا سامنا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ انہوں نے اس دشواری پر قابو پالیا۔ اور عوام میں ان کی عزت اور ہر دل عزیزی جگہ بناتی گئی۔

سلطان کی پہلی شادی سن ۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ اس... بیوی سے ان کے چھ بچے ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں انہیں اپنے ملک کی ائر سروس کی ایک ہوسٹس پسند آگئی۔ اس کا نام مریم تھا۔

سلطان کی یہ دوسری شریکِ حیات بن گئی۔ اس سے ان تین بچے ہیں۔

ان کے والد نے جس انداز سے ان کی تربیت کی سلطان بھی اپنی اولاد کے سلسلے میں کچھ وہی روش رکھتے جس زمانے میں وہ برطانیہ میں زیرِ تعلیم تھے انہیں خرچ لیے بہت معمولی رقم ملا کرتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کی ہر ناجائز خواہش پوری کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ان کی پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

سلطان برونائی... ایک مذہب پسند آدمی ہیں۔ روزے کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ برونائی میں کوئی آدمی غریب نہیں ہے۔ اس ملک میں ہر تیسرے فرد کے کار موجود ہے۔ کوئی گھر تین کمروں سے کم کا نہیں۔ برو کے دیہاتوں میں بھی بجلی موجود ہے اور الیکٹرونک کی تقریباً ہر گھر میں ہیں۔ آپ کو برونائی میں کوئی شخص بھیک نہیں ملے گا۔ وہاں ہمہ وقت تعمیراتی کام ہوتا رہتا ہے۔ مفت ہے۔ لوگوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ ویسے یہ ملک بہت چھوٹا ہے اور آبادی تین ساڑھے تین لاکھ سے زا نہیں۔

سلطان تنقید کو ناپسند نہیں کرتے اگر ان کی پالیسی پر اگر عوام تنقید کرتے ہیں تو وہ فوراً معاملے پر غور کرتے ہیں او اپنی اصلاح کرلیتے ہیں۔

سلطان کو نوادرات سے بھی شغف ہے لیکن ان ہے کہ وہ محض دکھاوے یا نمائش کے لیے اشیا نہیں خرید بلکہ وہ چیز اگر اچھی ہوتی ہے اور وہ اس کے بارے میں معلومات بھی رکھتے ہیں تبھی اسے خریدتے ہیں۔

سلطان کو اپنی دولت پر کوئی فخر نہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ان سے بھی بڑھ کر مال دار لوگ موجود ہیں۔ تاہم وہ خدا کے شکر گزار ضرور ہیں کہ انہیں ایک اچھا کنبہ میسر ہے خوش حالی حاصل ہے اور اللہ کی بخشی ہوئی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

وہ اس بات کے آرزو مند ہیں کہ انہیں لوگ سلطان کی حیثیت سے نہیں بلکہ عوام کے خادم کی حیثیت سے یاد رکھیں۔

برونائی کے سلطان کا محل کوئی سات سو کمروں پر مشتمل کہا جاتا ہے۔ یہ ریاست ایشیا میں ہے اور مشرقِ بعید میں واقع ہے۔

آدم خور

جم کاربٹ

ترجمہ: اقبال کاظمی

شکاریات کا موضوع نیا نہیں اور اس حوالے سے جم کاربٹ کا نام بھی خاصی شہرت کا حامل ہے۔ اس نے اپنی شکاری زندگی کے واقعات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ زیرِ نظر واقعہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔

اس شیرنی کے شکار کا ماجرا جو آدم خور بن گئی تھی

ہندوستان کے انتہائی شمال میں نیپال کی سرحد کے قریب ... گرمائی ہیڈکوارٹر نینی تال سے صرف اٹھارہ میل دور ... ہمالیہ سے الگ ہونے والی آٹھ ہزار فٹ بلند اور پندرہ ... طویل پہاڑی پٹی کے ایک سرے پر دامن کوہ میں مکتیسار ... کی وہ چھوٹی سی بستی ہے جہاں وٹرنری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ واقع ہے۔ یہاں ہندوستان کے طول و عرض میں پائے جانے والے مویشیوں اور پالتو جانوروں کی بیماریوں پر ریسرچ ہوتی ہے اور ان کے علاج کے لیے ادویات کی تیاری کے سلسلے میں مدد فراہم کی جاتی ہے۔

جن لوگوں نے ہندوستان کے شمالی علاقوں کا سفر کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ قدرت نے ان علاقوں کو فطری حسن سے جی بھر کے نوازا ہے اور مکتیسار کا خطہ تو ایسا ہے جس پر بلاشبہ جنت کا گمان ہوتا ہے۔ یہاں سے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کا حسین ترین نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ مکتیسار کے باشندے یہ دعویٰ کرنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ اگر پوری دنیا میں نہیں تو کماؤں (ریاست) میں کہیں اور ایسا حسین خطہ نہیں ہے۔

اور شاید مکتیسار کے قدرتی حسن اور خوبصورت موسم سے متاثر ہو کر ایک شیرنی نے اس بستی سے ذرا آگے گھنے جنگل میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس شیرنی کو اس جنگل میں خوراک کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہرن، سانبھر، بارہ سنگھا اور کاکار (ہرن کی نسل سے ملتا جلتا جانور) جیسے جانور بڑی آسانی سے اس کا شکار بن جاتے تھے لیکن ایک روز بد قسمتی سے اس شیرنی کا ٹاکرا ایک خارپشت سے ہوگیا۔ بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ خارپشت جسے سیہہ بھی کہا جاتا ہے، خرگوش کے قد و قامت یا اس سے ذرا سا بڑا جانور ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر چرخے کے تکلے کی طرح لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔ یہ نوکدار کانٹے چند انچ سے ایک بالشت یا اس سے بھی زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔

جنگل میں اس خارپشت سے تصادم میں وہ شیرنی نہ صرف اپنی ایک آنکھ کھو بیٹھی بلکہ پچاس کے لگ بھگ لمبے نوکدار کانٹے اس کے اگلے پنجوں کے تلووں، ٹانگوں اور جسم کے مختلف حصوں میں پیوست ہوگئے۔ بہت سے کانٹے گوشت میں پیوست ہو کر ہڈیوں میں اٹک کر ٹوٹ گئے تھے۔ ٹانگوں میں پھنسے ہوئے ان نوکدار کانٹوں کو اپنے دانتوں سے کھینچ کر نکالنے کی کوشش میں ان جگہوں پر زخم سے بنتے چلے گئے۔

زخمی شیرنی بستی سے کچھ دور جنگل میں پڑی اپنے زخم چاٹ رہی تھی۔ پچھلے دو تین روز سے اسے کوئی شکار نہیں ملا تھا۔ وہ زخموں اور بھوک سے اس قدر نڈھال تھی کہ اس میں شکار کی تلاش میں چند گز دور جانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ لیکن اس روز قدرت نے بیٹھے بٹھائے اس کی خوراک کا بندوبست کردیا۔

وہ عورت اپنے مویشیوں کے لیے گھاس کاٹتی ہوئی اس طرف نکل آئی تھی۔ اس طرف گھاس خاصی دبیز اور تقریباً دو فٹ اونچی تھی۔ وہ عورت بڑے اطمینان سے گھاس کاٹتی رہی۔ وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھی کہ چند گز آگے موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔

زخمی اور بھوک سے نڈھال شیرنی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی کہ سرسراہٹ کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا اور آواز کی سمت دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھر آئی جیسے کسی شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں ابھر آتی ہے۔

شیرنی نے بڑی آہستگی سے اپنے آپ کو اوپر اٹھایا۔ گھاس میں سے چند گز دور اس عورت کو دیکھا، اگلے دونوں پیر آگے کو نکالے اور پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کا ایک پنجہ وزنی ہتھوڑے کی طرح عورت کے سر پر لگا۔ عورت کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی اور وہ لمبی گھاس پر گر کر تڑپنے لگی۔ چند ... بعد وہ بے حس و حرکت ہو چکی تھی۔

شیرنی وہاں نہیں رکی تھی۔ اس نے عورت پر حملہ ... کسی خوف کی وجہ سے کیا تھا اور اس خوف نے ہی اسے ... سے بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ شیرنی لنگڑاتی ہوئی جائے وار ... سے تقریباً ایک میل دور نکل آئی اور ایک گرے ہوئے ... کے نیچے زمین کی کھوہ میں بیٹھ کر ایک بار پھر اپنے زخم چا... لگی۔

دو دن گزر گئے اور پھر قسمت کا مارا ایک آدمی اس گر... ہوئے درخت سے لکڑیاں کاٹنے کے لیے پہنچ گیا۔ زخمی شیر... نے حملہ کرکے اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

زخمی شیرنی نے خوف کی وجہ سے پہلے ایک عورت پر ح... کرکے اسے ہلاک کیا تھا اور اس کی لاش وہیں چھوڑ کر بھا... نکلی تھی۔ اس دوسرے آدمی پر حملہ بھی شاید اس نے کسی خو... کی وجہ سے ہی کیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ یہ سمجھی ہو کہ یہ شخص ا... مارنا چاہتا ہے اور اس خوف سے اس نے حملے میں پہل کر... اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہو سکتا ہے وہ اسے بھی چھوڑ ... چلی جاتی مگر اس شخص کی لاش سے بہتا ہوا خون دیکھ کر ر... گئی۔ شاید بہتا ہوا یہ خون دیکھ کر اسے احساس ہوگیا تھا کہ ا... کی بھوک کا کچھ بندوبست ہو سکتا ہے۔

تیسرے روز اس نے گھات لگا کر ایک اور آدمی پر حم... کرکے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی لاش ... حصے سے اپنی بھوک مٹا کر وہاں سے آگے نکل گئی۔

تیسرے آدمی کی ہلاکت کے بعد وہ زخمی شیرنی سے آدم خو... مشہور ہوگئی اور مکتیسار بستی اور آس پاس کے علاقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

میں ان دنوں نینی تال میں تھا۔ اس تیسرے آدمی کی ہلاکت کے بعد اس شیرنی کے بارے میں خبریں مجھ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ میں ان خبروں میں اگرچہ دلچسپی لے رہا تھا لیکن اس طرف جانے کا میرا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ بہت سے شکاری ان دنوں مکتیسار پہنچ چکے تھے اور زخمی شیرنی کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں اس لیے بھی نہیں گیا تھا کہ شاید میری مداخلت کو پسند نہ کیا جائے۔

چند روز میں ہی شیرنی کے ہاتھوں ہلاک ہونے والوں کی تعداد چوبیس تک پہنچ گئی۔ نہ صرف مکتیسار بلکہ دور دراز کی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مکتیسار بستی میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ نے حکومت سے درخواست کی کہ شیرنی سے نجات دلانے کے لیے مجھے بھیجا ... کی طرف سے جب اس آدم خور شیرنی کے شکار کا ... مجھ سونپا گیا تو میں انکار تو نہیں کرسکا لیکن میں اندازہ ... اس مہم کو سر کرنا آسان ثابت نہیں ہوگا کیونکہ ان ... آدم خور شیر کے شکار کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اور وہ علاقہ ... لیے قطعی اجنبی تھا جسے شیرنی نے اپنی شکارگاہ ... بنا لیا تھا۔

... دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے ایک ذاتی ملازم اور ... آدمیوں کے ساتھ نینی تال سے مکتیسار کے لیے ... ہوگیا۔ اس زمانے میں موٹر گاڑیاں صرف شہروں ہی میں ... تھیں۔ گاؤں دیہاتوں میں تو بیل گاڑی ہی کو معزز ترین ... سمجھا جاتا تھا لیکن یہ بہت سست رفتار سواری تھی اس ... نے پیدل سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

تقریباً دس میل کی مسافت طے کرکے ہم ایک سرکاری ... میں پہنچ گئے۔ اس وقت شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ ... جاری رکھنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے رات ... بنگلے میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔

... اندھیرے میں میں نے اپنے آدمیوں کو جگا دیا اور انہیں ... وہ سامان پیک کرکے میرے پیچھے چلے آئیں۔ جبکہ میں ... اپنی پوائنٹ فائیو ہنڈرڈ ایکسپریس ڈبل بیرل رائفل کندھے پر ... ڈاک بنگلے سے نکل کھڑا ہوا۔

ٹھیک اس وقت جب سورج کی پہلی کرن بلند درختوں کی ... کو چھو رہی تھی، میں مکتیسار روڈ پر پہنچ گیا۔ اب مجھے ... ہو جانا پڑا کیونکہ میں آدم خور شیرنی کی قلمرو میں داخل ہو چکا تھا۔

مکتیسار کی طرف جانے والی یہ سڑک کچھ دور تک میدانی ... میں بالکل سیدھی چلی گئی تھی اور پھر عمودی چٹانوں کے ... خم کھاتی ہوئی پہاڑیوں کے دوسری طرف ہموار اور ... ڈھلوانی خطے پر نکل آتی تھی۔ یہاں سے کچھ ہی آگے ... مکتیسار کی آبادی شروع ہو جاتی تھی۔

سب سے پہلے پوسٹ آفس تھا اور اس کے ساتھ ہی بازار شروع ہو جاتا تھا۔ بہت سی دکانیں اس وقت کھل چکی تھیں۔ میں نے ایک دکان دار سے ڈاک بنگلے کا پتا پوچھا اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چلتا رہا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں ڈاک بنگلے کے برآمدے میں کھڑا دور، بہت دور ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کا نظارہ کرتے ہوئے ناشتے کا انتظار کر رہا تھا کہ درجن بھر انگریز فوجیوں پر مشتمل ایک پارٹی ڈاک بنگلے کے سامنے سے گزری۔ ان کے ساتھ ایک سارجنٹ اور سب سے آخر میں دو مقامی اردلی تھے جنہوں نے ٹارگیٹ اور سرخ جھنڈے اٹھا رکھے تھے۔

سارجنٹ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کی یہ پارٹی چاند ماری کے لیے رائفل رینج کی طرف جا رہی ہے۔ چاند ماری پر جانے والے عام طور پر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر گپیں ہانکتے ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن آدم خور شیرنی کی وجہ سے آج کل گروپ کی صورت میں چلتے ہیں۔

سارجنٹ سے باتوں میں یہ بھی پتا چل گیا کہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ کو کل شام حکومت کی طرف سے ٹیلی گرام کے ذریعے اطلاع مل گئی تھی کہ میں یہاں آنے کے لیے نینی تال سے روانہ ہو چکا ہوں۔

"یہاں کی صورت حال تو بہت ہی خوفناک ہے۔" سارجنٹ نے بتایا۔

"نہ صرف اس بستی میں بلکہ دور دور تک چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ کوئی اکیلا آدمی دن کے وقت بھی بستی سے باہر نہیں جاتا۔ دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ خوف بھی بڑھتا رہتا ہے اور شام کا دھندلکا پھیلنے سے پہلے

عیسائی ڈاکٹر کا حیرت انگیز کمال

پاکستان بننے سے پہلے دہلی میں ایک عیسائی ڈاکٹر نے میرے مطب کے چند کامیاب نسخوں کو اپنے مریضوں پر آزما کر انکا کامیاب علاج کیا۔ تو وہ میرا اور بھی گہرا دوست بن گیا پھر وہ ریٹائر ہو کر انگلستان چلا گیا۔ یہ دوستی پھر خط و کتابت کی صورت میں جاری رہی وہ میرے بہت سے نسخے تو اپنے ساتھ لے گیا لیکن اپنی دواؤں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ آخر انتقال سے ایک سال قبل ڈاکٹر ولیم نے اپنا ایک مشہور نسخہ مجھے تفصیل سے لکھ کر بھیج دیا۔ جو کہ کمزور نوجوانوں کو بہت کم دنوں میں قابل فخر صحت کا مالک بنا دیتی تھیں میں نے خاص بیماریوں کا نسخہ پاتے ہی فوراً دوائیں تیار کرکے اپنے مطب میں آنے والے بالکل گئے گذرے کمزور نوجوانوں کو استعمال کرائیں خدا نے میرے مریضوں کو مکمل شفا عطا فرمائی اور ساتھ ہی میرے مطب کو ایسی شہرت بخشی جیسی ولیم کو اپنے ملک میں حاصل تھی۔ اس نسخہ کے استعمال کے فوراً بعد ہی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سدا نوجوانی کا راز پا لیا ہو۔ مایوس مریضو! یہ اشتہار نہیں بلکہ حقیقت ہے اگر خدانخواستہ آپ بھی کسی ایسی ہی شکایت میں مبتلا ہوں تو آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ روانہ کردیں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائیگا۔

حکیم اینڈ سنز پوسٹ بکس 2159 کراچی 74600 پاکستان

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہی لوگ گھروں میں گھس کر دروازوں کو تالے لگا لیتے ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے شکاری بہت کوشش کر چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی اس آدم خور کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکا اور لطف کی بات یہ ہے کہ شیرنی اپنے کسی شکار پر دوبارہ واپس نہیں آتی حالانکہ آدم خود شکار کا گوشت کھانے کے لیے دوبارہ وہاں ضرور آتے ہیں۔"

یہ صورت حال میرے لیے واقعی تشویش ناک تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ شیرنی بھی پوری طرح خطرے سے آگاہ ہو چکی تھی اور ایسے آدم خور جانور جو خطرہ بھانپنے کی صلاحیت رکھتے ہوں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

ناشتے کے بعد میں بستی سے باہر آ گیا اور پہاڑی کے قریب کھڑا نیچے وادی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ پوسٹ ماسٹر اور بستی کے چند دکان دار بھی وہاں پہنچ گئے۔

وادی میں تقریباً دو میل دُور چند کھیت اور ایک وسیع و عریض باغ نظر آ رہا تھا جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ زمین اور باغ بدری پرشاد کی ملکیت ہے۔ بدری پرشاد میرا پرانا دوست تھا اور وہ مجھ سے ملنے اکثر نینی تال آیا کرتا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب وہ آیا تھا تو اس نے آدم خور شیرنی کے شکار کے سلسلے میں اپنی مدد کی پیش کش کی تھی۔ اور جب پوسٹ ماسٹر نے مجھے یہ بتایا کہ شیرنی نے اپنا آخری شکار سیبوں کے اس باغ کے دوسری طرف کیا تھا تو میں نے بدری پرشاد سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے قریب کھڑے ہوئے لوگ آدم خور کے بارے میں مختلف کہانیاں سنا رہے تھے۔ میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور ان کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا نیچے وادی میں جانے والی سڑک پر چل پڑا۔ بدری پرشاد سے رابطہ کرنے سے پہلے میں پہاڑی کے مشرق میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

دھوپ ابھی تیز نہیں ہوئی تھی اس لیے مجھے چلنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دو بستیوں کا جائزہ لینے کے بعد اوپر کی طرف سے ایک طویل فاصلہ طے کرتے ہوئے میں واپس آ رہا تھا کہ مجھے ایک دلچسپ منظر دکھائی دیا۔

اس لڑکی کی عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک سانڈ کی رسی پکڑے اسے کٹیسار کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ وہ سانڈ ایک قدم آگے بڑھانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مخالف سمت میں جانے کے لیے رسی چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مجھے اس لڑکی پر ترس آ گیا اور میں قریب پہنچ کر سانڈ کو ہانکنے لگا۔ وہ سانڈ یقیناً اچھی نسل کا تھا۔ میرے ایک ہی مرتبہ ہانکنے پر وہ آرام سے لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

"کہیں یہ کلوا چوری کا تو نہیں ہے" میں نے لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ سانڈ کو اسی نام سے پکار رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ میرے پتا جی کا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"اور تم اسے کہاں لے جا رہی ہو؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"اپنے چاچا کے پاس' اس کی زمین پر حل چلانے کے لیے" لڑکی نے کہا "اس کے پاس دو سانڈ تھے' اب ایک ہی رہ گیا ہے۔"

"کیوں' دوسرا کہاں گیا؟" میں نے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ دوسرا سانڈ قرضہ چکانے کے لیے بیچ دیا گیا ہوگا۔ اس علاقے ہی میں کیا پورے ہندوستان میں کاشتکار اور غریب لوگ ہندو مہاجنوں کے قرضوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے اور بعض لوگ تو قرضے چکانے کے لیے اپنی اولاد تک کو بیچ ڈالتے تھے مگر ان کے سروں پر قرضوں کا بوجھ جُوں کا تُوں رہتا تھا۔

"دوسرے سانڈ کو کل شیر نے مار دیا" لڑکی نے کہا اور میں چونک گیا۔ یہ میرے لیے دلچسپ اطلاع تھی۔ ابھی میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی حوصلہ پا کر بولی "کیا تم اس شیر کو مارنے آئے ہو صاحب جی؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "اسے مارنے کی کوشش کروں گا۔"

"تو پھر تم اس جگہ سے دُور کیوں جا رہے ہو جہاں شیر نے میرے چاچا کے سانڈ کو مارا تھا" لڑکی نے کہا۔

"اس لیے کہ کلوا کو تمہارے چاچا کے پاس پہنچانا ہے" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ وہ شیر آدم خور بھی ہے۔"

"مجھے پتا ہے" لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا "وہ کنتھی کے پتا جی! بشن سنگھ کی ماتا جی اور بہت سے لوگوں کو کھا چکا ہے۔"

"تو پھر تمہارے پتا جی نے تمہیں کلوا کے ساتھ اکیلے کیوں بھیج دیا؟" میں نے کہا۔

"نہیں بھاری بخار (ملیریا) ہو گیا ہے۔ وہ چل نہیں سکتے" لڑکی نے جواب دیا۔

میں کلوا کو ہانکتا اور لڑکی سے باتیں کرتے ہوئے چلتا رہا۔ اس لڑکی کی بہن کوئی نہیں تھی۔ ایک بھائی تھا جو دو سال پہلے ملیریا ہی کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔

مجھے اس لڑکی کی ہمت کی داد دینی پڑی جو سانڈ کو اپنے چچا کے ہاں پہنچانے کے لیے اکیلی اپنی بستی سے نکل کھڑی ہوئی تھی جبکہ کوئی بھی اکیلا آدمی ڈر کے مارے ان راستوں پر نہیں نکلتا [illegible] چار چار چھ چھ کی ٹولیوں میں ایک بستی سے [illegible] آتے جاتے تھے اور پچھلے چار گھنٹوں کے [illegible] اس علاقے میں کوئی انسان دکھائی نہیں دیا تھا اور یہ [illegible] والی تھی۔

[illegible] پگڈنڈی پر مڑ گئے جس کے اختتام پر اس بچی کے [illegible] کہا۔ لڑکی نے باہر ہی سے آواز لگا کر اپنے چاچا کو [illegible] لے آئی ہے۔

"[illegible] تلی!" اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی "[illegible] کھونٹے سے باندھ دو اور تم واپس چلی جاؤ' اپنے [illegible]"

[illegible] تلی نام کی اس لڑکی کے ہاتھ سے رسّی لے کر کلوا [illegible] گڑی ہوئی ایک کِلّی سے باندھ دیا اور ہم سڑک کی [illegible] چل پڑے۔ میں تلی کو اکیلے نہیں جانے دینا چاہتا [illegible] اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا چلتا رہا۔

"[illegible] مجھے وہ جگہ دکھا سکتی ہو جہاں کل شیر نے تمہارے [illegible] کو ہلاک کیا تھا؟" میں نے تلی کی طرف دیکھتے [illegible]

"[illegible] نہیں" تلی نے جواب دیا "میں نے وہ جگہ دیکھی تو [illegible] مجھے معلوم ہے۔"

"کیا شیر کے حملے کے وقت وہ بھینسا اس طرف اکیلا ہی [illegible]" میں نے پوچھا۔

"نہیں' اس کے ساتھ اور مویشی بھی تھے" تلی نے بتایا "[illegible] صبح کے وقت مویشیوں کو وادی کی طرف ہانک دیا جاتا [illegible] وہ گھاس چرتے رہیں۔ کل صبح بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شیر [illegible] حملہ کیا تو کلوا اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ جبکہ باقی مویشی [illegible]"

[illegible] کے ساتھ چلتے ہوئے میں محتاط نظروں سے اطراف [illegible] دیکھ رہا تھا۔ سڑک اب کچھ تنگ ہو گئی تھی۔ اس کے [illegible] طرف گھنے درخت اور قد آور گنجان جھاڑیاں تھیں۔ [illegible] ایسی ہی جگہیں ہوتی ہیں جہاں درندے گھات لگا کر راہ [illegible] حملہ آور ہوتے ہیں۔ اس لیے میں پہلے سے کچھ زیادہ [illegible] ہو گیا تھا۔

اس سڑک پر تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد [illegible] میں ایک تنگ سے راستے پر مڑ گئے۔ اس راستے پر [illegible] نچلی اور دبی ہوئی تھیں۔ چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے [illegible] رُک گئی اور اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگی کہ کل صبح شیر [illegible] کو اس جگہ پر حملہ کر کے ہلاک کیا تھا۔

"ٹھیک ہے' آؤ' اب میں تمہیں گھر پہنچا دوں" میں نے کہا۔

تلی کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد میں دوبارہ اسی جگہ پر آ گیا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد پگڈنڈی پر آگے چلتا رہا۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' جنگل گنجان ہوتا جا رہا تھا۔

تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ایک جگہ رُک گیا اور گہری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دراصل یہی وہ جگہ تھی جہاں شیر نے حملہ کیا تھا۔ دُور دُور تک جھاڑیاں نچلی اور دبی ہوئی تھیں۔ میں دیر تک دائیں بائیں اور اِدھر اُدھر دور تک گھومتا رہا اور بالآخر اس جگہ پہنچ گیا جہاں کسی بھاری چیز کے گھسیٹے جانے کے نشان واضح تھے۔

میں ان نشانوں کو دیکھتا ہوا چلتا رہا۔ اور پھر تقریباً دو سو گز آگے نشیب میں مجھے وہ بھینسا نظر آ گیا جو تقریباً بیس فٹ کی بلندی سے گرنے والے ایک نالے کے کنارے پر پڑا ہوا تھا۔ بھینسے کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کا بہت کم گوشت کھایا گیا تھا۔

نالے کے کنارے اور بھینسے کے درمیان ایک ٹُنڈ مُنڈ سا درخت تھا جس کے تنے کے کچھ حصے پر جنگلی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ یہی ایک ایسا درخت تھا جس پر بیٹھ کر میں اس آدم خور کو شکار کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ان دنوں چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اندھیری رات میں اس درخت پر میں آدم خور کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ آدم خور کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اپنے شکار کا گوشت کھانے کے لیے وہ دوبارہ اس جگہ ضرور آتا ہے۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ شیرنی بھی بھینسے کا گوشت کھانے کے لیے رات کو وہاں ضرور آئے گی۔

اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے اور میرے پاس اتنا وقت تھا کہ اپنے دوست بدری پرشاد سے ملاقات کر کے اس کے ساتھ ایک کپ چائے بھی پی سکوں۔

بدری پرشاد سے بستی میں داخل ہوتے ہی ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ مجھے بستی کے آخر میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اپنے گیسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں سے وادی میں اس کی زمینوں' سیب کے باغ اور اس کے پیچھے دُور تک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

برآمدے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے میں بدری پرشاد کو کٹیسار میں اپنی آمد کا مقصد بتا رہا تھا۔ میں نے اُسے اس بھینسے کے بارے میں بھی بتا دیا جس کی نشاندہی تلی نامی اس بچی نے کی تھی اور میں اس بھینسے کی آدھ کھائی لاش دیکھ کر آ رہا تھا۔

"کئی شکاری بہت دنوں سے یہاں گھوم رہے ہیں۔ انہیں اس بھینسے کے بارے میں کیوں نہیں بتایا گیا؟" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے بدری پرشاد کی طرف دیکھا۔

"وہ شکاری!" بدری پرشاد کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ آگئی "وہ تو صرف سیر و تفریح کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہرن، لومڑیوں اور خرگوشوں کے علاوہ وہ کسی اور جانور کا شکار نہیں کر سکے۔ آدم خور کے بارے میں تو وہ اب تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ اس کی شکارگاہ کہاں ہے؟ اس سے پہلے انہیں ہر بات بتائی جاتی رہی ہے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ ان پر سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ چکا ہے اس لیے اس بھینسے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ان شکاریوں کا طریقہ کار بھی بڑا احمقانہ ہے۔ ان کی تیاریاں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ جس جگہ شکار پڑا ہوتا ہے اس کے آس پاس دُور دُور تک جھاڑیاں اور درخت تک کاٹ دیے جاتے ہیں تاکہ کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ پھر چاروں طرف مچان بنائے جاتے ہیں۔ ہر مچان پر کئی کئی آدمی بیٹھ جاتے ہیں۔ آدم خور اتنا بے وقوف نہیں کہ یہ سب کچھ دیکھ کر ان کے جال میں پھنس جائے۔ وہ اس طرف کا رُخ ہی نہیں کرتا۔"

بدری پرشاد کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ کنکیسار کے علاقے میں تباہی مچانے والا آدم خور ایک ہی ہے اور وہ اگلے دائیں پیر سے کسی قدر لنگڑا کر چلتا ہے۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ لنگڑا کس طرح ہوا تھا اور نہ ہی اسے یہ اندازہ تھا کہ وہ آدم خور نر ہے یا مادہ۔

میں نے بدری پرشاد کو اس ٹُنڈ مُنڈ درخت کے بارے میں بھی بتایا جس پر بیٹھ کر میں رات کو آدم خور کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

بدری پرشاد بھی ضد کر کے میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ اس نے سامان اٹھانے کے لیے اپنے دو آدمی بھی تیار کر لیے۔

بدری پرشاد اور اس علاقے کے لوگ گزشتہ ایک سال سے خوف کے سائے میں زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون، کب آدم خور کا شکار ہو جائے۔ میرے منتخب کردہ اس ٹُنڈ مُنڈ درخت کو دیکھ کر وہ تینوں سہم گئے۔ اور مجھے مشورہ دیا کہ میں آدم خور کے انتظار میں اس پُرخطر جگہ پر رات گزارنے کا ارادہ ترک کر دوں۔ ان کا خیال تھا کہ شیر آج رات اپنے شکار کو گھسیٹ کر کسی اور جگہ لے جائے گا۔ اور ممکن ہے اگلی رات مجھے گھات لگانے کے لیے اس سے بہتر اور نسبتاً محفوظ جگہ مل جائے۔

اگر وہ شیر آدم خور نہ ہوتا تو شاید میں ان کا مشورہ مان لیتا۔ اور اگلی رات کا انتظار کرتا۔ لیکن میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس خطے میں ریچھ بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے تھے۔ ہمالیہ کے ریچھ دوسرے ریچھوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ وہ شیر وغیرہ کی پروا نہیں کرتے اور بعض اوقات اس کی موجودگی ہی میں اس کے شکار پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہ خطرہ بہرحال موجود تھا کہ رات کو اگر کوئی ریچھ اس طرف نکل آیا تو میری اب تک کی ساری محنت رائگاں جائے گی۔ اس لیے میں نے آج ہی رات یہاں گھات لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

درخت کے تنے پر چھوٹے چھوٹے کانٹے بھی تھے۔ میں کانٹوں سے بچتا ہوا درخت پر چڑھ کر ایک محفوظ جگہ پر بیٹھ گیا۔ بدری پرشاد نے رائفل میرے حوالے کر دی اور اگلے روز صبح سویرے آنے کا وعدہ کر کے وہ تینوں رخصت ہو گئے۔

میرا رُخ سامنے والی پہاڑی کی طرف تھا اور پچھلی طرف نالا تھا۔ سامنے پہاڑی کی طرف آنے والا کوئی بھی جانور مجھے آسانی سے دیکھ سکتا تھا لیکن اگر وہ آدم خور نالے کی طرف سے آئے تو میں اس کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا تاآنکہ وہ بھینسے کی اَدھ کھائی لاش تک پہنچ جاتا اور مجھے اس پر گولی چلانے کا موقع مل جاتا۔

سفید بھینسا دائیں پہلو پر اس طرح پڑا تھا کہ اس کی ٹانگیں میری طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے اور بھینسے کے درمیان تقریباً پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں تقریباً چار بجے درخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد نالے کی طرف سے تقریباً دو سو گز دُور ایک کاکار کی آواز سنائی دی۔ کاکار ہرن کی نسل کا جانور ہے جس کی آواز کتے کے بھونکنے سے مشابہ ہوتی ہے۔

اس آواز کو سنتے ہی میں سمجھ گیا کہ شیر جنگل میں کسی جگہ متحرک ہے اور کاکار نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اور وہ غالباً ایک ہی جگہ پر کھڑا منہ سے خوف زدہ سی آوازیں نکال رہا تھا۔ لیکن پھر شاید وہ وہاں سے دُور ہٹتا چلا گیا کیونکہ وہ آواز بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی تھی۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ آدم خور شیر اپنے شکار کے قرب و جوار میں کسی جگہ پہنچ چکا تھا اور زمین پر لیٹا وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ آدم خور شیر بہت زیادہ حساس اور عقل مند ہوتا ہے۔ دوسری مرتبہ شکار کے پاس آنے سے پہلے وہ اس بات کا اطمینان کر لیتا ہے کہ اسے آگے

IMPORTED FROM GERMANY

MADAUS

جرمنی سے درآمد شُدہ ہومیوپیتھک ادویات

ڈاکٹر میڈاس (جرمنی) کے ایم نمبرز

ہومیوپیتھک میں معیاری ادویات کے استعمال ہی سے کامیاب علاج ممکن ہے

M 1	نوجوانوں میں کمزوری کے لیے	M 26	پھوڑے، پھنسیاں، کان کا متواتر بہنا
M 2	بواسیر بادی و خونی، فسٹولا، دائمی قبض	M 27	ورم گردہ، گردوں کے فعل کی خرابی کے لیے
M 3	عورتوں میں دُودھ کی کمی	M 28	حافظہ کمزور، ذہنی تھکاوٹ، نزلہ زکام کے لیے
M 4	عورتوں میں ہسٹریا کی کیفیت، چڑچڑاپن	M 29	گٹھیا، جوڑوں کے وَرم کے لیے
M 5	دَورانِ حمل متلی وقے، دورانِ سفر متلی کے لیے	M 30	دَمہ، سانس کی نالیوں میں تشنج کے لیے
M 6	معدہ کے السر، تیزابیت کے لیے	M 31	دردِ قولنج، کھٹی ڈکاروں کے لیے
M 7	شدید بخار، پوشیدہ چوٹوں کے لیے	M 32	مسوڑھوں کا گلنا، منہ کے چھالوں کے لیے
M 8	بانجھ عورتوں کے لیے ٹانک	M 33	ذیابیطس، پیشاب، خون میں شکر، کیل مہاسے
M 9	شدید بدہضمی، مروڑ، اینٹھن	M 34	بدہضمی، اجابت ناکافی اور نامکمل
M 10	گردے و مثانے کی پتھری، شدید دَرد کے لیے	M 35	مرگی، تشنج، دَورے کے لیے
M 11	قد بڑھانے اور ہڈیوں کی نشوونما کے لیے	M 36	پروسٹیٹ غدود کی سوزش، گلینڈ کا بڑھنا
M 12	عضلات کی کمزوری، وزن کا گرنا	M 37	دَردِ عرق النسار، پٹھوں میں دَرد کے لیے
M 13	بانجھ پن، عورتوں میں ہارمونز کی کمی کے لیے	M 38	کمزوری، اولاد نہ ہونا، مردوں کے لیے مخصوص
M 14	اسہال، پیچش، ملیریا بخار کے دَوران	M 39	حسّاس عورتوں کے لیے بہترین ٹانک
M 15	یرقان، جگر اور پتے کی خرابی کے لیے	M 40	اِلرجی سے نزلہ چھینکیں، پرانا نزلہ
M 16	ایام میں بے قاعدگی، سن یاس کے عوارض	M 41	بھوک کی کمی، گیس کی بیماری کے لیے
M 17	لو بلڈ پریشر، چکر اور سر دَرد کے لیے	M 42	جوڑوں کا دَرد، پتی اچھلنا، یورک ایسڈ کی زیادتی
M 18	دل کا ٹانک، قلب میں گھٹن	M 43	مثانے کی کمزوری، بار بار پیشاب آنا، بول بستری
M 19	میگرین، آدھا سیسی کا دَرد	M 44	ہائی بلڈ پریشر، خون میں پلیٹلیٹس کی کمی
M 20	لیکوریا کے لیے	M 45	خشک اور خارش والا ایگزیما۔ پرانا زخم
M 21	قوتِ مدافعت بڑھانے اور عفونت کے لیے	M 46	پرانی کھانسی، کالی کھانسی
M 22	انفلوئنزا، کھانسی اور بلغم کے اخراج کے لیے	M 47	ایگزیما، پیپ دار کھال کے درمیان ہو
M 23	وزن کم کرنے کے لیے	M 48	آشوبِ چشم، نظر کی کمزوری کے لیے
M 24	خون کی کمی، بچوں میں بھوک کے لیے	M 49	میگرین، اعصابی درد، چہرے کے درد کے لیے
M 25	تکلیف دہ ماہواری، بے چینی کے لیے	M 50	مسّہ، گومڑ، ناک کے گومڑ کے لیے

ہائی بلڈ پریشر، انجائنا، دردِ قلب کے لیے AUROCARD® ایک نہایت مؤثر دل کا ٹانک DIACARD GOLD DROPS®

ہومیو اسٹورز سے ہمیشہ جرمنی سے درآمد شدہ ادویات ہی پر اصرار کریں

ڈاکٹر میڈاس جرمنی کی مندرجہ بالا ادویات کے متعلق تفصیلی معلومات کیلئے ڈاکٹر میڈاس کا مکمل کتابچہ ملک بھر میں کسی بھی ہومیو اسٹور سے مُفت طلب کیا جاسکتا ہے۔ کتابچہ میں مرض کی علامات اور علاج کیلئے ادویات کے استعمال سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔

ملک بھر کے تمام ہومیوپیتھک اسٹورز پر دستیاب ہے

بڑھنے میں کوئی خطرہ تو نہیں۔ کوئی شکاری اس کے انتظار میں گھات لگائے تو نہیں بیٹھا۔

وقت گزرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میری کوئی معمولی سی حرکت آدم خور کو ہوشیار کر سکتی تھی۔

سورج ڈھل گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ سامنے والی پہاڑی پر درختوں کے ہیولے بھی بتدریج تاریکی میں مدغم ہوتے چلے گئے۔

تاریکی میں بھینسے کی لاش ایک ہلکے سے سفید دھبے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اگر بھینسے کا رنگ سیاہ یا براؤن ہوتا تو میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دفعتاً کڑک کی ہلکی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ کوئی چھوٹی سی خشک شاخ چٹخنے کی یہ آواز میرے عقب میں نالے کی طرف سے آئی تھی اور پھر دبے دبے قدموں کی بہت ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ آدم خور بہت ہی محتاط تھا اور کسی قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اور بالآخر وہ آواز درخت کے عین نیچے رک گئی۔ کئی لمحات خاموشی میں گزر گئے۔ سناٹا میرے اعصاب کو متاثر کرنے لگا تھا اور پھر خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ وہ آدم خور ٹنڈ مُنڈ درخت کے تنے کے قریب بکھرے ہوئے خشک پتوں پر لیٹ گیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ میری کوئی بہت معمولی سی حرکت بھی آدم خور کو ہوشیار کر سکتی تھی۔ شام ہونے سے کچھ پہلے آسمان پر بادل جمع ہونے شروع ہو گئے تھے اور اس وقت پورے آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

پتوں کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ آدم خور بھینسے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں آواز کی حرکت پر اس طرف دیکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن گہری تاریکی میں نہ تو آدم خور دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی بھینسا۔

چپ چپ کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ شیر نے اپنے شکار پر منہ مارنا شروع کر دیا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس نے گوشت کھانے سے پہلے بھینسے کو گھسیٹ کر کہیں اور لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مجھے جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے درمیان اگرچہ فاصلہ بہت کم تھا لیکن شیر مجھے اس وقت تک نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک میری طرف سے کوئی حرکت نہ ہوتی یا آواز اسے متوجہ نہ کرتی۔

اس درخت پر ڈیرہ جمانے سے پہلے ہی مجھے شبہ تھا کہ آدم خور اندھیرا پھیلنے سے پہلے نہیں آئے گا۔ اور میرا خیال تھا کہ میں ستاروں کی روشنی میں آسانی سے اس کا نشانہ لے سکوں گا لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے چھا جانے والی تاریکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اب مجھے آنکھوں کے بجائے اپنے کانوں پر بھروسا کرنا تھا۔

میں نے بڑی احتیاط سے رائفل سیدھی کر کے گھٹنے پر ٹکائی اور آواز پر نشانہ لینے لگا۔ میں نے دایاں کان اس طرف کر کے ایک بار پھر پوری توجہ سے شیر کے منہ چلانے کی آواز کو سُنا تو اندازہ ہوا کہ رائفل کا رخ کسی قدر اوپر تھا۔ میں نے نال کو ذرا سا نیچے کی طرف جھکایا اور ایک بار پھر گردن گھما کر آواز سننے لگا۔

دو تین مرتبہ ایسا کرنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ رائفل کا رخ ٹھیک آواز کی سمت تھا اور پھر نال کو ذرا سا دائیں طرف حرکت دیتے ہوئے میں نے ٹریگر دبا دیا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی پتوں اور خشک جھاڑیوں کی پُر شور آواز سنائی دی۔ ایک تاریک ہیولہ اچھلتا ہوا نظر آیا، وہ آدم خور شیر تھا۔ جو دو ہی چھلانگوں میں نالے کے [illegible] کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ اس کنارے سے آگے کچھ ہموار [illegible] تھی جس کے پرلی طرف گہرا عمودی کھڈ تھا۔ ہموار جگہ پر [illegible] پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز کچھ دیر سنائی دیتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اس خاموشی سے صرف دو ہی نتیجے اخذ کیے جا سکتے تھے۔ وہ شیر یا تو مر چکا تھا یا میری گولی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ میں رائفل سنبھالے کسی آواز کا منتظر رہا۔ تین چار منٹ تک کوئی آواز سنائی نہیں دی تو میں نے رائفل نیچے کر لی۔ ادھر میرے منہ سے گہرا سانس نکلا اور ادھر نالے کے اونچے کنارے کی طرف سے شیر کی خوفناک دہاڑ سنائی دی۔ میں نے ایک اور گہرا سانس لیا۔ شیر نہ صرف زندہ تھا بلکہ مجھے اس نے دیکھ بھی لیا تھا۔

میں اس ٹنڈ مُنڈ درخت کی جس شاخ پر بیٹھا ہوا تھا، وہ اگرچہ زمین سے دس فٹ اوپر تھی مگر یہ شاخ میرے بوجھ سے جھک کر تقریباً دو فٹ نیچے آگئی تھی اس طرح زمین سے میرا فاصلہ صرف آٹھ فٹ رہ گیا تھا۔ مزید برآں میرے پیر مزید نیچے لٹکے ہوئے تھے اور مجھ سے ذرا اوپر تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر وہ آدم خور شیر شدید غصے میں دہاڑ اور غرا رہا تھا جس پر چند منٹ پہلے میں نے گولی چلائی تھی۔

[illegible] کا نام ہی خوف و دہشت کی علامت ہے۔ دن کے وقت [illegible] آپ کو نہ ہی دیکھا ہو لیکن اس کی ایک جھلک [illegible] انسان کی گھگھی بندھ جاتی ہے اور رگوں میں خون کی [illegible] ہو جاتی ہے... اور میں تو اس وقت خطرناک ترین [illegible] سے دو چار تھا۔ اندھیری رات، دس بجے کا وقت [illegible] آدم خور شیر مجھے دیکھ کر غرا رہا تھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے [illegible] اس وقت میری کیفیت کیا ہوگی؟

[illegible] شیر کی فطرت سے بڑی حد تک واقف تھا۔ شیر کسی [illegible] جانور پر اس وقت حملہ کرتا ہے جب اسے اشتعال دلایا [illegible] اسے بھوک لگی ہو۔ وہ شیر اس وقت اشتعال میں تو تھا [illegible] بہرحال یہ اطمینان تھا کہ وہ ایک جانور کو پہلے ہی شکار [illegible] تھا۔ اس نے اس وقت اس کا کچھ گوشت کھا بھی لیا تھا [illegible] دو تین دن تک اسے شکار کی ضرورت نہیں تھی لیکن [illegible] کی غرائیں سن کر مجھے شبہ تھا کہ شاید وہ ان اصولوں کی [illegible] اور مجھ پر حملہ کر دے لیکن دوسری طرف مجھے یہ [illegible] اطمینان تھا کہ جب تک میں درخت پر بیٹھا رہوں گا، اس [illegible]

[illegible] اس وقت سگریٹ کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا۔ [illegible] سوچتے ہوئے میں نے سگریٹ کیس میں سے [illegible] سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور اسے سلگانے کے لیے [illegible] دیا سلائی جلائی، شیر ہولے ہولے غراتا ہوا دوسری [illegible] چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا لیکن [illegible] لیے اس کی خوفناک دہاڑ سن کر میں کانپ اٹھا۔ وہ کم [illegible] واپس آگیا تھا۔

[illegible] تین سگریٹ پی چکا تھا۔ آدم خور ابھی تک میری [illegible] کر رہا تھا۔ وہ کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی ٹہلتے ہوئے غرانے [illegible]

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ شام کے وقت [illegible] گہرے بادل چھا گئے تھے اور اب موٹی موٹی بوندیں [illegible] لگی تھیں۔ پہلے تو ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی اور پھر تیز [illegible] شروع ہو گئی۔ میرے جسم پر پینٹ اور ہلکی سی قمیص تھی۔ [illegible] چند سیکنڈ میں ہی میرے جسم پر پانی کی دھاریں بہنے [illegible] شیر کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ بارش شروع [illegible] کسی محفوظ جگہ پر چلا گیا ہوگا۔

[illegible] رات گیارہ بجے شروع ہو کر صبح چار بجے بند ہوئی [illegible] رات بھر تیز بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ بارش بند ہوتے [illegible] صاف ہو گیا، تیز اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ مجھے یوں [illegible] خون میری رگوں میں منجمد ہوا جا رہا ہو۔

قیامت خیز رات بیت گئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ آدم خور شیر تو مجھے کہیں نظر نہیں آیا البتہ بدری پرشاد ایک آدمی کے ساتھ آتا ہوا نظر آگیا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی تھی۔

پہلے میں نے اپنی رائفل بدری پرشاد کو تھمادی۔ اور پھر درخت سے اترنے کے لیے نیچے لٹکا تو بدری پرشاد اور دوسرے آدمی نے مجھے سنبھال لیا اور سہارا دے کر درخت سے اتار لیا۔

میری ٹانگیں بالکل اکڑی ہوئی تھیں۔ رگوں میں خون کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ بدری پرشاد نے مجھے سہارا دے کر لٹا دیا۔ پہلے مجھے کپ میں چائے انڈیل کر دی اور پھر وہ دونوں میری ٹانگوں کی مالش کرنے لگے۔ مالش سود مند ثابت ہوئی۔ رگوں میں خون کی گردش بحال ہونے لگی۔ اس طرح بہت دیر بعد میں اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکا تھا۔ بدری پرشاد نے اپنے آدمی کو گیسٹ ہاؤس کی طرف بھیج دیا تھا تاکہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ آتش دان میں آگ روشن کر سکے۔

میں نے اس سے پہلے کبھی آواز پر نشانہ نہیں لگایا تھا۔ یہ میرا پہلا تجربہ تھا؟ خاصا دلچسپ ثابت ہوا۔ اگر میں رائفل کی نال کو ذرا سا اور دائیں طرف کر لیتا تو شیر کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ میں نے گوشت کھانے کی چپڑ چپڑ کی آواز پر نشانہ لگایا تھا اور گولی وہاں سے صرف چھ انچ کے فاصلے پر بھینسے کے جسم میں لگی تھی جہاں سے شیر گوشت کھا رہا تھا۔

گرم گرم چائے کے دو کپ اور تقریباً نصف میل تک پیدل چلنا میرے لیے خاصا سود مند ثابت ہوا تھا۔ کپڑے بھیگے ہوئے ہونے کی وجہ سے صرف سردی کا ہلکا سا احساس تھا لیکن بہرحال میں اپنے آپ کو خاصا بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اس علاقے کی مٹی سرخ تھی۔ سیبوں کے باغ کے اوپر سے گھوم کر واپس جاتے ہوئے کیچڑ میں مجھے بدری پرشاد اور اس کے ساتھی کے اوپر کی طرف جاتے ہوئے قدموں کے نشان دکھائی دیے جبکہ ایک آدمی کے قدموں کے نشان واپسی کی نشاندہی کر رہے تھے۔ یہ اس آدمی کے قدموں کے نشان تھے جسے بدری پرشاد نے گیسٹ ہاؤس کی طرف واپس بھیجا تھا۔

تقریباً پچاس گز آگے جا کر میں ٹھٹک گیا۔ یہاں واپس جاتے ہوئے آدمی کے قدموں کے ساتھ شیر کے پنجوں کے مخصوص نشان بھی تھے۔ ان کا رُخ بھی اس طرف تھا جس طرف بدری کا آدمی گیا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے بدری کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔ اگر اس کا آدمی بروقت

کسی محفوظ جگہ پر نہیں پہنچا تھا تو اب ہم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔

کیچڑ میں ہمارے پیر پھسل رہے تھے اور ہم ہر ممکن تیز رفتاری سے چلتے رہے۔ اور بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے کافی آگے تک کا علاقہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اور یہاں زمین پر قدموں کے نشان دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شیر کے پنجوں کے نشان پگڈنڈی سے نیچے جنگل کی طرف مڑگئے تھے جبکہ آدمی کے قدموں کے نشان سیدھے چلے گئے تھے۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر میں نے بدری پرشاد کے آدمی سے شیر کے بارے میں پوچھا تو اس نے نفی میں سرہلادیا۔ اور جب اسے یہ بتایا گیا کہ شیر اس کا پیچھا کر رہا تھا تو اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

○☆○

آتش دان کے سامنے کرسی پر بیٹھے چائے پیتے اور اپنے جسم کے کپڑے سکھاتے ہوئے میں بدری پرشاد سے اس جنگل کے بارے میں دریافت کر رہا تھا جس طرف وہ شیرنی گئی تھی۔

بدری کے کہنے کے مطابق وہ راستہ جس پر شیرنی گئی تھی بتدریج ڈھلان کی طرف جاتے ہوئے ایک کھاڑی سے مل جاتا تھا اور گنجان جھاڑیوں اور درختوں سے اَٹی ہوئی یہ کھاڑی ایک عمودی چٹان کے سامنے جاکر ختم ہوجاتی تھی۔ پہاڑی کے دامن میں ایک کشادہ ندی اور اس کے ساتھ ایسی کھلی جگہ تھی جہاں سے کھاڑی پر پوری طرح نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ بدری پرشاد کا خیال تھا کہ شیرنی اس کھاڑی کی طرف گئی ہوگی جہاں وہ آرام سے لیٹ کر پورا دن گزار سکتی ہے۔

مجھے بدری کے اس خیال سے پورا اتفاق تھا۔ اپنے شکار سے دُور بھاگنے کے بعد وہ شیرنی کسی ایسی ہی جگہ پر پناہ لے سکتی تھی جہاں اسے کوئی خطرہ نہ ہو۔ لیکن میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

بدری پرشاد نے اپنے مالی گووند سنگھ کو بلالیا اور تجویز اس کے سامنے رکھی۔

”ٹھیک ہے صاحب جی!“ گووند میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”مجھے دوپہر تک کا وقت دیں۔ میں پچیس تیس آدمی جمع کرلوں گا۔“

میں ڈاک بنگلے میں واپس آگیا۔ سب سے پہلے کپڑے بدلے پھر رائفل صاف کی اور پھر ڈاک بنگلے سے نکل کر سیبوں والے باغ کا ایک چکر لگا کر بدری پرشاد کے گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔ بدری اس وقت کھانا کھانے کے لیے بیٹھا ہی تھا میں بھی اس کے ساتھ شامل ہوگیا۔

دوپہر کے وقت گووند بھی تیس آدمیوں کی پارٹی لے کر پہنچ گیا۔ پروگرام کے مطابق میں اکیلا ہی شکارگاہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ گووند اور اس کے آدمیوں کو ایک گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ اور اس ایک گھنٹے کے دوران میں مجھے اپنے طور پر آدم خود کو تلاش کرنا تھا۔ فائر کی آواز سن کر وہ سمجھ جاتے کہ میرا آدم خور سے ٹاکرا ہوگیا ہے۔ بصورت دیگر میں ندی کے قریب پوزیشن لے کر بیٹھ جاتا۔

پروگرام کے مطابق گووند کو اپنے آدمیوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کرنا تھا۔ میری روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد دونوں پارٹیاں جنگل میں داخل ہوکر شوروغل مچاتی ہوئی دو مختلف اطراف سے کھاڑی کی طرف بڑھتی رہتیں۔ شکاریوں کی اصطلاح میں شکار کو گھیرنے کے اس طریقے کو ہانکا کہا جاتا ہے۔ اور قوی امید تھی کہ اس طرح وہ آدم خور شیرنی بھی اپنی پناہ گاہ سے نکل آئے گی۔

میں اسی راستے پر چلتا رہا جس پر صبح شیرنی کے نشان دیکھے تھے۔ اس راستے کا اختتام ایک ایسے خطے پر ہوا جہاں آگے گنجان اور قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ میں ان جھاڑیوں میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ کئی سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں رُک گیا۔ آگے پہاڑی میں لاتعداد کٹاؤ تھے۔ میں مزید آگے بڑھتا رہا اور بالآخر ایک بار پھر رُک جانا پڑا۔ یہ کھاڑی کا کنارہ تھا۔ اس سے آگے عمودی کٹاؤ اور گہرا کھڈ تھا جہاں ندی اور اس کے اطراف میں اونچے درخت نظر آرہے تھے۔

میں کھاڑی کے کنارے پر کھڑا کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھراُدھر دیکھ رہا تھا کہ چند گز دائیں طرف مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سن کر میں اس طرف بڑھ گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ جھاڑیوں میں ایک گائے کا ڈھانچا پڑا ہوا تھا جس پر لاکھوں کی تعداد میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ یہ گائے تقریباً ایک ہفتہ پہلے شیرنی کے ہاتھوں ہلاک ہوئی تھی۔

گائے کے ڈھانچے پر گوشت برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ اس کے کٹے ہوئے نرخرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ گائے بلاشبہ کسی شیر ہی کا شکار ہوئی تھی۔

میں کچھ دیر اِدھراُدھر دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر گائے کے ڈھانچے کو کھڈ میں دھکیل دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں میرے ارادے کو بھی کوئی دخل نہیں تھا۔

گائے کا ڈھانچا ندی سے تقریباً پچاس فٹ اوپر چٹان سے باہر کو نکلے ہوئے ایک بہت بڑے پتھر پر گرا۔ میں بھی کچھ دیر تک راستے کی تلاش میں اِدھراُدھر پھرتا رہا۔ بالآخر ایک تنگ

...ل گئی اور میں تقریباً تین سو گز کا فاصلہ طے کر کے ...گیا۔

...اوپر جھاڑیوں والے خطے سے بالکل مختلف تھی۔ ...گنجان درخت تھے اور شیرنی میری نظروں میں آئے بغیر ...اسی وقت کسی طرف سے نکل کر میرے اوپر حملہ کرسکتی تھی۔

میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھراُدھر دیکھ رہا تھا کہ ...دائیں طرف بہت دُور سے شور کی آواز سن کر چونک گیا۔ ہانکا ...شروع ہوچکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہانکا کرنے والے چیختے چلاتے دائیں طرف ...پہاڑی سے نیچے اترتے نظر آئے۔ وہ پہاڑی کے دامن میں ...تو میں نے چیخ کر کہا کہ وہ ہانکا بند کردیں اور میرے پاس ...آجائیں۔ اس ہانکے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی ...توقعات ہی غلط ہوئی تھیں۔

وہ تمام آدمی زمین پر بیٹھے اپنے ہاتھوں، پیروں میں ...چبھے کانٹے نکالتے ہوئے اونچی آواز میں باتیں کر رہے ...تھے۔ ان میں تین چار تو ایسے تھے جو بڑی بے تکلفی سے میرے ...سگریٹ پھونک رہے تھے۔ میں گووند کے ساتھ ایک طرف کھڑا ...انتظار کر رہا تھا۔

گووند باتیں کرتے کرتے اچانک ہی خاموش ہوگیا۔ اس کے ...چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے اور وہ پلک جھپکے بغیر ...میرے کندھوں کے اوپر میرے پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس ...کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی ...کہ میرے عقب میں کسی غیر معمولی چیز نے اس کی توجہ اپنی ...طرف مبذول کرالی ہے۔

میں تیزی سے پیچھے گھوم گیا اور اس طرف دیکھنے لگا۔ اس ...کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

ندی کے دوسری طرف تقریباً چار سو گز کے فاصلے پر وہ ...شیرنی بڑے اطمینان سے ایک پگڈنڈی پر ٹہلتی ہوئی ہماری ...طرف آرہی تھی۔

ندی سے شیرنی کا فاصلہ تقریباً تین سو گز تھا۔ جس میں ...سو گز کا ٹکڑا ایسا تھا جو چٹیل میدان کی طرح صاف تھا۔ وہاں نہ ...کوئی درخت تھا اور نہ ہی جھاڑیاں تھیں۔

ہماری کسی معمولی سی حرکت سے بھی وہ ہماری طرف متوجہ ...ہوسکتی تھی۔ میں نے تمام آدمیوں کو اشارہ کیا کہ کوئی بھی اپنی ...جگہ سے حرکت نہ کرے۔ اور خود بھی بے حس و حرکت کھڑے ...رہ کر شیرنی کی طرف دیکھتا رہا۔ شیرنی بہت ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ...ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں کبھی

سُود

شاید انسانیت نے نامعلوم تاریخ میں ناموافق حالات میں ایک دوسرے کی اناج سے مدد کی تھی اور اچھے حالات میں لیے گئے اناج کے بدلے میں زیادہ اناج کی توقع کی تھی۔ معلومہ تاریخ میں سب سے پرانی سُود کی شرائط ہمیں بابل کی تاریخ سے ملتی ہیں۔ اس وقت کے بابل کے بادشاہ ہمورابی HAMMURABI (1686-1728 قبل مسیح) نے دوسو بیاسی نکات کا سُودی قانون بابل کی دیواروں پر کندہ کروایا تھا۔

اس قانون کی تاریخی نوعیت یہ تھی کہ لوگوں پر قرضہ چڑھتا جاتا تھا اور بدلے میں لوگوں کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ بادشاہ ہمورابی نے غلام بنانے والا قانون تو ختم نہیں کیا مگر سُودی قانون بنا کر اس قانون کو دوسرے سے علیحدہ کردیا اور قرضے کے طور پر لیے گئے اناج اور دوسری اشیا پر سُود کا نظام قائم کردیا۔ مثال کے طور پر گندم پر ۳۳ $\frac{1}{3}$ پرسنٹ۔ چاندی پر ۲۰ پرسنٹ علاوہ ازیں اگر قرضہ لینے والا تین سال کے اندراندر یہ قرضہ مع سُود کے واپس کردیتا تو ٹھیک ورنہ وہ اگلے تین سال کے لیے غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا۔

آج کی انسانیت میں یہ بابل کا قانون دیکھا جائے تو ہمارے اردگرد ابھی بھی لاگو ہے؟

محمد یونس بلوچ، جرمنی

کسی شیر یا شیرنی کو اس قدر سست روی سے چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

مکتیسار کے لوگ کہتے تھے کہ وہ آدم خور شیرنی لنگڑی تھی۔ لیکن میں نے اس کی چال میں معمولی سی لنگڑاہٹ بھی محسوس نہیں کی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی محسوس ہورہی تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شیرنی کو ندی تک آنے کا موقع دیا جائے اور جیسے ہی میرے اور اس کے درمیان کوئی رکاوٹ آئے، میں

تیزی سے آگے بڑھ کر اس پر گولی چلادوں۔ اگر اسے نشانہ بنانے میں کامیاب نہ بھی ہو سکا تو اسے ندی پار کرنے سے تو روک ہی دوں گا۔

شیرنی ست روی سے آگے بڑھتی رہی اور بد قسمتی سے راستے میں ایسی کوئی رکاوٹ نہیں آئی جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا۔ اور شیرنی ندی کے دوسرے کنارے کے قریب جھاڑیوں میں داخل ہو گئی۔

جھاڑیاں خاصی اونچی تھیں۔ ان میں داخل ہونے کے بعد شیرنی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے تمام آدمیوں کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور پہاڑی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس طرف بھی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ میں ان کے درمیان پگڈنڈی پر دوڑتا ہوا پہاڑی کے پاس پہنچ گیا اور ایک تنگ سی سرنگ دیکھ کر بلا سوچے سمجھے اس میں گھستا چلا گیا۔

سرنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے دوسری طرف کے دہانے سے روشنی نظر آرہی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ شیرنی کس طرف جارہی تھی اور اس سرنگ کا دوسرا دہانہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں شیرنی سے پہلے ہی اس جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔

سرنگ کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میرا ہیٹ چھت سے ٹکرا کر گر گیا مگر میں اس کی پروا کیے بغیر جھک کر تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔

اور بالآخر میں کھلی جگہ پر نکل آیا اور متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے گائے کے ڈھانچے کو اوپر سے دھکیلا تھا لیکن وہ ڈھانچا مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔

میں سرنگ کے دہانے پر جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے آگے کھلی جگہ تھی اور لاتعداد جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں صورت حال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ہڈی چبائے جانے کی آواز سُن کر چونک گیا۔ شیرنی مجھ سے پہلے ہی اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں میں نے گائے کا ڈھانچا گرایا تھا۔ وہ اسی ڈھانچے پر بچا کھچا گوشت کھا کر اپنی بھوک مٹا رہی تھی۔

میں جھاڑیوں اور پتھروں کی آڑ لیتا ہوا مزید آگے بڑھ گیا۔ چٹان کا باہر کو نکلا ہوا وہ بہت لمبا چوڑا پتھر اس زمین سے جڑا ہوا تھا جہاں میں کھڑا تھا۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ گائے کے ڈھانچے پر گوشت بہت کم تھا۔ اسے کھانے کے بعد اگر شیرنی میری طرف آئی تو راستے میں کھلی جگہ پر مجھے اس پر گولی چلانے کا موقع مل سکتا تھا لیکن اگر وہ پہاڑی پر چڑھ گئی تو میری نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی تھی۔

میں جس جگہ پر کھڑا تھا وہاں ہڈیاں چبانے اور گوشت کھانے کی چڑ چڑ کی آواز تو سن سکتا تھا مگر شیرنی مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ اس طرف سے آنے والی تقریباً ایک گز چوڑی پگڈنڈی میرے قریب سے گزرتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ اس پگڈنڈی کے دوسری طرف اس چٹان نما پتھر کا وہ کنارہ تھا جس کے دوسری طرف تقریباً پچاس فٹ نیچے ندی بہہ رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ ایک پتھر پھینک کر شیرنی کو کھلی جگہ پر آنے پر مجبور کیا جائے۔ میں پتھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ اپنے عقب میں آہٹ سن کر اچھل پڑا۔ میں تیزی سے پیچھے گھوما اور گووند کو دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

گووند میرا ہیٹ لیے کھڑا تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں رہنے والا یا باہر سے آنے والا کوئی بھی یورپین ہیٹ کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ ہیٹ سر پر ہو تو ہر چند قدم کے بعد کسی نہ کسی طرف سے "صاحب سلام۔ نمسکار صاحب جی" کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ ہیٹ کی شان ہی کچھ نرالی تھی۔

گووند اس تنگ سی سرنگ میں سے ہوتا ہوا آیا تھا اور راستے میں میرا ہیٹ پڑے دیکھ کر اُٹھا لیا تھا۔ میں نے ہیٹ لے کر اپنے سر پر رکھ لیا اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر گووند کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

پہاڑی میں ایک چھوٹی سی کھوہ تھی جیسے کوئی بڑا پتھر کھود کر اس جگہ سے نکالا گیا ہو۔ میں نے گووند کو بانہوں سے پکڑ کر اس کھوہ میں بٹھا دیا۔ گووند اس کھوہ میں اس طرح فٹ ہو گیا جیسے یہ جگہ اس کے لیے بنائی گئی ہو۔ اس کے گھٹنے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ٹھوڑی گھٹنوں کو چھو رہی تھی۔ دوسری طرف سے ہڈیاں چبانے کی آواز سن کر گووند کے چہرے پر دہشت سی پھیلتی جارہی تھی۔ اس وقت گووند کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔

گووند کو اس کھوہ میں فٹ کرنے کے بعد میں ایک بار پھر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ چڑ چڑ کی آواز رُک گئی تھی۔ شیرنی کو غالباً ایک ہفتے کا باسی گوشت پسند نہیں آیا تھا۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ میں تمام تر توجہ اس طرف مبذول کیے ہوئے تھا۔ دفعتاً خشک جھاڑیوں کی چرچراہٹ کی ہلکی سی آواز سے سکوت ٹوٹ گیا۔ اور پھر وہ شیرنی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔

میرا شبہ درست نکلا۔ وہ میری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں پہاڑی پر چڑھ رہی تھی۔ اس طرف چھوٹی

چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور وہ شیرنی ان جھاڑیوں میں ٹہلتی ہوئی اوپر جارہی تھی۔ میں نے رائفل سیدھی کرلی۔ اگر گولی راستے میں گنجان جھاڑیوں میں الجھ کر دم نہ توڑ دیتا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فائر کر دیا۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی شیرنی بڑی تیزی سے گھومی اور نیچے آتی ہوئی پگڈنڈی پر میری طرف آنے لگی۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ میری گولی اس کے سر سے ٹکرا کر جھاڑیوں میں لگی تھی اور یہ کہ وہ شیرنی ایک آنکھ سے اندھی تھی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ فائر کی آواز سے خوف زدہ ہو کر بھاگی تھی۔ اس جگہ پہاڑیوں میں فائر کی آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور کسی کے لیے یہ اندازہ دشوار تھا کہ گولی کس طرف سے چلی تھی۔ ڈر کے مارے وہ جس طرف منہ اٹھا تھا، اسی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا کہ شیرنی میری گولی سے زخمی ہو گئی تھی اور اب مجھ پر حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپکی تھی۔

میرے اور آدم خور شیرنی کے درمیان دو گز کا فاصلہ رہ گیا تھا اور خوش قسمتی سے اس دوران میں مجھے رائفل میں دوسری گولی لوڈ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں تیزی سے آگے جھکا اور ٹریگر دبا دیا۔

گولی گردن کے قریب اس کے کندھے پر لگی۔ اعشاریہ چار سو پچاس بور ڈبل بیرل کی حامل گولی کا جھٹکا اس قدر شدید تھا کہ شیرنی اپنی جگہ سے کئی فٹ اوپر اچھلی۔ اس کا پنجہ میرے بائیں کندھے کے قریب سے گزر گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں چٹان کے کنارے سے اچھل کر پچاس فٹ نیچے ندی میں جا گری۔

چھپاکے کی زوردار آواز سن کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑتا ہوا چٹان کے کنارے پر پہنچ گیا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔ وہ آدم خور شیرنی پانی میں پڑی تھی اور ندی کا پانی اس کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

○☆○

گووند ابھی تک چٹان کی اس تنگ سی کھوہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے اشارہ کیا تو وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کھوہ میں سے نکال کر میری طرف آیا۔ چٹان کے کنارے پر جھک کر اس نے مردہ شیرنی کو دیکھا اور ہنکارا کرنے والے اپنے آدمیوں کو مژدہ سنانے کے لیے چیخنے لگا۔

"شیرنی مرگئی۔ صاحب نے شیرنی کو مار دیا۔"

گووند کی آواز سن کر ہنکارا کرنے والے بھی خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔ بدری نے بھی اپنے گیسٹ ہاؤس میں یہ آوازیں سن لیں۔ اس سے پہلے اس نے فائر کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ وہ سمجھ گیا کہ آدم خور شیرنی کا قصہ تمام ہو چکا ہے۔ اس نے بھی اپنی شاٹ گن سے دس فائر کر کے خوشی کا اظہار کیا۔

گولیاں چلنے کی آوازیں مکتیسار اور آس پاس کی بستیوں میں بھی سنی گئیں۔ وہ سمجھ گئے کہ انہیں آدم خور شیرنی سے نجات مل چکی ہے۔ لوگ بستیوں سے نکل کر ٹولیوں کی صورت میں ندی کے پاس جمع ہونے لگے۔

کئی آدمیوں نے ندی میں اتر کر شیرنی کی لاش باہر نکالی۔ دو آدمیوں نے ایک درخت سے موٹی سی شاخ توڑلی تھی۔ شیرنی کے پیروں میں رسّی ڈال کر اسے اس ڈنڈے سے باندھ دیا گیا۔ کئی آدمی کہاروں کی طرح شیرنی کی ڈولی اٹھا کر بدری پرشاد کے سیبوں والے باغ کی طرف روانہ ہو گئے اور میں ایک کپ چائے پینے کے لیے بدری کے گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔

ایک گھنٹے بعد میں باغ میں واپس آگیا۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ درجنوں لوگ وہاں جمع تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں لالٹینیں تھیں۔ میں لالٹینوں کی روشنی میں شیرنی کی کھال اتارنے لگا اور اس وقت یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ وہ آدم خور شیرنی ایک آنکھ سے نابینا تھی اور اس کی دائیں ٹانگ میں خارپشت کے پچاس کے لگ بھگ کانٹے پیوست تھے۔

رات دس بجے کے قریب میرا کام ختم ہو گیا اور میں بہت سے لوگوں کے ہجوم میں چلتا ہوا مکتیسار آگیا۔ شیرنی کی کھال پوسٹ آفس کے سامنے کھلی جگہ پر بچھا دی گئی۔ بستی کے لوگ، جن میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی، کھال کو دیکھنے کے لیے اُمڈے پڑ رہے تھے۔

آدھی رات کے قریب میں ڈاک بنگلے میں آگیا۔ مجھے سونے کے لیے صرف چند گھنٹے ہی مل سکے تھے۔ صبح سویرے ہی میں نینی تال کے لیے روانہ ہو گیا۔

میرا یہ مشن صرف بہتر گھنٹوں میں مکمل ہو گیا تھا۔

کسی آدم خور کو شکار کرنے والا شکاری اپنے مشن کی تکمیل کے بعد ایک عجیب سا سکون اور طمانیت محسوس کرتا ہے۔ کسی جانور کو موت کے گھاٹ اتارنا یقیناً اچھی بات نہیں ہے لیکن جب وہ جانور درجنوں انسانوں کا قاتل ہو تو اسے ہلاک کر دینا ضروری ہوتا ہے۔ اور میں اپنے اس مشن کی تکمیل پر بہت خوش تھا کیونکہ جنگل میں اکیلی گھومنے والی آٹھ نو سال کی بچی کے لیے بھی اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

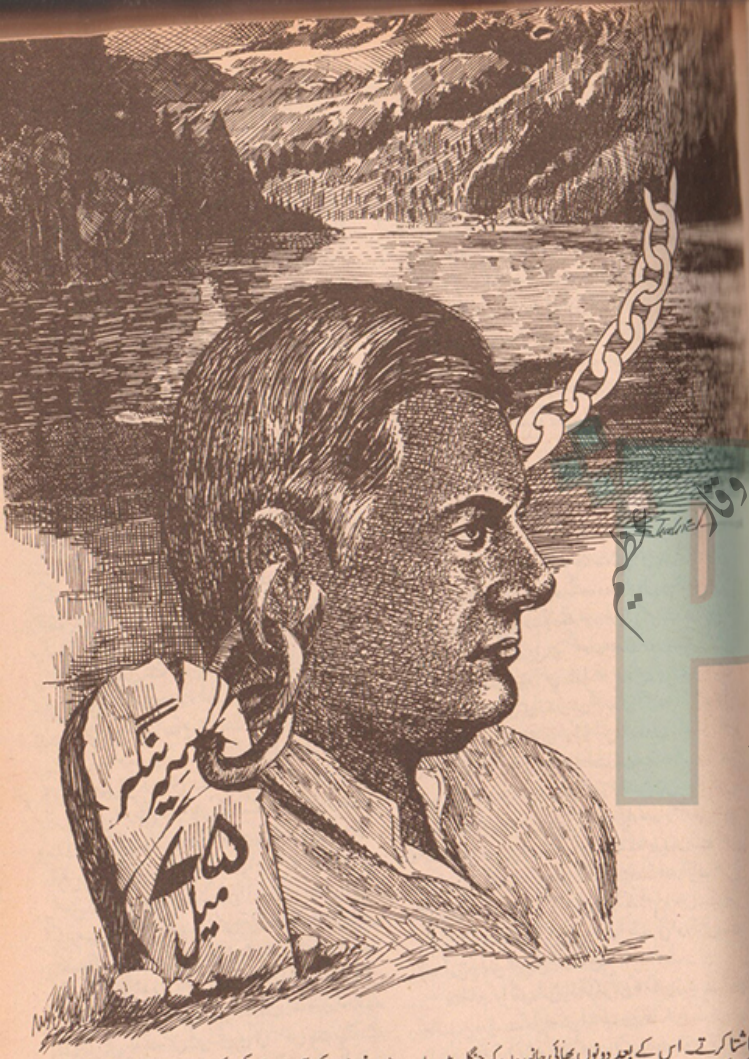

کشمیر ایک ایسا مسئلہ ہے جسے قیام پاکستان سے آج تک پاکستان کے جملہ مسائل میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ابتدا ہی سے یہ ایسا الجھا کہ آج تک سلجھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی وجہ سے ہمیں کتنی بار جنگ کے شعلوں سے بھی گزرنا پڑا۔ اس مسئلے کے حوالے سے مختلف نقطۂ نظر بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے ہیں، میں اکثر اختلافِ رائے بھی موجود رہا اور آج بھی ہے۔ زیرِ نظر تحریر جناب شمس کاشمیری کے خیالات و مشاہدات کا نچوڑ ہے جس میں انہوں نے کسی بھی سیاسی یا فوجی مصلحت و نظریے کو بالائے طاق رکھ کر تمام صورتِ حال کی اول تا آخر منظر کشی کی ہے اور ایک عام کشمیری کے جذبات و احساسات کو اجاگر کیا ہے جو اپنے گھر، اپنے گاؤں یا اپنے شہر سے تھوڑی دور بیٹھا حسرت سے اس راستے کو دیکھ رہا ہے جو اس کے گھر کا راستہ ہے مگر وہ اس پر قدم نہیں رکھ سکتا۔

"سرینگر پچھتر میل" شمس کاشمیری صاحب کی کتاب کا نام ہے جس سے یہ تحریر لی گئی ہے۔ افسوس ہم شمس صاحب کے موجودہ پتے سے واقف نہیں کہ ان کا شکریہ براہِ راست ادا کرتے۔ ہمارے پیشِ نظر یہ مقصد ضرور ہے کہ ایک عمدہ تحریر قارئین کے وسیع حلقے تک ماہنامہ سرگزشت کے ذریعے پہنچ جائے۔

نشانِ منزل

شمس کاشمیری

اس منزل کا نظارہ جس کی تلاش میں پچاس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا

یہ سن ۱۹۸۰ء میلاد عیسوی کی سردیوں کی ایک اُداس شام ہے۔ سری نگر روڈ پر مظفر آباد سے سینتیس میل کے فاصلے پر چکوٹھی گاؤں سے تھوڑا آگے سڑک سے دو فرلانگ ہٹ کر دریائے جہلم کے جنوبی کنارے کے قریب آٹھ دس مکانوں کی ایک ٹکڑی ہے جس کے چاروں طرف قابلِ کاشت زمین ہے جو ٹکڑی کے مکینوں کی کھیتی باڑی کے لیے اپنا سینہ کشمیریوں کی مہمان نوازی کی طرح ہمیشہ وا رکھتی ہے۔ ان میں دو تین کنبوں کے بچے فوج میں ملازم ہیں۔ ایک شخص کا لڑکا مظفر آباد میں فرنیچر بنانے والے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے اور ایک کا محکمۂ صحت کے مرکزی دفتر مظفر آباد میں کہیں ملازم ہے۔ ان کنبوں میں اتنا بھائی چارہ ہے کہ تمام لوگ ایک ہی خاندان کے افراد لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام میں معاونت بھی کرتے ہیں اور کھیتی باڑی میں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس طرح جب ملازمت پیشہ لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں تو تمام لوگوں سے ملتے ہیں اور ہر ایک کو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ ایسی فضا میں ادھیڑ عمر کا رمضان نامی ایک شخص گہری سوچوں میں گم اپنے ماضی کی تلاش میں کھویا ہوا ہے۔ وہ ماضی جو اندھیروں میں کہیں گم ہے اور اس کی قسمت کی طرح تاریک ہے۔ وہ ماضی جس پر چالیس سال کی گرد جم چکی ہے جسے اب وہ کھرچنا چاہتا ہے۔

رمضان پاکستان کی فوج میں صوبیدار تھا۔ ابھی دو سال پہلے ریٹائر ہوا ہے۔ اس کی زندگی عجیب و غریب حادثات کا مجموعہ ہے۔ فوج کی زندگی نے کبھی اسے اتنی فرصت ہی مہیا نہیں کی تھی کہ وہ سنجیدگی سے اپنے ماضی کے بکھرے ہوئے اوراق کو حُسنِ ترتیب سے ہمکنار کرتا لیکن ایک جانی پہچانی سی کسک اس کے دل میں ہمیشہ رہی۔ چند دن پہلے وہ بیٹی کی شادی سے فارغ ہوا تھا۔ اب گھر میں اس کی بیوی کے سوا کوئی اور نہیں رہا تو تنہائی اسے گزرے ہوئے لمحات دہرانے پر مجبور کرنے لگی۔ اس کی سوچ اسے یہاں سے صرف اڑتالیس میل اوپر مشرق کی سمت اسی دریائے جہلم کے شمالی کنارے پر بارہ مولا سے تھوڑا آگے ایک گاؤں تک لے گئی۔ جہاں پر راجپوت خاندان کے ایک غریب کشمیری زمیندار کے ہاں آج سے کوئی باسٹھ سال قبل اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کے دو بھائی اور بھی تھے، ایک بڑا ایک چھوٹا اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ اس کا سارا بچپن اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ ایک ایک واقعہ فلم کی اسکرین کے مانند قرطاسِ ذہن پر ابھرنے لگا۔ اسے اپنا بڑا بھائی بھی یاد آیا جس کے ساتھ وہ مسجد میں مولوی صاحب سے قرآنِ کریم پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اس کا بڑا بھائی مولوی صاحب کی سخت گیری برداشت نہ کرسکا اور صرف ایک سیپارہ قرآن ناظرہ پڑھ کر بھاگ گیا۔ اس نے خود پورا قرآنِ مجید پڑھا لیکن اسکول جانے کی نوبت نہ آئی کیونکہ اسکول بارہ مولا میں تھا جو وہاں سے تین میل دور تھا البتہ اس کا چھوٹا بھائی بارہ مولا میں مڈل کلاس تک پڑھا پھر اسے سب بھائیوں کا باپ.... کے ساتھ مل کر کھیتوں میں کام کرنا بھی یاد آیا۔ دونوں بڑے بھائی مل کر صبح سویرے باپ کے ساتھ کام کرتے اور پھر دھوپ نکلے، ناشتا کرتے۔ اس کے بعد دونوں بھائی جانوروں کو جنگل میں یا کبھی کبھار دریا کے کنارے چرانے کے لیے لے جاتے ان کے پاس ایک دو بکریاں، پانچ سات بھیڑیں، دو تین گائیں... چند بیل اور ان کے بچھڑے ہوتے۔ انہوں نے گھر میں کچھ مرغیاں بھی پال رکھی تھیں۔ جن کے انڈے جمع کر کے زیادہ تر وہ بارہ مولا میں فروخت کر آتے یا پھر کبھی کبھار انڈے مہمانوں کے کام آجاتے۔ ان دنوں نقد پیسوں کا منہ دیکھنا شاذو نادر ہی نصیب ہوتا تھا۔ فصل پکنے پر حکمرانوں کا حصہ نکال کر اناج بڑی مشکل سے کھانے کے لیے کافی ہوتا۔ بعض مرتبہ بلکہ اکثر چاول ختم ہوجاتے تو مکئی اور گندم تک کھانے کی نوبت آجاتی۔ وہ وادیِ

کشمیر کے لوگوں کے لیے خاصا تکلیف دہ مسئلہ ہوتا کیونکہ وہ صرف چاول ہی کھانے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے کھیتوں کے کناروں پر اخروٹ، سیب، ناشپاتی، آلوچہ، آڑو وغیرہ کے درخت تھے۔ ان درختوں کا پھل اکثر پکنے سے پہلے ہی ڈوگرہ حکمرانوں یا ان کے کارندوں کی نذر ہو جاتا۔ جو بچ رہتا وہ بارہ مولا میں فروخت کے لیے چلا جاتا۔ بعض اوقات کچھ بیمار اور داغ دار قسم کے پھل بچوں کو بھی کھانے کے لیے مل جاتے یا جو بچے چوری چھپے پکنے سے بہت پہلے ہی کچے توڑ کر کھا لیتے۔ وہی ان کا حصہ ہوتا۔ اس کے بچپن کا زمانہ ڈوگرہ شاہی کے عروج کا زمانہ تھا۔ کشمیر کے بالعموم سبھی اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ کشمیر کی غلامی دہری تھی کیونکہ برصغیر تو صرف انگریزوں کا غلام تھا جن کے کچھ اصول بھی تھے لیکن کشمیر کی ریاست تو انگریزوں کے غلام ڈوگروں کی بھی غلام تھی۔ جو ان کے جدِ امجد گلاب سنگھ نے معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء کے تحت انگریزوں سے پچھتر لاکھ نانک شاہی روپوں کے عوض مالکانہ حقوق کے پٹے پر لے رکھی تھی اور جس کے وہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ جس نے منگلا کے قلعے کی تعمیر کے دوران میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اپنی مکاری اور خونخوارانہ صفات کے سبب سردار بن کر بالآخر سکھوں کی طرف سے جموں کا گورنر بن گیا تھا۔ اس نے انگریزوں کے چڑھتے سورج کو دیکھ کر اپنے مربی سکھوں سے بھی غداری کی اور انگریزوں کا طرف دار بن گیا اور پھر انگریزوں سے ان کی جنگی ضروریات پوری کرنے کے لیے معاہدہ امرتسر کے تحت سودا کرکے ریاست کشمیر کا مالک و مختار بن گیا۔ کچھ رقم اس نے جموں کی گورنری کے دوران میں لوٹ مار سے جمع کر رکھی تھی اور باقی رقم ایمن آباد کے ہندو دیوان لکھپت رائے سے قرض لے لی جو خود سکھوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ قرض کی ادائیگی ہر سال جمع شدہ مالیے کی رقم کا آٹھواں حصہ ٹھہری جسے دیوانوں کی نسبت سے دیوانی کہا گیا۔ ہر سال دیوانی کی وصولی کے لیے انہوں نے ایمن آباد سے براستہ ستراہ جموں تک سڑک بنوائی جو کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہے۔ ڈوگرہ شاہی ادا شدہ رقم کا کئی گنا کشمیر کے لوگوں سے وصول کر چکنے کے بعد بھی مطمئن نہ تھی اور بنیوں والا سود در سود کا کچھ ایسا چکر چل پڑا تھا جس میں کشمیری کئی نسلوں سے پستے چلے آ رہے تھے لیکن ہنوز روزِ اول والا معاملہ تھا۔ ڈوگرہ حکمرانوں کے بعد ان کے کارندوں کی کئی قسمیں تھیں جو کشمیریوں پر ظلم و ستم کرکے ڈوگروں سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

جس طرح ڈوگروں نے ریاست انگریزوں سے ٹھیکے پر لے رکھی تھی، اسی طرح وہ آگے چل کر تھانے اور تحصیلیں بھی ٹھیکے پر چلاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ تھانے دار اور تحصیل دار ٹھیکے کی رقوم ادا کرنے کے بعد عوام پر کون سا ظلم نہ ڈھاتے ہوں گے۔ چنانچہ یہ کارندے فصل کی کٹائی پر ساری فصل اٹھا کر لے جاتے۔ اسی طرح پھل کے پکنے پر بھی سارا اچھا پھل درختوں ہی سے نوچ لیتے۔ جو جانور خوبصورت اور تندرست نظر آتا، اسے بھی لگان میں وصول کر لیتے۔ مردوں کو اکثر بیگار پر پکڑ کر لے جاتے اور کئی کئی دن تک برف باری میں بغیر کھانا دیے بیگار لینے کے بعد رہا کرتے تو ان میں سے کئی ایک انسان موسم اور بھوک کی نذر ہو جاتے۔ اسی طرح کئی بد فطرت اور بدمعاش حکام غریب عورتوں تک کو پکڑ کر لے جاتے اور جب جی چاہتا چھوڑتے۔ جور و ستم اور بربریت کا ایک ایسا دور تھا جو آسمان نے دنیا کی سب سے حسین اور خوبصورت سرزمین کے علاوہ کبھی کہیں اور نہ دیکھا ہوگا۔ ڈوگروں اور ان کے کارندوں کے کرتوت ہلاکو اور چنگیز خان کی روحوں کو بھی شرماتے تھے۔ کشمیر دنیا میں وہ واحد خطۂ زمین تھا جہاں پر سوائے مہاراجا کے کسی شخص کا مکان بھی اس کی اپنی ملکیت نہیں تھا بلکہ سب مہاراجا کی ملکیت ہی تصور ہوتے تھے جسے چاہے وہ مکان سے نکال دے اور جسے چاہے رہنے دے۔ ایسے حالات میں بھی چند شرفا موجود تھے جو بڑے شہروں میں رہتے تھے۔ وہ ڈوگروں کی غلامی اور چاپلوسی کرکے وقت گزارتے تھے [illegible] غداری کا معاوضہ پاتے تھے۔ کشمیریوں پر سکھوں اور ڈوگروں کے مسلسل جور و ستم نے انہیں بے حس بنا دیا تھا اور ان کی زندگی ایک طرح سے جانوروں کی سی زندگی بن کر رہ گئی تھی۔ اگر کوئی کسی ذریعے سے بھی احتجاج کرتا یا بھی کارندوں کے کسی کام میں مدافعت کرتا تو پھر اس کا ریاست میں رہنا دوبھر ہو جاتا۔ پنجاب کے کشمیر کی سرحد سے ملحقہ اضلاع میں جو لاکھوں کشمیری آباد ہیں، یہ وہی ہیں جن کے آباواجداد سکھوں اور ڈوگروں کے عہد میں ان کے ظلم نہ سہہ سکے اور وہاں سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو کر یہاں آکر آباد ہوئے اور ایک طرح برصغیر میں یہ پہلی ہجرت تھی جو اسلام کے نام لیواؤں نے غیر مسلم حکمرانوں کے ظلم و ستم کے باعث اختیار کی اور جس سے ایک طرح دو قومی نظریہ کی ابتدا ہوئی۔

رمضان کو اچھی طرح یاد تھا کہ ان کا مکان دریا کے شمالی کنارے پر دریا سے کوئی دو تین فرلانگ دور تھا۔ ان کے گھر سے دریا صاف نظر آتا تھا، وہ لکڑی کا بنا ہوا تین منزلہ مکان تھا جس کی نچلی منزل میں دو بڑے کمرے تھے جن میں جانور باندھتے تھے۔ اوپر کی دو منزلوں میں وہ خود رہتے تھے۔ اوپر والی آدھی منزل جو ڈھلوان چھت کے کھپریل کے نیچے ہوتی ہے، اس میں غیر ضروری فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔ کشمیر میں اکثر مکانات اسی طرز کے بنائے جاتے ہیں اور شدید سردیاں انسان اور جانور

دونوں مل کر اکٹھے ہی گزارتے ہیں اور پھر جانوروں کے سانس لینے سے اوپر کی منزلیں بھی گرم رہتی ہیں یہ اور بات کہ تازہ ہوا کی کمی ہو جاتی ہے لیکن سردیوں کی یخ بستہ ہوا سے بچنے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ ویسے بھی سکھوں اور ڈوگروں نے کشمیریوں کو جانوروں سے بہتر کبھی نہیں سمجھا تھا اور پھر ان کی جان کی قیمت بھی کیا تھی، جب کوئی کشمیری کسی حکمران ٹولے کے آدمی کے ہاتھوں مارا جاتا تو قاتل پر صرف سولہ روپے جرمانہ ہوتا۔ اگر مرنے والا ہندو ہوتا تو گھر والوں کو چار روپے خون بہا ادا ہوتا اور اگر مسلمان ہوتا تو صرف دو روپے ملتے اور باقی رقم سرکاری خزانے میں بطورِ فیس جمع ہو جاتی۔ یہ تھا عدل کا وہ معیار جو وہ کئی نسلوں سے دیکھ رہے تھے۔ ڈوگروں نے کشمیریوں کی تذلیل کے لیے ایسے ایسے حربے اختیار کر رکھے تھے کہ مہذب دنیا کا کوئی شخص ان پر یقین نہیں کر سکتا۔ کوئی مسلمان پگڑی نہیں باندھ سکتا تھا۔ اگر کوئی پگڑی باندھ لیتا تو ڈوگروں کے کارندے سربازار اس کی پگڑی اتار کر اسے جوتے لگاتے۔ اگر کسی کشمیری کی موجودگی میں کوئی شخص پانی میں ڈوب جاتا تو اسے سزائے موت دی جاتی۔ جس کے نتیجے میں کشمیری جونہی کسی کو ڈوبتے دیکھتے فوراً وہاں سے بھاگ جاتے۔ کشمیریوں کی بزدلی کی ایسی ایسی خود ساختہ کہانیاں اور افسانے پھیلائے گئے جن سے نفسیاتی طور پر ان کی نسل کشی کی جاسکے۔ کشمیریوں کی طرف سے مزاحمت ختم کرنے کے لیے ان کو فنونِ سپہ گری سے بالکل دور کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ انہیں فوج وغیرہ میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ حالانکہ یہی کشمیری ایسے جنگجو تھے کہ مغلوں کے دور سے پہلے تک ہمیشہ خود مختار رہے بلکہ موجودہ صوبہ سرحد اور پنجاب کا بیشتر علاقہ ان کے ماتحت رہا اور کبھی کسی بیرونی حملہ آور کو کشمیر پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اگر ایسی کبھی جرأت کی گئی تو کشمیریوں نے اس کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور حملہ آوروں کو شکست دی۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور ان میں سے صرف ایک ناکام ہوا اور وہ کشمیر پر حملہ تھا۔ اس سے آپ کشمیریوں کی نسلی بہادری کا تصور کر سکتے ہیں پھر جب وہ اسلام کی آغوش میں آگئے تو اور بہادر اور نڈر ہو گئے۔ مغل بادشاہ اکبر نے کئی دفعہ کشمیر پر حملے کیے جو تمام کے تمام کشمیریوں نے ناکام بنا دیے بالآخر شیعہ سنی فساد برپا کرا کے اس نفاق کی آڑ میں کشمیر کو فتح کیا گیا۔ ڈوگرے ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کشمیریوں پر غلامی مسلط کرتے رہے تاکہ وہ ان کی نسل کا ہی فنونِ سپہ گری سے تعلق ختم کر سکیں اور وہ کبھی ان کے چنگل سے آزادی کا سوچ بھی نہ سکیں۔

کشمیر کی یاد کے ساتھ ہی اسے کانگڑی بھی یاد آئی جو تنکوں سے بنی ہوئی ایک ٹوکری سی ہوتی ہے جس کے اوپر پکڑنے کے لیے مٹھا سا لگا ہوتا ہے۔ ٹوکری کے اندر مٹی کا ایک کٹورہ سا فٹ ہوتا، جس میں چند کوئلے ڈال کر کشمیری اپنے پھرن (کھلا کرتہ) کے اندر سینے کے سامنے رکھ کر جسم کو گرم رکھتے ہیں کبھی کبھار ٹانگوں کو گرمی پہنچانے کے لیے ٹانگوں کے درمیان بھی رکھ لیتے ہیں اور اکثر سوتے ہوئے رضائی کے اندر بھی رکھتے۔ گرمیوں میں کوئلوں کی راکھ محفوظ کر لیتے جو بعد میں ماچس جلانے سے زندہ ہو جاتی اور کانگڑی میں استعمال کی جاتی اور سردیوں میں ان کے کام آتی۔ بعض گھرانے ایک ہی بڑی رضائی کے اندر سارا سارا خاندان گھس کر سوجاتا جس سے کفایت بھی ہوتی اور رضائی گرم بھی رہتی۔ سردیوں میں بعض دفعہ زیادہ برف باری یا گرمیوں میں زیادہ بارشوں میں ژالہ باری کی وجہ سے فصلوں کو نقصان پہنچتا تو لگان کی رقم کا ادا کرنا مشکل ہو جاتا لیکن حکومت کے کارندوں کے سامنے ان کے، ساری باتوں کے جاننے کے باوجود جب ایسی آفات کا ذکر کیا جاتا تو وہ انہیں صرف بہانے ہی گردانتے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب اس کی عمر ابھی صرف تیرہ سال تھی تو برف باری اور اولوں سے فصلیں بالکل تباہ ہو گئیں، پھل دار درختوں کا سارا پھل ضائع ہو گیا۔ کچھ جانور بھی مر گئے اور ان کے مکان کے قریب کے ایک درخت کے گرنے سے مکان کے ایک حصے کو بھی نقصان پہنچا لیکن ڈوگرہ شاہی کے کارندوں کو مالیہ ادا کرنے کے لیے ان کا کوئی عذر نہ سنا گیا اور مالیہ ادا کرنے کے لیے انہیں باقی کے کچھ جانور اور گھر کا سامان بیچنا پڑا۔ علاقے میں قحط تک نوبت جا پہنچی لیکن حکومت بجائے لوگوں کی مدد کرنے کے اپنا لگان وصول کرتی رہی اور لوگوں کی بے بسی کا تماشا دیکھتی رہی۔ حالات کی مجبوری کے تحت اس سال اسے پنجاب میں مزدوری کے لیے کم سنی میں ہی جانا پڑا۔

پھر اسے اپنے پہلے سفر کی داستان یاد آگئی جب وہ پانچ چھ جوان گھر سے پنجاب میں مزدوری کرنے نکلے تھے۔ بارہ مولا سے دو بڑی کشتیاں تحصیل دار کا سامان لینے اسلام آباد (اننت ناگ) جا رہی تھیں۔ جس کا تبادلہ اسلام آباد سے بارہ مولا ہوا تھا۔ کشتیوں کے مالک ہانجی اس کے والد کے جاننے والے تھے اس لیے اسلام آباد تک انہوں نے ان کے ساتھ کشتیوں پر سفر کا پروگرام بنایا۔ دونوں کشتیوں میں صرف چھ آدمی تھے۔ اس طرح دریا کے بہاؤ کے خلاف ہانجیوں کی مدد بھی کر سکتے تھے۔ اسے آج تک یاد تھا۔ اس کے گھر والوں نے اسے چند برتن، تھوڑی سی چائے اور نمک ایک پوٹلی میں باندھ کر دیے تھے اور اس میں چند باقرخانیاں تھوڑے سے چاول پچورہ اور کشمیری کلچے بھی ساتھ دیے تھے۔ گھر سے وہ علی الصباح روانہ ہوئے تو اس کا والد اور بھائی اسے رخصت کرنے آئے تھے اور محنت سے کام کرنے اور لڑائی جھگڑوں سے بچنے کی تاکید کرتے رہے پھر اسے تمام دریائی سفر کی تفصیل یاد آگئی وہ تمام ہنسی خوشی

چھلیں کرتے گلریز گاتے سفر کرتے رہے۔ راستے میں دریا کے دونوں جانب کھیت اور باغات تھے۔ پہلے سڑک دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ تھی پھر پرے ہٹ گئی پھر آگے دریا پوہڑو دریائے جہلم میں آملا۔ پھر وہ سوپور پہنچے۔ دریا کا کنارہ کئی جگہ سے چار پانچ فٹ اونچا تھا۔ دریا میں پانی ذرا کم ہی تھا۔ سوپور شہر بھی دریا کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور ایک پل کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ اس شہر میں زیادہ تر پرانی عمارتیں تھیں۔ پکے مکانات زیادہ تر ہندو پنڈتوں کے تھے۔ سوپور سے پہلے ہی سرینگر کو جانے والی سڑک دریا سے جدا ہو گئی تھی۔ سوپور شہر سے وہ آگے نکل گئے اور اس کے بعد وولر جھیل میں داخل ہوئے۔ یہ وادی کشمیر کی سب سے بڑی تازہ پانی کی جھیل ہے۔ جس کی لمبائی بارہ چودہ میل اور چوڑائی پانچ چھ میل ہے۔ گرمیوں میں اس میں پانی بڑھ جاتا ہے اور اس کی وسعت بھی بڑھ جاتی ہے اور سردیوں میں پانی کی سطح گر جاتی ہے۔ اس کی گہرائی دس سے پندرہ فٹ تک ہے۔ شمالی سمت اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ دریائے جہلم اس میں شمال مشرقی سمت سے داخل ہو کر چکے سے جنوب مغربی سمت سے باہر نکل جاتا ہے۔ جب گرمیوں میں دریا میں پانی زیادہ ہوتا ہے تو کشتیاں جھیل میں داخل ہوئے بغیر سوپور سے صرف آٹھ میل دور رہتی ہیں لیکن جب پانی کی سطح کم ہوتی ہے تو پھر جھیل کی طرف سے ہی جایا جاسکتا ہے اس طرح اٹھارہ بیس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ شام کے قریب جھیل میں پہاڑوں کی طرف سے اچانک تیز ہوائیں چلنے لگتی ہیں جن سے ہلکی کشتیوں کے الٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وہ شام تک جھیل کے کنارے ایک محفوظ مقام تک پہنچ گئے جو بانڈی پورہ کے مشہور قصبے کے قریب ہی تھا۔ بانڈی پورہ سے وادی لولاب کو راستہ جاتا ہے اور وہیں سے برزل درّے سے ہو کر گلگت کو سڑک جاتی ہے۔ انہوں نے رات کو چاول پکائے، اس کے بعد چائے پی کر کشتیوں میں سو گئے۔ اس کی زندگی کی وہ پہلی رات تھی جو اس نے گھر سے باہر گزاری تھی۔ تھکان کی وجہ سے وہ تو جلد ہی سو گیا لیکن ہانجی رات گئے تک مقامی ہانجیوں سے گپ لگاتے رہے۔ دوسری صبح سویرے ہی وہ اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ جھیل سے گزر کر وہ پھر دریا میں داخل ہو گئے۔ راستے میں ہاجن اور سنبل کے قصبے آئے پھر شادی وال گاؤں آیا جہاں سوپور سے سیدھی آنے والی نہر نورو بھی آکر مل جاتی ہے۔ ہانجی اس علاقے سے خوب واقف تھے۔ شادی وال کے قریب ہی سپورہ یا پرے ہست پورہ کے پرانے مندروں کے کھنڈرات ہیں جہاں ہندو لوگ زیارت کرنے کو جاتے ہیں یا پھر آثارِ قدیمہ کی تلاش میں اکثر سیاح بھی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ ویسے اس کے اکثر بزرگوں کے کہنے کے مطابق اس کا اپنا خاندان بڑے دراصل اسی شہر سے متعلق تھا اور اسی شہر سے لوگ اٹھ کر

مختلف مقامات پر آباد ہوتے گئے۔ شادی وال کے نام کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہاں پر دریائے جہلم اور سندھ ندی آکر ملتے ہیں اس لیے ان کے مقام اتصال کی وجہ سے یہ شادی وال کہلاتا ہے۔ وہاں پر دریا کے عین درمیان میں ایک جزیرہ تھا جس پر چنار کا ایک درخت تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ درخت وہاں پر صدیوں سے موجود ہے لیکن اپنے حجم میں نہیں بڑھتا۔ سندھ ندی میں بھی گاندربل تک کشتی رانی ہو سکتی ہے اور گاندربل سے ہی آگے لداخ اور کرگل کو رستہ جاتا ہے پھر اسے گاندربل بھول بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ بعد میں ایک دفعہ جب وہ اپنے سسرال والوں کے ساتھ اپنے سالے کی بارات میں گیا تھا تو بیگار میں پکڑا گیا تھا۔ لداخ کا وزیرِ وزارت سرینگر سے واپس لیے جارہا تھا اور اس کا سامان اٹھانے کے لیے بیگار کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے ان کی بارات ادھر سے گزر رہی تھی کہ ڈوگرہ کارندوں نے بارات کو پکڑ لیا۔ دولہا سمیت ہی، وہ تو بڑی مشکل اور منت سماجت سے انہوں نے دولہا کو چھوڑ دیا لیکن دوسرے کافی لوگوں کو پکڑ کر لے گئے جن میں وہ خود اور اس کا ایک اور سالا بھی تھا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اگلے ہی پڑاؤ پر لداخی مزدوروں کا قافلہ موجود تھا جس کی وجہ سے وہ تیسرے دن واپس آگیا لیکن پھر سسرال جانے کے بجائے سیدھا اپنے گھر ہی چلا آیا۔ ان کا سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب آگیا۔ ادھر سری نگر شہر کے آثار بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ دور سے ہی تختِ سلیمان کا پہاڑ اور قلعہ ہری پربت سری نگر کے آنے کی خبر دینے لگے۔ وہ شام یقیناً اس کی زندگی کی حسین ترین شام تھی جب وہ اپنے خوابوں کے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ نویں دسویں رات کا چاند سر پر چمک رہا تھا اور دریائے جہلم کا خاموش پانی اردگرد درختوں کے جھنڈ سب کچھ کشمیر کا منفرد مسحور کن ماحول موجود تھا۔ سری نگر دیکھنے کی اس کی خواہش بچپن سے ہی اس کے ذہن میں پرورش پاتی رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ اس شہر کے تذکرے بڑے شوق سے سنے تھے۔ اس نے اس شہر کو بڑے شوق سے دیکھا۔ کئی معاملات میں بارہ مولا سے مختلف بھی پایا لیکن اس وقت اسے اس کی خوبصورتی کا وہ معیار معلوم نہ تھا جو بعد میں علم حاصل کرنے کے بعد اور تجربات کی بھٹی سے نکلنے کے بعد معلوم ہوا۔ فوج کی نوکری کے دوران میں اس نے اردو لکھنا پڑھنا سیکھا پھر رومن اردو سیکھی، اس کے بعد انگریزی میں بھی خاصی شدھ بدھ پیدا کرلی۔ اس کی محنت سے جہاں اس کے شعور کو وسعت ملی، وہاں ملازمت میں بھی ترقی کے مواقع ملے ورنہ وہ کبھی صوبیدار کے عہدے تک نہ پہنچ پاتا۔ جب وہ اپنے ملک سے دور رہا تو اسے کتابوں میں لکھا اپنے ملک کے بارے میں تمام مواد پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، اس طرح وہ اپنے وسائل کے مطابق کشمیر پر ملنے

والی کتابیں خریدتا رہا۔ لائبریریوں سے نایاب کتب لے کر پڑھتا رہا۔ مختلف غیر ملکی سیاحوں کے سفرنامے بھی اس نے پڑھے اور ملازمت میں جب برصغیر کے مختلف شہروں کو دیکھا۔ اسی طرح افریقہ اور ایشیا کے کئی دیگر ممالک کے علاقوں کو بھی دیکھا تو اسے اپنا ملک ان تمام ملکوں سے اعلیٰ لگا اور پھر وہ تصور ہی تصور میں جب اپنے ملک کی خوبصورتی پر غور کرتا تو اس سے جدائی اسے اور بھی شاق گزرتی اس سے اس کی محبت میں اور اضافہ ہو جاتا لیکن یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ وہ پھر کبھی اپنے گھر نہ جاسکا اور اب وہ تقریباً مایوس ہی ہو چکا تھا کیونکہ اپنے ملک میں ہی اپنے گھر سے صرف چند میل دور رہ کر بھی وہ اپنے علاقے کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ ایک طرح وہ اپنے ملک میں ہی اجنبی تھا۔ ایسا اجنبی جو قانونی طور پر وہاں رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی سوچ اسے پھر سری نگر شہر میں داخلے کے مرحلے پر لے گئی اور اس شہر کے حسن میں کھو گئی۔ کشمیریوں کی قسمت بناتے وقت قدرت نے کشمیریوں کے حصے کے تمام آرام اور آسائش بھی شاید ان کے وطن کی خوبصورتی میں ہی خرچ کر دیے تھے اور پھر یہ خوبصورتی ہی اس کی آزادی کی دشمن بن گئی۔ جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ صدیوں سے غلامی ان کا مقدر بن چکی ہے۔ ہر حکمران اسے دیکھتا تو اس کے حسن کے سحر میں کھو جاتا اور پھر اسے اپنے قبضے میں رکھنے پر حریص ہو جاتا اور ظاہر ہے کہ وہ کشمیریوں کو پسماندہ رکھے بغیر ان کے ملک پر قابض نہ رہ سکتا تھا۔ سری نگر شہر ہی دراصل کشمیر ہے بلکہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں اسے کشمیر کے نام سے ہی پکارتے رہے لیکن بعد میں سکھوں اور ہندو ڈوگروں نے اس کا پرانا ہندوانہ نام سری نگر بحال کر دیا۔ سری نگر شہر دریائے جہلم جس کے پرانے کئی نام ہیں جن میں ہائیڈ-سپس HYDASPES وتستہ اور بہت وغیرہ خاصے مشہور ہیں۔ کے دونوں کناروں پر ایسے آباد ہے کہ دریا اس شہر میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے اور اگر دریا کو شہر سے نکال دیا جائے تو اس شہر کی تہذیب و تمدن، صنعت اور حسن ہر چیز ختم ہو جائے۔ شہر کو ملانے کے لیے دریا پر سات پل ہیں (اب ایک آٹھواں پل زیرو برج کے نام سے بھی بنا ہوا ہے) جن کے نام نمبروں کے لحاظ سے مقرر ہیں۔ ویسے ان کے عام نام بھی ہیں مثلاً پہلے پل کو میرا کدل۔ دوسرے کو حبہ کدل، زینہ کدل، عالی کدل، نوا کدال اور صفا کدل کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ دنیا میں اور بھی کئی ملکوں میں کئی شہر دریاؤں کے کناروں پر آباد ہیں۔ جن میں عراق میں بغداد شہر دریائے دجلہ پر موجود سات پلوں سے مربوط ہے اور یورپ میں بھی کئی شہر دریاؤں کے کناروں پر اس طرح آباد ہیں کہ دریا ان کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث ہیں۔ سری نگر شہر میں دریائے جہلم کی حیثیت کچھ زیادہ ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے

اچھی طرح سے یاد تھا کہ سری نگر میں رات ٹھہرنے کے لیے انہوں نے اپنی کشتیاں تیسرے اور چوتھے پل کے درمیان مسجدِ شاہ ہمدانؒ کے قریب لنگر انداز کی تھیں۔ چاندنی رات میں دریا کا سکوت اور مسجدِ شاہ ہمدانؒ کے مخصوص کشمیری طرزِ تعمیر کا ملکوتی حسن عجیب ہی پُربہار تھا۔ شاہِ ہمدانؒ سے کشمیریوں کی عقیدت بھی بے پناہ ہے کہ ان ایسے بزرگوں کے ہی دم سے وہ اسلام کے ازلی اور ابدی نظام کے تحت دائمی خوشیوں سے ہم کنار ہوئے۔ صبح سویرے مسجد میں نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد انہوں نے آگے سفر کرنے کا ارادہ کیا لیکن رمضان نے بڑی منت سماجت سے ہانجیوں کو دوپہر تک سری نگر شہر کی سیر کے لیے رکنے پر رضامند کرلیا۔ سری نگر شہر میں داخلے کے وقت چونکہ رات تھی، اس لیے چاندنی کے باوجود وہ شہر کے پرانے حصوں کو اچھی طرح نہ دیکھ سکا تھا۔ دریا کے دونوں جانب کئی کئی منزلہ مکانوں کے درمیان سے وہ گزرے تو تھے جن میں دریا کی طرف جھکی ہوئی بالکونیاں بھی تھیں اور مکانوں کے درمیان چھوڑی ہوئی جگہوں پر چھوٹے چھوٹے سیڑھیوں والے گھاٹ بھی لیکن ان کے پیچھے دریا کے متوازی چلنے والے بازار نہ نظر آسکے۔ مکانوں پر اکثر ڈھلوان چھتیں تھیں۔ جن پر گھاس اور پھول بھی اُگے ہوئے تھے اور جگہ جگہ لوگ دریا کو اپنی ضرورتوں کے مطابق استعمال کرتے نظر آتے تھے۔ دریا کے کناروں پر کئی دکانیں بھی تھیں۔ جن کے دروازے بیک وقت دریا کی طرف بھی اور پچھلی طرف بازار کی جانب بھی کھلتے تھے اور کاروبار بھی دونوں جانب ہوتا تھا۔ دریا کی طرف سے کشتیوں، شکاروں کے ذریعے اور دوسری طرف پیدل لوگوں سے دریا میں کشتیوں، ڈونگوں، شکاروں کی بھرمار تھی۔ کہیں کہیں ہاؤس بوٹ بھی نظر آتے تھے۔ ہاؤس بوٹ جھیل ڈل یا دریائے جہلم میں پورے مکانات ہوتے ہیں۔ جن میں عام مکانوں کی طرح آرام اور آسائش مہیا ہوتی ہے۔ سونے کا کمرا، کھانے کا کمرا، ڈرائنگ روم، باورچی خانہ، غسل خانہ، برآمدہ، صحن اور صحن میں پودے تک موجود ہوتے اور کمروں میں پلنگ، صوفے، پردے، قالین، میزیں، کرسیاں ہر قسم کی ضرورت کا سامان ہوتا ہے۔ شہر میں مکان ڈھونڈنے سے پانی کے ان مکانوں میں رہائش بہت بہتر ہوتی ہے۔ انگریز سیاح تو اکثر ہاؤس بوٹوں میں ہی قیام کرتے تھے۔ ہاؤس بوٹ سے ضرورت کے لیے باہر نکلنے کے لیے ساتھ ہی ڈونگے ہوتے جن کو جب جہاں جی چاہے، لے جایا جاسکتا ہے اور پھر ضرورت کے تحت تو ہاؤس بوٹ بھی جھیل ڈل میں اِدھر اُدھر یا دریا میں اسلام آباد سے لے کر بارہ مولا تک کہیں بھی لے جائے جاسکتے ہیں۔ ہاؤس بوٹ کے مالک عام طور سے ہانجی ہوتے ہیں جو ہاؤس بوٹ سے ملحقہ ڈونگوں میں ہی رہتے ہیں۔ اس طرح سے ان کے خاندان کے سارے افراد ہی ہاؤس بوٹ

میں قیام کرنے والے کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ بازار سے سودا سلف لانا، کھانا پکانا، فرصت میں گپ شپ لگانا۔ یہ تمام مراحل وہ بڑی خوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہی کہا جاتا ہے کہ سری نگر کی ڈل جھیل اور دریائے جہلم میں ہانجیوں کا ہی راج ہے۔ ان میں سے اکثر اتنے حریص ہوجاتے ہیں کہ کاروبار میں اخلاقی حدود کو بھی پھلانگ جاتے ہیں۔ کتابوں میں اکثر سیاحوں نے ان کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں لکھی ہیں۔ جن کو وہ تمام کشمیریوں پر بھی منطبق کرتے رہے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہانجی کشمیر میں نچلے طبقے کی اقوام میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کے کردار کا اطلاق عام کشمیریوں پر کرنا نامناسب ہے اور پھر انہیں ایسا بنانے میں جہاں سابق حکمرانوں کا ہاتھ تھا۔ وہاں سیاحوں کی اکثریت بھی انہیں ایسا بنانے میں شامل ہوتی رہی ہے۔

جھیل ڈل کی حیثیت سری نگر شہر میں ایسے ہی ہے جیسے کوئی ماں اپنی گود میں اپنے بچوں کو سمیٹے ہوئے ہو۔ جھیل کے پیچھے انسانی جسم کی طرح پہاڑ استادہ ہے جھیل کے ایک سمت تختِ سلیمان سے سلسلۂ کوہ شروع ہوکر گولائی میں سامنے کے کونے میں قلعہ ہری پربت تک چلا گیا ہے۔ جس کے نیچے جھیل ڈل پیٹ کی گولائی کی طرح ہے اور اس کے سامنے ہی گولائی میں شہر سری نگر پھیلا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ دریائے جہلم بھی شہر کے درمیان گولائی میں ہی بہتا ہے۔ جھیل کے کنارے کی گولائی میں ہی مغلیہ دور کے تعمیر شدہ مشہور زمانہ باغات ہیں۔ جھیل کی لمبائی چار سے چھ میل تک ہے اور چوڑائی تقریباً دو میل۔ اس میں تازہ پانی کے چشمے ہیں جن کی وجہ سے اس کا پانی ہمیشہ صاف اور تازہ رہتا ہے۔ اس کی گہرائی چھ فٹ سے آٹھ فٹ تک ہے۔ جھیل میں ہاؤس بوٹ، شکارے، ڈونگے تیرتے ہوئے کھیت ہر طرف نظر آتے ہیں۔ تختِ سلیمان کے نیچے سے ہی دریائے جہلم سے ایک نہر نکالی ہوئی ہے، جو دریا کو جھیل سے ملاتی ہے۔ جس کے کنارے پر ایک گیٹ لگا ہوا ہے جسے ڈل گیٹ کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے شکارے اور ہاؤس بوٹ وغیرہ جھیل سے دریا میں آجاسکتے ہیں۔ گیٹ کچھ اس طرح بنا ہوا ہے کہ جوں ہی دریا میں پانی کی سطح بلند ہوتی ہے وہ خود بخود بند ہوجاتا ہے اور اسی طرح دریا میں پانی اگر کم ہوجائے تو بھی وہ جھیل کے پانی کو دریا میں نہیں جانے دیتا۔ اسی وجہ سے جھیل کا پانی تقریباً ایک ہی سطح پر رہتا ہے۔

رمضان جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد شاہ ہمدانؒ میں نماز فجر ادا کرکے روانہ ہوا تو روشنی پھیل رہی تھی۔ ناشتا انہوں نے وہیں پر کرلیا تھا۔ اسی طرح دریا میں کشتیاں چلتی رہیں۔ ڈوگرے مہاراجا کا محل شیرگڑھی بھی آیا۔ جس کی بالکونیاں اور کھڑکیاں دریا کی طرف کھلتی تھیں بلکہ دریا تک نیچے سیڑھیاں نکل کر آتیں۔ اس کے بعد کھلا کھلا علاقہ آتا گیا۔ حتیٰ کہ تختِ سلیمان کے پاس سے وہ ڈل گیٹ میں داخل ہوگئے۔ ایک کشتی اور ایک آدمی کو انہوں نے دریا میں ہی چھوڑدیا۔ تختِ سلیمان پر شنکر اچاریہ کا مندر نظر آرہا تھا۔ جھیل کے کنارے چلتے ہوئے سب سے پہلے نشاط باغ آیا پھر شالیمار باغ اور آخر میں سامنے کی سمت نسیم باغ تھا۔ وہاں پر کچھ وقت گزار کر پھر وہ خانقاہ حضرت بل پہنچے۔ جس کے پاس آبادی بھی تھی۔ خوش قسمتی سے اس دن زیارت بھی کھلی ہوئی تھی۔ چنانچہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ اس سے بڑھ کر کسی مسلمان کے لیے اور کیا سعادت ہوسکتی ہے اور پھر کشمیر کے لیے تو اس تبرک کی موجودگی ہی قابلِ فخر ہے۔ مغلیہ دور کے تعمیر شدہ باغات کو دیکھ کر اس کے دل میں بشاشت اور تفاخر کے جذبات پیدا ہوتے گئے کہ مسلمان حکمرانوں نے کشمیر کے حسن کو دوام بخشنے کے لیے کتنی محنت کی تھی۔ ایسے نادر باغات تعمیر کرائے اور پھر ان میں سدا چلنے والے فوارے لگوائے جن کی تازگی صدیوں گزر جانے کے باوجود ویسے کی ویسی ہی تھی۔ دوپہر کے قریب وہ واپس دریائے جہلم میں داخل ہوگئے۔ باہر والا ساتھی بالکل تیار کھڑا تھا اور ان کے دوپہر کے کھانے کا بندوبست بھی کرچکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سفر پر آگے روانہ ہوگئے۔

○☆○

وہ سری نگر شہر کے مضافات کو پیچھے چھوڑ کر اسلام آباد کی سمت آگے بڑھتے گئے۔ تقریباً پانچ چھ میل کے سفر کے بعد وہ پام پور کے مشہور علاقے میں پہنچے جہاں دنیا کا بہترین زعفران پیدا ہوتا ہے یا پھر کچھ زعفران صوبہ جموں کے کشتواڑ کے علاقے میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس فصل کے لیے زمین ڈھلوان رکھی جاتی ہے تاکہ پانی نہ کھڑا ہو۔ کھیت کے چاروں طرف فالتو پانی نکلنے کے لیے نالی بنادی جاتی ہے۔ ایک دفعہ بونے پر تین چار سال خود ہی پودے اگتے رہتے ہیں۔ گھاس کی طرح پودے کی شاخیں اور پتیاں نکلتی ہیں جن پر موسم خزاں میں زرد تین شاخہ پھول نکلتے ہیں اور پھولوں کے موسم میں ان کی خوشبو اردگرد کے ماحول میں اس طرح سے پھیل جاتی ہے کہ جو انسان اس خوشبو کے احاطے میں آتا ہے، اس کا دل خوشی سے معمور ہوجاتا ہے جس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور اس کا دل خواہ مخواہ ہنسنے کو چاہتا ہے۔ اس کے آگے اونتی پورہ کا قصبہ آیا لیکن شام تو پام پور کے پاس ہی ہوچکی تھی۔ اونتی پورہ میں پرانے مندروں کے کھنڈرات موجود تھے اور ہندو لوگ اور سیاح ان کی زیارت کے لیے اکثر آتے تھے۔ رات اونتی پورہ میں گزری۔ دوسری

صبح بہت جلد وہاں سے روانہ ہوئے اور شام تک اسلام آباد (اننت ناگ) کے مقابل جا پہنچے۔ اسلام آباد وادی کا دوسرا بڑا شہر ہے اور دریا سے ذرا ہٹ کر ہے۔ یہیں پر لدھڑندی آکر دریائے جہلم میں ملتی ہے بلکہ یہیں سے یعنی کھنابل سے آگے جہلم دریا کی صحیح شکل اختیار کرتا ہے۔ لدھڑندی کے کنارے کنارے ہی پہلگام کو جانے والی سڑک بھی جاتی ہے اور آگے یہی راستہ امرناتھ کے مشہور غار کو جاتا ہے جو ہندوؤں کے نزدیک بہت متبرک تیرتھ ہے اور اس کی زیارت کے لیے وہ بڑی دور دور سے آتے ہیں اور یہ راستہ دوسری طرف کشتواڑ اور بھدرواہ کو بھی جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر ان کا دریائی سفر ختم ہوگیا تھا اور ایک ہانجی اسلام آباد تحصیل دار کے ملازم کو اطلاع دینے چلا گیا تھا۔ وہ رات بھی انہوں نے وہیں بسر کی۔ دوسری صبح اسلام آباد کی جھلک بھی دیکھی۔ تحصیل دار کا سامان کشتیوں پر لدوا کر وہاں سے آگے روانہ ہوئے۔ گھر سے چلے انہیں پانچ دن ہوچکے تھے اور وہ اس وقت تک وادیٔ کشمیر کے اندر ہی تھے۔ اسلام آباد سے چل کر وہ اچھابل سے گزرے جہاں مغلیہ دور کا باغ تھا جس میں چنار کے خوبصورت بڑے بڑے درخت تھے جن کے متعلق لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ جہانگیر بادشاہ کے لگوائے ہوئے تھے۔ بجی باڑہ میں مغل شہزادے دارا شکوہ کا باغ دریا کے پار نظر آیا۔ اس کو جانے کے لیے دریا پر پل تھا۔ لیکن اس وقت وہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہاں پر چنار کے ایک درخت کا لپیٹ ۸۰ فٹ کے قریب تھا۔ اسی طرح چلتے چلتے قاضی گنڈ سے ہوتے ہوئے رات تک وہ ویری ناگ پہنچ گئے کیونکہ دریائے جہلم کا منبع دیکھنے کا شوق انہیں ادھر لے گیا۔ چشمے سے پانی اچھل کر گیند کے مانند نکل رہا تھا اور آگے خوبصورت باغ بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لیے دھرم شالہ تھی لیکن مسلمانوں کے لیے رات ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کشمیر میں مسلمان مغلوں کی عمارت کے نشانات ڈوگروں اور سکھوں کے مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکے اور ان میں سے اکثر عمارات اپنی پوری شان کے ساتھ موجود ہیں۔ رات انہوں نے ایک پن چکی میں گزاری اگلی صبح وہ وہاں سے بڑی اونچی چڑھائی چڑھتے بانہال درے پر پہنچے سامنے خشک پہاڑی ٹیلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں کہیں کہیں دریائے چناب کی جھلک موجود تھی جو اس علاقے سے سانپ کے مانند گھوم کر نکلتا ہے۔ پچھلی جانب کشمیر کی حسین و جمیل وادی تھی جو ان کا وطن تھا اور جسے وہ اپنی مادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے محنت و مزدوری کی خاطر عارضی طور پر چھوڑ رہے تھے۔ اس وقت اسے کیا خبر تھی کہ وہ حسین و جمیل وادی کبھی اس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی۔ درہ بانہال کی مثال اعراف کی طرح ہے جہاں سے جیسے جنت اور دوزخ ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ جموں کے پہاڑی سلسلے کو دوزخ کہنا اگرچہ مناسب نہیں اور شاید جموں کے لوگوں کو گراں گزرے لیکن اس تفاوت کی اور مثال بھی کیا دی جاسکتی ہے۔ بہرحال وطن پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے وہ آگے روانہ ہوئے۔ بانہال کی چڑھائی نے انہیں تھکا دیا تھا اس لیے بڑی مشکل سے شام تک رام سو پہنچے۔ اس کے بعد کے سفر میں سوائے اس کے کہ موسم خاصا گرم تھا، کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔ پانچ دن مزید سفر کرتے ہوئے بٹوت، کُد، چنہنی اور اودھم پور سے ہوتے ہوئے جموں تک پہنچ گئے۔ جموں میں دو دن رکے رہے۔ ایک تو حالات کا جائزہ لینے کے لیے اور دوسرے زادِ راہ ختم ہوچکا تھا۔ جموں سے سامنے ہی پنجاب کے میدان نظر آرہے تھے۔ رات کو جموں سے سیالکوٹ شہر کی روشنیاں دکھائی دیتی تھیں بس ایک جست کی ہی بات تھی۔ وہ دو دن دراصل مزدوری کی تلاش میں گزرے کہ کچھ ملے تو آگے روانہ ہوں۔ کچھ مزدوری ملی جس سے بس کھانا کھانے کا بندوبست ہوا۔ جموں میں ہی انہوں نے زندگی میں پہلی بار ریل گاڑی دیکھی تھی۔ جب مزدوری کا بندوبست نہ ہوسکا تو وہ چپکے سے رات کو سیالکوٹ جانے والی گاڑی میں چھپ گئے۔ صبح سویرے گاڑی روانہ ہوئی اور ابھی اندھیرا ہی تھا جب سیالکوٹ چھاؤنی کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ اس تمام عرصے میں وہ خدا سے دعا ہی کرتے رہے کہ وہ انہیں کسی مشکل میں مبتلا ہونے سے بچائے رکھے۔ سیالکوٹ چھاؤنی کے اسٹیشن پر وہ چپکے سے اتر گئے اور ایک طرف دبک کر بیٹھ گئے۔ گاڑی جب روانہ ہوگئی تو کافی دیر کے بعد وہاں سے نکلے اور سیالکوٹ شہر کی طرف چل پڑے۔ شہر میں گھومتے رہے اور کام تلاش کرتے رہے۔ اڈا شہباز خاں میں ایک لکڑی کا ٹال نظر آیا اور وہاں انہیں اپنے ہم وطن لکڑیاں پھاڑتے دکھائی دیے تو ان کے پاس جا پہنچے۔ علیک سلیک ہوئی۔ کام کا پوچھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ بہرحال عارضی قیام کا بندوبست تو ہوگیا۔ اگلے تین چار دن سیالکوٹ شہر میں کام کی تلاش میں پھرتے رہے۔ ریلوے اسٹیشن پر سامان اٹھانے کا کام کیا۔ دو آدمیوں کو ایک نالے کے پل پر نیکہ پورہ میں لکڑی پھاڑنے کا کام مل گیا لیکن گزارے کے لیے تمام لوگوں کو روزگار میسر نہ آیا۔ چنانچہ تین آدمی وزیر آباد روانہ ہوگئے۔ وزیر آباد میں داخل ہونے سے پہلے ہی خوش قسمتی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ چنانچہ چاول چھڑنے والے ایک کارخانے میں انہیں دھان سکھانے اور انہیں اٹھا کر کارخانے میں ڈھونے کا کام مل گیا۔ فیکٹری کا مالک

ایک کشمیری دین محمد بٹ تھا جس کے آباواجداد نے سکھوں کے زمانے میں کشمیر سے ہجرت کی تھی اور وزیر آباد میں آباد ہوگئے تھے۔ بٹ صاحب کا پہلے لکڑی کا ٹال تھا۔ دو تین سال پہلے انہوں نے دھان سے چاول نکالنے کی فیکٹری لگالی تھی۔ وہ لوگ دھان خرید لیتے اور پھر سکھا کر چاول نکالتے اور بیچتے۔ دوسرے لوگ بھی ان سے اپنے چاول چھڑاتے۔ پنجاب میں یہ بات کچھ اس طرح سے مشہور ہوئی تھی کہ ہر کشمیری مہاجر دوسرے کو بٹ ہی کہتا بلکہ دوسرے لوگ ہر کشمیری کو بٹ ہی کہتے۔ اس طرح دین محمد صاحب بھی بھٹی سے بٹ بن گئے۔ پہلے پہل تو لوگوں کو منع کرتے رہے پھر خود ہی بٹ کہلانے لگے۔ بٹ صاحب مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ انہیں اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اکثر کشمیر کی ہی باتیں کرتے رہتے بلکہ انہیں کشمیر کے حالات اور تاریخ وہاں پر موجود کشمیریوں سے بھی زیادہ معلوم تھی۔ کشمیریوں کی مختلف اقوام اور ان کی مختلف گوتوں کے متعلق ان کا علم بڑا وسیع تھا۔ پنجاب میں آباد کشمیریوں کے آباواجداد کے کشمیری پیر باقاعدہ ہر سال پنجاب میں اپنے خاندانی مریدوں کے ہاں آتے رہتے اور دعوتیں اڑاتے اور نذرانے وصول کرکے کشمیر لوٹتے۔ دعوتیں کیا ہوتیں، بس چاول، شلغم اور کشمیری نمکین چائے یا زیادہ سے زیادہ کبھی کبھار تھوڑا سا حلوہ ہوتا۔ پانچ روپے نیاز کے بھی وہ ہر گھرانے سے وصول کرتے اور اس سے خوش ہوکر سردیاں گزار کر اپنے بیوی بچوں کے لیے گرمیوں کا خرچا بنا کر لے جاتے۔ پنجاب میں کسی کشمیری خاندان میں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو پتا نہیں کس طرح کشمیری بھانڈوں کو اس کی اطلاع ہوجاتی اور وہ فوراً آپہنچتے اور نقلیں کرتے۔ گاتے اور شہنائیاں بجاتے، بولیاں بولتے اور اپنا نذرانہ وصول کرکے لوٹتے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بانس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا جس کا ایک حصہ تو ٹھوس ہوتا اور دوسرا پھٹا ہوا ہوتا۔ پھٹا ہوا حصہ وہ تماشا کرنے والے کے سر میں مارتا، اس طرح کبھی کبھار اردگرد جمع شدہ بچوں کے سروں پر لگا دیتا۔ دراصل انہی پیروں اور بھانڈوں نے ان مہاجر کشمیریوں کا رشتہ ان کے وطن سے قائم رکھا ہوا تھا ورنہ وہ تو کئی نسلوں سے پنجاب میں آباد تھے۔ زبان ترک کرچکے تھے اور اکثر نے کشمیر کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی اس لیے پنجاب کے کشمیری اپنے ہم وطن لوگوں کی خدمت کرکے خوش ہوتے تھے اور کشمیری ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے جب کہ اس دور میں کشمیر میں موجود کشمیری خود کشمیری ہونے کا دعویٰ کرنے سے شرماتے تھے کیونکہ ڈوگروں نے ان کی بزدلی کے کئی قصے بنا رکھے تھے تاکہ ان کی نسل کشی کرکے شجاعت سے ان کا تعلق توڑ دیا جائے تاکہ وہ کسی وقت بھی بغاوت پر نہ آجائیں۔

بٹ صاحب کے پاس کشمیر کے متعلق کئی کتابیں تھیں اور اپنا شجرۂ نسب تو انہوں نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہ تمام کشمیری اخبار جو لاہور اور امرتسر سے نکلتے تھے، منگواتے تھے۔ چند سال پیشتر گوجرانوالہ میں کشمیری کانفرنس ہوئی تھی۔ جس میں پنجاب میں آباد کشمیریوں کی برادری کی تنظیم کے متعلق مشورے بھی ہوئے تھے اور کشمیر میں آباد کشمیریوں کے حقوق کے متعلق کئی قراردادیں منظور ہوئی تھیں۔ بٹ صاحب نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ پنجاب میں آباد کشمیریوں کا ذکر بڑے فخر سے کرتے تھے کہ انہوں نے یہاں کتنا عروج حاصل کیا ہے۔ امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، پنڈی اور پشاور کے سرکردہ کشمیریوں کا ذکر کرتے جو سیاسی، مذہبی، ادبی اور معاشرتی لحاظ سے صفِ اوّل کے لوگ تھے۔ وہ یہ بھی بات بڑے فخر سے بتاتے کہ کسی گاؤں میں اگر ایک بھی کشمیری گھرانا موجود تھا۔ تو اس نے گاؤں کے زمینداروں اور چوہدریوں کے جاگیردارانہ چنگل سے وہاں کے لوگوں کو نکال کر ان کے مقابل کھڑا کردیا اور بڑی بہادری سے ان کے حقوق کی پاسداری کرائی۔ فنِ پہلوانی میں تو تمام قابلِ ذکر پہلوان صرف کشمیری ہی ہوتے۔ اس فن کو انہوں نے کسی دوسری قوم میں جانے ہی نہیں دیا۔

اسے سب یاد تھا کہ دین محمد بٹ نے ان سے کس طرح اچھا سلوک کیا۔ فیکٹری میں الگ ایک کمرا ان کے رہنے کے لیے دیا۔ جلانے کے لیے لکڑی بھی انہیں وہیں سے مل جاتی۔ کھانے کے لیے چاول بھی انہیں کارخانے سے مل جاتے۔ بٹ صاحب نے فیکٹری میں ہی بھینسیں رکھی ہوئی تھیں اور ملازم ان کا دودھ دوہ کر ان کے گھر دے آتا تھا، ان کی چائے کے لیے دودھ بھی انہیں وہیں سے مل جاتا۔ ایک طرح سے ان کے کھانے اور رہنے کا بندوبست مفت ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی بٹ صاحب انہیں اپنے گھر سے بھی کھانا بھجواتے۔ ان کا کام اتنا تھا کہ وہ سارا دن پڑوں (میدانوں) میں مُونجی (دھان) سوکھنے کے لیے پھیلا دیتے اور شام کو اکٹھی کرکے بوریوں میں بھر دیتے یا ان پر موٹا کپڑا ڈال دیتے تاکہ اوس سے محفوظ رہے۔ رات کو وہ شلغم بہت کھا کر نمکین چائے پیتے اور پرالی اور لکڑی کے دھوئیں میں آگ تاپتے۔ گاتے شغل کرتے گزار دیتے۔ دن میں فرصت کے وقت دھوپ تاپتے۔ کبھی کبھار کپڑے دھوتے اور اگر ان کے کپڑوں میں جوویں پڑجاتیں تو انہیں نکالتے رہتے یا پھر قیلولہ کرتے، وقت گزار دیتے۔ وہ جتنا عرصہ بھی وزیر آباد میں رہے، بہت خوش رہے بلکہ ایک دفعہ ان کے کارخانے کے مالک دین محمد بٹ صاحب انہیں اپنے بیٹے کی شادی

پر گوجرانوالہ لے گئے۔ بارات لاریوں میں گئی۔ راستے میں گکھڑ کے قصبے کے قریب ایک لاری میں نقص پڑ گیا اور انہیں رکنا پڑا تو وہاں پر بٹ صاحب کے ایک دوست نے جو دریوں کا کاروبار کرتے تھے، تمام بارات کی دودھ اور مٹھائی سے تواضع کی اور گوجرانوالہ میں بھی بارات کی بڑی خاطر مدارات کی گئی اور بٹ صاحب نے اپنے کئی رشتے داروں سے انہیں ملوایا تھا۔ انہوں نے پنجاب کے کشمیریوں کی شادیوں میں بھی کشمیری روایات کو موجود پایا کیونکہ کشمیری خواہ کتنا غریب ہی کیوں نہ ہو، شادی اور غمی کے موقعوں پر خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتا خواہ اسے کتنا ہی مقروض کیوں نہ ہونا پڑے۔ کشمیری مزدور کشمیر میں سردی کی شدت کی وجہ سے اکثر پنجاب کے ملحقہ علاقوں میں مزدوری کے لیے چلے جاتے اور سردیوں میں محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے اور بچوں کے لیے کچھ رقم پس انداز کرکے واپس لے جاتے لیکن کسی نے کبھی انہیں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے مقابلے میں افغان قبائلی مزدور بھی سردیوں میں پنجاب میں مزدوری کے لیے آتے۔ دن کو مزدوری کرتے کچی دیواریں بناتے اور رات کو مسجدوں میں ٹھہرتے اور محلے والوں سے کھانا' خدا کے نام پر کھاتے۔ ویسے وہ شاید اپنی رسم مہمان داری کے مطابق لوگوں سے کھانا لے کر کھانا اپنا حق سمجھتے ہوں۔ سردیوں کے پانچ ماہ انہوں نے وزیر آباد میں گزارے۔ مالک نے انہیں تمام سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں جبکہ دوسرے کارخانوں میں دوسرے مزدوروں کو وہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔ بٹ صاحب انہیں نہانے دھونے اور کپڑے صاف رکھنے کی تاکید کرتے رہتے لیکن وہ تو جیسے اپنی کشمیر کی عادت سے مجبور تھے جو انہیں غلامی اور غربت کی وجہ سے ورثے میں ملی ہوئی تھی' اسے کیسے بدل دیتے کیونکہ کشمیر میں صاف ستھرے کپڑے پہننے کا مطلب تھا معاشی خوش حالی اور اس صورت میں تو ڈوگرے ان کے مکانات کی پھٹیاں تک اتار کر لے جاتے۔ اس لیے انہیں اپنی گندہ رہنے کی عادت کی تبدیلی منظور نہ ہوئی۔

گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی مُونجی کا کام بھی ختم ہو گیا اور انہوں نے واپس وطن جانے کا پروگرام بنایا۔ بٹ صاحب نے انہیں پچاس پچاس روپے دیے حالانکہ ان کی مزدوری اتنی نہیں بنتی تھی اور کپڑوں کا ایک ایک نیا جوڑا بھی لے کر دیا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کے لیے کچھ کپڑے خریدے اور ساتھ لے جانے کے لیے نمک بھی خریدا۔ بٹ صاحب نے وزیر آباد سے جموں تک کے ریل کے ٹکٹ بھی خرید کر انہیں گاڑی میں سوار کرا دیا۔ انہوں نے رات کو جموں پہنچنے والی گاڑی کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ دن کے وقت ان کے نئے کپڑے' نمک اور دوسری اشیا اگر کسٹم والوں کی نظر میں آ گئیں تو ٹیکس کے اتنے پیسے دینے پڑیں گے کہ سردیوں کی محنت بدمزہ ہو جائے گی اور پھر خود ان پر بھی فی آدمی چھ آنے ٹیکس لگتا تھا۔ انہوں نے پھٹے پرانے کپڑے پہن لیے اور اپنے سامان کی گٹھڑیاں بنا لیں اور گاڑی میں سیٹوں کے نیچے گھس کر بیٹھ گئے۔ کمرے تاریک ہونے کی وجہ سے چپکے سے دبکے رہے اور جموں میں گاڑی کے داخل ہوتے ہی چپکے سے اتر کر شہر میں داخل ہو گئے۔ ڈوگرہ حکمران اور کارندے اگرچہ کشمیریوں کی چمڑی ادھیڑنے میں بڑے ماہر تھے لیکن کشمیریوں نے بھی ان کو فریب دینے کے لیے کافی حربے ایجاد کر رکھے تھے۔ اپنی محنت کی کمائی سے انہیں ڈوگروں کو ٹیکس دینا بڑا ہی تکلیف دہ محسوس ہوتا تھا۔ جموں سے آگے انہوں نے سفر بڑی جلدی میں طے کیا اور ایک ہفتے میں وہ اپنے گھر جا پہنچے۔ واپسی پر سری نگر میں رکنے کو اس کا جی تو بڑا چاہا لیکن سامان اور گھر والوں سے ملنے کے لیے خواہش شدید ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی گھر جا پہنچا تھا۔

گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ماں نے کچھ روپے مکان کی مرمت کے لیے رکھ کر باقی زمین میں گاڑ کے کسی کونے میں دبا دیے تاکہ اگلے سال اس کی اور اس کے بھائی کی شادی میں کام آئیں۔ اس سال فصل بھی کچھ اچھی ہوئی جس سے کچھ رقم مزید پس انداز ہو سکی پھر اسے یاد آیا کہ اگلے سال وہ اور اس کا بڑا بھائی دونوں ہی مزدوری کرنے پنجاب جانے کے لیے تیار تھے۔ وزیر آباد میں بٹ صاحب نے چونکہ ان سے بڑا اچھا سلوک کیا تھا اس لیے انہوں نے وہیں واپس جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اس سال انہوں نے وادی جہلم کا راستہ اختیار کیا۔ سری نگر سے کوہالہ تک سڑک دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ کوہالہ کے بعد براستہ مری راولپنڈی پہنچتی ہے۔ گرمیوں میں پنڈی سے موسم کے لیے لوگ تانگے سری نگر جایا کرتے تھے اور گرمیاں گزارنے کے بعد واپس پنڈی آجاتے۔ آتے وقت وہ تازہ اور خشک فروٹ لے آتے۔ انہیں سفر کے لیے ایسا تانگے والا مل گیا جو اکیلا ہی سفر کر رہا تھا جس کو انہوں نے صرف دو روپے دیے۔ تو وہ انہیں راولپنڈی لے جانے کے لیے مان گیا۔ اس کے ساتھ سامان بھی تھا اس لیے اسے رستے میں کسی ساتھی کی بھی ضرورت تھی۔ اس طرح وہ تانگے کے سفر میں وہ پانچویں روز راولپنڈی پہنچ گئے۔ اس سفر میں بارہ مولا سے چل کر رام پور' اوڑی' چکوٹھی' چناری' ہٹیاں' گڑھی دوپٹا' دو میل' دلائی' کوہالہ' بھکواڑی' علیوٹ' سہر بگلہ' جھیکا گلی' سنی بنک (مری)' گھوڑا گلی' کمپنی باغ' چھتراپانی' تریٹ' چھتر' بارہ کوہ جیسے مقامات آئے۔ راتیں انہوں نے چکوٹھی۔ دو میل' بھکواڑی اور گھوڑا گلی میں گزاریں۔ پنڈی سے پیدل چل کر وہ تین دن کے مسلسل سفر کے بعد وزیر آباد جا پہنچے۔ بٹ صاحب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بڑی عزت سے پیش آئے۔ گھر والوں کی خیر خیریت پوچھی اور انہیں فوراً کام پر لگا لیا اور پہلے کی طرح رہنے کے لیے کارخانے میں ہی ایک کمرا دے دیا۔ اب ان کو وہ دھان سکھانے کا کام کرتے تو رات کو بارہ بجے تک دونوں بھائی ایک لوہار کی دکان پر مزدوری کرنے لگے۔ جہاں چاقو چھریاں بنتی تھیں۔ ایک بھائی بھٹی کا پہیا چلاتا اور دوسرا ہتھوڑا چلاتا۔ کبھی کبھی ڈیوٹی بدل بھی لیتے۔ آدھی رات کو سو لیتے اور دن میں بھی فرصت ملتی تو تھوڑی نیند پوری کر لیتے۔ ان سردیوں میں انہوں نے مل کر ڈیڑھ سو روپیہ جمع کر لیا۔ بٹ صاحب کو جب پتا چلا کہ دونوں بھائیوں کی شادیاں ہونے والی ہیں تو انہوں نے دس دس روپے دونوں کو مزید شادیوں کی خوشی میں دیے اور وعدہ کیا کہ اگر انہوں نے دعوت دی تو وہ ان کی شادی میں بھی شریک ہوں گے پھر اس سال واپسی پر دونوں بھائیوں کی شادیاں ایک ساتھ ہی کر دی گئیں۔ شادی کے بعد انسان کی زندگی میں سب سے اہم موڑ آتا ہے جو اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے بلکہ اس کی ہر چیز دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے کی محبتوں کا امتحان شروع ہو جاتا ہے کیونکہ مقابلے پر کچھ اور محبتیں آجاتی ہیں جو اپنا حق فائق سمجھتی ہیں۔ پہلے زمانے میں یہ فرق کم ہوتا تھا اور نئی محبتوں کی شدت اتنی تیز نہیں ہوتی تھی کہ وہ خود کو اتنا نمایاں اظہار کر سکتیں لیکن آج کے دور میں تو نئے رشتے اکثر پرانے رشتوں کو ختم کرکے ہی پروان چڑھتے ہیں اور مفاہمت کی راہ پر نہیں آتے۔ حساس انسان ان رشتوں کے درمیان کچھ اس طرح سے لٹک جاتے ہیں کہ زندگی ان پر جہنم بن جاتی ہے لیکن اس دور میں ان دونوں بھائیوں کی شادیاں ان کی زندگی پر اتنا اثر انداز نہ ہو سکیں۔ بس اتنا ہوا کہ ان کے گھر میں دو نفوس کا اضافہ ہو گیا اور وہاں انہیں سونے کے لیے الگ الگ کمرے بھی مل گئے۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ شادی کے وقت اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی اور ابھی داڑھی بھی پوری طرح سے اس کے نہ اتری تھی۔ ان کی ماں نے بڑی مدت سے اس موقع کے لیے رقم جمع کر رکھی تھی اور کچھ رقم وہ کما کر بھی لائے تھے اس لیے ان کے والد نے ان کی شادیاں بڑی دھوم دھام سے کیں اور ہوئیں بھی دونوں بھائیوں کی ایک ہی گھر میں۔ ان کے گاؤں سے آٹھ دس کوس آگے سوپور کے قریب ایک گاؤں میں ان کے سسرال والے دور سے پہلے بھی ان کے رشتے دار تھے۔ لوگ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تمام کشمیریوں کی نانی ایک ہے پھر اپنی شادی کی تمام تفصیل اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ واقعات تو تقریباً تمام یاد تھے لیکن ذہن سے کچھ لوگوں کی تصویروں کی شناخت کھو چکی تھیں اور کوئی ان کا واضح تصور ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ شادی سے پہلے مہندی اور پانی کی ساری رسومات ایک ایک کرکے اسے یاد آتی رہیں۔ شادی کی صبح سویرے تیاری اور پھر وہاں سے بارات کی روانگی اب تک اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی وہ سسرالی گاؤں پہنچ گئے تھے۔ نکاح کی رسومات ادا ہوئیں اور شام کو وہ دلہنیں ڈولیوں میں ڈالے واپس اپنے گھر آ پہنچے۔ رات بھر ان کے گھر میں شہنائیاں گونجتی رہیں۔ بینڈ باجے تو شادیوں پر پنجاب میں بھی بجانے کا رواج ہے پر پہاڑی علاقوں میں اور خاص طور پر کشمیر میں رات کی خاموشی میں کشمیری شہنائی جتنی بھلی لگتی ہے اس کا تصور اہلِ پنجاب نہیں کر سکتے۔ دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دی گئی جس میں علاقے کے تمام لوگ شریک ہوئے۔ کھانا پکانے کے لیے باورچی بارہ مولا سے منگوائے گئے۔ انہوں نے گوشت کئی قسموں میں پکایا جس نے بھی کھایا' ہاتھ چاٹتا رہ گیا۔ کشمیری دعوتوں میں آخری ڈش گوشتابہ ہوتی ہے جو گوشت ہی سے تیار کی جاتی ہے۔ کشمیر میں پرانے وقتوں سے دعوتوں کے رسم و رواج کچھ ایسے اعلیٰ قسم کے ہیں جس سے کشمیر کی پرانی معاشی خوش حالی اور ترقی یافتہ معاشرے کا واضح تصور ذہن میں آتا ہے۔ زمین پر فرش بچھا کر دسترخوان لگایا جاتا ہے۔ جس کے دونوں جانب مہمانوں کو بٹھایا جاتا۔ کھلے تھالوں میں چاول آتے ہیں جسے چار چار مہمان مل کر کھاتے ہیں پھر باری باری سالنوں کی دیگچیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وازہ مہمان کے سامنے کے چاولوں پر مختلف ڈشوں سے سالن ڈالتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چاول ختم ہو جائیں اور اگر کسی کو اور چاول درکار ہوں تو وہ لے سکتا ہے۔ گوشتابہ کی ڈش اس بات کی علامت سمجھی جاتی ہے کہ یہ آخری ڈش ہے۔ اس کے بعد چلمچی میں سب کے ہاتھ دُھلائے جاتے ہیں اور بعد میں نمکین کشمیری چائے کا دور چلتا ہے۔

کشمیر کے حکمران ویسے تو کشمیریوں کو مالدار ہونے ہی نہیں دیتے لیکن پھر بھی کشمیری دو موقعوں کے لیے رقمیں جمع کرکے رکھتے ہیں اور ضرورت پر قرض لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایک شادی اور دوسرے موت پر۔ چنانچہ ان کے والد نے بھی ان کی شادی خوب دھوم سے کی۔ یہ اور بات ہے کہ اگلے دو تین سال انہیں پنجاب میں مزدوری کرکے یہ قرض اتارنا پڑا

کیونکہ سُود پر قرضہ لینا ایک مستقل مصیبت میں پھنسنا ہوتا ہے بہرحال ان کے والدین نے اپنی خوشی پوری کی اور ظاہر ہے کہ خود ان کی اپنی شادی تھی، وہ کیوں نہ خوش ہوتے۔ بٹ صاحب کو وزیر آباد انہوں نے دعوت نامہ لکھ کر بھیجا لیکن شاید انہیں وقت پر ملا نہیں کیونکہ وہ ان کی شادی میں شامل نہ ہو سکے پھر تین سال بعد انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کی بھی شادی کردی۔ وہیں پاس کے گاؤں میں ایک لڑکا تھا جو اپنے باپ کے ساتھ مل کر زمینداری کرتا تھا۔

○☆○

رمضان کو یاد تھا کہ جب اس کی عمر بیس سال کی ہوئی تو وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ لڑکا بڑا تھا اور اس کا نام شعبان اور لڑکی چھوٹی تھی۔ ان گرمیوں میں علاقے کا تحصیلدار دورے پر آیا تو کارندے ان کے گھر سے تمام مرغیاں اور ان کے باغ سے تمام درختوں کے پھل نوچ کر لے گئے۔ اس حادثے کے چند دن بعد علاقے کا پولیس انسپکٹر بارہ مولا کے دورے پر آیا تو سپاہیوں نے پھر ان کے گھر کا رخ کیا جس پر پولیس کے سپاہی سے اس کی تلخ کلامی ہوگئی۔ پنجاب کے علاقے میں چند سال کچھ وقت گزارنے کے بعد اس میں کچھ جُرات پیدا ہوگئی تھی اور پھر خود کشمیر میں بھی آزادی کی ایک لہر اٹھ رہی تھی اور ڈوگرہ حکمرانوں اور ان کے کارندوں سے بیزاری پیدا ہوچکی تھی۔ بیزاری تو پہلے بھی تھی لیکن کشمیر میں کچھ لیڈروں اور پنجاب کے سیاسی لیڈروں کی کشمیر سے دلچسپی نے لوگوں میں ظلم برداشت کرتے رہنے کے بجائے مدافعت کرنے کی کچھ جُرات پیدا کردی تھی کچھ عرصہ پہلے شیخ عبداللہ نے بارہ مولہ میں تقریر کی تھی جس کی سارے علاقے میں گونج تھی اور لوگ شیخ عبداللہ کے گرویدہ ہورہے تھے۔ ان حالات میں اس میں ایسی جُرات پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ پولیس کے سپاہی کے رویے کے خلاف اس کے احتجاج نے سپاہی کو اور مشتعل کردیا اور اس نے اسے ماں بہن کی گالیاں دیں۔ گالی سنتے ہی اس نے سپاہی کے منہ پر طمانچہ ماردیا جس سے ایک طوفان کھڑا ہوگیا۔ سپاہی اکیلا ہی تھا اس لیے خیر گزری اور وہ فوراً بارہ مولا تھانے میں مدد لینے کے لیے چل دیا۔ معاملہ خاصا سنجیدہ ہوگیا تھا کیونکہ سپاہی نے اپنی وردی بھی پھاڑ لی۔ جس سے وہ اس کے خلاف مضبوط کیس بنانا چاہتا تھا اس لیے تمام لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ وہ فوراً وہاں سے بھاگ جائے اور جتنی جلدی ہوسکے ریاستی حدود سے نکل جائے کیونکہ ڈوگرے اپنے پولیس کے سپاہی کی توہین اور مارپیٹ ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔

وہ ستمبر ۱۹۳۹ء کی ایک سہ پہر تھی جب اسے اپنے گھر والوں کی خواہش کے مطابق اپنے گھر سے فرار ہونا پڑا۔ اُوڑی والا رستہ سیدھا تھا مگر اُدھر جانے کے لیے بارہ مولا سے گزرنا پڑتا لہٰذا اس نے ٹیٹوال کی طرف سے مظفر آباد اور پھر آگے ہزارہ کی طرف نکلنے کا پروگرام بنایا۔ وہ خود اپنی اس کارروائی پر نہ تو نادم تھا اور نہ ہی خوف زدہ لیکن دوسرے لوگوں اور خود گھر کے افراد نے آگے آنے والی مشکلات کے پیشِ نظر اسے خوف دلا کر مشورہ دیا تھا اس لیے اسے راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ فرار ہوتے وقت نہ تو وہ اپنے تین سالہ بچے شعبان کو پیار کرسکا اور نہ ہی ایک سالہ معصوم بچی کو گود میں لے کر شفقت کا ہاتھ پھیر سکا۔ حتیٰ کہ بیوی سے چند رُخصتی کلمات بھی نہ کہہ سکا کیونکہ اس وقت خود اس سمیت سب کا یہی خیال تھا کہ حالات درست ہوتے ہی وہ واپس گھر آجائے گا لیکن قدرت کے کھیل ہی نیارے ہوتے ہیں۔ حالات نے اس کے بعد ایسے رخ اختیار کیے کہ وہ بعض دفعہ وسائل اور موقع میسر آنے پر بھی اپنے گھر واپس جانے پر قادر نہ ہوسکا۔ اب تو اسے اپنے بچوں اور بیوی کی شکل بھی صحیح طور پر یاد نہ تھی۔ اس واقعے کو چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ ان میں سے کوئی زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ اگر زندہ ہیں تو کس حال میں۔ اسے تو یہ بھی پتا نہ لگ سکا کہ اس کے فرار کے بعد ڈوگروں کے کارندوں نے اس کے والدین اور بیوی بچوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اگر اس کی اولاد ٹھیک ٹھاک ہوئی تو اس وقت خود پوتوں نواسوں والی ہوگی۔ یہ عجیب بے کلی جو اس کے حصے میں آئی تھی اور وہ کیسا منحوس وقت تھا جب وہ واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا۔ کئی دفعہ وہ سوچتا کہ اگر وہ وہاں رہ بھی گیا ہوتا تو بھلا کیا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ پولیس والے اسے مارپیٹ لیتے، چند برس کی قید سنادیتے لیکن رہائی کے بعد وہ اپنے خاندان میں تو رہتا۔ جدائی کے یہ طویل لمحے تو اس کے حصے میں نہ آتے اور اگر وہ اسے جان سے مار بھی دیتے تو کم از کم اپنی سرزمین میں ہی دفن کرتے ان پُر فضا ہواؤں اور خوشنما بہاروں کی سرزمین میں جن کی موجودگی کا شعور اسے بہت بعد حاصل ہوا۔ اب تو زندگی کے آخری زمانے میں اسے یہ بھی امید نہیں رہی کہ وہ کم از کم اپنی سرزمین پر قبر ہی حاصل کرسکے گا۔ جدائی اور فرقت کے ان چند سالوں میں اس کے دل میں وطن کی محبت اس درجہ عود کر آئی تھی کہ بعض دفعہ وہ اپنی بے بسی پر رو دیتا۔ پچھلے چالیس سال اس نے بھرپور مصروفیت میں گزارے تھے اور قومی اور ملی جذبے نے اس کی تمام محبتوں پر گرفت رکھی لیکن ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بڑھاپا اور پھر تنہائی اسے سوچ کے گہرے غاروں میں لے جاتی اور اسے ایسے محسوس ہوتا کہ قومی جذبہ

کوئی چیز نہیں اجتماعی فلاح کی کوشش کرنا بے وقوفی ہے۔ انسان کو صرف اپنا ذاتی مفاد ہی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اگر اس نے بھی اپنی زندگی کو سنوارنے کی خواہش کو پیشِ نظر رکھا ہوتا تو آج اس طرح بے وطن اور تنہا نہ ہوتا۔ قومی خدمت اور پیشہ ورانہ دیانت نے اسے کیا دیا بلکہ اس نے خود اپنے ساتھ اور اپنے بال بچوں کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ اپنے والدین کی بے چینی اور کسک تو اسے ابھی تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔ انسانی ذہن بھی کیا چیز ہے۔ صدیوں پر محیط گزرے واقعات جب دُہرانے پر آتا ہے تو چند لمحوں میں ہر چیز نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے اور ٹیپ ریکارڈر اور ویڈیو فلم کی طرح جہاں سے چاہو ایکشن ری پلے کرکے دیکھ لو۔ اس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس کا گھر صرف اڑتالیس میل کے فاصلے پر ہی تو تھا لیکن اس فاصلے پر جیسے کئی صدیاں حائل ہوچکی تھیں اور ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ جس کی بنیاد دو قومی نظریے کی تاریخ قائم تھی لیکن کچھ قوتوں نے اس کے وطن کی وحدت پر اس نظریے کا اثر نہیں ہونے دیا تھا اور انہیں اس طرح سے بانٹ رکھا تھا کہ سر کہیں ہے تو دھڑ کہیں۔ باپ کہیں ہے تو بیٹا کہیں۔ خاوند کہیں ہے تو بیوی کہیں اور ماں باپ ایک طرف ہیں تو بیٹی دوسری طرف بلکہ کئی جگہیں تو ایسی ہیں کہ جہاں دریا کے دونوں پار کے لوگ آپس میں رشتے دار ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، ہاتھ سے اشارے بھی کرسکتے ہیں لیکن قریب آ کر مل نہیں سکتے کہ دریا کنٹرول لائن کا کام کررہا ہے اور دونوں طرف دونوں ملکوں کی فوجیں براجمان ہیں۔ .... بحیثیت مسلمان کشمیریوں کے معاشرتی، معاشی، مذہبی سارے روابط پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں لیکن عوام کے جذبات تو لیڈروں کی خواہشات سے ابھرتے ہوئے پُرپیچ الفاظ میں گم رہتے ہیں اور دوسرے ممالک کے لوگوں کو کشمیریوں کے جذبات سے بھلا کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ دونوں ممالک کو صرف اپنے اپنے مینٹل پیسوں پر سجانے کے لیے کشمیر جیسے ڈیکوریشن پیس کی ضرورت ہے اس لیے انسانوں کے جذبات کی ان کے نزدیک کیا قدر ہوسکتی ہے۔ حقائق بڑے تلخ ہوتے ہیں دراصل یہ برطانیہ کے مکار اور تجارتی ذہن کی پیدا کردہ کڑی ہے جس کے تحت اس نے پہلے ۱۸۴۶ء میں معاہدہ امرتسر کے تحت گلاب سنگھ کے ہاتھوں کشمیریوں کو فروخت کیا اور پھر دوبارہ کشمیر کو آزادی دیتے وقت اسے بھارتی بنیے کے ہاتھوں ریڈ کلف ایوارڈ کی معرفت اور ماؤنٹ بیٹن کی مرضی سے فروخت کردیا۔ ساری دنیا کی آزادی کے گُن گانے والا اور انسانی حقوق کی باتیں کرنے والا یہ ملک ایک ایسا دلال ہے جو اپنی بیٹی کی عصمت کی قیمت وصول کرنے سے بھی دریغ نہ کرے۔ رمضان کی بڑی خواہش تھی کہ اگر اس کے پاس وسائل ہوتے تو ان معاہدوں کے خلاف بین الاقوامی عدالت میں انگریزوں کے خلاف مقدمہ کھڑا کرتا کہ وہ کون سے اختیارات تھے جن کے تحت ڈوگروں کے ظلم و ستم سہنے کے لیے کشمیریوں کے دام وصول کیے اور پھر بھارتی راکھشسوں کے ہاتھوں ان کی عصمت فروخت کی۔ ایسے مقدمے سے اگرچہ انصاف میں کشمیریوں کو کچھ بھی نہ ملتا لیکن انگریزوں کی شرمناک حرکتوں سے دنیا تو آگاہ ہوتی لیکن پھر وہ سوچتا بیسویں صدی کے آخری ربع میں سیاست منافقت کے علاوہ ہے بھی کیا؟ ہر جھوٹ بولنے والا سیاست داں اپنی سچائی کا پرچارک ہے کیونکہ اس دور میں کامیابی کی یہی دلیل ٹھہری ہے کہ کوئی جتنا زیادہ جھوٹ نباہ سکے وہ اتنا ہی زیادہ بڑا سیاست داں ہے اور پھر چھوٹے اور بڑے سیاست داں کے پیشِ نظر صرف ذاتی مفاد ہیں، قومی مفادات بھی اگر ہوں تو ان کے اپنے وضع کردہ ہوتے ہیں چاہے سارا زمانہ انہیں گمراہی تصور کرے۔ یہ ساری چیزیں اس کے ذہن میں گڈمڈ رہتیں۔ جس سے اس کے حلق میں بھی اور مزاج میں بھی تلخی بھر جاتی۔ وہ اپنے وطن میں اجنبی تھا، اپنے وطن میں پردیسی تھا۔ حتیٰ کہ حکومتی کارندوں نے اسے کشمیری ماننے سے ہی انکار کردیا تھا اور اسے غیر کشمیری قرار دے کر مکان کے لیے ایک ٹکڑا زمین خریدنے کا نااہل قرار دے دیا تھا۔ وہ گزرے ہوئے واقعات کو دُہرانے میں گم تھا کہ زندگی کا کوئی واضح مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جب وہ سوچ کی گہرائی میں چلا جاتا تو ماحول سے بے گانہ ہوجاتا۔ اسے محسوس ہی نہ ہوتا کہ وہ کہاں ہے اور کون ہے پھر وہ یہ بھی تلاش کرتا رہتا کہ کشمیر کہاں

ہے؟ پاکستان کا نقشہ دیکھتا تو سارے کشمیر کو اس میں موجود پاتا۔ اگرچہ اس میں سرخ نقطے اور خونی لکیر ہوتی (ویسے اب کچھ لوگوں نے کئی نقشے ایسے شائع کیے ہیں جن میں کشمیر کو پاکستان میں شامل نہیں دکھایا گیا) بھارت کا نقشہ دیکھتا تو کشمیر سالم کا سالم اس میں موجود ہوتا اور دنیا کے دیگر ممالک کے شائع شدہ نقشے دیکھتا تو کشمیر نہ بھارت میں ہوتا اور نہ پاکستان میں بلکہ ایک علیٰحدہ اکائی کی شکل میں سرخ لکیردار جال میں الجھا نظر آتا جیسے دونوں طرف سے سرخ تیروں کے نشانات اس علاقے میں گھستے چلے جا رہے ہوں پھر وہ سوچتا کہ نہ تو کشمیر پاکستان میں ہے اور نہ بھارت میں اور نہ علیٰحدہ، اس کی کوئی حیثیت ہے تو پھر آخر کشمیر ہے کہاں؟

پھر وہ خود ہی کہتا کہ کشمیر تو کشمیریوں کے دل میں ہے۔ ان کشمیریوں کے دل میں بھی اسی طرح موجود ہے جن کو کشمیر سے بچھڑے صدی سے بھی زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ جس طرح فلسطین کا وجود فلسطینیوں کے دل میں ہے جہاں ایک بھی فلسطینی موجود ہے وہی جگہ فلسطین ہے۔ سامراجی قوتیں کتنی بھی کوششیں کریں، وہ فلسطینیوں کے دل سے ان کی ملکی محبت نہیں چھین سکتیں۔ آخر وہ انہیں کتنی دیر جلاوطن رکھیں گی، کتنی لمبی دربدری پر مجبور کر سکیں گی۔ ایسے ہی جب تک ایک بھی کشمیری سپوت موجود رہے گا، کشمیریوں کی اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد زندہ رہے گی۔ کبھی نہ کبھی یقیناً ان کی نسل سے کوئی سپوت پیدا ہوگا جو دنیا کے نقشے پر کشمیر کا تشخص اپنے خونِ جگر سے ابھارے گا کیونکہ آزادی کبھی خون کا نذرانہ دیے بغیر نہیں ملا کرتی۔

اپنے گھر سے جلاوطنی کے لیے اس نے کاجی ناگ (قاضی ناگ) کا دشوار گزار راستہ منتخب کیا تاکہ پولیس والوں سے بچ سکے۔ گاؤں سے نکل کر وہ بارہ مولا سے اوتر مچھی پورہ کی طرف جانے والے راستے پر ہولیا۔ وہاں سے پانزگام اور نوگام تک پہنچا پھر پہاڑی سلسلہ قاضی ناگ عبور کیا اور اکنھا قاضی ناگ (نالہ) کے ساتھ ساتھ چلتا مہاراج گنڈ اور امروئی سے ہوتا ہوا کرناہ کے علاقے میں ٹیٹوال اور دریائے کرشن گنگا (نیلم) کے کنارے پہنچا جو جنگ بندی لائن کے وجود میں آنے کے بعد سرحد قرار پایا اور جس کے ایک کنارے پر بیٹھ کر دوسرے کنارے والے لوگوں کو گھورا تو جا سکتا تھا۔ ہاتھ سے اشارہ بھی کیا جا سکتا تھا لیکن ان سے ملاقات ممکن نہ تھی۔ دریا کے آر پار گرے ہوئے ایک درخت کے تنے سے گزر کر اس نے دریا پار کیا اور دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہی نوسہری تک جا پہنچا وہاں سے مظفر آباد قریب ہی تھا۔ چنانچہ اس نے مظفر آباد کی

لکڑمنڈی سے ہی لوہارو گلی کی سڑک والا راستہ ترک کیا اور سیدھا پہاڑ پر چڑھ کر دوسری سمت اتر گیا۔ سامنے برار کوٹ کی ریاستی کسٹم چوکی نظر آرہی تھی۔ وہ پہاڑ کی دوسری جانب دریائے کنہار کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ دریا کی دوسری سمت سڑک موجود تھی۔ ایک رسّی کا پُل پار کرکے وہ اس سڑک تک جا پہنچا اور اب اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ریاستی حدود سے نکل کر ہزارہ کے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔ اسے سفر کرتے چھٹا روز تھا اس لیے تھک کر وہ بالا کوٹ کی مسجد میں چنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں جا کر لیٹ گیا۔ یہ مسجد دریا کے کنارے پر تھی وہاں کے مولوی صاحب سے نماز کے بعد ملاقات ہوئی انہیں اس نے اپنی کہانی سنائی۔ انہوں نے اس کے لیے کھانے کا بندوبست کردیا اور بالا کوٹ کی اس مسجد کی تاریخی حیثیت کے متعلق بھی بتایا۔ اسی مسجد کے ملحقہ قبرستان میں سید احمد شہیدؒ کا مزار تھا اور ان کے ساتھی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مزار گاؤں سے ذرا ہٹ کر ایک نالے کے کنارے والے قبرستان میں تھا۔ مولوی صاحب نے ان بزرگوں کے کارہائے نمایاں سے اسے آگاہ کیا۔ اس وقت اس نے اگرچہ بڑی عقیدت سے ان کا تذکرہ سنا لیکن حقیقی طور پر اسے بعد میں ان کے متعلق لٹریچر پڑھ کر معلوم ہوسکا کہ ان اصحاب نے سکھوں کے عہد میں ان کے مسلمانوں پر مظالم سے متاثر ہو کر ان کے خلاف جہاد شروع کیا۔ چنانچہ انہوں نے قندھار کے راستے کابل پہنچ کر صوبہ سرحد سے اس جہاد کا آغاز کیا اور پشاور کے علاقے فتح کر لیے اس کے بعد وہ ہزارہ کے راستے کشمیر کی طرف آنا چاہتے تھے کہ اپنوں کی ہی سازش کا شکار ہو گئے۔ علاقے کے بااثر لوگوں کی غداری کی وجہ سے سخت معرکہ ہوا جس میں یہ دونوں بزرگ شہید ہو گئے اور اس طرح سے ان کا کشمیریوں کو سکھوں کے عذاب سے نجات دلانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ سکھوں کے بعد ڈوگرے کشمیر کی قسمت کے مالک بنے تو وہ سکھوں سے بھی بدتر تھے۔ جن کے نام سکھوں جیسے تھے لیکن تھے وہ کٹر اور متعصب ہندو۔ وہ تین دن تک اس مسجد میں رہا اور اپنے سفر کی تھکان دور کی اور زخموں کا علاج کیا۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ بالا کوٹ سے مانسہرہ، ایبٹ آباد اور حویلیاں تک پہنچ کر وہاں سے ریل پر سوار ہوگیا جس نے اسے شام تک راولپنڈی پہنچا دیا۔ جب اس نے پنڈی کا ریلوے پُل عبور کیا کہ شہر میں کوئی ٹھکانا تلاش کرے تو اس پر عجب بے بسی کا عالم تھا۔ گھر سے بے گھر۔ نہ پاس کوئی رقم نہ زادِ راہ، نہ کوئی اجنبی شہر میں واقف اور پھر وہ صبح سے بھوکا بھی تھا۔ سیڑھیوں والے پل کے پاس ہی ایک تنور تھا وہ وہاں ایک طرف ہو کر بیٹھ رہا۔ کئی دفعہ

تنور والے سے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ آخر کار سارے گاہک چلے گئے اور تنور والا اور اس کا ملازم رہ گئے۔ آخر وہ سامان سمیٹنے لگے انہوں نے اسے ایک طرف سمٹے بیٹھے دیکھا تو خود ہی پوچھ لیا کہ میاں کیوں بیٹھے ہو، کھانا کھانا ہو تو کھالو۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کے پاس پیسے نہیں لیکن اگر کوئی مزدوری ہو تو وہ کر سکتا ہوں۔ تنور والے نے اسے کھانا دیا اور کہا پیسوں کی فکر نہ کرو۔ مسافر جان کر تنور پر رات کو سونے کی اجازت بھی دے دی اور کہا کہ دوسرے دن ملاقات ہوگی۔ اس نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

○☆○

یہ رمضان کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔ وہ تنور والے کے پاس جس کا نام غلام نبی تھا مستقل رہنے لگا۔ اس نے اسے چارپائی اور بستر مہیا کردیا۔ وہ صبح سویرے اٹھتا اور تنور سے راکھ صاف کرکے اس میں لکڑیاں بھر دیتا۔ اس کے بعد وہ تنور پر لالہ جی کی گدی پر جھاڑو دیتا پھر رات کے پڑے برتن الگ رکھ دیتا اور کمیٹی کے نلکے سے بالٹی میں پانی بھر بھر کر لاتا اس طرح وہ مٹکا اور بڑا دیگچہ پانی سے بھر دیتا۔ برتن صاف کرتا۔ لالے کے آنے سے پہلے وہ سارے کام نمٹا دیتا۔ حتیٰ کہ تنور پر روٹیاں لگانے والا لڑکا بھی آجاتا جو آکر آٹا گوندھتا۔ لالہ جی کے آتے ہی چائے بنتی پھر سب ایک ایک پیالی چائے پیتے۔ لڑکے پیاز وغیرہ بناتے اور لالہ جی گوشت دال اور سبزی لے آتے پھر تنور کو آگ دکھائی جاتی۔ تنور کی آگ پر ہی سالن پکائے جاتے اور جب تنور گرم ہو جاتا تو روٹیاں لگنے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ اس طرح کئی وقفوں سے یہ سلسلہ جاری رہتا۔ عام لوگ روٹی پر دال رکھ کر کھا لیتے۔ بعض لوگ گوشت اور سبزی بھی کھاتے۔ سبزی ہر روز تبدیل ہو جاتی۔ اسی طرح دال بھی کبھی کبھار تبدیل ہوتی اور چنے کی دال کی جگہ مونگ، مسور یا ماش کی دال پکتی۔ کبھی کبھار لالہ جب چنے کی دال میں گوشت ڈال کر پکاتا تو وہ بہت لذیذ بنتی۔ ان دنوں ایک پیسے کی روٹی بکتی تھی اور دال اس کے ساتھ مفت دی جاتی تھی۔ صبح صادق کے طلوع سے شروع ہو کر رات گئے تک اس کی مصروفیت ایسی تھی کہ اسے دم بھر کو بھی فرصت نہ ملتی اور رات تھکا ہوا جب وہ لیٹتا تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ ہاں کبھی کبھار خواب میں جب وہ اپنے بچے کا منہ چومتا اور اس کی نیند کھل جاتی تو صرف تنور کی تنہائی ہوتی جو اسے چند لمحوں کے لیے اداس کر جاتی لیکن وہ اپنے گھر والوں سے کسی قسم کا کوئی رابطہ قائم نہ کر سکا۔ اس طرح چھ ماہ بیت گئے۔ ان دنوں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی اور فوجی بھرتی زوروں پر تھی۔ سیاسی لوگوں کی مخالفت کے باوجود لوگ غربت کی وجہ سے فوج میں بھرتی ہو رہے تھے وہ کئی دنوں تک فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اپنے اس ارادے کا ذکر کسی سے بھی نہ کیا۔ ایک دو چکر بھرتی دفتر کے بھی لگا آیا۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ کشمیریوں کو فوج میں بھرتی نہیں کرتے۔ ایک دن چپکے سے جا کر وہ فوج میں بھرتی ہو گیا اور اپنا پتا اس نے تنور والے کی معرفت ہی لکھوایا۔ لالہ غلام نبی کو اس کے فوج میں بھرتی ہونے سے افسوس ہوا کیونکہ وہ خود حریت پسندوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو انگریزوں کے خلاف اپنی آزادی کے لیے نبرد آزما تھا اور ہندوستانیوں کے انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر ان کی طرف سے لڑنے کا مخالف تھا لیکن وہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ فوج میں بھرتی ہونے کے بعد اسے ٹریننگ کے لیے جبل پور بھیج دیا گیا۔ جبل پور کا شہر پورے ہندوستان کے عین وسط میں واقع تھا اس لیے انگریزوں نے بڑے حساب سے وہاں ٹریننگ سینٹر بنایا تھا۔ شہر اگرچہ اتنا بڑا بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی خاصا تھا کئی اور محکموں کے بھی وہاں پر ٹریننگ سینٹر تھے۔ جبل پور میں چھ ماہ کی ٹریننگ کے بعد اسے حیدر آباد (دکن) کی چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک وہ مختلف چھاؤنیوں میں رہا۔ جن میں بنگلور، سکندر آباد، مدراس اور پونا وغیرہ شامل ہیں۔ تھوڑے عرصے میں اس نے کافی علاقے بھی دیکھ لیے آخر میں اسے بحری جہاز کے ذریعے سمندر پار طرابلس (لیبیا) جانا پڑا۔ وہاں جنگِ عظیم کے خاتمے تک مختلف محاذوں پر رہا۔ واپسی سے کچھ پہلے مصر میں جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ مصر کا ملک اسے بہت پسند آیا۔ اسکندریہ کی بندرگاہ اور قاہرہ کا شہر بہت خوب صورت تھے۔ ہر طرف مصری اور اسلامی تمدن اور تہذیب کے نشانات بکھرے پڑے تھے۔ دریائے نیل میں وہ بہت نہایا اور اسے کئی دفعہ پار کیا۔ یہ وہی دریائے نیل تھا جو اسلام سے پہلے ہر سال انسانی زندگی بھینٹ لیتا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم بھیجا تو اس وقت سے مسلسل بہہ رہا ہے۔ ادھر برِاعظم میں سیاسی تبدیلیوں کا سلسلہ بڑی تیزی سے ظہور پذیر ہوا اور آزادی کی تحریکوں نے جنگ کی وجہ سے زیادہ تقویت پکڑلی۔ جنگِ عظیم میں جرمنی اور جاپان نے یورپی اتحادی قوتوں کو خوب دبایا ہوا تھا۔ جرمنی نے یورپ کے بیشتر ممالک کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔ اگرچہ بالآخر جرمنی اور جاپان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اتحادی قوتوں کو بھی اتنا نقصان پہنچا کہ ان کی معیشت تباہ

ہو کر رہ گئی اور ان کے لیے ایشیا اور افریقہ کی نو آبادیوں پر قبضہ رکھنا ممکن نہ رہا۔ ہٹلر کے جنگی عزائم اگرچہ یورپی ممالک کے لیے تباہ کن تھے اور اس نے انہیں تباہ کرکے بھی رکھ دیا کیونکہ اس کی دور رس نگاہوں سے مستقبل اور ماضی کے فتنے پوشیدہ نہ تھے لیکن اسے حد سے زیادہ خود اعتمادی اور خود سری لے ڈوبی ورنہ آج دنیا کا نقشہ مختلف ہوتا۔ یہودیوں کے بارے میں اس کے جو خیالات تھے کیا ماضی اور موجودہ دور کے یہودیوں کے کارناموں نے انہیں صحیح ثابت نہیں کردیا۔ ساری دنیا مانتی ہے کہ فسق وفجور اور فسادات و تصادم کی تمام پالیسیوں کا منبع ہمیشہ سے یہودی ہی رہے ہیں۔ مختلف قوموں اور ملکوں کے خلاف درپردہ پروان چڑھنے والی تمام سازشیں ہمیشہ یہودی دماغوں سے ہی جنم لیتی رہی ہیں اور پھر اسلام سے تو انہیں پہلے دن سے ہی عناد ہے کہ وہ ان کی بنیادی کمزوریوں کی نشان دہی بھی کرتا ہے اور ان کے مقابل متبادل صحیح طریقۂ کار بھی پیش کرتا ہے اور صحیح روحانی مدارج کا تعین بھی کرتا ہے۔ جن کے یہودی ہمیشہ سے دعوے دار رہے ہیں۔ یہودی نصرانیوں کے بھی سخت دشمن ہیں لیکن نصرانی چونکہ اپنے صحیح مذہب سے بہت دور جاچکے ہیں اس لیے انہیں اس دشمنی کا احساس نہیں۔ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب نصرانیوں کو انہی یہودیوں کی سوچ پر پچھتانا پڑے گا اور ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہوگی اور وہ یہودیوں کی نسبت اسلام سے قریب تر ہوں گے۔ ہر برائی میں کوئی نہ کوئی خوبی مضمر ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم دوم میں جو تباہی ہوئی اس میں تعمیر کا یہی پہلو تھا کہ ایشیائی اور افریقی ممالک کو آزادی نصیب ہوسکی اور ہٹلر کی کارروائی سے ان کی راہیں آسان ہوگئیں ورنہ یورپی اقوام اتنی مضبوط ہوچکی تھیں کہ کم ازکم ایک صدی اور ان ممالک کو اپنا غلام رکھ سکتی تھیں۔ اسی جنگ سے ہندوستان بھی متاثر ہوا اور انگریز کو اس ملک کو بھی آزادی دینی پڑی۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے عقائد تہذیب، معاشرت اور مزاج کے اعتبار سے ہندوستان کی اکثریتی قوم ہنود سے الگ پہچان رکھتے تھے پھر ہنود بھی یہود کی ہی ایک بگڑی ہوئی شاخ ہے جن کا صدیوں پہلے نسب ان سے ہی جاملتا ہے اور گوسالہ پرستی، سُود خوری اور حد سے بڑھتی ہوئی مادّہ پرستی اور مکاری یہ تمام صفات ان میں مشترک ہیں جو انہیں یہودیوں کی ہی شاخ کے طور پر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ موجودہ دور میں بھی بھارت کے اسرائیل کے ساتھ گٹھ جوڑ کو اس کے ثبوت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ حق پر مبنی تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کی حکومت انہیں سونپی جائے کیونکہ ان کا ہندوؤں کے ساتھ گزارہ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کے اس مطالبے نے اتنی شدت اختیار کی کہ انگریز کے لیے یہ مطالبہ مانے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہا اور اس طرح سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مملکتِ پاکستان وجود میں آئی۔ ہندوؤں کی یہودی جبلت اپنی جگہ موجود تھی اور انہوں نے ہر قسم کے فیصلے کے لیے اپنے ذہنوں میں پہلے سے ہی سازشیں تیار کررکھی تھیں اور انہی حالات کی تیاری کے سلسلے میں انہوں نے اپنے اپنے محلوں اور علاقوں کو پوری طرح سے مسلح اور قلعہ بند کررکھا تھا ایسا تقریباً تمام شہروں میں تھا۔ اس سازش کے تحت فساد برپا کرکے آبادی کے انتقال کے لیے حالات بھی پیدا کیے گئے۔ نہتے مسلم عوام پر ظلم و ستم اور قتل وغارت کا بازار گرم کردیا گیا۔ سکھوں کی جنگجو قوم کو بھارتی بنیوں نے مکاری سے اپنے ساتھ ملاکر انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ علاقوں کی تقسیم میں بھی مکروفریب، زروزن کے تمام مکروہ یہودی حربوں کی شکل میں انگریزوں کو رشوت دے کر اپنی مرضی کے علاقے پاکستان سے نکال کر بھارت میں شامل کرالیے جو تقسیم کے بنیادی اصولوں سے قطعی انحراف تھا۔ پنجاب اور بنگال کی مجوزہ تقسیم میں مزید کاٹ چھانٹ کرکے کئی اضلاع کے مسلم اکثریتی علاقے بھارت میں شامل کرالیے کیونکہ ہنود کے سازشی ذہن نے بہت دور کی سازش تیار کررکھی تھی۔ گورداسپور کا ضلع ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو مسلم اکثریتی ضلع ہونے کی بنا پر پاکستان کا حصہ قرار پایا اور اس دن گورداسپور کی ضلع کچہری پر پاکستان کا پرچم بھی لہرایا گیا لیکن دوسرے دن تحصیل شکرگڑھ کو چھوڑ کر باقی سارا ضلع بھارت کے حوالے کردیا گیا اور اس طرح سے بھارت کو کشمیر کے ساتھ ملحقہ سرحد دی گئی تاکہ وہ بعد میں کشمیر میں دخل اندازی کرسکے۔ اس سازش سے ایک دفعہ پھر بھارتی ہندوؤں نے انگریزوں سے کشمیریوں کا سودا کیا اس کے علاوہ ضلع لاہور کے کئی علاقے ناجائز طور پر بھارت کے حوالے کردیے گئے۔ ادھر اندرونی طور پر یہ سازشیں اور دھاندلیاں کی گئیں تو بیرونی طور پر جنگ ختم ہونے کے بعد مسلمان فوجی یونٹوں کو واپس ہندوستان جان بوجھ کر نہ لایا گیا تاکہ تقسیم کے عمل میں غیر مسلم فوجی یونٹوں کی مدد سے بھارت اور غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ دلایا جاسکے اور پاکستان کی عسکری قوت مجتمع نہ ہوسکے۔ چنانچہ ڈوگرہ، گورکھا اور سکھ رجمنٹیں جس طرح مسلمانوں کے قتل عام میں ملوث ہوئیں، یہ سب تاریخ کا ایک حصہ ہیں چنانچہ انہی منصوبوں کے تحت رمضان کی یونٹ بھی ۱۹۴۷ء کے آخری دنوں میں واپس وطن پہنچی۔ اس وقت آبادی کافی حد تک منتقل ہوچکی تھی لیکن مشرقی پنجاب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان عورتیں جنہیں ہندو اور سکھ غنڈے اٹھاکر لے گئے تھے، ابھی بھارت میں ہی تھیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے کتنا بڑا چیلنج تھا۔ کہاں وہ وقت کہ جب ہندوستان کے ساحلی علاقے سے ایک مسلمان عورت کی فریاد مسلمانوں کے دارالحکومت میں پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا۔ ایک زلزلہ آگیا اور مسلمان مجاہد اس مظلوم عورت پر ظلم کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے ہزاروں میل سمندر پار کرکے طوفان کی طرح امڈے اور ظالموں کو نہ صرف سزا دی بلکہ ایسے فتنوں کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کردیا اور کہاں یہ دور کہ مسلمان اپنی بہو، بیٹیوں، ماؤں، بہنوں کو غیر مسلم ہندو اور سکھ غنڈوں کے ہاتھوں میں چھوڑ آئے۔ جن میں بہت سی آج تک وہاں ہیں اور غیر مسلموں کی کئی نسلیں جنم دے چکی ہیں۔ کتنے باضمیر ہیں وہ لوگ جو انہی ہندوؤں اور سکھوں سے اپنے تعلقات پھر سے استوار کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بھی کبھی وہاں جاکر ذہنی عیاشی کرسکیں یا شاید وہ وہاں جاکر ان عورتوں کی بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں یا یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس ماحول میں کس طرح ضم کررکھا ہے۔ ایسے حالات تھے جن میں پاکستان قائم ہوا۔ انگریزوں کا راج ختم ہوتے ہی کشمیر میں ڈوگرہ راج کا سنگاسن بھی ڈولنے لگا کیونکہ ڈوگروں کے مربی اور محسن اور کشمیریوں کے فروخت کنندگان نے اس ملک سے رخصت ہوتے ہوتے کشمیریوں کو ایک دفعہ پھر بھارتی ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کردیا اس لیے اب انہیں ڈوگروں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی اور نہ کشمیر کے مسلمانوں سے اس لیے ڈوگرہ حکمران بہانوں کی تلاش میں بھٹکنے لگا کہ کسی طرح ریاست کو بچالے جائے لیکن دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستگی ضروری ہوگئی تھی۔ ڈوگرہ حکمران نے حکومت پاکستان سے عارضی معاہدہ کرلیا کہ وہ حکومتِ انڈیا کی طرح ڈاک و تار، کرنسی اور دیگر مرکزی معاملات پر کنٹرول کرے اور دوسری طرف بھارت سے بھی اس کی ساز شیں جاری تھیں۔ مہاتما گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن کشمیر کے چکر لگاکر مہاراجا کشمیر کو شیشے میں اتار رہے تھے کیونکہ انگریز گورداسپور کا علاقہ بھارت کو دے کر کشمیر سے اس کا تعلق تو پیدا کرہی چکے تھے اس لیے بھارتی ہندو کی سوچی ہوئی سازش پوری ہونے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی دوسری طرف ڈوگرہ حکمران تذبذب کے عالم میں تھا؟ اور اپنے مستقبل کی فکر میں تھا۔

○☆○

رمضان بیرون ملک سے واپسی پر چھٹی لے کر گھر جاسکتا تھا اور بظاہر اب ڈوگرہ سپاہیوں سے اسے کوئی خطرہ بھی نہ تھا لیکن پاکستان کے حالات اور فرض کی مجبوری کے تحت اس نے ڈیوٹی پر رہنے کو ہی ترجیح دی پھر اس کی ڈیوٹی اغوا شدہ مسلم خواتین کی بازیابی پر لگادی گئی۔ وہ بھارتی پنجاب کے مختلف قصبوں اور شہروں میں جاتے اور اغوا شدہ مسلم خواتین کو تلاش کرکے واپس پاکستان لاتے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں اسے ایسے ایسے تجربوں سے دوچار ہونا پڑا کہ اس کے ذہن سے ڈوگرہ شاہی کے کشمیریوں پر مظالم بھی ماند پڑ گئے۔ ہر عورت کو بازیاب کرنے کے دوران میں انہیں نئے رد عمل سے واسطہ پڑا۔ بعض عورتوں سے آنکھیں چار کرتے ہوئے شرم آتی اور کلیجہ منہ کو آتا۔ بعض کی بے بسی کی حالت پر دل خون کے آنسو روتا۔ کچھ کی طنز بھری نگاہیں سینے کے آرپار اس طرح ترازو ہوجاتیں کہ دل چاہتا زمین پھٹ گئی ہوتی اور وہ اس میں سماگئے ہوتے۔ ان میں سے کئی عورتیں کتنے ہی بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بچوں کے بارے میں بھی جذبات مختلف ہوتے۔ کسی کی نگاہوں میں ان کے لیے ملی جلی محبت اور نفرت ہوتی۔ کسی کی آنکھوں میں نفرت کا جوالا مکھی ہوتا کسی کی نگاہوں میں شفقت اور بے بسی ہوتی اور کئی نگاہیں جیسے خلا میں کہیں گھورتی ہوتیں جن میں کوئی رد عمل نہ ہوتا اور ایسے محسوس ہوتا کہ جیسے ان نگاہوں کا جسم سے تعلق ہی ختم ہوچکا ہو۔ بعض کا انداز اتنا جارحانہ تھا کہ ان سے ڈر لگتا۔ ان میں سے کئی اپنے رشتے داروں میں آنے سے گریز کرتیں کہ پاکیزگی کا جو تصور مسلم گھرانوں میں ہوتا ہے وہ ان میں اب نہیں رہا تھا۔ آٹھ ماہ کی اس مسلسل اور جاں گسل ڈیوٹی نے اسے ذہنی طور پر ہلاکر رکھ دیا۔ وہ ذہنی طور پر مایوسی کا اتنا شکار ہوا کہ محاذِ جنگ پر بھی اتنا دل برداشتہ نہ ہوا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب راجا کی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے بغاوت کردی۔ پاکستان سے سابق فوجی اور رضاکار کشمیر کی طرف بڑھنے لگے جن کی اکثریت کشمیریوں پر مشتمل تھی۔ ان میں مسلم نیشنل گارڈ کے رضاکار بھی شامل تھے۔ توڑے دار بندوقیں، خنجر، بلم، کلہاڑیاں، لاٹھیاں ان رضاکاروں کے ہتھیار تھے۔ پاکستان کی حکومت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اپنے فوجی کشمیر میں داخل کرتی۔ یہ ہماری کمزوری تھی یا مصلحت اس کا جواب ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا۔ صوبۂ سرحد کے

وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم نے کوئی پروا نہ کرتے ہوئے قبائلی جتھوں کو کشمیر میں داخل کردیا۔ ریاستی فوج کے سابق فوجیوں، رضاکاروں اور قبائلیوں نے بارہ مولا سے آگے تک کا علاقہ ڈوگرہ فوجیوں سے صاف کردیا۔ جب مہورہ کا بجلی گھر جہاں سے سری نگر کو بجلی سپلائی ہوتی تھی، بند ہوگیا تو مہاراجا کشمیر سری نگر چھوڑ کر جموں بھاگ گیا۔ اس افراتفری کے عالم میں ہندو اور انگریز لیڈروں کے دباؤ میں آکر اس نے بھارت سے فوجی معاہدے پر دستخط کردیے جس سے بھارت کو کشمیر میں فوجیں اتارنے کا جواز مل گیا۔ چنانچہ ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر کے ہوائی اڈے پر بھارتی فوجیں اترنے لگیں۔ اس وقت قبائلی سری نگر کے قرب وجوار میں پہنچ چکے تھے لیکن وہاں کے غیر مانوس ماحول اور پانی کی فراوانی ان کے لیے مصیبت بن گئی اور پھر بھارتی فوج کے سامنے غیر منظم جتھے نہ ٹھہر سکے۔ اس دوران میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے پاکستانی فوجی چھٹیاں لے کر جنگ میں شامل ہوگئے لیکن سامانِ جنگ کی کمیابی اور غیر تربیت یافتہ رضاکاروں کی وجہ سے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ خود بھی ان چند فوجیوں میں شامل تھا جو اس جنگ میں شامل ہوئے۔ اسی دوران میں اسے اپنے گاؤں کے پاس سے گزرنے کا موقع ملا لیکن فرض کی پابندی نے اسے پھر ایک دفعہ ذاتی جذبات کی تکمیل سے باز رکھا اور وہ صرف دور سے اسے دیکھتا ہوا ہی وہاں سے گزر گیا۔ قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی کہ آٹھ نو سال کے بعد اسے اپنے وطن آنا نصیب بھی ہوا تو کن حالات میں، اس کے دل میں ایک کسک سی پیدا ہوئی۔ اپنے والدین، بیوی بچوں، بہنوں بھائیوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی خواہش نے شدت بھی اختیار کی اور قریب تھا کہ وہ قومی فریضے سے منہ موڑ کر چپکے سے اپنے گھر روانہ ہوجاتا لیکن فرض شناسی اور فوجی ڈسپلن کی عادت نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا اور اس نے اپنے شدید تر جذباتی رشتوں کی بھی پروا نہ کی اور اجنبیوں کی طرح اپنے گھر کو دور سے دیکھتا ہوا گزر گیا۔ اس وقت اس کے دل میں کتنی حسرتیں پوشیدہ تھیں۔ خوشی اور غم کے امتزاج نے اسے کتنا افسردہ کردیا تھا لیکن اس نے اس کا اظہار اپنے قریبی ساتھیوں سے بھی نہیں کیا اور سارے طوفان کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ گھر کے اردگرد ماحول بالکل پہلے جیسا تھا۔ بالکل وہی سبزہ وہی دریا کا کنارہ، ہاں فصلیں اور درخت کچھ اُجڑے اُجڑے لگ رہے تھے۔ مکانوں میں مکینوں کی موجودگی کا احساس تو ہوتا تھا لیکن خوش حالی اور آزادی کے خلاف کارروائی یقیناً ایسے ہی حالات کی شکل میں ظاہر ہوسکتی تھی پھر قبائلی غیر منظم لوگ بھی جدھر سے گزرتے جو کچھ ان کے ہاتھ لگتا مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹ لیتے، ایک طرح سے وہ اس ملک کو فتح کرنے نکلے تھے۔

یہ بات کشمیریوں کے لیے آج تک معما ہے کہ جب مسلمانوں کا قتلِ عام جموں کے علاقے میں ہو رہا تھا تو قبائلیوں اور رضاکاروں کو مسلم اکثریتی علاقے وادیٔ کشمیر کی طرف کیوں بھیجا گیا، انہیں جموں کے علاقے میں مسلمانوں کی مدد کے لیے کیوں نہ بھیجا گیا اور اسی چیز نے شیخ عبداللہ اور اس کے ساتھیوں کو قبائلی حملہ آوروں کے خلاف آواز اٹھانے کا جواز مہیا کیا۔ اس کا گاؤں دریا کے دوسری جانب ہونے کی وجہ سے کچھ محفوظ تو تھا پھر بھی جنگ کا نتیجہ تو بھگت چکا لگتا تھا۔ وادیٔ کشمیر میں چونکہ ہندو بہت کم تھے اور جو تھے وہ بھی صرف بڑے شہروں میں تھے اس لیے خانہ جنگی کا امکان کم از کم کشمیر میں نہیں تھا۔ جموں میں جن سنگھی ہندوؤں اور ڈوگروں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام اس منظم طریقے سے ہوا کہ انہیں مختلف کیمپوں سے پاکستان پہنچانے کے بہانے لاریوں میں سوار کراکے مخصوص جگہوں پر جاکر ذبح کردیا گیا۔ اگرچہ یہ تمام کشمیر میں بھی مسلمانوں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھا لیکن پھر بھی مسلمانوں نے اپنی رواداری کو نبھایا اور غیر مسلموں کے خون سے ہاتھ نہ رنگے۔ اگر [illegible] اور اس کے گھر کے درمیان حائل نہ ہوتا تو شاید وہ [illegible] ساتھیوں سے چند منٹ کی مہلت لے کر گھر سے ہو آتا [illegible] کے گھر والوں کو تو اس کی زندگی کا بھی کوئی پتا نہ تھا کیونکہ گھر سے نکلنے کے بعد اس کا رابطہ گھر سے بالکل ختم ہوچکا تھا اس لیے اتنے مختصر عرصے میں تو شاید وہ اپنے گھر والوں سے پوری طرح متعارف بھی نہ ہوسکتا۔ بھارتی فوجوں نے غیر منظم قبائلیوں اور نہتے فوجیوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ پہلے بارہ مولا بعد میں رام پور پھر اوڑی اور آخر میں چکوٹھی پر آکر معاملہ رک گیا۔ پاکستان نے کچھ فوجی غیر سرکاری طور پر کشمیر میں [illegible] جس سے معاملہ کچھ بہتر ہوا لیکن پاکستان کے انگریز کمانڈر انچیف نے سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گورنر جنرل پاکستان قائدِ اعظم کے احکام کو نظرانداز کرکے کشمیر میں فوجی کارروائی کرنے سے انکار کردیا اور حکومتِ پاکستان [illegible] نہ کرسکی۔ بلکہ انگریز کمانڈر انچیف نے بھارت کے انگریز گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کو کہہ کر بھارت کی کشمیر میں مداخلت کو فوری اور تیز تر کرادیا۔ بھارت وادیٔ کشمیر [illegible] کرچکا تھا۔ پاکستان کے فوجی کشمیر میں کمانڈر انچیف کے [illegible] کے بغیر ہی لڑ رہے تھے اور خطرہ تھا کہ وہ بھارتی فوجوں سے [illegible]

[illegible] واپس لے لیں اس لیے بھارت اقوام متحدہ کی سلامتی [illegible] میں جا پہنچا اور واویلا مچایا۔ اپنے مربی ملکوں سے مل کر [illegible] بندی کی قرارداد منظور کرائی کیونکہ اب اس کے [illegible] اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ واپسی پر بھی گاؤں کے [illegible] گزرتے ہوئے اس کا دل مچلا لیکن وہ سیاسی حالات [illegible] تھا خیال تھا کہ پاکستانی فوجیں کشمیر میں داخل ہوکر [illegible] فوجوں کو مار بھگائیں گی اور وہ پھر جلد ہی فاتح کی حیثیت [illegible] اس علاقے میں آئیں گے لیکن یہ ایسی خواہش تھی جو [illegible] ثابت ہوئی اور وہ وطن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ [illegible] سیاست کی باتوں کو سمجھ نہیں سکتے اور شیخ عبداللہ [illegible] تو اس کی سمجھ میں بالکل نہ آسکی جس کے تحت [illegible] ڈوگرہ حکمرانوں کا ساتھ دیا اور بھارتی وزیر اعظم [illegible] اختیار کرتے ہوئے کشمیریوں کی جنگِ آزادی اور [illegible] عوام کی اپنی کشمیری بھائیوں کی مدد کو بیرونی حملہ [illegible] اور بھارتی حکومت اور فوجوں کی معاونت کی۔ شیخ [illegible] اس فیصلے کی سزا کشمیری عوام آج تک بھگت [illegible] اور آج تک بھارت کے ہندو بنیے کی قید میں غلامی [illegible] بسر کررہے ہیں۔ بھارت آہستہ آہستہ ان کی نئی [illegible] میں مذہب سے بے زاری کے ایسے بیج بو رہا ہے جو [illegible] سالوں میں اپنا رنگ دکھائیں گے۔ غالباً شیخ [illegible] ذہن میں شروع سے ہی کشمیر کا حکمرانِ اعلیٰ بننے کا [illegible] تھا اور ظاہر ہے کہ بھارت یا پاکستان دونوں میں [illegible] کے ساتھ مل کر وہ یہ مقصد حاصل نہیں کرسکتے تھے [illegible] کشمیر کا تصور ہی ان کے خیال کی تکمیل ہوسکتا تھا [illegible] کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے بعد ان کی سیاسی [illegible] میں پڑجاتی کیونکہ پاکستان سے الحاق کے حق [illegible] والے کشمیری لیڈر ان کے مدمقابل ہوتے۔ [illegible] پاکستان کے جاگیردار بدنیت سیاسی لیڈروں [illegible] جنہوں نے شیخ عبداللہ کے بھیجے ہوئے وفد کو [illegible] مل کر کشمیر کے پاکستان سے الحاق پر بات کرنے [illegible] ہونے دیا۔ غالباً وہ شیخ عبداللہ کی سیاسی پوزیشن [illegible] کیونکہ ان سب میں سے کسی کی حیثیت بھی [illegible] کے مدمقابل نہ تھی اس لیے شیخ عبداللہ نے [illegible] الحاق نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ریاست کو فوری [illegible] سے بچانے کے لیے اور نہرو سے ذاتی دوستی کی [illegible] حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ڈوگرہ حکمران [illegible] کا ساتھ دیا تاکہ وہ بعد میں کشمیر کو ایک [illegible] کی حیثیت دلواسکیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندو بنیے نے اپنا اصل رنگ دکھایا اور کشمیر پر مکمل قبضہ کرلیا بلکہ وہاں کی اسمبلی سے بھارت سے مکمل الحاق کی کارروائی بھی پوری کرالی۔ شیخ عبداللہ کو جب قید کرلیا گیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور پھر انہوں نے بھارتی آئین کی ایک شق کی جو کشمیر کی علیحدہ حیثیت کی ضمانت تھی آڑ لے کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور بالآخر اسی شق سے ہی اپنی قوت کا اظہار کرکے پھر اقتدار حاصل کیا اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے چونکہ انہیں پھر بھارتی حکومت کی موافقت کی ضرورت تھی اس لیے پھر بھارت کے گن گاتے رہے اور پاکستان کو کوستے رہے چنانچہ انہوں نے بھارتی حکومت پر اپنی لیڈری کا رعب ڈالنے کے لیے ہر الیکشن میں اسی حربے کو آزمایا اور بھارت سے علیحدگی پسندوں کی حمایت حاصل کرکے الیکشن جیتا اور پھر بھارت کی ہم نوائی کا راگ الاپتے رہے اور پاکستان کی مخالفت میں بیانات دیتے رہے ان کے اس رویے سے پاکستان کے مفادات کو زک پہنچتی رہی لیکن وہ بھارت کو بلیک میل کرکے اقتدار پر براجمان رہے۔ پتا نہیں بھارت شیخ عبداللہ یا ان کے خاندان کے اس طریقۂ کار سے کب تک نباہ کرتا ہے اور کب اس کی پالیسیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ جس کے تحت وہ کشمیر کی مسلم اکثریت کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ جموں کے صوبے میں بہت سے مسلمانوں کا قتلِ عام کرکے اور کچھ کو پاکستان میں دھکیل کر وہ جموں کی مسلم اکثریت تو پہلے ہی ختم کرچکا ہے اور آہستہ آہستہ وہ غیر کشمیری ہندوؤں کو بھارت سے لالا کر جموں کے صوبے میں آباد کرتا جارہا ہے جس سے اس منصوبے میں مسلمان واضح اقلیت میں چلے گئے ہیں۔ بعد میں وہ یہی حربہ وادیٔ کشمیر میں بھی استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن چونکہ وادی میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں اور اپنا الگ کلچر اور معاشرت رکھتے ہیں اس لیے وہاں پر لمبی مدت کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ شیخ عبداللہ نے غالباً اپنی انا اور لیڈری کی خاطر جو فیصلہ کیا تھا شاید بعد میں شیخ صاحب ساری عمر اس کے لیے پچھتاتے بھی رہے ہوں گے کیونکہ ان کے فیصلے سے نہ تو لوگوں کا بھلا ہوا اور نہ ہی ان کا اپنا مقصد حاصل ہوسکا۔

○☆○

آزاد فوج پسپا ہوتی ہوتی چکوٹھی پر آکر رک گئی تھی کہ فائربندی ہوگئی اور وہاں سے صرف دو میل آگے جنگ بندی کی لائن قرار پائی۔ مختلف سیکٹروں میں جہاں جہاں اس وقت فوجیں تھیں، رک گئیں اور اس طرح کشمیر کی ریاست کو غیر جغرافیائی، غیر قانونی اور غیر تہذیبی طور پر دو حصوں میں

تقسیم کردیا گیا۔ یہ غیر قدرتی خطِ تقسیم ایک ایسی حیثیت اختیار کرچکا ہے کہ اس کو بدلنا اب اتنا آسان نہیں رہا اور اب یہ ایسے ہی ہے جیسے اسرائیل سے غرب اردن کا یا غزہ کی پٹی کا فلسطینی علاقہ خالی کرانا۔ چکوٹھی سے کشمیر کی طرف منہ کرکے دیکھیں تو سامنے بس دو تین پہاڑوں کی گھیاں ہیں جن کے پیچھے وادیِ کشمیر شروع ہوجاتی ہے اور اس کا گاؤں یہاں سے کوئی زیادہ دور نہیں لیکن پتا نہیں کہ اس کا خاندان اب کن حالات میں زندہ ہے یا پھر زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ اگر وہ لوگ زندہ ہیں تو انہوں نے کبھی اپنے بابا کو یاد بھی کیا ہے یا نہیں اور وہ خود کس قدر مجبور ہے کہ وہ ان چند میلوں کے فاصلے کو طے کرنے پر قادر نہیں کیونکہ یہ چند میل اب بہت بڑا فاصلہ ہیں جسے طے کرنا آسان نہیں‘ اس فاصلے کو پاٹنے کے لیے اس کے بعد بھی جنگیں لڑی گئیں لیکن اس میں تھوڑی کمی بیشی ہی ہوسکی اور نتیجہ سوائے معاہدۂ تاشقند اور معاہدۂ شملہ کے کچھ نہ نکل سکا یا پھر کچھ مزید کشمیری رُسوا ہوئے کچھ اور لوگوں کو مہاجرین کی شکل میں پاکستان کی سمت دھکیلا گیا۔ کچھ اور کشمیری مسلمانوں کو بھارت سے غداری کی سزائیں دی گئیں یا وہ پاکستان کے جاسوس قرار پائے یا پھر کچھ اور پاکستانیوں کو کشمیریوں کے بے حمیتی اور ان کے مسلم اقدار سے غداری کے افسانے گھڑنے کا موقع مل گیا کہ وہ انہیں بدنام کرکے اپنی ناقص فوجی کارروائیوں کی ناکامی کی خفت کو مٹاسکیں۔ پاکستانی گوریلوں کی مدد کرنے اور پاکستانی مفاد کے حق میں کام کرنے کے جو نتائج کشمیری لوگوں نے بھگتے ہیں وہ اس سمت کے لوگوں کے علم میں نہیں آسکے۔ بہرحال کشمیر کی آزادی کی خواہش اب ختم نہ ہونے والی تاریک رات کی طرح ہے جو جیسے صدیوں پر محیط ہو اور جس کا دن طلوع ہوتے ہی گویا ہمسایہ ملکوں میں قیامت برپا ہوجائے گی کیونکہ ان کے لیے اب یہ کشمیریوں کے حقوق کے مسئلے سے بڑھ کر دونوں حکومتوں کی انا کا مسئلہ بن چکا ہے کہ وہ اسے کسی بھی قیمت پر اپنے سے علیحدہ کرنے کے لیے تیار نہیں حالانکہ قانونی اور اخلاقی طور پر کسی طرح بھی انہیں اس کا حق حاصل نہیں۔ دونوں حکومتیں اپنے عوام کو اس مسئلے پر حقائق تسلیم کرنے اور ان کا پابند ہونے کے لیے تیار نہیں کرسکتیں۔ یہ ایک المیہ ہے جس کا شکار کشمیری عوام ہیں۔ پاکستانی حصے کے کشمیری لیڈر بھی اپنی اپنی ڈفلی بجاکر اب آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو کوئی واضح پروگرام ہے اور نہ ہی ان میں جرأت ہے کہ کوئی انقلابی قدم اٹھاسکیں اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کا ان سے کوئی تعارف ہی نہیں اس لیے پورے کشمیر کی سطح پر جاکر ان کی سیاست ختم ہوجاتی ہے۔ مقبوضہ علاقے میں صرف شیخ عبداللہ ہی ایسی شخصیت تھے۔ جنہیں آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان کے لوگ بھی پہچانتے تھے اور ان کی نسبت سے ان کے بیٹوں کو بھی یہ اعزاز تو حاصل ہوسکتا تھا کہ ادھر کے لوگ اُن کے نام سے واقف ہیں لیکن ان کا براہِ راست یہاں کے عوام سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اور ان کے اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے لوگوں میں ان کے متعلق کئی غلط فہمیاں بھی موجود ہیں۔ اب کشمیری عوام کو راہنمائی ملے تو کہاں سے اور ان کے حقوق کی کوئی بات کرے تو کون کرے؟ اور اگر استصواب رائے کی بات بھی کی جائے تو کیا اس دور میں حالات کی اتنی تبدیلیوں کے بعد اور آبادی کے اتنے انتقال کے بعد اب یہ بات ممکن رہی ہے اور اگر ناممکن ہے تو اب مسئلے کا کیا حل ہے‘ یہ تمام ایسے سوالات ہیں جن پر بات کی جانی چاہیے۔

...... رمضان کے دل میں یہ بات بھی کئی دفعہ آئی کہ کسی وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے چپکے سے جنگ بندی لائن پار کرجائے کیونکہ ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کشمیر میں ہر جگہ۔ پھیلی ہوئی یہ غیر قدرتی لکیر پار کرنا ناممکن نہیں اور پھر بحیثیتِ فوجی اسے معلوم ہے کہ کون سی جگہ اس کام کے لیے موزوں ہوسکتی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ یہ بھی سوچا کہ آخر اس کا اس ملک میں کیا ہے؟ لیکن پھر پاکستان سے اس کی محبت اور قوانین کی پابندی کرنے والا فوجی ذہن ہمیشہ اس کے جذباتی ہیجان کو نیند کی طرح سلادیتا رہا۔ جنگِ عظیم میں ہندوستان اور بیرونی افریقی ممالک میں فوجی ملازمت کے دوران میں اس نے بڑی محنت سے اردو اور پھر رومن اردو سیکھی اور پڑھنے لکھنے میں مہارت حاصل کرلی تھی اور پھر اس نے انگریزی میں بھی کچھ شدھ بدھ حاصل کی اس کوشش میں جہاں اس کی تعلیمی استعداد بڑھی وہاں اس پر ترقی کے دروازے بھی کھل گئے۔ وہ سپاہی سے نائیک پھر حوالدار ہوا میں جمع دار اور پھر صوبیدار بن گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں وہ چھمب جوڑیاں سیکٹر میں تھا اور اس کی یونٹ کے کارنامے پاکستان کی جنگی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے گئے۔ انہوں نے اس حصے کا خاصا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ چھمب اور جوڑیاں کی چھاؤنی کی تاریخی فتح کو تو کسی صورت میں بھی نہیں بھول سکتا جب مسلسل ۳۶ گھنٹے کی شیلنگ کے بعد بھی مورچوں کے بنکر نہ ٹوٹے اور انہیں دست بدست جنگ کرکے دشمن کو ان مورچوں سے نکالنا پڑا۔ وہ مورچے مسلسل گولا باری سے سرخ ہوچکے تھے لیکن ٹوٹے نہیں اس سے دشمن کی مضبوط مورچہ بندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن پاکستانی فوج نے قومی جذبے کے تحت ان کو اپنی جان

کی بازی لگاکر وہاں سے نکالا اور اس علاقے کو فتح کیا۔ لوگ ... کے تعمیراتی کام کرنے والوں کی دیانت سے بڑے متاثر ... جنہوں نے جنگی نوعیت کی عمارت کو پوری دیانت کے ساتھ مضبوط بنایا تھا اور وہ موازنہ کرتا رہا کہ ادھر ہم ہیں کہ مسلمان ہونے کے دعوے دار بھی ہیں اور قومی جذبات کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں لیکن تعمیراتی کاموں میں اس طرح بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں کہ گولا خدانخواستہ چند گز دور ... گرے تو عمارت بھک سے اڑجائے اور اسی طرح بددیانتی ... میں موجود ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک وہ بھمبر ... میں باغ سر کے قلعے میں بھی رہا۔ باغ سر ساڑھے تین ہزار فٹ کی بلندی پر ایک چھوٹی سی جھیل ہے جس کے کنارے آموں کے باغ ہیں اور اردگرد چیل اور دوسرے درختوں کا جنگل ہے۔ جھیل کی لمبائی تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے قریب ہوگی اور چوڑائی کوئی آدھا میل۔ سردیوں میں جھیل میں خوبصورت سرخ کنول کھلتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک قلعہ ہے۔ شاید مغلیہ دور کا۔ قلعے کے ساتھ ہی پہاڑی ختم ہوجاتی ہے اور پہاڑی سے نیچے تھوڑی ہی دور سامنے مقبوضہ علاقہ نظر آتا ہے۔ ہمارے علاقے میں آخری حد تک لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں جبکہ مقبوضہ حد کے اندر کافی دور تک پٹی خالی رکھی گئی ہے۔ شاید بھارتی فوجیوں کو علاقے کے مسلمان عوام پر اعتبار نہیں اور وہ انہیں آزاد کشمیر کے لوگوں سے میل ملاپ رکھنے سے روکنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کچھ عرصہ مینڈھر سیکٹر میں رہا۔ پہلے کوٹلی سے بھیرہ جانے والی سڑک جنگ بندی لائن کے پاس سے تو گزرتی تھی لیکن تھی آزاد کشمیر کے علاقے میں اور صرف کبھی کبھار جھڑپوں میں ... بند ہوتی تھی لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ میں اس سڑک کا کچھ حصہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔ جس سے یہ سڑک بند ہوگئی۔ ... راستہ بنایا تو گیا لیکن نالوں پر پل صحیح طور پر نہیں بن سکے کیونکہ وہ ہر وقت شیلنگ رینج میں تھے۔ اس کے بعد دو سال اس نے کوٹلی میں گزارے۔ کوٹلی دریائے پونچھ کے کنارے ایک چھوٹی سی وادی میں خوب صورت شہر ہے۔ پہلے یہ ضلع میرپور کی تحصیل تھا اور اب اسے ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔ ڈوگروں کے وقت میں بھی یہاں فوجی چھاؤنی تھی۔ جنگ آزادی میں ڈوگرہ فوج نے یہاں کافی مزاحمت کی لیکن بالآخر مجاہدوں نے انہیں مار بھگایا۔ کوٹلی کے چاروں طرف اونچے پہاڑ ہیں۔ گرمیوں میں یہاں کافی گرمی ہوتی ہے۔ دریائے پونچھ ایک موڑ کے ساتھ گھوم کر گزرتا ہے اور اس کا پانی کافی تیز ہوتا ہے۔ دریا میں پتھروں کی وجہ سے پانی شور کرتا ہوا جاتا ہے۔ دریا کے کنارے ٹھنڈے پانی کے چشمے ہیں۔ کوٹلی شہر میں چار پانچ میل اوپر سے نہر کاٹ کر لائی گئی ہے جو کھیتوں کو سیراب کرتی ہے اور لوگوں کی دوسری ضروریات پوری کرتی ہے۔ یہاں سے ایک سڑک پلندری کو بھی جاتی ہے جو ابھی کچی ہے۔ سردیوں میں کوٹلی میں ہر وقت یخ بستہ ہوائیں چلتی رہتی ہیں اور بعض دفعہ سردی ناقابلِ برداشت حد تک ہوجاتی ہے۔ کوٹلی سے راولپنڈی‘ میرپور اور کھوئی رٹہ کو بھی سڑکیں جاتی ہیں۔ کھوئی رٹہ والی سڑک ہی آگے نوشہرہ کو نکل جاتی ہے جو اب مقبوضہ علاقے میں ہے۔

کوٹلی سے پھر اس کا تبادلہ مظفر آباد کے علاقے میں ہوا اور کچھ عرصہ اس نے ٹیٹوال میں گزارہ۔ اس علاقے کی بیشتر آبادی دریائے نیلم (کرشن گنگا) کے کنارے پر دونوں طرف ہے اور سڑک بھی دریا کے ساتھ ساتھ ہی جاتی ہے اور یہ وہی راستہ ہے جس راستے پر وہ اپنے وطن سے فرار ہوکر گزرا تھا۔ نوسہری‘ کنڈل شاہی‘ اٹھمقام‘ دواریاں‘ شاردا اور کیل کے مشہور قصبے آباد ہیں اور مقبوضہ علاقے میں ٹیٹوال اور کرن ایسے مشہور مقامات ہیں جو دریا کے دوسرے کنارے پر اس طرح سے ہیں کہ اس طرف کی ہر چیز صاف نظر آتی ہے۔ بس صرف راستے میں چھوٹا سا دریا (نیلم) حائل ہے یا پھر دونوں ملکوں کی فوجیں۔ جو لوگ ادھر آگئے اور ان کے رشتے دار ادھر رہ گئے بس ایک دوسرے کو دور سے دیکھ تو سکتے ہیں ملاقات نہیں کرسکتے۔ اٹھمقام اب سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہے اور ایک خوبصورت مقام ہے۔ اس طرح کنڈل شاہی میں اوپر پہاڑ سے بڑی بڑی لکڑیاں کاٹ کر لانے کے لیے رسّے کی ٹرالی لگی ہوئی ہے اور نیچے ان کو کاٹ کر چھوٹی گیلیاں بنانے کا سرکاری کارخانہ ہے۔ ساتھ ہی دریا میں آگے رکاوٹ کی وجہ سے پانی جمع ہے۔ جس نے خوبصورت جھیل کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اسی طرح شاردا میں پانی کی رکاوٹ

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
گمراہ
۸ حصوں میں مکمل قیمت فی حصہ ۵ روپے پورے سیٹ کی قیمت ۳۵۰ روپے مع ڈاک خرچ
رعایت حاصل کرنے کے لیے رقم پیشگی بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔
جبار توقیر کا منفرد انداز بیان
کتابیات پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس ۲۳ کراچی

کی وجہ سے دریا میں اچھی خاصی جھیل بن گئی ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر فارسٹ کا خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے اور اس سے ذرا اوپر پرانے قلعے میں آج کل پولیس کا تھانہ ہے۔ اس سے بھی اوپر بودھوں کی پرانی یونیورسٹی کے کھنڈرات ہیں جہاں پر دور دور سے لوگ کبھی تعلیم کے لیے آتے تھے۔ کشمیر کے ہردلعزیز بادشاہ بڈشاہ (زین العابدین) نے سری نگر سے لمبا سفر کرکے یہاں آکر اسے دیکھا تھا اور اس کی مرمت کرائی تھی۔ شاردا سے آگے کیل ہے جہاں سے آگے وادی گریز شروع ہوجاتی ہے جہاں کی زبان کشمیری ہے اور اس وادی کا زیادہ حصہ مقبوضہ علاقے میں ہے۔ آزاد کشمیر کے حصے میں تاؤبٹ آخری مقام ہے۔ کیل کی دوسری سمت پیدل اور ٹٹوؤں کے راستے گلگت کی استوروپلی میں اترتے ہیں جو آگے ایک طرف گلگت اور دوسری طرف اسکردو کو نکل جاتے ہیں۔ وادیِ نیلم وہ واحد علاقہ ہے جہاں تین ہزار فٹ کی بلندی پر بھی دیودار کا درخت ملتا ہے ورنہ یہ درخت چھ ساڑھے چھ ہزار فٹ کی بلندی سے کم پر نہیں ہوتا۔ نیٹوال سیکٹر میں وہ دو سال رہا پھر اس کے بعد وہ چناری چکوٹھی میں سری نگر روڈ پر آگیا اور پھر ہمیشہ کے لیے ہی چکوٹھی کا ہوگیا اور چکوٹھی سے ہی ۱۹۸۰ء کو ریٹائر ہوا۔ دشمن ملک کی سرحدوں پر تعینات فوجیوں کی ڈیوٹی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے انہیں عام آدمیوں سے مل جل کر بھی رہنا پڑتا ہے کیونکہ آخر مقامی آبادی کو ان کے گھروں سے بے دخل تو نہیں کیا جاسکتا اور الگ بھی رہنا پڑتا ہے۔ مل جل کر اس لیے رہنا پڑتا ہے کہ مقامی طور پر آباد لوگوں میں سے ہر آدمی کے متعلق اس کے روزگار اور اس کی مصروفیت کے متعلق جاننا ضروری ہوتا ہے کہ وہ کہیں ملک دشمن کارروائیوں میں تو ملوث نہیں کیونکہ سرحدی علاقے کے لوگوں کے دوسرے ملک کے ملحقہ علاقے کے لوگوں سے اکثر روابط بھی ہوتے ہیں ایک دوسرے سے اکثر ملتے بھی ہیں اور بعض علاقوں میں ایک دوسرے ملک میں چیزیں بھی اسمگل کرتے ہیں اس لیے تمام لوگوں کی کارکردگی پر نگاہ رکھنی ضروری ہوتی ہے اور اس لیے ان سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان سے ایسے راز دشمن کے پاس نہ پہنچ جائیں جو ملک کے لیے نقصان دہ ہوں اس لیے بعض دفعہ ان پر سختی بھی کرنی پڑتی ہے اور کئی دفعہ کچھ گنجائش بھی دینی پڑتی ہے۔ اس کے کئی مقامی باشندوں سے ذاتی تعلقات استوار ہوگئے اور ان سے اکثر ملاقات بھی رہتی۔ انہی لوگوں میں مقبوضہ علاقے کا ایک مہاجر غلام محمد بھی تھا جس سے اس کی خاصی دوستی ہوگئی۔ وہ چکوٹھی کے قریب ہی رہتا تھا اور زمینداری کرتا تھا۔ وہیں دریائے جہلم کے کنارے اس کے پاس چالیس کینال زمین تھی اور دو گھراٹ یا جندر (آٹا پیسنے کی پن چکی) تھے جو اوپر سے ایک نالے سے آنے والے پانی پر لگائے ہوئے تھے۔ گھراٹ جندر یا پن چکی پہاڑی نالوں پر بڑے چشموں کے پانی کو باندھ کرا ونچائی سے لکڑی کے ایک ایسے پہیے پر گرایا جاتا ہے جو پانی کے زور کے تحت گھومتا ہے۔ اس پہیے کے ساتھ لکڑی یا لوہے کی لٹھ باندھ کر اس کے آگے چکی کے پاٹ منسلک کردیے جاتے ہیں اور وہ پہیے کے ساتھ ہی گھومتے ہیں اوپر لکڑی یا ٹین کے ڈبے لگادیے جاتے ہیں جو اناج سے بھردیے جاتے ہیں اور اناج آہستہ آہستہ خود بخود پستا رہتا ہے۔ بس آدمی صبح وشام آکر اناج ڈال جاتا ہے اور آٹا نکال لیتا ہے۔

غلام محمد کا خاندان بالکل مختصر تھا۔ بس ایک بیوی اور ایک بچی وہ کبھی کبھار اس سے ملنے اس کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ اس کی جب غلام محمد سے پہلی ملاقات ہوئی تو بچی چار پانچ سال کی تھی۔ چھوٹی سی خوبصورت گڑیا۔ اس کو دیکھ کر اسے اپنی بچی یاد آگئی جسے وہ ایک سال کا ہی چھوڑ کر گھر سے چلا آیا تھا۔ اس نے اس کو اٹھا کر پیار کیا اور اس کا نام پوچھا اور کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ غلام محمد اوڑی سے آگے رام پور کے پاس، رام پور سے منڈی اور پونچھ جانے والی سڑک پر آباد گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ میں اس کے والدین اور تمام کنبے والے بھارتی ہوائی جہازوں کی [illegible] مجاہدوں پر بمباری کی وجہ سے مارے گئے کیونکہ بمباری مجاہدوں کا تو کچھ نہ بگاڑ سکی۔ بس ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ غلام محمد بالکل تنہا رہ گیا تو وہ بھی ان مجاہدوں کے ساتھ ہی مظفر آباد کی طرف نکل آیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف سولہ سال تھی، تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ چکوٹھی میں آکر آباد ہوگیا۔ پہلے چائے کا چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ وہ کاروبار کم کرتا، دوستیاں اور واقفیت زیادہ بناتا۔ لوگوں کی خدمت پر کمربستہ رہتا۔ خود زخم خوردہ تھا اس لیے ہر ایک سے ہمدردی سے پیش آتا۔ علاقے میں آنے والے ہر سرکاری افسر سے ملتا، سلام کرتا اور ان کی بے لوث خدمت کرتا۔ بس یہ اس کی عادت سی بن گئی تھی۔ اسی دوران میں اس کی ملاقات بٹھیاں کے تحصیل دار سے ہوئی اور پھر اس سے اس کے نیازمندانہ تعلقات پیدا ہوگئے۔ اس نے جب اپنی داستان تحصیل دار کو سنائی تو اس نے اسے غیر آباد زمین الاٹ کردی۔ یہ زمین پہلے بھی آباد رہی ہوگی لیکن کچھ عرصے سے غیر آباد ہوچکی تھی۔ بعد میں گھراٹ (جندر) لگانے کی اجازت بھی اسے مل گئی۔ اس نے بڑی محنت سے زمین آباد کرلی اور چکیاں (گھراٹ۔ جندر) بھی لگالیں۔ یہ چکیاں پہاڑ کے اوپر سے ایک چشمے سے آنے والے پانی کے نالے پر لگائی گئیں۔ اس نے ایک آدمی کو اپنی مدد کے لیے ملازم بھی رکھ لیا اور محنت کرکے آہستہ آہستہ آسودہ حال ہوگیا۔ لوگوں نے کئی بار اسے شادی کرلینے کی بھی ترغیب دی لیکن جب بھی شادی کی بات ہوتی تو اس کے ذہن میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ بھائی بہنیں گھوم جاتے اور وہ اداس ہوجاتا اور بات ٹل جاتی۔ اس نے اپنی مصروفیت اسی بات میں ڈھونڈلی تھی کہ وہ علاقے کے تمام سرکاری افسروں اور اہلکاروں سے روابط رکھتا۔ ان کی خدمت کرتا اور وہ بھی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتے اور اس کی سفارشوں پر لوگوں کے کام کردیتے اس طرح علاقے میں متعین تمام فوجی افسروں سے بھی اس کا میل جول رہتا اور وہ لوگوں سے گپ شپ لگا کر ہی زندگی گزارتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء کا زمانہ آگیا اور بھارت اور پاکستان کے درمیان پھر جنگ شروع ہوگئی اور اس جنگ کی وجہ بھی دراصل مسئلہ کشمیر ہی تھا۔ ۱۹۶۲ء میں جب بھارت سرحدی جھڑپوں میں چین سے نبرد آزما تھا اور یہاں اسے خاصی زک اٹھانی پڑی۔ وہ اچھا وقت تھا جب پاکستان کشمیر پر حملہ کرکے بھارت کو کشمیر کے بارے میں کسی فیصلے پر مجبور کرسکتا کیونکہ بھارت چین سے شکست کھا جانے کی وجہ سے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا اور پھر دونوں ملکوں کے ساتھ دونوں محاذوں پر لڑنے کے قابل نہ تھا لیکن پاکستان میں صحیح منصوبہ بندی کا ہمیشہ سے ہی فقدان رہا ہے۔ اس وقت کے صدر جنرل ایوب خاں نے پتا نہیں کس ڈر یا مصلحت کے تحت اس طرف توجہ نہیں دی اور تاریخ کی طرف سے مہیا کردہ اس مسئلے کو حل کرنے کا ایک سنہری موقع ضائع کردیا۔

○☆○

۱۹۶۲ء میں بروقت عمل نہ کرنے کی وجہ سے حکومت نے جب موقع گنوادیا تو پھر ۱۹۶۵ء میں منصوبہ بنایا گیا جس کے تحت وادی کشمیر میں گوریلے بھیجے گئے لیکن کشمیری لوگوں کو بالکل اعتماد میں نہ لیا گیا۔ جولائی اور اگست ۱۹۶۵ء میں بھیجے گئے گوریلوں نے کافی کام دکھایا اور مقامی لوگوں نے ان سے بھرپور تعاون کیا۔ اگرچہ ان سے اس سلسلے میں بالکل رابطہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔ مقبوضہ علاقے میں انقلابی کونسل تشکیل دی گئی۔ اس کونسل نے اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرکے باقاعدہ نشریات شروع کردیں۔ بھارت کے لیے حالات خاصے تشویش ناک ہوگئے اور اس کے رد عمل میں بھارت نے اس کارروائی کو روکنے کے لیے پاکستان کے تمام علاقوں پر بھرپور حملے کروئیے جس سے پاکستان کی قوت بٹ گئی اور مقبوضہ کشمیر میں مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوسکے۔ ہم آج تک یہی کہتے آئے ہیں کہ بھارت نے چپ چاپ لاہور پر حملہ کیا تھا لیکن حقائق کو چھپایا نہیں جاسکتا کیا ہم اتنے ہی غافل تھے کہ کشمیر میں فوجی کارروائی کے بعد بھارت کے پاکستانی علاقوں پر حملے کے متوقع نہ تھے۔ خیر اس جنگ کے نتیجے میں معاہدۂ تاشقند وجود میں آیا۔ روس کو اپنے دوست بھارت کو خوش کرنے کا موقع مل گیا۔ کشمیر میں کشمیری لوگوں نے اس ادھورے اور ناکام آپریشن کی وجہ سے اور پھر آخر فائربندی کے بعد جو سزائیں بھگتیں وہ تاریخ کے کسی ورق پر رقم نہیں ہوسکیں اور نہ پاکستانیوں کے علم میں آسکیں بلکہ پاکستان میں کشمیریوں کے خلاف ایک طبقے کو اپنی ہرزہ بافیاں اور کشمیریوں کے متعلق خودساختہ کہانیاں گھڑ کر قومی اخباروں اور رسائل میں شائع کرانے کے مواقع مل گئے اور ان کی نجی محفلیں ان موضوعات سے سجتی رہیں۔ پاکستان میں ایک ایسا طبقہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ جس نے کشمیریوں کے جذبۂ حریت کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے اور ان کی آزادی کی ہر کوشش کو غداری کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یوں وہ اپنی سادگی یا بے وقوفی انگریزوں کی مکاری اور ہندوؤں کی بدنیتی سے زیادہ کشمیریوں کو کشمیر کی غلامی کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں اور ان کی بزدلی کی داستانیں گھڑ گھڑ کر سناتے ہیں لیکن اگر کوئی کشمیری جذبۂ حریت کے تحت اپنے وطن کی آزادی کے لیے کوئی جدوجہد کرتا ہے تو اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں اور حکومتی سطح پر بھی وہ قابل گردن زدنی ٹھہرتا ہے۔ گنگا اغوا کیس اور بوئنگ ۷۳۷ اغوا کیس میں کشمیری حریت پسندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ان پر قلعے میں تشدد کرکے مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں کتنا عرصہ مسلسل پابند سلاسل رکھ کر ان کے جذبۂ حریت کی داد دی گئی اور بالآخر جب پاکستان کے خلاف ان پر کوئی جرم ثابت نہ ہوسکا تو انہیں باعزت رہا کرنا پڑا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ کشمیر کو بھارتی چنگل سے آزاد کرانا چاہتے تھے جب اجتماعی کارروائی نہ کرسکے تو گوریلا چھاپامار کارروائیاں کرکے اپنے جذبے کا اظہار کرتے رہے۔ کشمیریوں کو بزدلی کا طعنہ دینے والوں نے اپنے گریبانوں میں جھانکا ہوتا تو ان کا اپنا کردار بھی کھل کر ان کے سامنے آجاتا۔ کشمیری حریت پسند چھاپامار کارروائیاں کرکے پاکستان میں آکر بھی بھارتی جاسوس کہلواتے ہیں اور یہاں سے مقبوضہ علاقے میں جاکر تو وہ پاکستانی جاسوس ہوتے ہی ہیں۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بھارت نے کشمیر میں چپے چپے پر فوجی بٹھار کھے ہیں۔ اس طرح سے سنگینوں کے سائے میں بھی بھارتی حکومت کے خلاف اور پاکستان کے حق میں نعرے لگانے والے کشمیری بزدل ہیں تو دنیا میں کسی بہادر قوم کی بھی نشان دہی کی جائے۔ ان حریت پسندوں نے کشمیر... کی آزادی کے لیے جس جرأت سے تکالیف کو گلے لگایا ہے، کیا اس کے بعد بھی لوگوں کو کشمیری قوم کی حریت پسندی اور بہادری میں شک رہ گیا ہے۔ دراصل ایسے مفروضے صرف وہ لوگ باندھتے ہیں جو مسلمانوں کی اجتماعی ترقی کو پسند نہیں کرتے اور دانستہ یا نادانستہ طور پر بھارت کے ایجنٹ کے طور پر کام کررہے ہیں۔ ایسے لوگ ان لوگوں کی طرح کے ہیں جو صوبائی یا مقامی تعصب پھیلا کر ملک کے ایک حصے کے لوگوں کو دوسرے حصوں کے لوگوں سے متنفر کرتے رہتے ہیں مثلاً ایسے بنگالی بھی تھے جو کہتے رہے کہ کشمیر ہمارا مسئلہ نہیں، ہم کشمیریوں کے حقوق کے لیے بھارت سے تعلقات کشیدہ رکھنے پر تیار نہیں اور بالآخر ان کی اس نہج کی سوچ ہی ان کی علیحدگی کا باعث بنی۔ اب بھی پاکستان میں ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ کشمیر ہمارا مسئلہ نہیں اور ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ ہم نے اس مسئلے کی وجہ سے خواہ مخواہ بھارت سے تعلقات خراب کررکھے ہیں۔ دراصل ان لوگوں کے ذہن تمام حدود پھلانگ کر بھارت کی حکومت کی منافقانہ پالیسی کا شکار ہیں جس کے تحت وہ پاکستانیوں کے دلوں اور ذہنوں میں شکوک پیدا کرکے برصغیر میں دو قومی نظریئے کی نفی کرنے کے درپے ہے اور پاکستان کی تشکیل کو بے مقصد قرار دینا چاہتا ہے۔ بھارت میں پاکستان کے نچلی سطح کے سیاسی لیڈروں اور دانشوروں کی اس طرح سے پذیرائی صرف ان میں احساسِ محرومی پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہے تاکہ جب ان کی انا اپنے ملک میں اپنی حیثیت میں تسکین نہ پاسکے تو وہ بھارت کے ہی گن گاتے رہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے کہ مسئلہ کشمیر کے بعد پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی جھگڑا باقی نہیں رہے گا۔ بھارت اس کے بعد کئی اور جھگڑے پیدا کرے گا۔ کشمیریوں کی یہی خواہش ہے کہ اگر پاکستان ان کے حقوق انہیں نہیں دلا سکتا تو وہ ایک طرف ہو جائے اور انہیں ان کی اپنی جنگ لڑنے دے۔ آزاد کشمیر کے علاقے پر ان کو پورا کنٹرول دے دیا جائے اور پھر دنیا دیکھے گی کہ کشمیر کا مسئلہ کس طرح سے حل ہوتا ہے۔ اس دور میں کسی قوم کے جذبۂ حریت کو کچلنا اتنا آسان نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں بار بار ویت نامیوں کا ذکر کرنے والے دانشوروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ویت نامیوں نے امریکا سے جنگ ضرور جیتی ہے لیکن اس کے لیے ان کے حالات کچھ اور طرح کے تھے۔ امریکا ان کے ملک سے بہت دور واقع تھا۔ دونوں ملکوں کے موسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ویت نامیوں کے پاس بیس کے طور پر شمالی ویت نام کا حصہ موجود تھا پھر دنیا کی دو بڑی طاقتیں روس اور چین ان کی پشت پر موجود تھیں اور انہیں تمام قسم کا اسلحہ مہیا کرتی تھیں اور کشمیریوں کے حالات ان سے بہت مختلف ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے جذبۂ آزادی کے اظہار سے کبھی نہیں چوکے۔ پاکستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس ملک کی باگ ڈور ہمیشہ غیر [illegible] سیاسی ہاتھوں میں رہی ہے جو جاگیردار طبقے میں پروان چڑھے اور عوام سے ان کا رابطہ صرف جاگیردار اور مزارع یا "کمین لوگوں" کی طرح کا ہی رہا اور انہوں نے اپنے ہتھکنڈوں سے کبھی کسی پختہ کار سیاسی آدمی کو عزت اور اقتدار کے مقام تک نہیں پہنچنے دیا اور وہ خود صرف اپنے مفادات کا ہی تحفظ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے عوام کے حقوق کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ انہوں نے ہمیشہ ذاتی اغراض کی طرف ہی توجہ دی اور اجتماعی ملکی مفادات کو ہمیشہ پس پشت ڈالا ہے۔ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے، پاکستان کا تصور کشمیر کے بغیر ادھورا ہے۔ کشمیر سے آنے والے دریاؤں کے پانی ہی پنجاب اور سندھ کی زمین کی زرخیزی کے ضامن ہیں۔ کشمیر سے آنے والی لکڑی سے ہی پاکستان کی تمام لکڑی کی [illegible] پوری ہوتی ہیں۔ آزاد کشمیر کے سنگلاخ اور دشوار گزار کہساروں ہی پاکستانی سرحدوں کو تحفظ بخش رکھا ہے۔ کشمیر [illegible] کا قدرتی حصہ ہونے کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے بارش کا جو قطرہ بھی وادیٔ کشمیر میں گرتا ہے بالآخر اس کا پانی پاکستان کی زمینوں کو آکر سیراب کرتا ہے۔ کشمیری مسلمان تہذیب، ثقافت اور معاشرت کی تمام سمتوں سے پاکستان کے لوگوں سے ہم آہنگ ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کی آزادی مستقل طور پر سلب نہیں کرسکتی۔ آزادی کے حصول کا طریقہ کار جدا ہو سکتا ہے لیکن ان کی منزل بالآخر پاکستان ہے اس لیے غلط سوچ کے لوگوں پر واضح کرنا ضروری ہے کہ وہ اپنی اصلاح کریں اور کشمیریوں کو شک کی نظر سے دیکھنا ترک کردیں۔ کشمیری مسلمانوں نے پاکستان کے لیے کسی بھی صوبے کے لوگوں سے کم قربانیاں نہیں دیں بلکہ وہ تو اب قربانیاں دے رہے ہیں کیونکہ آزادی کی طرف ان کا ہر قدم پاکستان کی تکمیل کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ کشمیریوں نے تاریخ حریت کو اپنے خون سے لکھا ہے۔ انہوں نے ہر موقع پاکستانی گوریلوں کی ہر طرح سے معاونت کی ہے اور اس

[illegible] میں جو اذیتیں اٹھائی ہیں، وہ تاریخ کی کسی کتاب میں قلمبند نہیں ہو سکیں۔ ایک داستان کچھ یوں ہے کہ ایک پاکستانی گوریلے نے ایک کشمیری کے ہاں پناہ لی، وہ رات کو اس کے گھر میں چھپا ہوا تھا کہ بھارتی فوج کو کسی طرح اس کی موجودگی کا علم ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے پورے گاؤں کا محاصرہ کرلیا اور لوگوں کی تلاشی لینا شروع کردی۔ اس شخص کو بھی تلاشی اور محاصرے کا علم ہوگیا۔ وہ اگر چاہتا تو پاکستانی گوریلے کو اپنے گھر سے نکال کر بری الذمہ ہو جاتا یا پھر اسے [illegible] لیکن اس نے اس فوجی کو اپنی جوان بیٹی کے ساتھ ایک کمرے میں بند کردیا اور تلاشی کے وقت اسے اپنا داماد ظاہر کیا جس کی اس کی بیٹی کے ساتھ شادی چند روز پہلے ہی ہوئی تھی اور وہ اس کے ہاں آیا ہوا تھا۔ اس وقت تو بلا ٹل گئی اور گوریلا اپنے وقت پر وہاں سے چلا گیا لیکن دوسرے روز انہوں نے پوری پڑتال کی کیونکہ مخبروں نے مکمل اطلاع پہنچائی تھی۔ اصل بات چھپی نہ رہ سکی۔ فوجی اس شخص کو اور اس کی بیٹی کو پکڑ کر لے گئے۔ آدمی کو تو ایک ہفتہ تشدد [illegible] چھوڑ دیا لیکن اس کی بیٹی کبھی واپس گھر نہ جاسکی۔ لڑکی [illegible] روز قریبی فوجی کیمپ کے ہندو، ڈوگرے اور مرہٹے فوجیوں کی پوچھ گچھ میں رہی پھر مزید تفتیش کے لیے رجمنٹ ہیڈ کوارٹر میں بھیج دی گئی اور وہاں پوچھ گچھ اور تفتیش کی [illegible] کیا ہوگی؟ ہر کوئی شخص سمجھ سکتا ہے۔ لڑائی کے دنوں [illegible] سرحدوں پر فوجیوں کے اختیارات لامحدود ہوتے ہیں اور [illegible] ملک میں تو انہیں پوچھنے والا ہی کوئی نہیں ہوتا اور [illegible] میں بھارتی فوجیوں کا رویہ بھی کچھ فاتح قسم کی فوجیوں کا [illegible] ہوتا ہے۔ دو تین ہفتوں میں اس کی جو حالت ہوگئی وہ کسی [illegible] پوشیدہ نہ ہوگی۔ ایک شام وہ موقع ملتے ہی کیمپ سے فرار ہوگئی۔ رات بھر پہاڑوں پر چڑھتی اترتی رہی۔ دن کو کسی [illegible] میں دبک کر پڑی رہی۔ اگلی رات پھر ہمت کرکے چل [illegible] اسی طرح گھسٹتی گرتی پڑتی دوسری صبح کے قریب وہ [illegible] کے قرب وجوار میں آپہنچی۔ اس وقت اس کے [illegible] تار تار تھے اور جسم زخموں اور تھکن سے چور اور نڈھال حتیٰ کہ وہ ایک پن چکی (گھراٹ) میں داخل ہوگئی وہاں سردی کا کچھ احساس کم ہوا تو وہ بے ہوش ہوکر گر گئی۔ [illegible] رہی تھی لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ صبح [illegible] چکی کا مالک وہاں پر آیا تو ایک اجنبی نوجوان نیم عریاں [illegible] کو چکی میں بے سُدھ سوتے ہوئے پایا۔ اس کے [illegible] جگہ سے پھٹے ہوئے تھے اور وہ زخمی بھی تھی، وہ [illegible] واپس چلا گیا اور اپنے ہمسائے اور اس کی بیوی کو لے آیا اور اسے اپنے ساتھ زنانہ کپڑوں کا جوڑا بھی..... لانے کو کہا وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بڑے تیز بخار میں جل رہی ہے۔ اس عورت نے اسے جگانے کی کوشش کی لیکن بے سود، کبھی وہ بڑبڑانے لگتی اور کبھی ڈر کر سمٹ جاتی۔ اس کے کپڑے تبدیل کیے گئے۔ اتنے میں مرد واپس جاکر چارپائی لے آیا اور اسے وہ چارپائی پر ڈال کر گھر لے گئے۔ قریب کی یونٹ میں ہی ایک فوجی ڈاکٹر تھا جس سے اس شخص کی شناسائی تھی۔ چنانچہ وہ اسے دکھانے کے لیے اس ڈاکٹر کو لے آیا جس نے اسے ٹیکہ لگایا اور دوائیاں دیں۔ اس کے ہمسائے کی بیوی اور وہ خود اس کی تیمارداری کرتے رہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور اسے اس حالت میں کس نے پہنچایا؟ یہ تمام راز اس کے ہوش میں آنے پر ہی معلوم ہو سکتے تھے۔ تیسرے دن اسے ہوش آیا تو عجب نظروں سے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن انہوں نے اسے چارپائی پر لٹادیا۔ ایک ہفتے کے بعد اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے رو رو کر اپنی کہانی ان لوگوں کو سنائی۔ اس دوران میں وہ عورت اس کے اکیلے گھر میں رہی اور ہمسائے کی بیوی بھی اس کے پاس سوتی رہی اور وہ شخص مکان کے باہر کھلے میدان میں درختوں کے نیچے سوتا رہا پھر آہستہ آہستہ وہ گھر کے کام کاج کرنے لگی۔ وہ شخص سارا دن اپنے کام کاج میں لگا رہتا اور رات کو مکان کے باہر سو رہتا۔ کچھ دن کے بعد اس کے ہمسائے اور اس کی بیوی نے اس شخص کو مشورہ دیا کہ وہ اس عورت سے نکاح کرلے۔ اس نے ارادہ تو یہی کررکھا تھا کہ وہ تمام زندگی شادی نہیں کرے گا لیکن اس عورت کا دکھ سن کر اسے اپنے دکھ بھول گئے اور مجبور ہوکر اس نے اس سے شادی کرلی۔

ایک سال کے بعد ان کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس سے ان کی زندگی میں دلچسپی بڑھ گئی اور مصروفیت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ وہ شخص رمضان کا دوست غلام محمد تھا اور یہ کہانی اس نے صوبے دار رمضان کو دوستی پکی ہو جانے کے بعد برسبیلِ تذکرہ سنائی تھی۔ رمضان اس عورت کی داستان سے بڑا متاثر ہوا اور کئی دن افسردہ رہا۔ اس دوران میں وہ مسلسل اپنے والدین اور بال بچوں کے بارے میں سوچتا رہا کہ پتا نہیں وہ کن غیر یقینی حالات میں جی رہے ہوں گے۔ اس نے اپنے ماضی سے رشتہ منقطع کرکے نہ تو خود سے انصاف کیا تھا اور نہ ہی اپنے بیوی بچوں سے۔ حالات سُدھرنے کے بعد وہ اپنے گھر جا سکتا تھا اور دو دفعہ تو وہ اپنے گھر کے سامنے سے گزر بھی چکا تھا مگر۔

○☆○

رمضان اب چکوٹھی میں اس لیے مقیم تھا کہ یہ جگہ اس کے گھر سے قریب تر تھی اور اسے امید تھی کہ جب بھی حالات ذرا موافق ہوئے اور سری نگر روڈ کھلی تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ اس کا گھر یہاں سے صرف اڑتالیس میل ہی تو دور تھا اور یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں بھی طے ہو سکتا تھا۔ یہ ویران سی سری نگر روڈ کبھی کتنی مصروف سڑک تھی۔ گرمیوں کے آغاز کے ساتھ ہی کشمیر جانے والے قافلے شروع ہوجاتے اور لوگ مختلف جگہوں پر رات کو پڑاؤ کرتے ایک گہما گہمی سی رہتی کیونکہ رات کا سفر اس زمانے میں خطرناک ہوتا تھا اور پھر سڑک بھی اتنی اچھی نہ تھی۔ کوہالہ، دومیل، ہٹیاں، چناری، چکوٹھی، اوڑی، رام گڑھ یہ سب جہلم ویلی روڈ پر پڑاؤ کے مقام تھے جہاں بسیں، کاریں، قافلے وغیرہ رکتے اور رات بسر کرتے۔ راولپنڈی سے الامینٹو چراغ دین کی بسیں چلتیں اور دوسرے دن اور بعض دفعہ تیسرے چوتھے دن سری نگر پہنچاتیں اور اگر راستہ کبھی بند ہوجاتا تو مزید کئی کئی دن لگ جاتے۔ بارہ مولا سے پہلے ہی وادیٔ کشمیر شروع ہوجاتی ہے۔ بارہ مولا شہر میں پھلوں کی بڑی خرید و فروخت ہوتی اور واپسی پر اکثر لوگ تازہ اور خشک پھل یہیں سے خریدتے لیکن اب یہ سڑک ویران تھی۔ چکوٹھی تک چند بسیں چلتی تھیں کیونکہ صرف چند فوجیوں اور مقامی لوگوں کی آمدورفت رہتی۔ اس کی ریٹائرمنٹ قریب آئی تو اس نے چکوٹھی میں ہی بس جانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے دوست غلام محمد سے بھی کیا کہ وہ مکان کے لیے زمین خریدنا چاہتا ہے۔ غلام محمد نے اسے مکان کے لیے زمین کا ٹکڑا مفت دینا چاہا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ چنانچہ ایک دوسرے دوست کی وساطت سے قیمت کا تعین کیا گیا اور غلام محمد کو ساتھ لے کر وہ تحصیل دار کے پاس گیا تاکہ زمین کی رجسٹری کرالی جائے۔ تحصیل دار نے اس سے کشمیری ہونے کا ثبوت مانگا اور اسے بتایا چونکہ ریاست جموں و کشمیر ابھی متنازعہ علاقہ ہے اس لیے اس میں جائداد صرف کشمیری ہی خرید سکتے ہیں۔ دوسرے نہیں کیونکہ غیر ریاستی لوگ اگر یہاں آباد ہوجائیں تو یہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کی خلاف ورزی ہوگی۔ وہ اقوامِ متحدہ جس کی قراردادیں پچھلے تینتیس سال سے کشمیریوں کو ان کا حقِ خودارادیت دلا رہی ہیں۔ بھارت میں ان اصولوں پر کہاں تک عمل ہوا ہے یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ کس طرح اس نے مسلم اکثریت والے صوبہ جموں میں مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کردیا ہے کیونکہ بھارت تو کشمیر کو اب متنازعہ علاقہ بھی نہیں کہتا اور کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ کہتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ آزاد کشمیر والے علاقہ پر بھی اپنے دعوے کا اظہار کرتا ہے اور اس نے مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی سے کشمیر کے بھارت سے الحاق کا قانون بھی منظور کرا رکھا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ اسمبلی اس قانون کے پاس کرنے کی اہل بھی تھی یا نہیں اور اسے پورے کشمیر کی نمائندگی کا حق بھی تھا یا نہیں لیکن پھر بھی اپنے علاقے کی نمائندہ اسمبلی تو وہ تھی اور ادھر آزاد کشمیر میں چند برسوں کے سوا لوگوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق اسی طرح نہیں دیا گیا جس طرح خود پاکستان کے لوگ اس حق سے محروم ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ وہ قانونی اور اخلاقی طور پر آزاد کشمیر کی وہ حیثیت نہیں جو ایک منتخب حکومت کی ہوسکتی ہے۔ (اس وقت آزاد کشمیر میں منتخب حکومت نہیں تھی) اس لیے وہ مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی کی اس قراداد کے جواب میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ دوسری طرف گلگت اور بلتستان کو کشمیر سے الگ کرکے شمالی علاقہ جات کے نام پر ایک علیحدہ یونٹ بنادیا گیا ہے جس پر آزاد کشمیر کی حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں بلکہ وہ علاقہ براہِ راست حکومتِ پاکستان کے تحت ہے اس لیے بین الاقوامی طور پر مقبوضہ کشمیر کی اسمبلی کا حق ہی فائق سمجھا جائے گا اور پھر ہم نے سلامتی کونسل کے جس ریزولیوشن کو مان رکھا ہے اس میں بھی مقبوضہ کشمیر کی حکومت کو ہی ریاست کی نمائندہ حکومت تسلیم کیا گیا ہے اور اسی حکومت نے ہی اقوام کے کنٹرول میں رائے شماری کرانی تھی۔ ان تمام حقائق پر غور کرنے کے بعد بھی وہ تحصیل دار کو اپنے کشمیری ہونے کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ فوج میں بھرتی ہوتے وقت بھی اس نے اپنی قومیت صرف مسلم لکھوائی تھی اور اپنا پتا لالہ غلام نبی کی معرفت پنڈی کا دیا تھا۔ اس ڈر سے کہ وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں کو فوج میں بھی بھرتی نہیں کیا جاتا تھا اور پھر یوں بھی اپنا وطن اس وقت اس کے ذہن سے نکلا ہوا تھا اسے اپنی قسمت پر رونا آیا اور وہ قدرت کے اس ستم پر سوائے جھنجلاہٹ کے اور کسی چیز کا اظہار بھی تو نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس سرزمین میں رہ تو سکتا تھا لیکن کسی اجنبی کی طرح اس علاقے کے باشندے کی حیثیت سے نہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ڈوگروں نے اسے اس وقت وطن سے بے دخل کیا تھا۔ اب وہ کس عدالت سے فریاد کرتا اور کس سے انصاف چاہتا۔ وہ تمام زخم جن پر پچھلے چالیس سال میں کھرنڈ جم چکے تھے پھر سے ہرے ہوگئے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے

لیکن وہ مجبور تھا۔ غلام محمد بھی مجبور تھا۔ ادھر تحصیل دار بھی مجبور تھا۔ اس نے تحصیل دار سے آنسو بھری آواز میں کہا کہ اگر تمہارے بس میں ہو تو یہ سری نگر کا راستہ کھول دو اور اپنے عدالتی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے بارہ مولا کے پاس میرے گاؤں سے میرے بچوں کو بلا لو وہ میرے کشمیری ہونے کی گواہی دے سکیں اگر وہ کہیں زندہ ہے جسے تھپڑ مار کر میں گھر سے بھاگا تھا اسے بلا لو کہ وہ میرے کشمیری ہونے کا زندہ ثبوت ہوگا۔ اگر میرے ماں باپ زندہ ہیں تو وہ بھی اپنے خون کو پہچان کر میرے کشمیری ہونے کی گواہی دیں گے اور اگر تم خود کشمیری ہو تو میرے خون کا رنگ دیکھ لو۔ میرے پسینے کی بو سونگھ لو یا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو کہ میں کشمیری ہوں یا نہیں۔ کیا میرا چہرہ میرا جسمانی ڈیل ڈول اور میرا رنگ میرے کشمیری ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ سوال تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی مجھ سے میرے انسان ہونے کا ثبوت مانگے لیکن وہ قانون کے ہاتھوں مجبور تھا اس لیے وہ تحصیل سے واپس آگیا۔ اس واقعے کے بعد وہ کئی دن تک بیمار رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو کر سوج گئیں اور گلا سخت خراب ہوگیا۔ اس کی وجہ سے وہ بیرکوں سے باہر ہی نہیں نکلا۔ بس اسپتال تک جاتا رہا۔ ڈاکٹر نے اسے اسپتال میں داخل کرنا چاہا لیکن اس نے منت سماجت سے صرف دوائی دینے پر ڈاکٹر کو راضی کرلیا۔ اتنے دنوں میں وہ غلام محمد کے پاس بھی نہیں گیا۔ ادھر غلام محمد اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرتا رہا اور اسے ملنے نہیں آیا۔ آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھول گیا اور پھر عام زندگی گزرنے لگی۔ اس کی ملازمت کا ابھی ایک سال رہتا تھا کہ اچانک ایک دن اس کے دوست غلام محمد کو بس میں سفر کرتے ہوئے حادثہ پیش آیا۔ بس قلابازیاں کھاتی ہوئی سیکڑوں فٹ نیچے کھڈ میں جاگری۔ غلام محمد کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں، خون کافی بہہ گیا۔ رمضان کو پتا چلا تو وہ فوراً وہاں پر پہنچا اسے اٹھا کر یونٹ کے اسپتال میں لے آیا لیکن خون کی کمی کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ گئی تھی اور اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ اسے مظفر آباد بھی لے جایا جاسکتا۔ غلام محمد نے اپنا آخری وقت سمجھ کر رمضان سے التجا کی کہ وہ اس کے بعد اس کی بیٹی کا خیال رکھے اور کسی اچھی جگہ اس کی شادی کردے اور اگر مناسب سمجھے تو اس کی بیوہ سے بعد میں شادی کرلے کیونکہ اس کی طرح اس کا بھی اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔ اس نے اسے دلاسا دیا لیکن بے رحم قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا تھا۔ بے چارہ غلام محمد انہیں چھوڑ کر دوسری دنیا میں اپنے بھائی بہنوں اور ماں باپ کے پاس چلا گیا۔ کتنا پُرسکون چہرہ نظر آرہا تھا غلام محمد کا۔ اس نے موت کو مسکراہٹ سے قبول کیا۔

○☆○

غلام محمد کی آخری خواہش کے مطابق اس نے بادلِ ناخواستہ اس کی بیوہ سے شادی کرلی کیونکہ اس کے علاوہ اس کی بچی کی دیکھ بھال کی اور کوئی صورت نہ تھی اور پھر اس عورت کے حالات بھی اس بات کے متقاضی تھے کہ اسے سہارا دیا جاتا حالانکہ اس نے اکیلے ہی زندگی گزارنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ وہیں پر آگیا۔ بس اب کاشتکاری کرتا اور چکیوں کا کام چلاتا۔ غلام محمد کی بیٹی کی اس نے مظفر آباد میں ایک اچھے گھرانے میں شادی کردی تھی۔ وہ لوگ بھی وادی کے مہاجر تھے۔ لڑکا آزاد کشمیر سیکریٹریٹ میں سیکشن آفیسر تھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی وہ سسرال گئی تھی اور اب دونوں میاں بیوی گھر میں اکیلے اپنی اپنی سوچوں میں گم کہیں ماضی کے دھندلکوں میں گھوم رہے تھے۔ جہاں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں لیکن انہیں اب اس کے علاوہ اور کوئی کام بھی تو نہ تھا۔

پاکستان کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کشمیر ہمارا مسئلہ نہیں اس کے لیے بھارت سے کیوں جنگ کی جائے۔ واقعی کشمیر ان لوگوں کا مسئلہ نہیں۔ ان کا مسئلہ تو مشرقی پاکستان بھی نہ تھا جو اب بنگلہ دیش ہے، ان کا تو مسئلہ اگر کچھ ہے تو صرف زمینی رقبے میں اضافے کا مسئلہ ہوسکتا ہے۔ گرمیوں میں اچھی سیرگاہ کے حصول کا مسئلہ ہوسکتا ہے یا پھر فوجی اہمیت کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا مسئلہ ہے۔ ایک کروڑ کشمیری تو محض بھیڑ بکریاں ہیں۔ جن کے جذبات اور حقوق کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ انہیں بھارت سے تعلقات عزیز ہیں۔ وہ بھارتی ثقافت سے اپنے رشتے جوڑنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسلام کا رشتہ ان کے نزدیک اب پرانا ہوچکا ہے۔ دراصل ایسے لوگ ذہنی تلذذ میں مبتلا ہیں اور ہندوؤں کی تہذیب سے اپنی جنسی ہیجانی جبلتوں کی تسکین چاہتے ہیں تاکہ وہ بھارت میں آزادانہ آجا کر اس مخلوط معاشرے میں لطف اندوز ہوسکیں ورنہ صحیح سوچ والے لوگ اور جنہیں ہندوؤں کے ساتھ رہنے کا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کے لیے اس معاشرے میں رہنا کتنا خطرناک اور نقصان دہ ہے۔ اس کی مثال بھارتی مسلمانوں کی مشکلات سے لی جاسکتی ہے۔ جن کا اپنے مذہب پر قائم رہنا مشکل بنادیا گیا ہے۔ کشمیر کے مسلمان اپنی ریاست میں اکثریت میں

ہیں اور وہ اپنی اس پوزیشن سے آگاہ ہیں اس لیے ان کی کوششیں آزادی کے لیے روز بہ روز تیز ہوتی جارہی ہیں کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ بھارتی سامراج کے مکمل چنگل میں آنے سے پہلے پہلے وہ بھارتی غلامی کا جوا اتار پھینکیں۔ ادھر بھارتی حکومت اس چکر میں ہے کہ کسی طرح پیار دلاسے سے کشمیری مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدل دے۔ اس وقت کشمیری مسلمان بھارتی مسلمانوں کے لیے ایک ڈھال کا کام دے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی منزل سے خوب آگاہ ہیں۔ ریٹائرڈ صوبے دار سردار (آزاد کشمیر فورسز میں جونیئر کمیشنڈ آفیسر سردار کہلاتے ہیں) رمضان پرے کی بڑی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح اگر زندہ وطن میں نہ پہنچ سکے تو مرنے کے بعد ہی اسے وطن میں دفن کیا جاسکے۔ دریائے جہلم کے کنارے اس پرانے قبرستان میں جس میں اس کے آباواجداد ابدی نیند سو رہے ہیں۔ جہاں پر وادی کی پُربہار اور معطر ہوا کا گزر تو ہوگا۔ جہاں دریائے جہلم میں ہوائیں چلنے پر پانی کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں سفیدے، بادام اور اخروٹ کے درختوں کے نیچے کھیل کود میں مصروف بچے کشمیری زبان میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اگر دریائے جہلم کا رخ الٹ جائے اور وہ اترائی سے اونچائی کی طرف چلنے لگے تو وہ یقیناً دریا میں چھلانگ لگا کر وہاں پہنچ جائے لیکن ایسا تو ممکن نہیں۔ اس کی بیوی تنہائی میں کیا سوچتی ہے یہ اس نے کبھی نہیں پوچھا لیکن بیٹی کی شادی کے بعد یقیناً تنہائی میں وہ اپنے بھائی بہنوں اور والدین کو یاد کرتی ہوگی کیونکہ عورت تو کسی لمحے بھی اپنے والدین کو نہیں بھولتی اور جب وہ والدین کو یاد کرتی ہوگی تو وطن کے بارے میں بھی ضرور سوچتی ہوگی۔ رمضان اسے اس کا ماضی یاد دلا کر کوفت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کئی دفعہ سوچتا کہ قدرت کو ابھی پتا نہیں کشمیریوں سے کتنی قربانیاں مزید درکار ہیں۔ دنیا کی ساری قومیں آزادی سے ہمکنار ہوگئیں۔ افریقہ اور لاطینی امریکا کے دور دراز کے پس ماندہ علاقے کے لوگوں کو بھی آزادی مل گئی لیکن اس کی بدقسمت قوم کو ابھی اس نعمت سے محروم رکھا گیا ہے وہ بھی آزادی اور جمہوریت کے دعوے دار خود اپنے دعوے کی نفی کرتے بھی نہیں شرماتے کہ انہوں نے ایک قوم کو سنگینوں کے سائے میں محبوس کر رکھا ہے۔ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ کسی دن چپکے سے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر کسی پہاڑی پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جائے اور پھر جو کچھ ہو دیکھا جائے اور اس کی روز روز کی یہ خلش تو ختم ہو لیکن پھر پتا نہیں وہ کون سی مجبوری تھی کہ وہ اس حرکت سے باز رہ جاتا۔ کبھی وہ سڑک کی آخری حد پر جا کر اس ٹوٹے ہوئے پُل کو دیکھتا جو جنگ کے دوران میں ہی توڑ دیا گیا تھا اور پھر فائربندی کے بعد مرمت نہیں کیا گیا اور وہی پُل حد بندی کا کام دے رہا ہے۔ مسافروں کی آمدورفت کے لیے لکڑی کا چھوٹا پیدل چلنے کے لیے پُل بنا دیا گیا تاکہ دونوں طرف رابطہ رہ سکے۔ وہ سوچتا اگر یہ پُل ہی سلامت ہوتا تو کسی گاڑی پر ایک گھنٹے میں، پیدل دن بھر میں اپنے گھر پہنچ سکتے تھے۔

حالات اگرچہ مایوس کن تھے لیکن وہ کبھی کبھی پُرامید بھی ہوجاتا کہ قدرت شاید اسے ایک دن اپنا وطن دکھادے۔ یہ علاقہ بھی اگرچہ اس کے وطن کا ہی حصہ تھا لیکن اپنا گھر اپنے رشتے دار، عزیز واقارب۔ ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد میں موجود ہونا کتنا اطمینان بخش ہوتا ہے وہ کئی دفعہ سوچتا کہ دنیا میں سیاسی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ قدرت کے نظام میں تغیر کو ہی دوام حاصل ہے۔ شاید کبھی بھارتی استعمار کی گرفت کشمیر سے ڈھیلی پڑجائے اور وہ بھارتی سامراج کی قوت کو توڑ کر آزادی کی منزل پاسکے۔ قدرت کے لیے تو کوئی کام بھی مشکل نہیں۔ کیا پتا کہ کشمیر کے جس سیاسی خاندان نے کشمیر کو مشکلات میں مبتلا کیا ہے، اسی خاندان کے ہاتھوں اس کی آزادی کا سورج طلوع ہو، قدرت کی طرف سے ہر چیز ممکن ہے۔ وہ رات کو اپنا منہ بھی وادی کی طرف کرکے سوتا تاکہ شاید رات کی تاریکی میں آزادی کا مژدہ مل جائے تو وہ دوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجائے۔

اس نے ارادہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ اپنی زندگی میں آزادی کی صبح نہ دیکھ سکا تو وصیت کرجائے گا کہ اسے سری نگر کی طرف کے آخری سنگ میل پر دفن کردیا جائے اور اس کی قبر پر ایک بڑا سا پتھر لگا کر اس کا نام پتا اور اس کے حالات لکھ دیے جائیں اور ساتھ لکھ دیا جائے۔ یہاں پر وہ شخص سو رہا ہے جو اپنی ساری زندگی میں ۴۸ میل کا فاصلہ طے کرکے بارہ مولا سے تین میل آگے اپنے گاؤں تک نہ پہنچ سکا۔ شاید کبھی اس کے بچے یا رشتے دار اس راستے سے گزریں تو اسے شناخت کرکے اس کے فراق کی تڑپ کو محسوس کرسکیں اور اس کی کرب کی زندگی سے آگاہ ہوسکیں۔ اب یہ اس کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح شام سری نگر روڈ کے آخری سنگِ میل تک جاتا اور کبھی پیار سے اور کبھی غصے سے اس میل کو دیکھتا اور دیکھتا رہتا جس پر تحریر تھا... سری نگر ۷۵ میل۔

بے شمار پراسرار واقعات دنیا میں انسان کو حیران کرتے ہیں۔ کبھی کوئی معمّا حل ہوجاتا ہے اور کبھی ہمیشہ کے لیے ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ جدید دنیا میں پیش آنے والے ایک ایسے ہی معمّے کا احوال۔

اس لڑکی کا سچا واقعہ جو کسی نادیدہ حملے کا شکار تھی۔

ماورائی حملہ

عکس بتول

...ی ۱۹۵۱ء کی ایک انتہائی گرم رات تھی جب ...کوارٹر میں چیف میڈیکل آفیسر کو طلب کیا گیا۔ ...چیف نے خود کیا تھا اس لیے چیف میڈیکل ...اینڈ کوارٹر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی لیکن جب ...کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ اس پر مرگی کے دورے ...وہ غصے سے پاگل ہوگیا اور پھر اس نے یہ خیال ...اس سامنے فیلا کا میئر بھی بیٹھا ہوا ہے' اپنا ہیٹ ...ا۔

...یہ بتانا چاہ رہے ہو کہ مجھے آدھی رات کو محض ایک مرگی کی مریضہ کے معائنے کے لیے طلب کیا گیا ہے؟" چیف میڈیکل آفیسر نے محض ایک فقرہ کہتے ہوئے غصے میں کچھ اس طرح سے ہاتھ چلائے تھے کہ میئر اور پولیس چیف دونوں کو یوں محسوس ہوا کہ فوراً ہی چیف میڈیکل آفیسر کی غلط فہمی دور نہیں کی گئی تو کہیں غصے میں خود اس پر مرگی کا دورہ نہ پڑجائے۔

"یہ تو آپ بتائیں گے کہ یہ دورہ مرگی کا ہے یا ہسٹریا ہے؟" پولیس چیف نے اپنے چیف میڈیکل آفیسر کا غصہ ٹھنڈا کرنے والے انداز میں کہا لیکن چیف میڈیکل

آفیسر یہ سن کر اور بھڑک گیا۔

"اس کے لیے تو آپ اسپتال کے کسی وارڈ بوائے کو بلوا لیتے تو وہ بھی آپ کو بتا سکتا تھا کہ یہ ہسٹریا ہے یا مرگی۔" چیف میڈیکل آفیسر یہ کہتے ہوئے اتنی زور سے چیخا تھا کہ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

"میرے خیال میں ڈاکٹر! نہ یہ ہسٹریا ہے نہ مرگی"

چیف میڈیکل آفیسر نے غصہ بھرے چہرے کے ساتھ میئر کی جانب رخ کر لیا تھا۔

"تو پھر۔۔؟" اس بار چیف میڈیکل آفیسر کی آواز اونچی نہیں تھی لیکن لہجہ اب بھی پھاڑ کھانے والا تھا۔

"بلکہ یہ تو شاید میڈیکل کا کیس ہی نہیں ہے" میئر نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تو چیف میڈیکل آفیسر کو پہلی بار احساس ہوا کہ معاملہ شاید ویسا نہیں ہے، جیسا کہ وہ سمجھ رہا ہے۔

چیف میڈیکل آفیسر منتظر تھا کہ میئر کچھ کہے لیکن میئر تو اپنی زبان بند کر کے یوں فضا میں گھور رہا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ چیف میڈیکل آفیسر کو حیرت ہوئی کہ میئر اس طرح کی کوئی غیر ذمے دارانہ حرکت بھی کر سکتا تھا۔ وہ ارسینا کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ شیلا کا میئر نہیں بنا تھا۔ اس وقت بھی ارسینا کی شہرت ایک شریف، ایماندار اور ذمے دار شخص کی تھی لیکن جب سے وہ میئر بنا تھا، پورے شہر کی زبانیں ارسینا کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں۔

"وہ لڑکی ابھی تکلیف سے چلاتے چلاتے تھک کر خاموش ہوئی ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم ابھی معائنہ کر لو۔" میئر ارسینا نے کافی دیر فضا میں گھورتے رہنے کے بعد چیف میڈیکل آفیسر کو مخاطب کیا۔

"کیس کیا ہے؟" ہیڈ کوارٹر میں آنے کے بعد پہلی بار چیف میڈیکل آفیسر نے نرم لہجے میں پولیس چیف کو مخاطب کیا تھا۔

"لڑکی کا نام کلاریتا ہے اور یہ ان ہزاروں بچوں میں سے ایک ہے جو جنگ کے دوران یا تو اپنے والدین سے بچھڑ گئے ہیں یا جنگ ان کے والدین کو نگل گئی ہے" پولیس چیف نے کیس کی ابتدا کرنے سے پہلے مریضہ کا تعارف کروانا ضروری سمجھا تھا۔

"لیکن اسے بیماری کیا ہے؟" پولیس چیف اگر اپنی عادت سے مجبور تھا تو چیف میڈیکل آفیسر بھی اپنی پیشہ ورانہ عادت سے مجبور تھا کہ اس کی دلچسپی مریضہ میں نہیں بلکہ مرض میں تھی۔

"اس کا کہنا ہے کہ کوئی شے اس پر حملہ کرتی ہے اور اپنے دانت اس کے جسم میں گاڑ دیتی ہے" پولیس چیف نے [illegible] میڈیکل آفیسر کا مزاج ایک بار پھر برہم ہوتا ہوا محسوس کیا [illegible] فوراً ہی تفصیل بتا دی۔

"کیا بکواس ہے" چیف میڈیکل آفیسر نے غصے سے ہا[illegible] جھٹکے۔

"ہم بھی یہی سمجھ رہے تھے لیکن جو کچھ ہمارے سا[منے] ہوا اس کے بعد ہمیں اس لڑکی کے بیان میں صداقت محسو[س] ہونے لگی ہے" میئر ارسینا نے اپنی بات مکمل کی تو [چیف] میڈیکل آفیسر کا جی چاہا کہ وہ میئر ارسینا کے جواب میں کو[ئی] تلخ بات کہہ دے لیکن زبان سے کچھ کہے بغیر وہ میئر کو صر[ف] گھور کر رہ گیا۔

"کب سے ہے اس کی یہ حالت۔۔؟" چیف میڈیکل آفیسر نے پولیس چیف سے سوال کیا لیکن جواب میئر ار[سینا] نے دیا۔

"گزشتہ اٹھارہ دنوں سے وہ پولیس کسٹڈی میں ہے ا[ور] تب سے اس کی یہی حالت ہے۔" میئر کے فقرے کا ایک ا[یک] لفظ طنز میں بجھا ہوا تھا۔

"دراصل پولیس نے جب اسے گرفتار کیا وہ تب [بھی] اسی تکلیف سے چلا رہی تھی" پولیس چیف نے میئر [کے] سامنے اپنے ماتحتوں کو بچانے کی کوشش کی۔

"پولیس نے کیا اسے چلانے کے جرم میں گرفتار [کیا] تھا؟" اب کی بار طنز کے تیر چلانے والا خود چیف میڈیکل [آفیسر] تھا۔ پولیس چیف نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا [جیسے کہہ] رہا ہو کہ کم از کم تم تو ایسا نہ کرو لیکن چیف میڈیکل آفیسر اپنی نظریں ہی دوسری جانب کر لی تھیں۔

"جس وقت پولیس نے اسے گرفتار کیا، اس وقت [اس] کے گرد ایک مجمع جمع تھا اور وہ اس مجمع کے درمیان [کھڑی] چلا رہی تھی" پولیس چیف نے وضاحت کرنی چاہی لیکن [چیف] میڈیکل آفیسر کے لیے وہ وضاحت بھی شاید قابل قبول [نہیں] تھی۔

"اگر وہ لڑکی نے کیا نام بتایا تھا؟" چیف میڈیکل آفیسر نے پولیس چیف سے سوال کیا تھا لیکن جواب میئر ار[سینا نے] دیا۔

"کلاریتا" میئر کی آواز سن کر چیف میڈیکل آفیسر نے اس کی جانب رخ تو کیا لیکن میئر ارسینا کو خاموش دیکھ [کر اس] نے اپنا رخ پھر پولیس کے چیف کی طرف کر لیا۔

"اگر وہ لڑکی کلاریتا تکلیف میں تھی تب بھی [پولیس کو] اسے اسپتال پہنچانا چاہیے تھا نہ کہ اس پر کوئی دفعہ [لگا کر] بند کر دیتی" پولیس چیف، جو پہلے ہی میئر ارسینا کے [illegible]

[س]والات کا جواب دے دے کر تھک چکا تھا، جواب میں [خام]وش ہی رہا۔

"[ب]ات یہیں ختم نہیں ہو جاتی" میئر ارسینا نے تلخ لہجے [میں کہن]ا شروع کیا۔

"وہ گزشتہ اٹھارہ دنوں سے پولیس کی حراست میں ہے اور [تکلیف] سے چلا رہی ہے لیکن۔۔۔" میئر ارسینا نے اپنا فقرہ [اس ط]رح ادھورا چھوڑا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو [کہ اس]ے کیا کہنا چاہیے۔

"[لڑ]کی کی عمر کیا ہے؟" چیف میڈیکل آفیسر نے سوال [کی]ا۔

"تقریباً دس سال" اس بار پولیس چیف نے جواب [دی]ا۔

"اور اس کا کہنا ہے کہ کوئی نادیدہ شے اس پر حملہ کرتی [ہے؟" چی]ف میڈیکل آفیسر نے سوال کیا جبکہ اس کے ذہن [میں یہ ب]ات تھی کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی کو کسی خاص شے سے [الرجی ہو] اور یہ سب کچھ الرجی کا ہی کیس ہو۔

"[پہلی] بار، جب اسے گرفتار کیا گیا تو وہ ایک گلی میں ہجوم [کے درمی]ان کھڑی تھی اور اس طرح چیخ رہی تھی جیسے کوئی [اس]ے مار رہا ہو" پولیس چیف نے تفصیل سے بتانے کا [آغاز کرتے] ہوئے کہنا شروع کیا۔ "اسی گلی میں ایک شراب [خانہ ہے] اور ہجوم میں زیادہ تر افراد وہ تھے جو اس میکدے [سے نکلے] تھے" پولیس چیف نے کہا مگر اس سے پہلے کہ پولیس [چیف ب]ات آگے بڑھاتا میئر ارسینا نے چیف میڈیکل [آفیسر کو اپن]ی جانب متوجہ کر لیا۔

"[صرف چند مع]زز شرابیوں کی گواہی پر ہی لڑکی کو گرفتار کر لیا گیا [جیسے وہ پاگ]ل ہے" میئر کا فقرہ مکمل ہوا تو پولیس چیف ایک [بار پھر بغلیں جھ]انکنے لگا۔

"[اگر وہ لڑکی] پاگل ہے تب بھی اس کی جگہ پاگل خانہ بنتی ہے نہ [کہ۔۔۔" چی]ف میڈیکل آفیسر ابھی اپنا فقرہ مکمل بھی نہیں [کر پایا تھا کہ پ]ولیس چیف نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ [چیف میڈیک]ل آفیسر تو خاموش ہو گیا لیکن میئر ارسینا خاموش [illegible]

"[اس] رات جب اسے گرفتار کیا گیا، وہ لڑکی چیخ چیخ کر [illegible] سے فریاد کرتی رہی کہ اسے پاگل قرار دینے [illegible] کے جسم پر کم از کم دانت کے کاٹنے کے وہ نشان [illegible] سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی [illegible] [ار]سینا کی آواز بلند ہوتی چلی گئی تھی۔ لیکن چیف [illegible] کو اب کسی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ یہ الرجی کا

خواہش

عالم گیر شہرت یافتہ PHYSICIST اسٹیفن ہاکنگ LOU GEHRIG نامی عارضے کا شکار ہیں اور مفلوج ہونے کی وجہ سے وہیل چیئر کے پابند ہیں۔ ایک بار وہ عالم گیر شہرت یافتہ ٹی وی شو اسٹار ٹریک کے سیٹ پر گئے۔ جب وہ ایگزیکٹیو پروڈیوسر رک برمین سے ملے تو اس نے پوچھا۔

"کیوں جناب! کیا مزید SETS دیکھنا پسند کریں گے؟"

جواب میں ہاکنگ نے کہا "ضرور۔" یہ جواب انہوں نے اپنے کمپیوٹرائزڈ ڈوائس سنتھیسائزر کی مدد سے دیا تھا۔ برمین نے لکھا ہے کہ جب وہ اسٹار انٹرپرائز کے برج پر پہنچے تو ہاکنگ نے ایک اور بات "پنچ" کرنی شروع کی وہ ساٹھ سیکنڈ تک پنچ کرتے رہے پھر کمپیوٹر سے ایک آواز برآمد ہوئی یہ ایک جملہ تھا جسے میں بھول نہیں سکتا۔

"کیا تم مجھے اٹھا کر کیپٹن کی سیٹ پر نہیں بٹھاؤ گے؟"

برمین نے لکھا ہے "یہ ایک بہت دلچسپ منظر تھا کہ اپلائیڈ میتھ اور تھیورٹیکل فزکس کا ایک بہت بڑا دماغ کسی اور خواہش کے بجائے صرف یہ خواہش کر رہا تھا کہ اسے کیپٹن پیکارڈ کی کرسی پر بٹھا دیا جائے۔"

(ریڈرز ڈائجسٹ سے)

"نشان تو دانت کے کاٹنے جیسے ہی ہیں لیکن اس میں تکلیف کیسی ہوتی ہے، میرا مطلب ہے درد ہوتا ہے یا خارش یا پھر پہلے خارش ہوتی ہے اور بعد میں درد؟" چیف میڈیکل آفیسر اب پوری طرح اس کیس میں دلچسپی لے رہا تھا۔

چیف میڈیکل آفیسر نے سوال تو کر لیا لیکن فوری طور پر اس کا جواب نہ میئر ارسینا نے دیا نہ ہی پولیس چیف نے۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے جیسے چاہتے ہوں کہ پہل اسے نہ کرنا پڑے۔

"کلاریتا کا کہنا ہے کہ وہ ایک غیر مرئی چیز ہے۔ انسان سے مشابہ ہے لیکن اس کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں اور باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور اس نے سر پر ایک سیاہ رنگ کی ڈھیلی سی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ جس سے اس کا سر اور کان تک چھپے ہوئے ہیں" میئر ارسینا نے خاموشی کے وقفے کو توڑنے میں پہل کی لیکن جیسے ہی وہ اپنا طویل فقرہ مکمل کر کے خاموش ہوا، پولیس چیف نے بات آگے بڑھائی۔

"وہ کہتی ہے کہ جب وہ شے اس کے سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہوا میں تیر رہی ہو۔ اس کی

آنکھوں میں کلاریتا کو اپنے لیے نفرت محسوس ہوتی ہے اور وہ شے قریب آتے ہی کلاریتا کے جسم پر اپنے دانت گاڑ دیتی ہے" پولیس چیف شاید مزید بھی کچھ کہتا لیکن اس نے چیف میڈیکل آفیسر کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ دیکھی جیسے وہ اس پوری گفتگو کو بکواس سمجھ رہا ہو۔

"جس رات اس لڑکی کو گرفتار کیا گیا اور اس کی اس فریاد کو نہیں سنا گیا کہ کوئی شے اس پر دانت گاڑ دیتی ہے' اسی رات اس لڑکی پر وہی دورہ پھر سے پڑا تھا" میئر ارسینا نے چیف میڈیکل آفیسر کی مسکراہٹ کی پروا کیے بغیر کہا تو پولیس چیف کو بھی حوصلہ ہوا۔

"وہاں ڈیوٹی پر موجود افراد نے بتایا کہ رات کے تیسرے پہر ہمیں اچانک اس کھولی سے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں جہاں کلاریتا کو بند کیا گیا تھا" پولیس چیف نے وہ بات بتانی شروع کی جو اسے اس کے ماتحتوں نے بتائی تھی۔

"صرف چیخیں تھیں یا وہ کچھ کہہ رہی تھی؟" چیف میڈیکل آفیسر نے سوال کیا۔ اس کا ذہن اب کسی اور لائن پر سوچ رہا تھا۔

"ان لوگوں نے جو بتایا اس کے مطابق پہلے تو وہ چلّا رہی تھی کہ... اسے روکو... اسے اندر نہ آنے دو لیکن بعد میں وہ چلّاتے ہوئے کسی سے معافی مانگتی رہی تھی" پولیس چیف کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ میئر ارسینا نے کہانی آگے بڑھانی شروع کی۔

"جب وہ یہ چلّا رہی تھی کہ مجھے معاف کردو' خدا کے لیے مجھے معاف کردو' اس وقت وہ زمین پر اس طرح تڑپ تڑپ کر لوٹیں بھی لگا رہی تھی۔ جیسے انتہائی تکلیف میں ہو" میئر ارسینا کی اس وضاحت سے چیف میڈیکل آفیسر کے ذہن میں صورت حال کافی حد تک واضح ہو گئی تھی۔

"ڈیوٹی پر موجود افراد یہ بھی بتاتے ہیں کہ دورے کے دوران یعنی جب وہ چلّا رہی تھی کہ مجھے معاف کردو' چار آدمیوں نے اسے پکڑنا چاہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔" پولیس چیف نے بتایا تو چیف میڈیکل آفیسر سوال کرتے کرتے رک گیا۔ جو کچھ وہ پوچھنا چاہتا تھا' پولیس چیف اسے طنز ہی سمجھتا۔

"تب سے اب تک اس پر کتنی بار دورہ پڑ چکا ہے؟" چیف میڈیکل آفیسر نے اپنا پرانا سوال چھوڑ کر نیا سوال کیا۔

"روزانہ ہی پڑتا ہے کبھی دو بار یا کسی دن تین بار" پولیس چیف نے آہستگی سے کہا اور کن انکھیوں سے میئر ارسینا کی جانب دیکھا۔

"اور اب تک وہ وہیں تڑپنے کے لیے رکھی گئی ..." چیف میڈیکل آفیسر نے مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ... سوال کیا۔

"مجھے اس پر افسوس ہے" پولیس چیف نے شر... میں کہا لیکن چیف میڈیکل آفیسر نے میز پر اس طرح ... جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گیا ہو۔

"میں اس لڑکی.... کیا نام بتایا تھا اس کا..." ... میڈیکل آفیسر نے میئر ارسینا کی جانب گھوم کر سوال کیا۔

"کلاریتا..." میئر نے ایک بار پھر اس لڑکی کا نام ... یاد دلایا۔

"ہاں کلاریتا!" چیف میڈیکل آفیسر نے اس ... دہرایا جیسے اب تک وہ بہت ہی اہم بات بھولا ہوا ہو۔

"میں اس لڑکی کلاریتا کا معائنہ کرنے بلکہ اس کا ... کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہوگی" ... میڈیکل آفیسر نے پولیس چیف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ... پولیس چیف جو پہلے ہی سے پریشان تھا۔ اس نئی آفت ... اس کے چہرے کا اعصابی تناؤ کچھ اور بڑھ گیا۔

"کیسی شرط۔" پولیس چیف نے اسی اعصابی تناؤ ... تحت سخت لہجے میں سوال کیا لیکن چیف میڈیکل آفیسر ... اسے گھورتا رہا۔ دراصل پولیس چیف کے لہجے میں ایسی ... کوئی بات تھی کہ چیف میڈیکل آفیسر ... تناؤ کا شکار ... تھا۔ ویسے اس نے پولیس چیف کے بدلے ہوئے لہجے ... محسوس کیا تھا کیونکہ واقعتاً اس سے یہ کہنا چاہ رہا تھا ... کیسی... یہ تمہاری ڈیوٹی ہے اور تمہیں اسی بات کی تنخواہ ... جاتی ہے" لیکن وہ چیف میڈیکل آفیسر کے مزاج کو ا... طرح جانتا تھا اس لیے صرف دو لفظ کہنے کے بعد اس ... پر قابو پالیا تھا۔

"شرط صرف اتنی ہے کہ وہ تمام افراد جو اس غیر ... داری کے مرتکب ہوئے ہیں انہیں فوری طور پر گرفتار کر... ان پر مقدمہ چلایا جائے" چیف میڈیکل آفیسر کا مطالبہ ... تھا کہ پولیس چیف کے ساتھ ساتھ میئر ارسینا بھی چونک ...

میئر ارسینا نے چیف میڈیکل آفیسر کے بارے میں ... کچھ سن رکھا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ جو کچھ اس ... تھا۔ وہ اس کے سامنے ہو بھی رہا تھا۔ میئر ارسینا کی اطلاع ... کے مطابق چیف میڈیکل آفیسر ایک انتہائی اصول پسند ... ہونے کے ساتھ انتہائی بدمزاج آدمی تھا۔ اور اس سلسلے ... وہ یہ دیکھنے کا عادی نہیں تھا کہ اس کا مخاطب کون ہے۔ ا... انتہائی بدمزاجی کے باوجود اگر وہ اپنی سیٹ پر برقرار تھا تو ا... اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ صرف منیلا میں ... بلکہ پورے ملک میں اس سے زیادہ قابل ڈاکٹر کوئی نہیں ... تھا۔

"میئر صاحب کے مطالبے پر ان تمام افراد کو پہلے ہی معطل کر دیا گیا ہے۔" پولیس چیف نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"میئر صاحب ڈاکٹر نہیں ہیں اور میں میئر نہیں ہوں" ... میڈیکل آفیسر نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

"ایک ڈاکٹر ہونے کے حوالے سے میں اس بے پروائی کو اقدام قتل کے برابر جرم سمجھتا ہوں" چیف میڈیکل آفیسر نے دوٹوک لہجے میں کہا اور پہلی بار پولیس چیف کو احساس ہوا کہ چیف میڈیکل آفیسر کے اس مطالبے کا مقصد کیا ہے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میئر ارسینا کی جانب دیکھا تو وہ اس وقت اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"میں ذاتی طور پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس ... میں الجھے بغیر پہلے آپ اس بچی کا معائنہ کرلیں" میئر ارسینا نے چیف میڈیکل آفیسر کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا تو خلاف توقع وہ فوراً تیار بھی ہو گیا۔

"میئر شہر کا باپ ہوتا ہے اور باپ کا حکم نہ ماننے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس وقت جب وہ تینوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے چلتے ہوئے اس کمرے کی جانب جا رہے تھے' جہاں وہ لڑکی ... تھی تو میئر ارسینا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ پولیس ... کی اپنی مجبوریاں ہیں لیکن آخر لوگ اس چیف میڈیکل آفیسر کو بدمزاج کیوں کہتے ہیں؟ جو تاثر میئر ارسینا نے اس کی شخصیت کا لیا تھا وہ اس پروپیگنڈے کے بالکل برعکس تھا جو لوگ اس کے بارے میں کرتے تھے۔

یہ تاثر اس وقت اور گہرا ہو گیا جب چیف میڈیکل آفیسر نے اس لڑکی کلاریتا کا معائنہ شروع کیا۔

"کیا نام ہے بچّی کا" چیف میڈیکل آفیسر نے پیار سے ... لرزتی کلاریتا کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"کلاریتا ولا نیودا" لڑکی نے خوف زدہ نظروں سے باری باری ان تینوں کو دیکھنے کے بعد جواب دیا تھا' اس وقت وہ ایک لکڑی کی بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور چیف میڈیکل آفیسر اپنی کرسی کھینچ کو اس کے پاس لے آیا تھا۔

"کہاں ہے بیٹا' وہ زخم...؟" چیف میڈیکل آفیسر نے ایک بار پھر پیار سے اسے مخاطب کیا تو کلاریتا نے اپنے دونوں ہاتھ سامنے کردیے۔ وہاں واضح طور پر ہتھیلیوں اور اس کے اوپر کلائیوں تک دانت کے نشان بنے ہوئے تھے۔ پھر جیسے جیسے کلاریتا اپنی آستینیں اوپر کرتی چلی گئی' دانتوں کے مزید زخم دکھائی دیتے چلے گئے۔ دونوں بازو دانتوں کے نشانوں سے بھرے ہوئے تھے۔

چیف میڈیکل آفیسر نے بغور ہاتھوں کو قریب لاکر دیکھا لیکن دانتوں کے نشان بالکل واضح تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہر نشان بالکل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ کسی نشان کے ساتھ کا حصہ کم نیلا تو کہیں زیادہ تھا بلکہ کسی کسی نشان پر تو کھرنڈ سا آگیا تھا یعنی اس سے اگر کوئی بات ظاہر ہوتی تھی تو اتنی کہ کچھ زخم تازے ہیں تو کچھ زخموں کو کچھ عرصہ ہو گیا ہے۔

چیف میڈیکل آفیسر کی زندگی کا وہ سب سے انوکھا کیس تھا۔ دو دانتوں کے وہ نشان اور تازہ نشانوں کے آس پاس نیلی ہو جانے والی جلد کے شواہد اتنے واضح تھے کہ انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا لیکن سب کیوں اور کیسے؟ اس کا جواب چیف میڈیکل آفیسر کے پاس کوئی نہیں تھا۔

"اور بھی کہیں نشان ہیں؟" چیف میڈیکل آفیسر نے سوال کیا۔

"ہر جگہ ہیں" کلاریتا نے معصومانہ انداز میں جواب دیا۔

"یہاں... یہاں... یہاں..." اس نے اپنے جسم کے مختلف حصے دکھانے شروع کر دیے اور چیف میڈیکل آفیسر نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے جسم کے ہر حصے پر ان نشانات کی بھرمار تھی۔ پیٹھ' پیٹ' شانوں سے لے کر ٹانگوں تک ہر جگہ وہی دو دانتوں کے نشانات موجود تھے۔

"تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے جب..." چیف میڈیکل آفیسر کے سامنے وہ شواہد موجود تھے لیکن اس کے باوجود اس کا ذہن اس کہانی کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا جو پولیس چیف اور میئر کے ذریعے اس تک پہنچی تھی۔

"پہلے اس کی بُو آنے لگتی ہے" کلاریتا نے بیان کرنا شروع کیا۔ اس کچھ دیر میں اس کا اعتماد کسی حد تک بحال ہو گیا تھا۔

"وہ بُو بہت سخت ہوتی ہے انکل' جیسے بہت سے گندے انڈے ایک ساتھ میرے اوپر انڈیل دیے گئے ہوں" کلاریتا اتنی معصومیت سے وہ سب کچھ بیان کر رہی تھی کہ چیف میڈیکل آفیسر چاہتے ہوئے بھی اسے جھٹلانے کی ہمت نہ

کر سکا۔

"پھر وہ آجاتا ہے اور پھر اسے جہاں جگہ ملتی ہے وہیں اپنے دانت میرے اندر گاڑ دیتا ہے" کلاریتا نے جو کچھ کہا تھا اس کا ثبوت بھی سامنے ہی موجود تھا لیکن چیف میڈیکل آفیسر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"وہ کچھ کہتا بھی ہے؟" کچھ دیر کے بعد چیف میڈیکل آفیسر نے سوال کیا لیکن کلاریتا نے نفی میں سر ہلایا۔

"مگر انکل، وہ مجھے مار دے گا" کلاریتا نے سہمے بغیر کہا لیکن جو یقین اس کے لہجے میں تھا اس کو محسوس کر کے چیف میڈیکل آفیسر کانپ گیا تھا۔

"تمہیں کوئی نہیں مارے گا" چیف میڈیکل آفیسر نے اسے تسلی دی اور پھر پولیس چیف اور میسٹر کی جانب پلٹ گیا۔

"میں اسے فوری طور پر اسپتال میں منتقل کرنا چاہتا ہوں" اس کے مخاطب دونوں ہی تھے لیکن دونوں میں سے کوئی بھی فوری طور پر کچھ نہ بولا۔

پولیس چیف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ پولیس کسٹڈی میں موجود لڑکی کو کس طرح اسپتال منتقلی کی اجازت دے سکتا ہے جبکہ میسٹر ارسینا کے ذہن میں کچھ اور ہی خیالات تھے۔

"ایک پرابلم ہو سکتا ہے ڈاکٹر۔" میسٹر ارسینا نے یہ فقرہ اس وقت کہا تھا جب وہ لڑکی والے کمرے سے نکل کر واپس پولیس چیف کے دفتر کی جانب جا رہے تھے۔" اگر اسپتال سے یہ بات باہر نکلی اور کسی طرح پولیس والوں تک پہنچ گئی تو شہر میں خوف پھیل سکتا ہے" میسٹر ارسینا نے ڈاکٹر کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا تو چیف میڈیکل آفیسر بھی سوچ میں پڑ گیا لیکن پولیس چیف اس بات پر خوش تھا کہ اس کے کچھ کیے بغیر ہی اس کا پرابلم حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"لیکن اس لڑکی کا اسپتال میں ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی بروقت نگہداشت ہو سکے خصوصاً اس وقت جب اس پر وہ دورہ پڑ رہا ہو" چیف میڈیکل آفیسر نے میسٹر کی بات سے اختلاف تو نہیں کیا لیکن ساتھ ہی اپنا نقطہ نظر بھی واضح کیا۔

"ہم اس لڑکی کو جیل کے اسپتال میں بھی شفٹ کر سکتے ہیں" پولیس چیف نے ان دونوں کو ایک نیا راستہ دکھلایا اور دونوں نے محسوس کیا کہ پولیس چیف کی بات میں وزن ہے۔

"جیل سے بات باہر بھی نہیں آئے گی اور پریس تک جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میسٹر نے تائید طلب نظروں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا جو پہلے ہی اس تجویز سے متفق ہو چکا تھا۔

"میں ایسا کرتا ہوں کہ ایک یا دو اچھی ڈاکٹرز جیل کے اسپتال شفٹ کر دیتا ہوں" چیف میڈیکل آفیسر نے تجویز پیش کی اور بقیہ دونوں افراد نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

کلاریتا کو پولیس ہیڈ کوارٹر سے جیل کے اسپتال منتقل کرنے سے پہلے چیف میڈیکل آفیسر نے فون کر کے مادینا لارا نامی کسی لیڈی ڈاکٹر کو فوراً جیل کے اسپتال پہنچنے کی تاکید کی جبکہ دوسری ڈاکٹر کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ صبح کسی وقت جیل اسپتال پہنچ جائے گی۔

چیف میڈیکل آفیسر جب مادینا لارا نامی اس ڈاکٹر کو فون پر ہدایات دے رہا تھا تو اس نے کچھ بیماریوں کا ذکر کیا تھا جس کے بارے میں میسٹر ارسینا اور پولیس چیف کچھ نہیں جانتے تھے لیکن اتنی بات ان دونوں کی سمجھ میں ضرور آ گئی کہ ڈاکٹر کے خیال کے مطابق کلاریتا کسی ایسی دماغی بیماری میں مبتلا ہے جو بہت کم ہوتی ہے۔

کلاریتا کے جیل اسپتال منتقلی کے فوراً بعد ہی چیف میڈیکل آفیسر بھی روانہ ہو گیا۔ البتہ میسٹر ارسینا اس وقت تک رُکا رہا جب تک پولیس چیف کے ساتھ اس نے تمام معاملات طے نہ کر لیے۔ ان دونوں کے درمیان یہ بات طے ہو گئی کہ لڑکی کو کل عدالت میں پیش کیا جائے گا جہاں میسٹر ارسینا کا وکیل اس کی ضمانت کروا لے گا اور پولیس چیف سرکاری وکیل کو اس بات پر پہلے ہی آمادہ کر لے گا کہ وہ اس ضمانت کی درخواست کی مخالفت نہیں کرے گا۔

پولیس چیف، میسٹر ارسینا اور چیف میڈیکل آفیسر نے پریس والوں کے خوف سے کلاریتا کو جیل کے اسپتال منتقل کیا لیکن پریس والوں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ پہلی خبر پریس رپورٹرز تک پہنچی وہ یہ تھی کہ منیلا پولیس اسٹیشن کا پورا عملہ معطل ہو چکا ہے اور یہ معطلی براہِ راست پولیس چیف نے کی ہے اور میسٹر ارسینا کے کہنے پر کی ہے۔

اس وقت تک تمام اخبارات کی آخری کاپیاں جا چکی تھیں اس لیے یہ خبر اگلے دن کے اخباروں میں تو نہ آسکی لیکن رپورٹرز اسکوپ کی تلاش میں منیلا پولیس اسٹیشن پہنچ گئے اور جوں جوں وہ تحقیق کرتے گئے، خبر کھلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ یہ تک معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ کلاریتا نامی اس لڑکی کو جیل کے اسپتال منتقل کیا جا چکا ہے اور اگلے دن اسے عدالت میں پیش کیا جائے۔

اگلے دن کا سورج اسی طرح تھا جس طرح کا سورج منیلا میں مئی میں نکلتا ہے لیکن طلوع ہوتے ہوئے سورج نے یہ دیکھا تھا کہ جیل اسپتال کے باہر رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور وہ سب کے سب منتظر ہیں کہ کب کلاریتا باہر نکلتی ہے جبکہ کلاریتا اسپتال کے اندر مسکن دواؤں کے زیرِ اثر ڈاکٹر مادینا لارا کی براہِ راست نگرانی میں

...ری تھی۔

...ن اچھی طرح چڑھ گیا تو کلاریتا بیدار ہوئی۔ ڈاکٹر مادینا ...ا نے ناشتے سے پہلے اور ناشتے کے بعد اس کا تفصیل سے ...ئنہ کیا اور پھر کلاریتا وہ نیا فراک پہن کر تیار ہو گئی جو میسٹر ارسینا نے اس کے لیے بھجوایا تھا۔ اس فراک کی آستینیں ...پھولی تھیں جب سے میسٹر ارسینا نے اسے پوری ...وں کی قیص میں دیکھا تھا، یہ بات اس کے دل میں گھر ...کر گئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے اس پر حیرت بھی ہوئی تھی لیکن ...فوراً ہی اس نے اپنا یہ خیال جھٹک دیا۔

"ان بچوں کو پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کے آگے ...ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے۔ ایسے میں یہ بے چارے اس بات پر کیا ...دھیان دیں کہ سردی میں کیا پہنیں اور گرمیوں میں کیا پہننا ...چاہیے؟" میسٹر ارسینا کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی ...حقیقت بھی اسی طرح کی ایک حقیقت تھی جو جنگ ...اپنے ساتھ لاتی ہے۔

...کلاریتا جیل کے اسپتال کے دروازے تک آئی تو بالکل ...ٹھیک تھی بلکہ عام دنوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہشاش بشاش ...تھی۔ رات وہ جس بستر پر سوئی تھی، وہ اس کی زندگی کا سب سے اچھا بستر تھا پھر صبح جو اس نے ناشتا کیا تھا، وہ اس کی اس ...زندگی کی سب سے اچھی خوراک تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو کپڑے اس نے پہن رکھے تھے، وہ اس کے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلے نئے کپڑے تھے۔ کلاریتا کی یادداشت کے مطابق وہ پہلا ایسا جوڑا تھا جو کسی کے بدن کو چھوئے بغیر اس کے جسم پر سجا تھا۔ ڈاکٹر مادینا لارا کے ساتھ اپنے کمرے سے نکل کر گیٹ تک آتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار اپنی اس فراک پر ہاتھ پھیرا تھا۔

ڈاکٹر مادینا لارا اور کلاریتا ابھی اس گیٹ تک پہنچے ہی تھے جہاں گاڑیاں انہیں عدالت تک لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں اور جس سے کچھ ہی دور ان رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کا ایک جم غفیر موجود تھا جو اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے نہ جانے کب سے وہاں موجود تھے کہ ان سب کو حیران کر دینے والی وہ چیخ نکلی جو کلاریتا نے ماری تھی۔

"وہ پھر آگیا... وہ پھر آگیا" کلاریتا یہ چیختے ہوئے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن دو تگڑے پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔ لیکن کلاریتا کی چیخیں تھیں کہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہی تھیں۔ اب وہ چیخ رہی تھی ......"مجھے معاف کر دو... مجھے معاف کر دو... خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

ڈاکٹر مادینا لارا، رپورٹرز، پولیس والوں سمیت وہاں موجود ہر شخص کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جب کلاریتا کے جسم پر اچانک وہی نیلگوں نشانات پھر سے بننے لگے۔ یہ حملہ پانچ

فیروپائرین (رجسٹرڈ)
قائم شدہ 1956
T.M. Reg. 7635
فیروپائرین دانتوں میں لگے ہوئے سب کیڑوں کو جڑ سے بالکل ختم کر دیتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں اور مسوڑوں میں ٹھنڈا اور گرم پانی لگنا بند کر دیتی ہے۔
فیروپائرین پائیوریا کی خطرناک بیماری دور کر کے دانتوں اور مسوڑوں کو تندرست رکھتی ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے گندہ اور بادی پانی خارج کر کے ورم اور سوزش اتارتا ہے۔
فیروپائرین مسوڑوں سے خون نکلنا بند کر کے مسوڑوں کو مضبوط اور سخت بناتی ہے۔
فیروپائرین منہ کے ان تمام جراثیم کو ہلاک کرتی ہے جو دانتوں میں کیڑا لگنے کا سبب بنتے ہیں۔
فیروپائرین منہ میں گندگی اور بدبو دور کر کے سانسوں کو خوشگوار بناتی ہے۔
فیروپائرین دانتوں مسوڑوں اور منہ کی سب پیچیدہ بیماریوں کی بے مثال دوائی ہے۔
فیروپائرین جراثیم کش ہے زخموں پر لگائی جا سکتی ہے۔
Packing
10 ml Rs. 12.00.
25 ml Rs. 24.00
ہر اچھے گھر کی ضرورت
تیار کردہ: فیر لیبارٹریز O/1084، غازی روڈ، راولپنڈی۔ فون (051-451631)

منٹ سے کچھ دیر جاری رہا اور اس وقت تک جاری رہا جب تک کلاریتا چیخ چیخ کر بے ہوش نہ ہوگئی۔ حملہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر مادینا لارا نے اس کا دوبارہ معائنہ کیا اور پھر اس نے اپنا سرہلایا۔

”لڑکی کی کہانی سچ ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ وہ نیلگوں نشانات دانتوں کے ہی تھے اور تازہ نشانات کے ساتھ تھوک بھی موجود تھا۔

مادینا لارا بہت ہی نڈر اور بہادر ڈاکٹر سمجھی جاتی تھی لیکن اس آخری معائنہ کے بعد وہ بھی کچھ خوف زدہ ہوگئی تھی لیکن ساتھ ہی وہ اس معصوم لڑکی کے لیے اپنے دل میں ہمدردی بھی محسوس کررہی تھی اور ہمدردی کا یہی جذبہ اسے وہاں موجود رہنے پر مجبور کررہا تھا۔

میئر ارسینا کے پہنچنے تک کلاریتا دوبارہ ہوش میں آچکی تھی۔ اس نے میئر کو دیکھ کر دوبارہ رونا شروع کردیا۔ اس تازہ حملے کے بعد کلاریتا کی حالت بہت زیادہ خراب ہوچکی تھی۔ اس کے بازوؤں کے زخم بہت زیادہ سوجے ہوئے تھے۔ ایک ہتھیلی تو بری طرح سے زخمی تھی اور وہاں دانتوں کے گہرے نشان بھی زیادہ واضح تھے۔

”بہت ہوچکا‘ اسے فوراً اسپتال منتقل کرو“ میئر نے حکم جاری کیا۔ جس اندیشے کے تحت کلاریتا کو اسپتال نہیں لے جایا گیا تھا‘ رپورٹرز کی موجودگی نے ثابت کردیا تھا کہ اب وہ اندیشہ ختم ہوچکا ہے۔

ایمبولینس میں ڈاکٹر مادینا لارا کے ساتھ میئر ارسینا خود سوار ہوا تھا۔ اس نے اخباری نمائندوں سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن نمائندوں نے میئر کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ سب کے سب ایمبولینس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

اسپتال کی جانب سفر شروع ہوا تو کلاریتا نارمل تھی لیکن ابھی کچھ ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ وہ پھر سے چلّانے لگی۔

”وہ اب بھی میرا پیچھا کررہا ہے“ کلاریتا نے ایمبولینس کے شیشوں میں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا لیکن میئر اور ڈاکٹر مادینا لارا کو کچھ نظر نہیں آیا۔

”وہ ہوا میں اُڑتا ہوا آرہا ہے“ کلاریتا ان دونوں کی آنکھوں میں غیر یقینی کیفیت دیکھ کر چلّائی تھی۔

”اب کی بار وہ مجھے جان سے ماردے گا۔۔“ کلاریتا کی چیخیں تیز سے تیز تر ہورہی تھیں۔

”اب وہ اپنے ساتھ مددگار بھی لایا ہے“ کلاریتا یہ کہتے ہوئے میئر ارسینا سے لپٹ گئی تھی۔

میئر ارسینا کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے کلاریتا کو یوں اپنے سینے سے لگالیا کہ وہ سامنے کی جانب سے بالکل چھپ گئی۔ ڈاکٹر مادینا لارا‘ جو اَب تک خاموش بیٹھی تھی‘ اس نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ بھی اس بچاؤ میں شریک ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کلاریتا کو پشت کی جانب سے اس طرح ڈھانپا کہ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن پھر بھی حملہ ہو ہی گیا۔

”مجھے معاف کردو“ کی چیخوں کے ساتھ ہی میئر ارسینا نے کلاریتا کی ٹانگ کے کھلے حصے پر دانتوں کے نشان ابھرتے ہوئے دیکھے۔ نیلے نیلے تازہ تھوک سے بھرے ہوئے دانت کے زخم‘ اب کی بار کلاریتا کے ساتھ میئر ارسینا بھی اس فریاد میں شریک تھا۔

”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں‘ اس معصوم بچی کو معاف کردو“ میئر ارسینا نے نادیدہ مجرم سے درخواست کی پھر وہ اپنی یہ درخواست دُہراتا چلاگیا‘ لفظ بدل جاتے تھے مگر مفہوم وہی رہتا تھا پھر ڈاکٹر مادینا لارا بھی اس درخواست میں شریک ہوگئی۔ وہ بھی تقریباً وہی الفاظ دُہرارہی تھی جو میئر ارسینا کہہ رہا تھا۔

یہ کیفیت پندرہ منٹ تک رہی۔ میئر اور ڈاکٹر اسی طرح کلاریتا کو نادیدہ حملہ آوروں سے بچاتے بھی رہے اور درخواست بھی کرتے رہے اور پھر اچانک میئر کو اپنے کانوں کے پاس کوئی سرگوشی سی محسوس ہوئی۔

”اب کی بار تمہارے کہنے پر چھوڑدیتے ہیں مگر آئندہ نہیں چھوڑیں گے“ وہ سرگوشی کسی مرد کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہی میئر کو یوں محسوس ہوا کہ ایمبولینس میں کسی نے گندے انڈوں کا پورا ٹوکرا اُلٹ دیا ہو۔

کلاریتا اسپتال پہنچی تو نیم جان ہوچکی تھی۔ چیف میڈیکل آفیسر انتظار میں تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے تازہ تھوک سے لتھڑے زخموں کو دیکھا لیکن فوراً ہی لڑکی کو اسپیشل وارڈ میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ کلاریتا کا علاج ہوا مگر صرف اُن زخموں کا‘ اسپتال سے رخصت ہوکر وہ میئر کے گھر میں رہی تھی۔ بعد میں اس کی شادی بھی ہوئی اور بچے بھی اور وہ سن ۹۴ء تک زندہ رہی مگر اسپتال والے حملے کے بعد اس پر کبھی حملہ نہیں ہوا۔ جس نے بھی کلاریتا کی وہ حالت دیکھی تھی‘ وہ وہی کہتا تھا جو سب کہتے تھے‘ صرف ایک چیف میڈیکل آفیسر تھا جو مرتے وقت تک یہی کہتا تھا کہ وہ سب کچھ ایک حسّاس‘ محروم ذہن کی پیداوار تھا جس کی توجیہہ یا پورا عمل تو میں نہیں بتاسکتا البتہ آنے والا کوئی سائنس داں اس کا جواب ڈھونڈ نکالے گا۔۔۔ نہ جانے وہ سائنس داں کب آئے گا؟

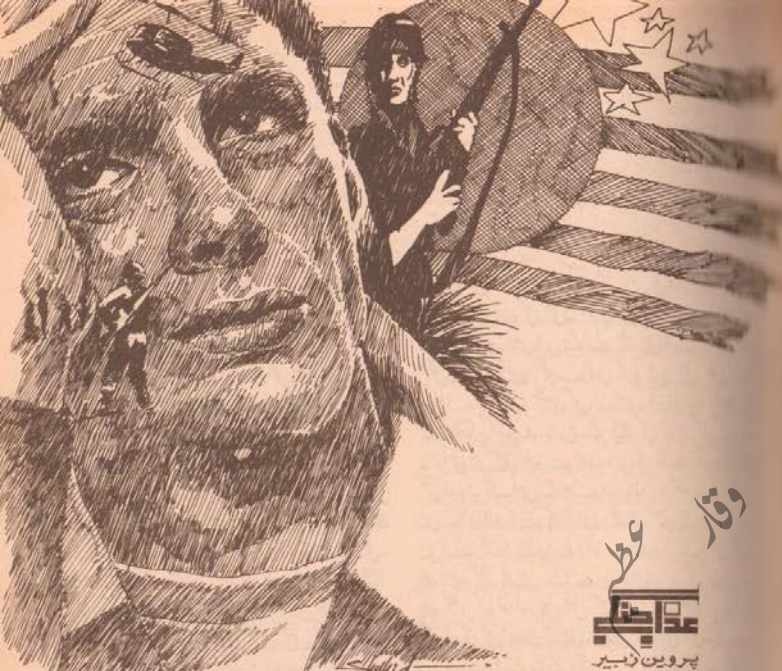

عذاب

پروین زبیر

جنگ کوئی بھی ہو... اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی داستانیں چھوڑجاتی ہے جو برسوں انسان کو اس کی ہولناک یادوں میں محصور رکھتی ہیں۔ جنگِ ویت نام کے دوران میں قید ہونے والے ایک امریکی سپاہی کا قصّہ۔ اس نے پورے پانچ سال اپنے بیوی بچوں سے دُور جس عذاب میں گزارے، وہ اس کی یادداشت کے طور پر اب ریکارڈ پر موجود ہیں۔ ویت نام میں امریکہ کا جنگی جنون ویت نامیوں کے لیے تو عذاب ناک تھا ہی مگر خود امریکی عوام نے اس حوالے سے کیا کیا دُکھ جھیلے یہ ایک قابلِ غور بات ہے۔

جنگِ ویت نام میں قید ہونے والے ایک امریکی سپاہی کی سرگزشت

”ٹیک اوور!“ ریڈیو پر میرے ہم منصب کرنل نے کہا اور میں نے پائلٹ کو واپسی کا اشارہ کیا۔ ہم نے ابھی ابھی امریکی فوج کے ویت نام میں مصروفِ جنگ ایک سو ایک ایئر بورن کے لیے ریڈیو گرایا تھا‘ بذریعہ پیراشوٹ۔ انہوں نے ریڈیو وصول کرلیا تھا۔ ہیلی کاپٹر واپس مڑا۔ یہ ہیل ... قسم کا جنگی و باربردار ہیلی کاپٹر تھا۔ میں نے دیکھا کہ ... کو پائلٹ اور کریو چیف فکرمندی سے کاپٹر کے کنٹرول ... پر جھکے ہوئے تھے۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں اس مشن کا کمانڈر تھا۔

”موسم کی رپورٹ دینے والا ریڈیو خراب ہوگیا ہے“ پائلٹ جیوروز نے کہا ”ویسے فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔“

فکر کی تو واقعی کوئی بات نہیں تھی لیکن حفظِ ماتقدم کے طور پر جیو نے ہیلی کاپٹر کو ساحل کی طرف موڑدیا۔ یہ ۸ فروری ۱۹۶۸ء کی تاریخ تھی۔ ہم نے چند روز پہلے ایک بڑے حملے میں ویت کانگ سے متعدد علاقے چھین لیے تھے اور کوانگ ٹرائی

جیسے اہم شہر پر قبضہ کرلیا تھا۔ مگر ابھی بھی شہر کے نواح میں ویت کانگ خاصی قوت کے ساتھ موجود تھے اور ایک سو ایک ڈویژن ان کی صفائی پر مامور تھا۔

جلد ہم ساحل کے قریب پہنچ گئے۔ اب جیو نے کاپٹر کو ساحل کے ساتھ ساتھ اڑانا شروع کردیا۔ ہم تین سو فٹ کی بلندی پر تھے۔ کاپٹر کے کھلے دروازوں سے زمین صاف نظر آرہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے زمین سے اٹھنے والے بخارات ماحول کو دھندلا کررہے تھے۔ دُور مغرب میں پہاڑ بھی بادلوں میں چھپے ہوئے تھے۔ جب کہ مشرق میں ریتلا ساحل اور بے حد سبز سمندر تھا جس پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ یہ سب اتنا حسین تھا کہ توپ خانے کی مسلسل آواز ہمیں جنگ کا احساس نہ دلاتی تو ہم خود کو بھی بھول جاتے۔

کیونکہ مشن کے دوران میں ہم فضائی تحفظ سے قطعی محروم تھے۔ لہٰذا ہم نیچی پرواز پر مجبور تھے اور یہ اتنی بلندی تھی کہ ویت کانگ ہمارے کاپٹر کو خود کار رائفلوں سے بھی مار گرا سکتے تھے۔ مگر میرے خیال میں ڈیڑھ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے اُڑتا ہیلی کاپٹر آسان ہدف نہیں تھا۔ اچانک مجھے کاپٹر کی گرج کے پس منظر میں تڑتڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ کو پائلٹ ڈک زیگلر چلایا۔ "ہم پر فائرنگ ہورہی ہے سر!"

میں نے جھک کر دیکھا تو مجھے کم از کم تین خود کار گنیں فائرنگ کرتی نظر آئیں۔ یہ بھاری مشین گنیں تھیں اور ان کی مؤثر مار ہزار گز سے زیادہ تھی۔ ہم تو بہت نیچے تھے۔ گنوں کی نالوں سے نکلنے والے شعلے بہت مہیب لگ رہے تھے۔ معاً ایک برسٹ آکر کاپٹر کے پہلو میں لگا۔ وہ بری طرح لرزا اور اس کے پچھلے حصے سے نارنجی شعلے لپکنے لگے۔ اور وہ پہلو کے بل نیچے جانے لگا۔

"ہم گررہے ہیں" زیگلر چلایا۔

اب کاپٹر نے چکر کھانے شروع کردیے تھے اور اس کے اندر دھواں بھر رہا تھا۔ جیوروز کنٹرول سے لڑ رہا تھا۔ وہ کاپٹر کو ایک ہموار میدان کی طرف لے جانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے زمین کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھا۔ کاپٹر پہلو کے بل زمین پر گرا۔ اس کے گھومتے بلیڈ زمین میں دھنس گئے۔ کاپٹر کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ ہم سب زیر وزبر ہوکر رہ گئے تھے۔ میرا چہرا کسی شے سے ٹکرایا اور کوئی شے زن سے آکر میرے کاندھے پر لگی۔

"باہر نکلو' باہر نکلو۔" پائلٹ چلّا رہا تھا۔

کریو چیف' پرائیویٹ جارج' دو کریو مین اور میں کھلے دروازے سے باہر کود گئے۔ لیکن دونوں پائلٹ جیوروز اور زیگلر ابھی اندر پھنسے ہوئے تھے۔ بدقسمتی سے اگلے دروازے جام تھے اور ہماری کوشش کے باوجود نہیں کھل رہے تھے۔ بہرحال ان دونوں نے ہم سے زیادہ عقل مندی دکھائی اور ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ سے باہر نکل آئے۔ وہ نرم ریت پر گرے تھے۔ زیگلر نے ایک چیخ ماری "میرا پیر!"

اس کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک گولی اس کی پنڈلی سے گزر گئی تھی۔ مگر ہڈی بچ گئی تھی ورنہ وہ کھڑا نہ ہوتا۔

"میری گن!" پرائیویٹ جارج چلّایا۔

"دفع کرو اسے۔" میں نے کہا مگر وہ اس سے پہلے ہی مڑ کر جلتے ہیلی کاپٹر میں گھس چکا تھا۔ اس کی ایم چودہ رائفل اندر ہی کہیں رہ گئی تھی۔ اگرچہ ہمیں ہتھیاروں کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن اس کے لیے جلتے ہیلی کاپٹر میں گھسنا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ دونوں کریو مین ہیلی کاپٹر کے دروازے پر نصب مشین گن اور اس کا ٹرائی پوڈ اٹھالائے تھے۔ معاً پرائیویٹ جارج کے چیخنے کی آواز آئی اور وہ بدحواسی میں ہیلی کاپٹر سے نکلا۔ اس کی شرٹ آگ پکڑ چکی تھی اور یہ آگ اس کے چہرے اور بالوں کو جھلسا رہی تھی۔ میں نے بروقت اسے پکڑ کر اوندھے منہ مٹی میں گرادیا اور اس وقت تک اسے دبائے رکھا جب تک شرٹ کو لگی آگ بجھ نہیں گئی۔ پھر میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کی گردن اور چہرہ جھلس گیا تھا اور بال جل گئے تھے۔ زیادہ خراب حالت گردن کی تھی' جہاں آبلے زدہ کھال لٹکنے لگی تھی۔ میں نے اس کی ہمت کی داد دی کہ اتنی بری طرح جلنے کے بعد بھی وہ ہوش میں تھا۔ اسی اثنا میں جیوروز اور کریو چیف چینو دیتھ زخمی زیگلر کی ٹانگ کی مرہم پٹی کرچکے تھے۔ میں نے زیگلر سے پوچھا۔

"کیا ہم رے ڈے کا پیغام نشر کرسکتے ہیں؟"

اس نے ایک نظر جلتے کاپٹر کو دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ "اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

اچانک ہیلی کاپٹر سے عجیب سی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ ہم فوراً دُور بھاگے۔ میں نے اور چینو دیتھ نے جارج کو سنبھال رکھا تھا اور جیوروز نے زیگلر کو سہارا دیا ہوا تھا۔ اردگرد کوئی آڑ نہیں تھی۔ سوائے ایک بڑے سے گڑھے کے جو کسی بم سے معرضِ وجود میں آیا تھا اور اب اس کے کناروں پر جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔

"اس میں گھس جاؤ" میں نے حکم دیا۔ ہم سب پھرتی سے گڑھے میں گھسے اور ممکنہ حد تک اس کی تہہ تک چلے گئے۔ تاکہ جب جلتا ہیلی کاپٹر پھٹے تو ہم اس کے اڑتے ٹکڑوں سے محفوظ رہیں۔ مگر خاصی دیر بعد بھی کوئی دھماکا نہیں ہوا البتہ شعلے بڑھتے گئے اور انہوں نے پورے ہیلی کاپٹر کو اپنی لپیٹ

موت کا علاج

ایک جوان لڑکی کا نام گسا گوتمی تھا' اس کی شادی ایک امیر آدمی کے بیٹے سے ہوگئی۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ بچہ ہی تھا کہ موت نے اسے اپنے آہنی پنجوں میں لے لیا۔ وہ جوان عورت بچے کو سینے سے لگائے ہوئے ہر فقیر درویش کے در پر جاتی۔ ان سے ایسی دوا مانگتی جس سے اس کا بچہ زندہ ہوجائے۔ ایک درویش نے کہا کہ میرے پاس دوا لئی تو نہیں ہے۔ ہاں' میں تمہیں ایک درویش کا نام بتا سکتا ہوں جس کے پاس اس کا علاج ہے۔ اس عورت نے اس نئے درویش کا نام پوچھا تو درویش نے بتایا کہ اس درویش کا نام ہے گوتم بدھ۔ وہ عورت گوتم بدھ کے پاس گئی تو گوتم بدھ نے کہا کہ میرے پاس اس کا علاج ہے۔ اس زمانے میں علاج کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جو مریض ہوتا تھا' وہی مطلوبہ جڑی بوٹی لاتا تھا۔ گوتم نے کہا کہ سرسوں کے دانے ایسے گھر سے لاؤ جس کا کوئی آدمی نہ مرا ہو۔ عورت گھر گھر جاتی' سرسوں کے دانے مانگتی اور پوچھتی کہ ان کا کوئی آدمی مرا تو نہیں ہے۔ ہر گھر والے یہی بتاتے کہ ان کے اتنے آدمی لقمۂ اجل بن گئے ہیں۔ جب اس عورت نے دیکھا کہ ہر آدمی موت کے پنجے میں اسیر ہے تو اس کے دل سے ظلمت کا پردہ چاک ہوگیا اور اس نے اپنے بچے کو جنگل میں لے جاکر دفن کردیا۔

میں لے لیا تھا۔ جارج اب ہوش میں تھا۔ میں نے اس سے کہا "جارج' تم نکل جاؤ اور کوانگ ٹرائی تک پہنچنے کی کوشش کرو' جب تک ہم ویت کانگ کو روکتے ہیں۔"

اس نے آہستہ سے اپنا جھلسا ہوا سر ہلایا اور رینگ کر گڑھے سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت ویت کانگ گوریلوں کے بولنے کی آوازیں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ ہر طرف سے آگے آرہے تھے اور کچھ دیر جاتی تھی کہ وہ ہمارے سر پر پہنچ جاتے اور ہم اتنے واضح تھے کہ اب ایک ایکشن سائن کے بنے جلتے بجھتے تیر کی کسر رہ جاتی تھی جو ہماری نشان دہی کرتا۔

"کرنل' کوئی اس طرف آرہا ہے۔" جیوروز نے سرگوشی میں کہا۔

"ایک نہیں بلکہ کئی ہیں" لینگر بولا پھر اس نے گننا شروع کردیا "ایک' دو' تین۔۔۔" کچھ دیر بعد اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا "کم سے کم بارہ افراد ہیں۔"

میں نے آنکھیں بند کرکے اپنے حلف کو یاد کیا کہ اگر میں دشمن کے محاصرے میں آجاؤں تو اس وقت تک ہتھیار نہیں ڈالوں گا جب تک ایسا کرنا ناگزیر نہ ہوجائے۔ میں نے چیف چینو دیتھ سے پوچھا۔

"اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ہمارے پاس صرف چار پستول ہیں اور ایک مشین گن بُری طرح مٹی میں لتھڑ چکی ہے" چینو دیتھ بولا۔

گویا اس کے چلنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ ایسے ہی فضائی معرکوں میں استعمال ہونے والا یہ ہتھیار بے اساس تھا۔ میں نے صورت حال کو ذہن میں تولا۔ ہم کل چھ افراد تھے۔ پرائیویٹ جارج جا چکا تھا۔ ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر اسلحہ تھا اور جو تھا اس کی کارکردگی بھی مشکوک تھی۔ جب کہ ہمارے مقابل کم از کم ایک درجن افراد تھے۔ جو پوری طرح مسلح تھے اور ان کے پاس ایسے ہتھیار بھی تھے جن سے ہیلی کاپٹر مار گرایا جائے' جیسا کہ انہوں نے کیا تھا۔ اگر ہم ان سے مقابلہ کرتے تو ہم زیادہ سے زیادہ دو تین افراد ماردیتے لیکن اس کے بعد خود ہمارے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ خود کشی ہوتی۔ اسی لمحے گڑھے کے کنارے ایک گرنیڈ آکر پھٹا۔ اگر وہ گڑھے میں گرتا تو یقیناً ہمارے پرخچے اڑجاتے۔ یہ وارننگ تھی کہ ہم نے ہتھیار نہ ڈالے تو اگلا گرنیڈ گڑھے ہی میں گرے گا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی زندگی کا سب سے مشکل فیصلہ کیا۔

"ساتھیو! ہم پھنس گئے ہیں' تعداد میں کم ہیں اور ضروری اسلحہ بھی نہیں ہے۔ ایسے حالات میں مقابلے کا مطلب خود کشی ہوگا' کوئی اعتراض؟"

وہ سمجھ گئے تھے اور ظاہر ہے کوئی اعتراض کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ سب سے پہلے چینو دیتھ سر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہم سب نے بھی اس کی تقلید کی۔ فوراً ہی ویت کانگ نے ہمیں دیکھ لیا۔ ایک منٹ کے اندر درجن بھر ویت کانگ نے گڑھے کو گھیر لیا۔ ان کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک جیسی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ جن پر کوئی نشان نہیں تھا۔ البتہ لیڈر نے دائیں ہاتھ پر سیاہ آرم بینڈ باندھ رکھا تھا۔ اس نے غرا کر کہا "ہینڈز اپ!"

حالانکہ ہمارے ہاتھ پہلے ہی سروں پر تھے۔ جب میں نے ہاتھ اوپر کیا تھا تو میرے پہلو میں درد کی تیز ٹیس سی اٹھی تھی۔ شاید کریش کے وقت میری کچھ پسلیاں زخمی ہوگئی تھیں۔ اسی اثنا میں ویت کانگ گوریلے اردگرد کی جھاڑیوں کو کھنگال رہے تھے اور جلد انہوں نے پرائیویٹ جارج کو ڈھونڈ نکالا۔ میں نے پہلے ویت نامی میں کسی کے چلّانے کی آواز سنی اور پھر جارج اذیت ناک انداز میں چیخا۔

"خدا کے لیے!" میں نے التجا کی "وہ پہلے ہی زخمی

ہے۔"

اس درخواست کے جواب میں لیڈر نے بے دردی سے اپنی کلاشنکوف کا دستہ میرے شانے پر مارا۔ درد نے میرے کندھے کو سن کردیا اور میں لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ لیڈر نے اپنی شکستہ انگریزی میں کہا۔

"خاموش رہو۔ کمانڈر میں ہوں۔ اپنا سب کچھ میرے حوالے کردو۔"

میں نے خاموشی سے جیب خالی کرنی شروع کردی۔ اپنا پرس، ملٹری کارڈ، ڈرائیونگ لائسنس اور جیب میں جو تھوڑی بہت رقم تھی مگر لیڈر کی حریص نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے انگلی سے میری گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گھڑی اتار کر اسے دے دی۔ پھر اس نے میرے جوتے مانگے، میں نے وہ بھی اُتار دیے، آخر میں اس نے میری انگلی میں موجود انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سونے کا معمولی سا چھلّا تھا۔ میں نے بے اختیار ہاتھ پیچھے کرلیا۔

"نہیں، یہ میری بیوی کا تحفہ ہے۔ میری شادی کی انگوٹھی۔ اس کی تمہارے لیے کوئی قیمت نہیں ہے۔"

"مجھے دو۔" وہ غرایا۔

"نہیں" میں نے ایک بار پھر سر ہلایا۔

اس پر لیڈر نے ایک گوریلے سے کچھ کہا تو اس نے ایک بڑا سا چاقو نکال لیا۔ وہ سفاکانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"پلیز کرنل!" لینگر گھگیایا "انہیں دے دو۔ ورنہ یہ تمہاری انگلی کاٹ لیں گے۔"

گوریلے کے تیور سے کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے انگوٹھی اتار کر لیڈر کے حوالے کردی۔ ایسا کرتے ہوئے میرے دل میں جیسے خنجر اتر گیا تھا۔ میرے بعد دوسروں کی باری آئی۔ اور ان سے بھی سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ پھر ان کے جوتے بھی اتروا لیے گئے۔ غالباً اس لیے کہ ہم فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ جنگل میں ہم ننگے پاؤں ایک میل بھی نہیں بھاگ سکتے تھے۔ اس سے پہلے ہی ہمارے پیر چھلنی ہوجاتے۔ پھر ہمارے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے۔

"چلو!" لیڈر نے اپنی اے کے ۴۷ رائفل سے مجھے آگے دھکیلا۔ ہم ایک قطار کی صورت میں ایک مختصر سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ ہمارا رخ پہاڑوں کی طرف تھا کیونکہ یہ علاقہ جنگ زدہ تھا۔ اس لیے یہاں ویت کانگ نے پہاڑوں میں ٹھکانے بنا رکھے ہوں گے۔ ہم تمام رات سفر کرتے رہے اور جب صبح ہم پہاڑوں کی ڈھلان تک پہنچے تو ہماری حالت بُری تھی۔ پیروں میں چھالے بن کر پھوٹ گئے تھے۔ مگر زیادہ خراب حالت پرائیویٹ جارج کی تھی۔ اس کا جھلسا ہوا ... سُوج گیا تھا اور وہ ہر دوسرے تیسرے قدم پر گر پڑتا تھا۔

"تم جاؤ" لیڈر نے غرا کر کہا "تم نے سب کو سست ... ہے۔"

"تم دیکھ رہے ہو، یہ زخمی ہے۔" میں نے احتجاج ... "اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"تم خاموش رہو۔ انچارج تم نہیں ہو، اب ... بولے تو میں تمہیں گولی ماردوں گا۔"

لیکن اب میرے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ ... نے اسے چیلنج کیا "اگر تم مجھے گولی مارنا چاہتے ہو تو مار دو ... میں خاموش نہیں رہوں گا۔ مجھے اس کے لیے ڈاکٹر کی ضروت ہے۔ تم جانتے ہو، بیک سی... کیا تم مجھ سے متفق ... بیک سی سے مراد ڈاکٹر ہی تھا۔ ویت نامی میں ڈاکٹر کو بیک ... کہتے ہیں۔

"ہاں... بیک سی!" لیڈر عجیب سے انداز میں مسکرایا "... تم سے متفق ہوں۔ اسے واقعی بیک سی کی ضرورت ہے۔"

جارج زمین پر لیٹا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا "کرنل ... کیا تم میرے ساتھ مل کر دعا کروگے۔"

"کیوں نہیں" میں گھٹنوں کے بل جھکا۔ ... ہم نے ہم آواز ہو کر دعا گانی شروع کردی۔

"کھڑے ہوجاؤ" لیڈر پھنکارا۔ اس کی رائفل ... میری گردن سے آلگی تھی۔ پھر میں نے بولٹ کھینچے ... گئی۔ میرے مساموں نے پسینہ اگلنا شروع کردیا تھا۔ ... کوئی لمحہ جاتا تھا کہ گولی میرے سر میں اتر جاتی۔ لیکن میں ... دعا جاری رکھی۔ حتیٰ کہ ہم نے دعا ختم کرلی۔ لیڈر نے جھلا کر ... اپنی رائفل کو فضا میں لہرایا تھا۔

"شکریہ کرنل!" جارج بولا "اب میں سکون سے ... مر سکوں گا۔"

"تم زندہ رہوگے۔ یہ معمولی زخم ہیں۔ جلد ... ٹھیک ہوجائیں گے" میں نے اسے تسلی دی۔

جارج عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں کرب تھا۔ "اب چلو!" لیڈر نے مجھے دھکا ... بادلِ ناخواستہ میں نے قدم آگے بڑھائے۔ جارج کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کے سر پر ایک ویت کانگ گوریلا ... تھا۔ ایک موڑ پر میں نے آخری بار گھوم کر جارج کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اب کے بعد میں اسے نہیں دیکھ سکوں گا اور جیسے ہی ہم موڑ سے اوجھل ... جارج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوا۔ فضا فائرنگ کی آواز ...

... دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

"... کیا تھا؟" میں نے چلّا کر لیڈر سے کہا۔

"... تم نے سنا" وہ مسکرانے لگا "ایک فائر، جو کسی پر ..."

"... نے پرائیویٹ جارج کو شوٹ کرادیا" میں نے پھر ...

"... نہیں" اس نے سر ہلایا "ہم نے اس کے لیے ... ہے۔"

... اس کی بات پر یقین پر مجبور تھا۔ اے خدا، میں یقین ... یقین عطا فرما۔ مجھے معلوم نہیں ہوا کہ کب ... آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

○☆○

ظاہر میں وعظ سن رہی تھی لیکن میرا ذہن کہیں دور ... کے پاس۔ آج مجھے اس سے جدا ہوئے پورے چھ ... تھے۔ جب وہ ویت نام گیا تھا۔ اس نے اپنا نام ... تھا لیکن مجھ سے پوچھ کر۔ اس نے کہا۔

"ہم پر صرف اپنے بیوی بچوں اور خاندان والوں ... نہیں، وطن کا قرض بھی ہے۔ اور میں اپنا قرض ادا ... تم مجھے اس کی اجازت دوگی؟"

ایک فوجی کی بیوی سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ وطن کا ... ہوتا ہے۔ ظاہر ہے میں نے اقرار کرلیا۔ جاتے وقت ... صرف ایک جملہ کہا تھا "میں واپس آؤں گا" یہ وعدہ ... اظہارِ محبت۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب ... کا ساتھ اتنا پرانا ہوجائے تو انہیں اظہار کے لیے ... ضرورت نہیں رہتی۔

... میں چونکی۔ چرچ کی سنڈے سروس ختم ہوگئی تھی ... لوگ ہال سے باہر جارہے تھے۔ میں ہال سے نکل کر چرچ ... اسکول اینکس کی طرف بڑھی۔ وہاں میری تین ... تھیں۔ دو سالہ جوائے، پانچ سال کی شیری اور دس ... سالہ ... وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ تھیں۔ میرے دونوں ... سال کا کلف اور چودہ سالہ ڈیوڈ گھر میں ہوم ورک ... تھے۔ میں بچیوں کو لے کر باہر آئی تو مجھے ریورنڈ ارل ... اور میجر جم اسٹیٹلر باہر کھڑے نظر آئے۔ یہ دونوں ... میرے شوہر کے دوست تھے۔ جب وہ فوج میں ... کلیموزن کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے مجھے کوئی ... چاہتا ہو۔ نہ جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہوا کہ یہ خبر ... کے بارے میں ہے۔

"... کیا تم میرے ساتھ چلوگی؟" کلیموزن بولا۔

میں ان کے ساتھ اپنے گھر آئی۔ بچوں کو ان کے کمروں میں بھیج کر میں کلیموزن کے پاس اسٹڈی روم میں آگئی۔ اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا تو میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا "بین تو ٹھیک ہے ناں؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے" کلیموزن نے مجھ سے آنکھیں چرائیں۔ "اس کا کاپٹر ہٹ ہوگیا۔ ۸ فروری کو۔"

"آٹھ فروری کو" میں چلّا اٹھی "اور تم کہتے ہو، وہ ٹھیک ہے۔"

"آرام سے... اپنے آرام۔ دو دن تو ہمیں کاپٹر کا ملبہ ڈھونڈنے میں لگ گئے تھے۔ مگر تلاش میں جانے والی پارٹی کو کوئی لاش نہیں ملی۔ وہ کریش میں بچ گئے لیکن اس کے بعد سے لاپتا ہیں۔"

نہ جانے میں کتنی دیر ساکت بیٹھی رہی۔ کلیموزن، اس کی بیوی، بونی اور جم مجھے تسلیاں دیتے رہے لیکن میں کچھ نہیں سن رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سانس رک گئی ہو۔ دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ زمین و آسمان کی گردش رک گئی ہو۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے ڈیوڈ، کلف اور ڈیبی کو ایک جگہ بٹھا کے یہ خبر سنائی تھی۔ میں ایک فوجی کی مضبوط بیوی تھی لہٰذا بچوں کے سامنے میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ میں انہیں تسلی دیتی رہی کہ ان کے ڈیڈی زندہ ہیں اور جلدی واپس آئیں گے۔ لیکن جب اپنے بیڈ روم میں آئی تو میرے اعصاب بکھر گئے تھے۔ میں بے تحاشا رونے لگی۔ اس وقت میں خود کو بے حد کمزور محسوس کررہی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ میری ساری مضبوطی اور حوصلہ بین اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اس کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"میں بین کے بغیر پانچ بچوں کو کیسے سنبھالوں گی؟" یہ سوال بھی منہ پھاڑے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ بین میرا محبوب شوہر ہی نہیں، میرے بچوں کا باپ بھی تھا اور انہیں اپنے باپ کی اتنی ہی ضرورت تھی جتنی کہ مجھے اپنے شوہر کی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کروں گی کہ میں مذہبی عورت ہوں لیکن میں خدا پر مکمل اعتقاد رکھتی ہوں۔ ہر مشکل گھڑی میں اس سے دعا مانگتی ہوں۔ اس وقت بھی بے اختیار میں دعا مانگنے لگی۔

"اے خدا، میرے چاروں طرف بہت اندھیرا ہے۔ مجھے روشنی عطا فرما۔ بے شک ننھی سی کرن ہی سہی۔ اے خدا، صرف ایک کرن... تھوڑی سی روشنی" میں گڑگڑانے لگی تھی۔

○☆○

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

ہم ننگے پاؤں اور رینگتی رفتار سے اس پہاڑی سلسلے کو عبور کررہے تھے۔ راستہ اتنا دشوار گزار تھا کہ بعض اوقات ہمیں چاروں ہاتھوں پیروں سے رینگنا پڑتا تھا۔ راستے بارش کی وجہ سے سخت پھسلواں تھے اور ہم گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستے میں بچھے کنکر ہمارے زخمی پیروں میں چبھ رہے تھے۔ ہم مسلسل سفر میں تھے اور تھکن سے برا حال تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں ہمیں کھانے کو دو کپ اُبلے ہوئے چاول اور دو گلاس پانی ملا تھا۔ میرے ہاتھ زخمی تھے اور شانے کی دکھن بڑھتی جارہی تھی۔ اس پُر عذاب سفر میں راحت کا سامان اپنے کا تصور تھا۔ مجھے معلوم تھا' وہ مجھے یاد کررہی ہوگی اور میرے بہ عافیت لوٹ آنے کی دعا بھی مانگ رہی ہوگی۔ کوئی آپ سے محبت کرتا ہے۔ آپ کی سلامتی کے لیے دست بہ دعا ہوتا ہے۔ یہ احساس کتنا فرحت بخش تھا۔ یہ میں نے ان عذاب ناک دنوں میں جانا تھا۔

پانچ دن کے مسلسل سفر کے بعد ۱۳ فروری کے دن ہم جنوبی ویت نام کے ایک کیمپ میں پہنچے۔ جہاں آرم بینڈ والے لیڈر نے ہمیں ایک دوسرے شخص کے حوالے کیا۔ میں نے اسے ہاک نوز کا خطاب دیا کیونکہ اس کی ناک آگے سے عقاب کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اگلے روز میری چالیسویں سالگرہ تھی اور ہاک نوز نے مجھے تفتیش کے لیے طلب کرلیا۔ وہ صاف اور رواں انگریزی بولتا تھا۔

"تمہارا نام۔۔۔۔ رینک اور سروس نمبر۔۔؟" اس نے بلاتمہید پوچھا۔

"بنجامن ایچ پرسل۔ لیفٹیننٹ کرنل' صفر چھ ایک صفر تین پانچ۔"

"تم کس یونٹ میں کام کرتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"تمہاری یونٹ میں کتنے آدمی ہیں؟" اس نے اَن سُنی کرکے کہا۔

"بنجامن ایچ پرسل۔ لیفٹیننٹ کرنل۔ صفر چھ ایک صفر تین پانچ" میں نے پھر دہرایا۔

ہاک نوز نے اپنی پنسل میز پر پٹخ دی تھی "سنو کرنل! نہ تمہاری حکومت کو علم ہے اور نہ ہی تمہارے گھر والوں کو کہ تم زندہ ہو یا مرگئے ہو۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کرتے تو ہمارے پاس تمہیں زندہ رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔"

"میں نے تعاون سے انکار نہیں کیا۔ لیکن میں صرف جنیوا کنوینشن کے تحت۔۔"

"اب تم دیکھو گے" اس نے میری بات کاٹی "یہاں کوئی جنیوا کنوینشن نہیں ہے۔"

اس کے بعد اذیت رسانی کے پہلے دور کا آغاز ہوا۔ پہلے میری وردی اتار کر مجھے مجرموں والی سیاہ پتلون اور قمیص دی گئی۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ ہاک نوز کے سامنے پیش کیا گیا جو کئی گھنٹے تک مجھے دھمکاتا رہا۔ درمیان میں مجھے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا اور آخر میں مجھے زمین پر بنائے گئے ایک سرد اور تاریک گڑھے میں اتار دیا گیا۔ جس میں پانی پڑا تھا۔ وہاں انواع واقسام کے کیڑے تھے جنہوں نے کاٹ کاٹ کر میرا برا حال کردیا تھا۔ چھ سات گھنٹے بعد مجھے اس گڑھے سے نکالا گیا تو میری حالت ابتر تھی۔

اگلے روز مجھے اور دوسرے افراد کو ایک بار پھر آگے روانہ کردیا گیا۔ ہم مختلف راستوں سے گزرتے اور خفیہ کیمپوں میں ٹھہرتے جنوب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہم جہاں بھی رکتے' وہاں ہم سے تفتیش کی جاتی تھی۔ ایک مہینے بعد زیگلر بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ اس کی ٹانگ کا زخم ٹھیک تھا۔ وہ اپنے زندہ بچ جانے پر خوش تھا تو قیدی ہونے پر افسردہ۔ پرائیویٹ جارج کے برعکس اسے طبی امداد مل گئی تھی' اسی بنا پر وہ صحت مند ہوا تھا۔

یہ سفر بھی ایک سزا سے کم نہیں تھا۔ ننگے پیر' ناکافی کپڑوں میں اور معمولی غذا کے سہارے ہمیں [illegible] چلایا جاتا تھا۔ پہاڑ' جنگل' دریا' ندی نالے اور دلدلیں ہماری راہ میں حائل تھیں۔ مچھر اور اس قبیل کے زیادہ [illegible] کیڑے مکوڑے اور زہریلے سانپ عام تھے۔ سفر میں زخم لگتے تو لگانے کو کوئی دوا نہیں ملتی تھی۔ نتیجے میں ان زخموں میں انفیکشن ہوجاتا تھا۔ ایک دلدل سے گزرتے ہوئے متعدد جونکیں میرے پیروں سے لپٹ گئی تھیں اور میں انہیں نوچ نوچ کر پھینکتا رہا۔ جونکوں نے جہاں بھی کاٹا وہاں زخم ہوگیا اور پھر یہ زخم پھوڑے اور آخر میں ناسور بن گئے۔ میری دونوں ٹانگیں ان پھوڑوں اور ناسوروں سے بھر گئی تھیں اور میرے لیے چلنا عذاب بن گیا تھا۔

آخر میں ہمیں ایک ٹرک میں ہوچی منہ سٹی جو [illegible] ہنوئی کہلاتا ہے پہنچایا گیا۔ یہ اس پورے سفر میں استعمال ہونے والی واحد گاڑی تھی۔ ٹرک ہمیں رات کو ایک [illegible] جنگل کے قریب اتار کر چلا گیا۔ درد کی شدت سے میرے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ جب گارڈ نے چلا کر ہمیں اٹھنے اور چلنے کا حکم دیا تو میں نہیں اٹھا۔ اس پر گارڈ پہلے [illegible] میں مجھ پر چلاتا رہا پھر جاکر اپنے افسر کو بلا لایا۔ اس [illegible] نامی میں کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ ہمارے ساتھ ایک [illegible] [illegible] بھی تھا جس کا تعلق شمالی ویت نام سے تھا۔ اس نے جھجک [illegible] سے کہا "کرنل' بہتر ہو گا تم ہمت کرکے اٹھ جاؤ ورنہ ویت نامی افسر تمہیں گولی مارنے کو کہہ کر گیا ہے۔"

اگرچہ درد سے میرا برا حال تھا لیکن موت کے خوف نے مجھے مجبور کردیا۔ جب گارڈ نے چلا کر مارچ کا حکم دیا تو میں بھی [illegible] کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم ایک تاریک پگڈنڈی پر آگے [illegible]۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہاں مکمل تاریکی تھی اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا اگلا قدم کہاں جاکر ٹکے گا۔ میں ایک بار اٹھ تو گیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ میں ایک بار گر پڑا تو پھر نہیں اٹھ سکوں گا اور یہ گارڈ فوراً مجھے گولی مار دے گا۔ مایوسی کی انتہا میں انسان کو خدا یاد آتا ہے۔ مجھے بھی خدا یاد آیا۔

"اے خدا! روشنی کی صرف ایک کرن۔۔۔ ایک روشنی [illegible] معبود!"

اور پھر جو ہوا اسے سوائے قبولیت دعا کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ سب سے پیچھے چلنے والے گارڈ نے اچانک ایک [illegible] ٹارچ روشن کرلی اور اس کی روشنی عین میرے پیروں [illegible] تھی اور مجھے راستہ صاف نظر آرہا تھا اور گارڈ نے [illegible] راستے فلیش لائٹ جلا کر رکھی تھی۔ میرا یقین ہے' [illegible] ضرور سنتا ہے جلد یا بدیر۔

صبح کے وقت ہمارے سفر کا اختتام ایک جنگی قیدیوں کے کیمپ میں ہوا۔ یہ کیمپ باؤ کاؤ کہلاتا تھا۔ مزے کی بات یہ [illegible] ویت نامی زبان میں اس کا مطلب وہی ہے جو انگریزی [illegible] کا ہے۔ یعنی درخواست کرنا۔ پہلے ہمیں کیمپ کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس کے چینی نقوش بتا رہے تھے کہ [illegible] کے ماں یا باپ میں سے کوئی ایک چین سے تعلق رکھتا [illegible]۔ کیمپ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں بہ مشکل تیس قیدیوں کی گنجائش تھی۔ مگر قیدی اس سے بھی کم تھے۔ [illegible] کوٹھریوں پر مشتمل دو بلاک تھے۔ ہر سیل کا سائز [illegible] ضرب سات فٹ تھا۔ یعنی ایک قبر جتنا۔ سامنے [illegible] صحن تھا۔ اس کے بعد دیوار تھی۔ کیمپ کے چاروں [illegible] خاردار تاریں لگی تھیں۔ حفاظتی انتظامات عام سے [illegible] چھ سات محافظ تھے۔ پاس ہی ایک ندی بہتی تھی۔ [illegible] ہفتے میں ایک بار نہانے کی اجازت تھی۔ میرے [illegible] بلاک میں کل آٹھ کوٹھریاں تھیں اور مجھے نہیں [illegible] میرے علاوہ وہاں اور کون تھا۔ پورے بلاک کے [illegible] ایک ٹوائلٹ تھا اور ایک قیدی کو دن میں صرف [illegible] جانے کی اجازت ملتی تھی۔

ایک مہینے تک مسلسل سفر' تشدد' خوراک کی کمی اور زخموں نے میری حالت تباہ کردی تھی۔ اس قید خانے میں آکر سفر سے تو نجات مل گئی لیکن اپنے ٹانگوں کے زخم دیکھ کر میرا دل اندیشوں سے دہلنے لگا تھا کہ کہیں میں اپنی ٹانگوں سے ہی نہ ہاتھ دھو بیٹھوں۔ ناسوروں اور زخموں میں انفیکشن کے آثار نمایاں تھے اور دوا کے نام پر مجھے ابھی تک ایک اینٹی بایوٹک کیپسول تک نہیں دیا گیا تھا۔ اگر سیپٹک ہوجاتا تو میں چند دنوں میں مرجاتا۔ میں نے اپنے زخم کیمپ کمانڈر کو دکھائے جو میرا نیا تفتیش کار تھا۔ اس کی سؤر جیسی ناک کی وجہ سے میں نے اسے پگ نوز کا لقب دیا تھا۔

"مجھے ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے' بیک سی" میں نے اسے اپنے انفیکشن زدہ زخم دکھائے۔

"کوئی بیک سی نہیں آئے گا" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "جب تک تم اپنی رائے سے رجوع نہیں کرو گے۔"

رائے سے رجوع کرنے سے مراد یہ تھی کہ میں جنگ کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کی حمایت کروں۔ پگ نوز نے اپنی بات جاری رکھی "تم یا تو ہمارے سوالوں کے جواب دو یا اپنی ٹانگوں سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ میں تمہیں ایک دن کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے تعاون کیا تو تمہیں کچھ دوائیں مل جائیں گی۔"

میں نے اپنے سیل میں جاکر سوچا۔ ایک طرف میری ٹانگیں تھیں تو دوسری طرف میرا فرض۔ مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ البتہ میں انہیں جھوٹ بول کر دھوکا دے سکتا تھا۔ میں جتنا اس پر غور کرتا گیا۔ مجھے یہ خیال اچھا لگنے لگا۔ ممکن ہے وہ ابھی دھوکا کھاکر میری ٹانگوں کا علاج کرادیتے۔ بعد میں جھوٹ پکڑے جانے پر وہ میرے ساتھ کیا کرتے' مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ اچھی طرح غور کرکے میں نے گارڈ کو آواز دی "میں کیمپ کمانڈر سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جب میری اس کے سامنے پیشی ہوئی تو وہ اپنی مختصر سی میز کے عقب میں چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ سجائے بیٹھا تھا۔

"خوب! تو تم اب سوالوں کے جواب دینے کو تیار ہو۔ بہت اچھے' یہ بتاؤ کہ تمہاری جاب کیا تھی؟"

"میں ٹروپس منظم کرتا تھا اور ایجوکیشن آفیسر ہوں" میں نے کہا۔ یہ غلط نہیں تھا۔ ایک ڈپٹی کمانڈر کی حیثیت سے متعدد ذمے داریوں میں سے میری یہ بھی ایک ذمے داری تھی۔

"تمہاری جاب کی نوعیت کیا تھی؟"

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

"سپاہیوں کی تربیت کرنا اور انھیں خاص طریقہ جنگ سکھانا" میں نے کہا "مثال کے طور پر ایک طریقہ ہوتا ہے مین ٹو مین ڈیفنس۔ اپنی آخری کلاس میں سپاہیوں کو اس کے بارے میں لیکچر دیا تھا۔"

میں نے یہ بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں نے مشن پر آنے سے پہلے جو آخری فلم دیکھی تھی، اس میں فٹ بال ٹیم کو مین ٹو مین ڈیفنس کی تربیت دی جا رہی تھی۔ اس سے پگ نوز کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اس نے اپنا منہ آگے کر کے کہا۔

"یہ مین ٹو مین ڈیفنس کیا ہوتا ہے؟"

پگ نوز کے خیال میں یہ کوئی شاندار فوجی تکنیک تھی۔ اگر وہ فٹ بال کی اصطلاحات سے واقف ہوتا تو شروع میں ہی تاڑ جاتا۔ اس کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھا کر میں شروع ہو گیا۔ میں نے ذہن میں آنے والی فٹ بال کی ہر اصطلاح بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دی۔ بے شک ان میں سے اکثر کا مطلب میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ سیفٹی بلٹز، ریڈ ڈوگس، سیمز، جمپ اینڈ گو، پوسٹ پیٹرن، لائن بیکر ڈروپس اور اسٹرانگ ڈیفنس وغیرہ وغیرہ۔ پگ نوز نے ہر اصطلاح بڑی احتیاط سے کاغذ پر اتاری تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے ان کی وضاحت مانگی۔

"یہ لائن بیکر ڈروپس کیا ہوتے ہیں؟"

میں نے گہری سانس لے کر پھر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ "لائن بیکر ڈروپس تین سپاہیوں کی ایک ٹکڑی کو کہتے ہیں جو ایک خاص علاقے کے تحفظ کی ذمے دار ہو۔ ایک سپاہی آگے ہوتا ہے، وہ فارورڈ کہلاتا ہے۔ درمیان کا آدمی لائن بیکر اور پچھلا لائن بیکر ٹو کہلاتا ہے۔ اگر دشمن کے حملے کا زور زیادہ ہے تو درمیانی شخص آگے والے کے پاس چلا جاتا ہے اور اگر دشمن بہت آگے آ جائے تو وہ پیچھے آ جاتا ہے۔"

پگ نوز کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا تھا لیکن وہ یوں سر ہلا رہا تھا جیسے سب سمجھ رہا ہو۔ البتہ اس نے سب لکھ ضرور لیا تھا۔

"یہ اسٹرانگ ڈیفنس کیا ہوتا ہے؟" اس نے اگلا سوال کیا۔

"ایک درمیانی آدمی، مرکزی شخص۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اسٹرانگ ڈیفنس، مرکزی شخص کا کوڈ نیم ہے۔"

"آہا۔ بہت خوب" وہ چہکا "ہمیں یہی تو چاہیے۔ اسٹرانگ ڈیفنس یعنی مرکزی شخص، بہت خوب۔"

"سنو!" میں نے التجا کی "میں نے یہ سب جو تمہیں بتایا ہے، اسے میرے ساتھیوں تک نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"میں سمجھتا ہوں، تم فکر ہی مت کرو" پگ نوز نے سر ہلایا "انھیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اور ہاں، جب تم اپنے سیل میں پہنچو گے، تو تمہیں کچھ دوائیں مل جائیں گی۔"

"تمہارا شکریہ" میں نے کہا اور گارڈ کے ہمراہ اپنے سیل میں واپس آ گیا۔ رات کو واقعی وعدے کے مطابق مجھے کچھ اینٹی بایوٹک دواؤں اور پین کلر کے ساتھ زخموں پر لگانے والا مرہم بھی مل گیا تھا۔ اس رات میں خاصے عرصے بعد سکون کی نیند سویا تھا۔

○☆○

جب بین ویت نام جا رہا تھا تو میں اور بچے یہ سوچ کر پریشان تھے کہ ہم اس کے بغیر ایک سال کیسے رہیں گے۔ بین نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک سال تو دیکھتے ہی دیکھتے گزر جاتا ہے۔ لیکن اب وہ غائب ہی ہو گیا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ میں اور بچے یہ طویل زندگی بین کے بغیر کیوں کر گزاریں گے۔ ہمارا پروگرام تھا کہ ویت نام سے بین کی واپسی پر ہم جارجیا شفٹ ہو جائیں گے۔ وہاں ہم نے ایک گھر بھی خرید لیا تھا۔ جو فی الوقت کرائے پر تھا۔ ڈیوڈ کو بوس ویلی کے سیکنڈری اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ پھر یہاں میرے، بین کے اور بچوں کے بے شمار دوست تھے۔ مگر ہمیں یہاں سے جانا تھا۔ جیسے ہی گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ ہم جارجیا واپس منتقل ہو گئے۔ مگر بدقسمتی سے مکان ہمارے اندازے سے چھوٹا پڑ گیا تھا۔ یہ ایک بڑے خاندان کے لیے ناکافی تھا۔ کمرے چھوٹے چھوٹے اور باتھ روم مختصر تھے۔ جبکہ میں اور بچے اب تک بڑے گھروں میں رہتے آئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ گھر میں متعدد مسائل تھے۔ بین ہی حل کیا کرتا تھا۔ بچے بھی بین کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ خاص طور سے دونوں چھوٹی بیٹیاں روز مجھ سے سوال کرتیں کہ ڈیڈی کب آئیں گے اور میں آنسو پی کر انھیں تسلی دیتی۔

"بہت جلد میری جان، بہت جلد۔"

مالی طور پر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بین کی تنخواہ اور الاؤنسز مجھے باقاعدگی سے مل رہے تھے۔ صرف میں ذہنی طور پر پریشان تھی۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ میری سہیلی مارگریٹ ایک کنڈرگارٹن اسکول کی پرنسپل تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نرسری کلاس کے بچوں کو پڑھانا پسند کروں گی۔

"اس سے تمہاری توجہ بھی بٹے گی اور اضافی آمدنی بھی ہو جائے گی۔"

"اضافی آمدنی کا میں کیا کروں گی؟" میں نے پوچھا۔

"تم یہ گھر بیچ کر کوئی بڑا گھر لے لو" مارگریٹ نے وہ تجویز پیش کی، جو میرے ذہن میں آنی چاہیے تھی۔

اس کے بعد میں جیسے خواب غفلت سے جاگ گئی۔ میرا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بین کی غیر حاضری میں، میں نے بچوں کے لیے وہ کچھ نہیں کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ بین نہیں تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں بچوں کے مسائل سے منہ موڑ لوں اور ہمہ وقت اپنے غم میں ڈوبی رہوں۔ میں نے سب سے پہلے بچوں سے معذرت کی کہ میں نے اتنے عرصے انھیں نظر انداز کیے رکھا تھا۔ پھر میں نے مارگریٹ کو مطلع کیا کہ میں اس کی پیشکش قبول کر رہی ہوں۔ اسکول کھلتے ہی میں نے پہلے بچوں کو داخل کرایا۔ پھر میں نے مکان کا سودا کیا اور ایک بڑا اور بہتر مکان لے لیا۔ اس کی نصف ادائیگی فوراً کر دی اور باقی رقم قسطوں میں ادا کرنی تھی۔ کنڈرگارڈن کی ملازمت سے مجھ پر مالی بوجھ بھی نہیں پڑا تھا۔ ملازمت، پھر گھر اور اپنے بچوں کی وجہ سے میں اتنی مصروف ہو گئی کہ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ البتہ رات آتی تو میرے دل میں ہول اٹھتے، ایک ہوک سی پھر سے جاگ اٹھتی تھی۔

اس دوران میں مسلسل فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے میں رابطہ کیے ہوئے تھی لیکن ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں تھی۔ پہلے گرما گزرا، پھر خزاں بھی آ کر چلا گیا اور کرسمس قریب آنے لگا۔ میں ہر روز امید کرتی اور ہر روز مایوس ہو جاتی تھی۔ میں خود کو بے حد تنہا محسوس کرتی اور یقیناً بین بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہو گا۔ عجیب بات ہے کہ اس کی گمشدگی کے بعد سے میں نے ایک بار بھی اس کی واپسی کے لیے دعا نہیں مانگی تھی۔ شاید مجھے خوف تھا کہ میری یہ دعا مسترد نہ ہو جائے۔ مگر بالآخر میرا صبر جواب دے گیا اور میں نے سادگی سے خدا سے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ بین زندہ ہے یا نہیں لیکن تو جانتا ہے۔ میں یہ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔ اس سے تو ہی واقف ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ وہ گھر واپس آئے لیکن میں جانتی ہوں کہ تو اس سے زیادہ محبت کرتا ہے میری نسبت۔ میں اسے تیرے سپرد کرتی ہوں اور تیری رضا پر راضی ہوں۔ جو تو چاہے۔" یہ دعا مانگ کر میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ میرا ذہن اب صاف تھا۔ جب سے بین کے ہیلی کاپٹر کے کریش ہونے اور اس کے غائب ہونے کی خبر سنی تھی، میرے ذہن کی عجیب سی حالت تھی۔ میرا سکون کھو گیا تھا۔ میں گھر سے، بچوں سے، خود سے، حتیٰ کہ اپنے ماحول سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کب دن نکلا اور کب رات ہو گئی۔ میں نے موسموں کو بدلتے نہیں دیکھا۔ جارجیا میں موسم بہار بے حد خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن میرے اندر تو صرف تاریکی تھی اور خزاں تھی۔

پہلی مارچ کو میرے فون کی گھنٹی بجی "مسز بنجامن! میں ہیڈ کوارٹر سے بول رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔"

میں دیوانہ وار فوجی دفتر پہنچی۔ جہاں ایک کرنل نے مجھے بتایا کہ بنجامن جنوبی ویت نام میں جنگی قیدی کی حیثیت سے موجود ہے اور زندہ ہے لیکن اس کی جسمانی حالت کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ میں مارے خوشی کے رو دی تھی۔ خدا نے میری دعا سن لی تھی۔ میرا بین زندہ تھا۔ مجھے معلوم تھا، وہ زندہ رہے گا اور ایک دن واپس بھی آئے گا۔ میں اس کا انتظار کروں گی اور جب وہ آئے گا تو ہم اپنی زندگی کو اینٹ اینٹ کر کے دوبارہ تعمیر کریں گے۔

○☆○

جولائی ۱۹۶۸ء میں مجھے جنگی قیدی کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ لیکن میرے بارے میں امریکی حکومت کو آٹھ مہینے بعد مطلع کیا گیا تھا۔ اگست میں مجھے ایک دوسرے جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا گیا جو باؤ کاؤ سے کسی قدر بہتر تھا۔ یہاں میرا قیدی نمبر K77 تھا۔ مجھے جو سیل دیا گیا تھا۔ وہ چھ بائی نو فٹ کا تھا۔ یہاں ایک عدد لکڑی کا بیڈ تھا۔ جس پر کمبل بچھا تھا اور ایک ٹوائلٹ باسکٹ تھی۔ اس سے مجھے اب خود پر جبر نہیں کرنا پڑتا تھا۔ لیکن بدبو سے ہر وقت دماغ خراب رہتا تھا۔ ایک صفائی کرنے والا صبح اور رات دو وقت آ کر باسکٹ صاف کر جاتا تھا۔

خوراک کا معیار بھی پہلے سے بہتر ہوا تھا۔ اب روٹی، سبزی اور چاول کے ساتھ کبھی کبھار گوشت یا انڈہ بھی مل جاتا تھا۔ ساتھ ہی میری ٹانگوں کا علاج بھی جاری تھا۔ اور ان کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ خوراک کی مقدار بڑھنے کے بعد میں نے اپنی صحت کی بحالی کی طرف توجہ دی اور ورزش کے ایک پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ جس حد تک میرے سیل کی گنجائش اجازت دیتی تھی، میں مختلف اقسام کی ورزشیں کرتا تھا لیکن یہ ورزش میں اس وقت کرتا تھا جب

پہرے دار میرے سیل سے دور ہو۔ میرے ذہن میں فرار کا خیال پرورش پا رہا تھا۔

مرہم اور ایم پنسلین کے انجکشنوں کے مسلسل استعمال سے میرے پیر کے زخم بھر گئے تھے اور انفیکشن بھی ختم ہو گیا تھا۔ مگر کبھی کبھار ٹانگوں میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔ درد کا یہ دورہ کئی گھنٹے جاری رہتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ویت نامی میرے برین واش سے خاصے خوش تھے۔ انہیں اب تک شبہ نہیں ہوا تھا کہ میں نے انہیں غلط معلومات فراہم کی تھیں لیکن اب وہ مجھ پر دباؤ ڈالنے لگے تھے کہ میں ویت نامی عوام کے خلاف جنگی جرائم میں ملوث ہونے کا اعتراف کرلوں۔ اس دفعہ میرا تفتیشی افسر ایک دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا فوجی افسر تھا۔ اس کا نام کرسکو تھا۔ وہ ایک اذیت پسند شخص تھا اور اکثر مجھے مذہب کے حوالے سے چھیڑتا رہتا تھا۔ کیونکہ میں نے اپنے سیل میں ایک کراس لگا رکھا تھا۔ مگر زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ وہ میرے فوجی ہونے کے بارے میں مشکوک تھا۔

"تم سی آئی اے کے ایجنٹ ہو" ایک روز اس نے اعلان کیا۔

"یہ غلط ہے۔ میں امریکی فوج کے ایوی ایشن کے شعبے سے تعلق رکھتا ہوں" میں نے اس کی تردید کردی۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ میری بات سے متاثر ہوا یا نہیں، مگر مجھے فکر تھی کہ کہیں وہ اس بات پر یقین کر بیٹھے تو میری شامت آجائے گی۔ ایک عام فوجی کو وہ سوائے جنگی قیدی بنانے یا اس پر معمولی نوعیت کے تشدد کے اور کچھ نہیں کرسکتے تھے لیکن ایک جاسوس کے ساتھ ہر سلوک روا رکھا جاسکتا ہے۔ ویت نامی عوام کے خلاف جنگی جرائم میں ملوث ہونے کا الزام وہ پہلے ہی لگا چکے تھے۔ اب انہیں میرے جاسوس ہونے پر یقین آجاتا تو وہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی مجھے رہا نہیں کرتے۔

جنوری ۱۹۶۹ء میں پیرس میں امریکا اور جنوبی ویت نام کے وفد کے درمیان امن اور جنگ بندی کی بات چیت ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔ اگر صلح اور جنگ بندی ہو جاتی تو مجھے اس کا فائدہ ہوتا بھی یا نہیں، کرسکو کی دھمکی کے بعد فرار کا خیال میرے ذہن میں مزید جڑ پکڑتا چلا گیا۔ ویسے بھی میرے کوڈ آف کنڈکٹ کے مطابق اگر میں گرفتار ہو جاؤں تو دشمن کی قید سے فرار میرے فرائض میں شامل ہے اور موقع ملنے پر مجھے اس کی کوشش کرنا چاہیے مگر فی الوقت میری جسمانی حالت اتنی بہتر نہیں ہوئی تھی کہ میں فرار کا سوچ سکتا۔ سب سے بڑھ کر مجھے یہ نہیں معلوم [illegible] کہ میں جنوبی ویت نام کے کس حصے میں تھا اور فرار ہو کر [illegible] کہاں جانا چاہیے؟ فرار کا منصوبہ پوری احتیاط سے بنانا تھا تاکہ پکڑے جانے کا امکان نہ رہے۔ جون ۱۹۶۹ء میں عملے میں ایک نیا گارڈ شامل ہوا۔ جسے واجبی سی انگریزی آتی تھی۔ جلد وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا۔ اس روز اس نے مجھ سے کہا۔

"آج میں ہنوئی جاؤں گا فلم دیکھنے۔"

"اچھا خیال ہے" میں نے مسکرا کر کہا "تم کب تک آجاؤ گے؟"

"میں دوپہر کو جاؤں گا۔ اور رات تک واپس آجاؤں گا۔ خوش قسمتی سے میرے دوست نے مجھے سائیکل دے دی ہے۔"

"ہنوئی کس طرف ہے؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"اس طرف" اس نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کیا۔

اگر ایک شخص سائیکل پر جا کر چار پانچ گھنٹے میں واپس آجائے تو میرے اندازے کے مطابق یہ فاصلہ پانچ چھ میل بنتا تھا۔ اگر اس وقت میں سے فلم کا وقت نکال دیا جائے [illegible] آنے جانے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹا لگتا۔ اس لحاظ سے فاصلہ اتنا ہی بنتا۔ معلومات بیش قیمت تھیں۔ میں ان [illegible] فائدہ اٹھا کر جنوبی ویت نام کے دارالحکومت [illegible] جا [illegible] میرے لیے فرانسیسی کونسلیٹ میں پناہ حاصل کرنا آسان ہوتا۔ میری سیاہ وردی پر سفید رنگ کی پٹی تھی جو قیدی کی علامت تھی۔ اسے میں الٹ کر پہن لیتا تو یہ سفید [illegible] چھپ جاتی اور وردی عام لباس بن جاتی۔ ویت نامی فرانسیسی زیادہ جانتے ہیں.... بہ نسبت انگریزی کے کیونکہ ویت نام فرانس کے زیر نگیں رہا ہے اور وہاں کی سرکاری [illegible] فرانسیسی رہی تھی۔ مجھے تھوڑی بہت فرنچ آتی تھی۔

اب مسئلہ تھا میں فرار کیسے ہوں۔ [illegible] سے نکلنا تو بعد کی بات تھی، پہلے مجھے اپنے سیل سے نکلنا تھا۔ دروازہ سلاخوں والا تھا اور اسے توڑنا یا اس کا تالا کھولنا میرے [illegible] ممکن نہیں تھا۔ سیل میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ البتہ دروازے کے اوپر ایک روشن دان تھا۔ اس میں بھی سلاخیں نصب تھیں اور سامنے باریک تاروں سے بنی [illegible] تھی جو شاید کسی زمانے میں مچھروں کو روکنے کے کام آتی [illegible] لیکن اب اس کے تار ادھڑ گئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے اس میں سے کچھ تار نکال لیے۔ ان سے میں کام لے [illegible] لیکن کہاں؟ میری نظر دروازے کے نیچے نصب ایک [illegible] اونچے لکڑی کے پینل پر جم گئی۔ لکڑی کا یہ پینل دروازے [illegible]

[illegible] نیچے سیمنٹ کی مدد سے چوکھٹ میں لگایا گیا تھا۔ ذرا [illegible] کرنے پر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ سیمنٹ بہ مشکل ایک سینٹی [illegible] تھا۔ یعنی اگر میں یہ سیمنٹ کھرچ دیتا تو پینل چوکھٹ [illegible] آتا۔ ایک فٹ کا خلا میرے گزرنے کے لیے کافی [illegible] میں نے تجربے کے طور پر تار کے ہک سے سیمنٹ کھرچا۔ [illegible] حوصلہ افزا رہا۔ سال خوردہ سیمنٹ برادے کی طرح [illegible] لگا۔ ایک تار کی مدد سے میں نے ایک مربع انچ کی جگہ صاف کر دی۔ اگر میں مستقل مزاجی سے اور کسی کی پروا کیے [illegible] کام کرتا تو شاید مجھے ایک دن لگتا مگر میں نے فیصلہ کیا کہ [illegible] بے حد احتیاط سے کروں گا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔

ایک مربع انچ سیمنٹ نکالنے سے اچھی خاصی گرد جھڑی [illegible] فرش پر صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے یہ [illegible] صاف کرکے دروازے کے باہر کچے صحن میں پھینک [illegible] سب سے زیادہ خوف گارڈز کا تھا جو اچانک ہی دبے [illegible] جاتے تھے اور ان کی آمد کا اس وقت پتا چلتا تھا جب [illegible] کے سامنے نمودار ہوتے تھے۔ ان کے راؤنڈ [illegible] کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی دس منٹ بعد بھی [illegible] آجاتے تھے اور کبھی ایک ایک گھنٹہ نہیں آتے تھے۔ [illegible] بندوبست کی اشد ضرورت تھی کہ میں ان کی آمد [illegible] واقف رہوں۔

[illegible] اس مسئلے میں سر کھپا رہا تھا کہ میری نگاہ صحن کے [illegible] میں پھرتی مرغیوں پر پڑی۔ جو چونچوں سے زمین کرید کر [illegible] تلاش کر رہی تھیں۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کسی [illegible] مرغیاں میرے سیل کے دروازے پر جمع ہو جائیں تو [illegible] کی آمد سے بروقت باخبر ہو سکتا ہوں۔ مسئلہ مرغیوں کو [illegible] سامنے جمع کرنے کا تھا تو اس کا حل بھی موجود تھا۔ [illegible] اپنی خوراک میں روٹی اور چاول کا کچھ حصہ بچا لیتا [illegible] وقفے وقفے سے دروازے کے عین سامنے ڈالتا [illegible] مرغیوں کو جو خوراک ملی تو وہ ہمہ وقت میرے سیل [illegible] کے آس پاس منڈلانے لگیں اور صرف اس [illegible] جاتی تھیں۔ جب گارڈز راؤنڈ پر آتے۔ یہ تجربہ [illegible] رہا۔ اگلے دن سے میں سیمنٹ کو تار کی مدد سے [illegible] میں لگ گیا۔

[illegible] ہوتا یہ تھا کہ میں ایک تار کی مدد سے ایک ڈیڑھ [illegible] ایک مربع انچ سیمنٹ صاف کر دیتا۔ اس دوران میں [illegible] مرغیوں پر ہوتی تھی۔ جیسے ہی وہ ادھر ادھر ہوتیں، [illegible] بستر پر بیٹھ جاتا اور جب گارڈ واپس چلا جاتا اور [illegible] واپس آجاتیں تو میں اپنے کام میں لگ جاتا۔ ایک مربع انچ جگہ صاف کرکے پہلے میں اس کی گرد کو ٹھکانے لگاتا۔ پھر دوسری جگہ کی صفائی شروع کرتا۔ گرد میں باہر پھینکتا تھا لیکن جلد مجھے احساس ہو گیا کہ سرخ مٹی پر سیاہ سیمنٹ بہت واضح نظر آئے گا اور ان لوگوں کو شک ہو سکتا تھا لہٰذا میں اب گرد کو اپنی ٹوائلٹ باسکٹ میں ڈال دیتا تھا جسے صفائی کرنے والا لے جاتا تھا۔ اس میں مٹھی بھر گرد کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔

رفتہ رفتہ لکڑی کا پینل سامنے آنے لگا اور اب کچھ ہی جگہ تھی جو سیمنٹ میں پوشیدہ تھی۔ اسے میں اب کھینچ کر بھی نکال سکتا تھا لیکن یہ میرے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔

اب دوسرا مرحلہ کمپاؤنڈ کی چودہ فٹ اونچی دیوار کو عبور کرنے کا تھا اور اس کے لیے رسی لازمی تھی۔ مجھے باؤ کاؤ کیمپ میں ایک کینوس بیگ دیا گیا تھا۔ جس میں، میں اپنا سامان اور کپڑے رکھ سکتا تھا۔ میں نے احتیاط سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ اس بیگ کو پھاڑ کر میں بیس فٹ لمبی رسی تیار کر سکتا تھا۔ اس کے بعد بھی تھوڑا سا کینوس بچ جاتا۔ اس کی میں کیپ بنا سکتا تھا۔ اس قسم کی کیپ اکثر ویت نامی فوجی افسر پہنا کرتے تھے۔ رسی کی مدد سے دیوار عبور کرکے میں بہ آسانی خاردار تاروں کے نیچے سے نکل جاتا۔

○☆○

۷ دسمبر ۱۹۶۹ء کی رات میں فرار کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے کینوس بیگ سے رسی اور کیپ تیار کرلی تھی۔ رات دس بجے تک کیمپ میں خاموشی چھا جاتی تھی اور پھر گارڈ ایک ایک گھنٹے کے وقفے سے چکر لگاتے تھے۔ جیسے ہی گارڈ دس بجے سیل میں جھانک کر واپس گیا، میں پھرتی سے اٹھا۔ میں نے اپنے تکیے کو کمبل تلے یوں رکھا کہ سرسری سی نظر میں ایک آدمی سوتا ہوا نظر آئے۔ پھر میں نے پینل پر جمی باقی ماندہ سیمنٹ صاف کی اور پینل نکال لیا۔ باہر جھانک کر اطمینان کیا کہ کمپاؤنڈ میں کوئی نہیں تھا۔ میں دروازے کے نچلے خلا سے باہر نکلا۔ پینل کو دوبارہ اپنی جگہ لگایا۔ رسی کی مدد سے دیوار پھاندنا کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا اور خاردار تاروں کی باڑھ سے بھی بہ آسانی نکل گیا۔ ہاں کمپاؤنڈ کے گرد چکر لگاتے ہوئے ایک جگہ پہرے دار سے سامنا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جو دوسری طرف منہ کیے ہوئے سگریٹ پی رہا تھا۔

کیمپ سے نکلنے کے بعد میں جھاڑیوں میں گھس گیا۔ کیمپ کے چاروں طرف سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ جن کی روشنی میں دور تک واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی میں اس روشنی کی حد سے نکلا، میں نے تقریباً دوڑنا شروع کر دیا۔ رات

ویسے بھی خاصی سرد تھی۔ دوڑنے سے میرا جسم گرم ہوگیا۔
کیمپ میں اکثر مجھے ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز آتی تھی۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ریل ٹریک کیمپ کے پاس ہی سے گزرتا تھا۔ اگر میں ریل ٹریک کے ساتھ ساتھ چلتا تو ہنوئی تک جاسکتا تھا۔ مگر ایک میل دور جانے تک کوئی ریل ٹریک نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں غلط سمت نکل گیا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں واپس آیا اور کیمپ کی روشنیوں سے بچتے ہوئے مخالف سمت میں گیا۔ مگر اس بار بھی کوئی ریل ٹریک نہیں ملا۔ میں دوسری بار کیمپ واپس آیا اور تیسری سمت میں روانہ ہوا۔ اس بار مجھے ریل ٹریک مل گیا تھا۔ قطبی تارے سے میں نے سمت کا اندازہ لگایا اور ہنوئی کی طرف چل پڑا۔
جب کوئی ریل گاڑی نمودار ہوتی' میں ٹریک سے اتر کر جھاڑیوں یا کسی خندق میں روپوش ہوجاتا۔ اور گاڑیاں ہر تھوڑی دیر بعد آجا رہی تھیں۔ اس سے میرا بہت وقت ضائع ہورہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ رات کی تاریکی میں ہی فرنچ کو نسلیٹ تک پہنچ جاؤں۔ باربار چھپنے سے بہتر میں نے سمجھا کہ ریل ٹریک سے ذرا ہٹ کر سفر کروں۔ یوں کسی کی نظروں میں آنے سے بھی محفوظ رہوں گا۔ اب صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور اس کچے راستے پر کئی افراد میرے پاس سے گزرے اور کسی نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ اچانک ایک سائیکل سوار عقب سے میرے پاس آکر رکا۔ اس نے ویت نامی میں مجھ سے کچھ کہا۔ میں نے جواب میں اپنی ناقص فرنچ استعمال کی۔
"مجھے فرانسیسی کو نسلیٹ کا راستہ معلوم کرنا ہے کیا تم بتاسکتے ہو؟"
"ہنوئی" اس نے مسکرا کر کہا اور اشارے سے سائیکل کے کیریئر پر بیٹھنے کو کہا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اس کی پیش کش قبول کرلی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ فرنچ جانتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ فرانسیسی کو نسلیٹ کہاں ہے۔ مگر وہ مزید ایک لفظ کہے بغیر سائیکل کے پیڈل چلاتا رہا۔ جلد ہم ہنوئی کے مضافات میں داخل ہوگئے۔ صبح کی سرگرمیوں کا آغاز ہوگیا تھا۔ لوگ اپنے کاموں پر جارہے تھے۔ بچے بستے لٹکائے اسکول کی طرف رواں دواں تھے۔ اخبار بیچنے والے' کھانے پینے اور بیکری کی دکانیں کھل گئی تھیں۔ زندگی کی گہما گہمی جاری تھی۔ ہنوئی میں داخل ہوتے ہی متعدد سائیکل سوار رواں دواں نظر آئے۔ یہ یہاں کی سستی اور مقبول سواری تھی۔
میرے ہوش اس وقت ٹھکانے آئے جب سائیکل ایک مختصر سی عمارت کے سامنے رکی۔ جس پر ویت نامی زبان میں کچھ لکھا تھا اور مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ وقت پیش نہیں آئی کہ میں ایک پولیس اسٹیشن کے سامنے تھا۔ کیونکہ عمارت کے باہر دو مسلح پولیس مین موجود تھے۔ سائیکل سوار نے ان سے کچھ کہا۔ غالباً یہ کہ میں کوئی یورپی باشندہ ہوں اور مجھے فرانسیسی کو نسلیٹ کا راستہ نہیں معلوم۔ یا یہ کہ میں اسے مشکوک حالت میں ملا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والوں کے تاثرات بدل گئے۔ ایک نے نہایت جارحانہ انداز سے کھینچ کر مجھے سائیکل سے نیچے اتارا اور ویت نامی میں کچھ کہا۔
"مجھے فرانسیسی کو نسلیٹ جانا ہے" میں نے فرانسیسی میں کہا۔
اور وہ مجھے پولیس اسٹیشن کے اندر لے گئے۔ صرف ایک گھنٹے بعد کیمپ کمانڈر کرسکو دو محافظوں اور ڈرائیور کے ساتھ آیا اور مجھے وصول کرکے واپس کیمپ لے گیا اور بہ طور سزا مجھے چار فٹ لمبے چوڑے اور اونچے پنجرے میں بند کردیا۔ جس میں نہ میں کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ لیٹ سکتا تھا۔ صرف جانوروں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ سکتا تھا۔ یہ ایک اذیت ناک پوز تھا۔ مجھے سزا سے زیادہ تکلیف اپنے پکڑے جانے کی تھی۔ کیمپ سے نکل کر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں ایک دشمن ملک میں ہوں اور یہاں امریکی فوجی کو بچہ بچہ پہچانتا ہے۔ مگر میں مایوس نہیں تھا۔ ٹھیک ہے میں فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا۔ لیکن میں پھر فرار ہوسکتا تھا۔ آخر امید پر دنیا قائم ہے۔

○☆○

دسمبر ۱۹۶۹ء میں جب کو گرفتار ہوئے بیس مہینے گزر چکے تھے' میں نے اور مزید ایک سو سینتالیس خاندانوں کے ساتھ پیرس کا دورہ کیا۔ ان خاندانوں کے بھی ویت نام میں جنگی قیدی تھے پیرس میں امریکا اور جنوبی ویت نامی حکومت کے درمیان جنگ بندی پر بات چیت جاری تھی۔ ان مذاکرات میں جنگی قیدیوں کا معاملہ بھی زیرِ غور آیا۔ مگر ویت نامیوں نے اس پر بات کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر ہم نے پریس کے سامنے مظاہرہ کیا اور جب اخبارات اور میڈیا نے ہماری حمایت کی تو ویت نامی وفد بادلِ ناخواستہ ہم سے بات چیت پر رضامند ہوا۔ ہم نے ان سے منوالیا کہ وہ جنگی قیدیوں کی مکمل لسٹ دیں گے اور ہماری طرف سے سامان کی ایک کھیپ ان تک پہنچائیں گے۔ جو بات امریکی وفد نہیں منوا سکا تھا وہ ہم نے منوالی۔ یہ ہماری پہلی فتح تھی اور میں نے محسوس کیا کہ امریکی حکومت اس سے خوش نہیں

واپسی پر ہم نے جنگی قیدیوں کے خاندانوں کی لیگ اس پر امریکی حکومت نے ہمیں اپنی سرگرمیوں کو محدود کو کہا۔ مگر ہم نے انکار کردیا۔ مصائب ہمارے مرد رہے تھے' واشنگٹن میں بیٹھے اربابِ اختیار نہیں پھر ہماری کوششوں سے ہمارے مردوں کو بہتر سہولیات مل سکیں تو ہم خاموش کیوں ہوتے۔ ہم نے ایک مشیر کی حاصل کیں تاکہ آل امریکا اپنی سرگرمیوں کو منظم ہم میں سے جو تقریر کرنا جانتے تھے۔ وہ کلبس اور میں سامعین سے خطاب کرتے' ہم اخباروں اور کو خط لکھتے اور انٹرویوز دیتے۔
ہماری سرگرمیوں کا مقصد عوام کو بتانا تھا کہ ہمارے تشدد اور غیر انسانی سلوک کا جتنا ذمے دار ویت نام ہی ذمے دار امریکی حکومت ہے۔ وہ لوگ وہاں قید جھیل رہے تھے۔ تشدد کرنے کے ساتھ انہیں نہیں دی جاتی تھیں۔ علاج کی سہولت نہیں تھی۔ تھے اور ان میں سے بہت سے مر بھی رہے وطن ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے احتجاج کا رکھتے ہیں جنہوں نے وطن کے لیے قربانی دی اور رہے تھے۔ ہم نے اپنی لیگ کا ایک پرچم بھی بنایا فوجی جوان کو دکھایا گیا' وہ زخمی تھا اور ایک قید تھا۔ اس کے آگے خاردار تار تھے اور عقب میں اس کے سر پر ایک سنگین مسلط تھی۔

○☆○

۱۹۷۰ء تک کرسکو اور اس کے ساتھیوں کا غصہ ٹھنڈا پڑگیا تھا۔ میرے زخم بھر گئے تھے اور مجھے سے نجات مل گئی تھی۔ لیکن سیل دوسرا ملا تھا اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ البتہ کرسکو اور اس نے ایک بار پھر میرے خیالات کی تشکیلِ نو کی مہم تھی۔ اب تک میں نے صرف سنا ہی تھا کہ واش کس طرح کرتے ہیں لیکن اب میں خود کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے سرمایہ داری پر لیکچر ازم کے فوائد گنواتے۔ میرے پاس سوائے سننے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ میں اس مزاحمت کرتا تھا جب مجھے امریکا سے غداری پر

متفق ہو کہ میں ایک اچھا فوجی ہوں؟" میں کہا۔
تک" اس نے اتفاق کیا۔
"تو ایک فوجی کے لیے پہلی شرط وفاداری ہے۔ وہ اپنے ملک سے غداری نہیں کرسکتا۔ اب فرض کرو کہ ہماری پوزیشن بدل جاتی ہے۔ تم میرے ملک میں جنگی قیدی ہو اور میں تمہارا تفتیشی افسر ہوں۔ اب میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی حکومت کے خلاف بیان دو تو کیا تم میری بات مان لوگے؟"
"ہرگز نہیں۔" وہ فوراً بولا۔
"کیوں؟"
"کیونکہ میں اپنی حکومت سے متفق ہوں اور اس کا وفادار ہوں۔"
"تو یہی عذر میری طرف سے بھی قبول کرلو" میں بولا تو وہ لاجواب نظر آنے لگا۔
بہ طور سزا' سیل کی صفائی بھی اب میرے ذمے کردی گئی تھی۔ میں صبح سویرے جھاڑو سے سیل صاف کرکے گرد اور کچرہ دروازے کے نیچے موجود چار انچ کے خلا سے باہر دھکیل دیتا تھا۔ جہاں ایک ویت نامی گارڈ اسے باہر پھینک آتا تھا۔ اس گارڈ کا تعلق شمالی ویت نام سے تھا اور یہ بھی جنگی قیدی بن کر آیا تھا لیکن یہاں آکر اس نے اپنی پٹڑی تبدیل کرلی اور ان کا اتنا اعتماد حاصل کرلیا کہ اب وہ اسی کیمپ میں گارڈ تھا جہاں جنگی قیدی بن کر آیا تھا۔ اس روز میں نے حسبِ معمول صفائی کرکے کچرا باہر پھینکا ہی تھا کہ میں نے کچرے کو واپس سیل میں آتے دیکھا۔ میں نے پھر کچرا باہر کیا۔ آج غالباً گارڈ کا صفائی کا موڈ نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے کچرا ایک بار پھر سیل میں کردیا۔ کچھ دیر ہمارے درمیان یہ ہاکی جاری رہی۔ میں کچرا باہر کرتا' وہ اندر پھینک دیتا۔ ایک بار جب وہ اپنی باری پر کچرا اندر پھینک رہا تھا تو میں نے لیٹ کر خلا سے ہاتھ نکالا اور جھاڑو کا ڈنڈا پکڑلیا۔
"کھونگ" وہ ویت نامی میں چلّایا۔ جس کا مطلب تھا "نہیں۔"
اس نے جھاڑو کھینچنے کی کوشش کی لیکن میری گرفت بے حد مضبوط تھی۔ کچھ دیر کی زور آزمائی کے بعد وہ منت سماجت پر اتر آیا۔ اگر میں اس سے جھاڑو چھین لیتا یا وہ مجھ سے بات کرتے پکڑا جاتا تو اسے سزا ملتی اور عین ممکن تھا کہ اسے دوبارہ قید کردیا جاتا۔ یہ سوچ کر میں نے جھاڑو چھوڑدی۔ ابھی میں اٹھ ہی رہا تھا کہ اس کا ہاتھ اندر آیا۔ جیسے وہ مجھ سے مصافحہ کرنا چاہ رہا ہو۔ یہ شاید بہ طورِ تشکر تھا کہ میں نے رضاکارانہ طور پر جھاڑو چھوڑدی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اچانک مجھ پر انکشاف ہوا کہ گزشتہ دو

سالوں میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی انسان کے دوستانہ لمس کو محسوس کیا تھا۔ یک لخت مجھے اپنے اندر کوئی چیز پگھلتی محسوس ہوئی اور میری آنکھیں برسنے لگیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ بھی میری کیفیت سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ میرے آنسو اس کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچنے کے بجائے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اندر داخل کرکے مضبوطی سے میرے ہاتھ تھام لیے، یہ انسانیت اور دوستی کی بے حد سادہ لیکن پُراثر مثال تھی۔ میں جب تک زندہ ہوں، اس لمس اور اس کے حرارت آفریں جذبے کو فراموش نہیں کرسکوں گا۔ نہ جانے کتنی دیر ہمارا یہ مصافحہ جاری رہا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ کوئی اسے یوں دونوں ہاتھ ایک قیدی کے سیل میں ڈالے دیکھ لے تو کیا سوچے گا اور جب یہ خبر اوپر پہنچے گی تو اس غریب کے خلاف نہ جانے کیا کارروائی ہو کیونکہ میں ایک خطرناک قیدی ہی نہیں تھا بلکہ مجھ پر سی آئی اے کے جاسوس ہونے کا شبہ بھی تھا۔ یہ سوچتے ہی میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور دبی زبان میں اپنائیت کے اس رویے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ تنہائی کے اس وحشت ناک دور میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں اب اتنا بھی اکیلا نہیں تھا۔ بعد میں جب بھی موقع ملتا یہ گارڈ میرے پاس آجاتا۔ کچھ عرصے بعد وہ غائب ہوگیا، نہ جانے کہاں گیا؟

قیدِ تنہائی کا مفہوم صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو اس تجربے سے گزر چکے ہوں۔ اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ میں نے کئی سال سب سے کٹ کر ایک مختصر سی جگہ گزارے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ میرے قید خانے بدلتے رہتے تھے۔ ہر جگہ وہی ایک سی تنہائی تھی۔ صبح سے شام اور رات سے صبح تک وہی دیواریں تھیں۔ دن میں چند بار کچھ لوگ آتے جاتے تھے۔ لیکن وہ مجھ سے ایک لفظ نہیں کہتے تھے۔ میری کئی بار کی درخواستوں کے باوجود مجھے پڑھنے کے لیے ایک صفحہ تک نہیں دیا گیا حالانکہ مطالعہ میرے معمولات میں شامل تھا۔ اینے میری اس عادت سے چڑ جاتی تھی کہ سارا دن باہر رہ کر میں گھر آتے ہی کتاب سنبھال لیتا تھا۔ اس قید خانے میں نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی اخبار، دنیا پر کیا گزر رہی ہے۔ میں نے ریڈیو نہیں سنا۔ ٹی وی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ میں پاگل کیوں نہیں ہوا۔

وسط دسمبر ۱۹۷۱ء کو ایک دن میرے سیل میں گارڈ داخل ہوا۔ اس نے کہا "اپنے کپڑے اور سامان سمیٹو اور چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

سوال کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے خاموشی اس کے حکم کی تعمیل کی۔ جب میں تیار ہوکر باہر آیا تو کے احاطے میں ایک جیپ میرے لیے تیار تھی۔ اس بیٹھتے ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ گویا وہ چاہتے تھے کہ مجھے راستے میں اس جگہ کا علم ہو جہاں مجھے جایا جارہا تھا۔ دو گھنٹے بعد جب میری آنکھوں سے پٹی گئی تو میں نے خود کو ایک نئے قید خانے میں پایا۔ یہ اور یہاں مجھے جو سیل الاٹ ہوا، وہ خاصا وسیع و عریض یعنی دس بائی دس کا۔ اس میں پڑے لکڑی کے بیڈ پر موٹا گدا تھا۔ مجھے تین برس بعد کوئی آرام دہ بستر ملا تھا۔ میں ایک چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل اور ایک عدد اسٹول تھا۔ سیل کے ساتھ ہی ایک مکمل ٹوائلٹ تھا۔ اس میں بھی کیا جاسکتا تھا۔ پانی نلکے کے ذریعے ہمہ وقت میسر رہتا ٹوائلٹ کے طور سیمنٹ سے بنا ایک چبوترہ تھا۔ جس وسط میں سوراخ تھا۔ ربر کی ایک بالٹی اور مگا بھی تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ کیمپ فوج کے نہیں سویلین انتظامیہ کے ماتحت تھا۔ مجھے بعد میں معلوم کہ یہ سیاسی قیدیوں کا بندی خانہ تھا خفیہ طور ہوتا تھا۔ لہٰذا سرکاری طور پر اس قید خانے کا کوئی تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہاں کیوں البتہ یہ مجھے اگلے ہی دن معلوم ہوگیا کہ یہاں اور قیدی تھے۔ ان ہی میں ایک جینے ویور تھا۔ مجھے اس پیغام دیا گیا۔ جو ٹیپ ریکارڈر پر تھا۔

اس نے تفصیل سے اپنا تعارف کرانے کے انکشاف کیا تھا کہ اس کا تعلق سی آئی اے سے ہے اپنے کیے پر شرم سار ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ یہ پیغام مجھے سنوانے کا مقصد اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ میں بھی اسی قسم کا اعتراف کرلوں کیونکہ جینے ویور نے اپنے پیغام میں مجھے ہوئے کہا تھا "بنجامن! ایک سی آئی اے ایجنٹ ایک عام کی نسبت کہیں زیادہ مراعات حاصل کرسکتا ہے۔ تم ہو، بہتر ہوگا اعتراف کرکے اپنے لیے سہولت حاصل

اگرچہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جینے کو کون سی حاصل تھیں۔ اس کے باوجود میں نے جواب دیا "میں سی آئی اے کا ایجنٹ نہیں ہوں، صرف ایک عام افسر ہوں۔"

جینے نے اگلے پیغام میں کہا "مجھے یقین ہے لیکن

یں ہے۔"

اب میرے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ جنوبی والے اب تک میرے بارے میں مشکوک تھے کہ جاسوس ہوں۔ درحقیقت مجھ سے جو امتیازی سلوک اور مجھے جس طرح الگ تھلگ رکھا جارہا تھا، یہ اسی عکاسی کرتا تھا۔ ایک عام جنگی قیدی کو صرف قید رکھا تھا۔ لیکن ایک جاسوس کو خود ساختہ عدالت سے موت بھی دی جاسکتی تھی۔

۱۹۷۲ء میں مجھے قید ہوئے پورے چار سال تھے۔ اڑتالیس طویل اور اذیت ناک مہینے تھے۔ جو ایسی دیواروں کے درمیان گزارے تھے۔ جب سوائے اپنے اور بچوں کی یاد کے کوئی خوشی نہیں میں تین بار میں انسانوں کی صورت دیکھتا تھا جب والا گارڈ کے ہمراہ آتا۔ کھانا دیتا اور خاموشی سے خاص ہدایت تھی کہ مجھ سے بات نہ کرے۔

دو عدد سیل تھے۔ ہر سیل کے آگے کمپاؤنڈ تھا۔ دس کی دیوار پر تین فٹ کی خاردار تار کی باڑھ لگی خاص بات یہ تھی کہ جب کھانا آتا تو گارڈ میرے سیل کا منٹ کے لیے کھول کر چلا جاتا تھا اور جب میں برتن لے کر دروازہ دوبارہ باہر سے مقفل کردیتا منٹوں کا ہر لمحہ میں سیل سے باہر گزارتا تھا۔

گارڈز کے خیال میں دروازہ کھلا ہونے کے باوجود فرار ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اول ممکن نہیں تھا کہ میں تیرہ فٹ اونچی دیوار کیمپ کی چاردیواری تھی۔ بفرضِ محال میں فرار میں منٹ کے اندر گارڈز کو میرے فرار کا علم میں زیادہ دور جانے سے پہلے ہی پکڑا جاتا۔ مگر ان کی وجہ سے میرے ذہن میں فرار کا منصوبہ ایک بار لگا۔ میں نے سوچا اگر میں فرار ہوا تو میں جنوبی نکلوں گا۔ اگر میں کسی طرح ساحل تک پہنچ ماہی گیر کی کشتی لے کر فرار ہوسکتا تھا۔ ایک دفعہ سمندر میں نکل جاتا تو امریکی بحریہ یا فضائیہ مجھے لازماً نام ایک کم چوڑا اور لمبا ملک ہے۔ جس کا ساحل بہت طویل ہے۔ اگر میں فرار ہوجاتا تو زیادہ سے کے اندر مجھے سمندر مل جاتا لیکن مسئلہ سمت کا تھا۔ اگر میں بھٹک جاتا تو کہیں کا کہیں نکل جاتا، پاس ریزر بلیڈ تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ ریزر کے دوران میں مقنالیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ فولادی اسٹک سے چپکا رہے۔ میں نے اپنے ریزر بلیڈ کو درمیان سے توڑ کر دو ٹکڑے کرلیا۔ اب یہ ایک مقناطیس تھا۔

بچپن میں اکثر میں سوئی کو پانی پر تیرانے کا تجربہ کرتا تھا۔ سوئی کو ٹشو پیپر پر رکھ کر پانی میں ڈال دیتا۔ ٹشو گیلا ہوکر ڈوب جاتا اور سوئی پانی پر تیرتی رہ جاتی۔ سوال یہ تھا کہ کیا بلیڈ بھی پانی پر تیر سکتا ہے۔ میں نے بلیڈ ایک کاغذ پر رکھ کر بالٹی میں پانی پر رکھ دیا۔ کچھ دیر میں کاغذ بھیگ کر ڈوب گیا اور بلیڈ تیرنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی پوزیشن بدلنے لگی اور اس کے دونوں سرے قطبین کی طرف ہوگئے تھے۔ یعنی یہ کمپاس کا کام کررہا تھا۔ میں نے مشرق کی سمت یاد کی اور بلیڈ پانی سے نکال کر محفوظ کرلیا۔ یہ آئندہ میرے کام آتا۔

گارڈز ہر آدھے گھنٹے بعد سیل کا چکر لگاتے تھے اور اندر جھانک کر چلے جاتے تھے۔ میرے پاس فرار ہونے کا موقع وہی تھا جب سیل کا دروازہ بیس منٹ کے لیے کھول دیا جاتا تھا۔ صبح اور دوپہر کے وقت یہ کام ممکن نہیں تھا اور مجھے کم ازکم ایک گھنٹے کی ضرورت تھی۔ میں یہ وقت حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ گارڈز کو اتنی دیر اطمینان ہونا چاہیے کہ میں سیل میں موجود ہوں۔ میرے ذہن میں ڈمی بنانے کا خیال آیا۔ یعنی میں ڈمی بناکر بستر پر لٹادیتا۔ لیکن اس میں خطرہ تھا۔ گارڈ ذرا بھی غور کرتا تو اسے ڈمی کا فرق محسوس ہوجاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں ڈمی کو باتھ روم میں رکھتا۔ باتھ روم کا دروازہ نہیں تھا اور اگر کوئی سیل کے دروازے پر کھڑا ہوکر جھانکتا تو اسے ٹوائلٹ پر بیٹھے شخص کا اوپری دھڑ نظر آتا لیکن سر نظر نہیں آتا۔

مجھے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے جب گارڈ رات کے کھانے کے برتن لینے آیا تو میں باتھ روم میں تھا۔ اس نے صرف پانی گرنے کی آواز سنی اور باتھ روم میں جھانکے بغیر چلا گیا۔ یعنی اسے یقین تھا کہ میں باتھ روم میں ہی تھا۔ یہ انسانی نفسیات تھی کہ وہ کسی کے باتھ روم میں جھانکتے ہوئے جھجکتا ہے۔ میں نے گارڈز کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ جب بھی کھانے کے برتن لینے آتے، میں باتھ روم میں جاکر بیٹھ جاتا اور پانی کھول دیتا۔ ہر بار گارڈ بغیر باتھ روم میں جھانکے چلا جاتا تھا۔ میں ان کی اس غلطی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اب مسئلہ ایسی ڈمی کا تھا جو سیل کے دروازے سے اصل نظر آئے۔ اس کے لیے میں نے ربر کی بالٹی کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی شرٹ بالٹی کو پہنا کر میں نے اسے ٹوائلٹ پر رکھا تو سیل کے دروازے سے یہ بالکل کسی مرد کے جسم کا اوپری حصہ لگا تھا لیکن ٹانگوں کے بغیر اوپری دھڑ مصنوعی لگ رہا تھا۔ میں نے

ایک پتلون میں کمبل ڈالا اور پتلون کو بالٹی کے ساتھ رکھا تو ڈمی مکمل نظر آنے لگی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ڈمی کا سر نہیں تھا۔ میں نے اسے چارلی کا نام دیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پانی گرنے کی آواز بھی آنا چاہیے تو میں نے بالٹی کے پیندے میں چھوٹا سا سوراخ کیا اور پھر بالٹی کو بھرا تو پتلی دھار سے پانی بیس منٹ میں جاکر ختم ہوا تھا۔ گویا فرار کا منصوبہ مکمل تھا۔ فرار کے لیے میں نے رات کا وقت چُنا۔ جب تاریکی کا فائدہ اٹھاکر میں کیمپ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل سکتا تھا۔ دن میں میرے سفید فام ہونے کا راز فوراً فاش ہوجاتا۔

۱۸ مارچ ۱۹۷۲ء کی رات میں اپنے منصوبے پر عمل درآمد کے لیے بالکل تیار تھا۔ جیسے ہی کھانا آیا اور گارڈ سیل کا دروازہ کھول کر گیا، میں نے پھرتی سے سوپ کا پیالہ پیا اور چاول ایک تھیلی میں ڈال کر زادِ راہ کے طور پر رکھ لیے پھر باتھ روم میں جاکر ڈمی سیٹ کی اور بالٹی میں پانی بھر دیا جو ایک مسلسل آواز کے ساتھ ٹوائلٹ کے سوراخ میں گرنے لگا۔ اگر گارڈ ذرا بھی توجہ دیتا تو یہ آواز اسے شک میں مبتلا کرسکتی تھی لیکن مجھے اتنا خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ اب میرے پاس پچیس منٹ تھے۔ آگے جو تقدیر کو منظور۔ اگر قسمت میں ہوگا تو نکل جاؤں گا اور پھر کبھی ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا ورنہ......

منصوبے کا پہلا حصہ ویسے ہی تکمیل پذیر ہوا جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔ میں نے دروازے پر چڑھ کر سیل کے سامنے چھجے پر قدم رکھا پھر بلاک کے کونے تک پہنچا اور خاردار تار پھلانگ کر دیوار سے نیچے کود گیا۔ یہاں فولادی پنجرے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں شاید قیدیوں کو بہ طور سزا بند کردیا جاتا تھا۔ سیل بلاک کی عمارت سے دس گز کے فاصلے پر کیمپ کی آٹھ فٹ اونچی دیوار تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ نہ تو اس پر خاردار تاریں تھیں اور نہ یہاں روشنی تھی۔ البتہ مرکزی بلاک کے قریب قائم واچ ٹاور سے سرچ لائٹ پھینکی جاتی تھی۔ میں آرام سے دیوار پھاند کر باہر نکلا اور فوراً جھاڑیوں میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد میں ایک ندی کے کنارے تھا۔ رات کے وقت میرے لیے خود ساختہ قطب نما کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے ندی کے ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا۔ ندی سمندر میں جائے یا کسی دریا میں۔ بہرحال میں سمندر کنارے تک پہنچ ہی جاتا۔ آسمان تاریک تھا..... مینڈک اور جھینگر کے قبیل کے جانور ٹرا رہے تھے۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں روشنیاں لہراتی محسوس ہوئیں۔ ممکن تھا یہ کسی گاڑی کی روشنیاں ہوں لیکن غالب امکان یہی تھا کہ میرے فرار کا راز فاش ہوگیا تھا۔ لہٰذا میں

نے دوڑ لگائی۔ میں ایک فارم ہاؤس سے گزر رہا تھا ... والے کتے نے میری موجودگی محسوس کرلی اور ... بھونکنے لگا۔ میں کسان کے باہر آنے سے پہلے جھا... چھپ چکا تھا۔ کتا شاید زنجیر سے بندھا تھا ورنہ اب ... حملہ آور ہوچکا ہوتا۔ کسان اپنے کیبن سے نکلا ... ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں ... نے گھوم پھر کر دیکھنا شروع کردیا۔ ایک بار وہ جھا... طرف آیا اور مجھ سے اتنا نزدیک تھا کہ میں ہاتھ ... چھو سکتا تھا۔ ظاہر ہے میں نے ایسی حماقت نہیں کی ... حیران تھا کہ جب کوئی تھا ہی نہیں تو کتا کیوں بھونک ... اس نے کتے کو ڈانٹا اور اندر چلا گیا۔ میں نے ایک ... شروع کردیا۔

راستہ بھٹک کر میں ندی سے دور نکل گیا تھا۔ ... نما دیکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں نے سامنے ... والی پہاڑیوں کو نظر میں رکھا تھا۔ لہٰذا ایک ہی ... کرتا رہا۔ جب صبح نمودار ہورہی تھی تو میں پہا... پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے ساتھ لائے چاول ... اور ایک جھاڑی میں چھپ کر سو گیا۔ میں دن میں ... خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ یہ پہاڑ ویت کانگ ... بھرے ہوئے تھے۔ جب میری آنکھ کھلی تو شام ہو... ہر طرف پرندے چہک رہے تھے اور پتوں سے ... آسمان بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں نے ایک ... سے گڑھے میں جمع پانی پر بلیڈ تیز کیا ... مشرق کی طرف چل پڑا۔ میں جس راستے ... کثرتِ استعمال سے کچی سڑک کی صورت اختیار ... جب میں کسی کو آتے دیکھتا تو جھاڑیوں میں ... لیکن ایک شخص سیدھا اسی جھاڑی میں گھس آیا ... چھپا تھا۔ وہ اپنی پتلون کے بٹن کھول رہا تھا اور اس ... واضح تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ لہٰذا مجھے ... سر پر لکڑی سے ضرب لگا کر اسے بے ہوش کرنے ... دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ لکڑی میں نے ایک ... توڑی تھی۔

رات شاید بارہ بجے تھے جب مجھے اپنے ... روشنی لہراتی نظر آئی۔ یہ روشنی اوپر نیچے اور ... ہورہی تھی۔ قریب آنے پر میں نے جیپ کے ... پہچان لی۔ یہ شاید کوئی شکاری پارٹی تھی جو میری ... نکلی تھی۔ میں نے راستہ بدل دیا اور درختوں ... سے ہوتا آگے نکل گیا۔ اس راستے پر جیپ میرے ... آسکتی تھی۔ لیکن چند منٹ بعد میری خوش فہمی ... میں درختوں سے نکلا ہی تھا کہ عین سامنے میں ...

... تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی روشنی مجھ پر نہیں ... میں اسی وقت پکڑا جاتا۔ میں پلٹ کر دوبارہ ... گھس گیا اور اندر ہی اندر آگے بڑھنے لگا۔ ان ... سے ظاہر تھا کہ میری تلاش پوری شدت ... تھی اور ایسی نہ جانے کتنی شکاری پارٹیاں ان ... اردگرد کے علاقوں میں میری بو سونگھتی پھر رہی ... سفر کے بعد جب مجھے مزید کوئی متلاشی پارٹی ... میں ذرا مطمئن ہوگیا۔ میرے تنے ہوئے اعصابی ... اور یہیں میں مارا گیا۔ میں غیر محتاط ہوگیا تھا ... بھالے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جھاڑی کے پیچھے ... تھا کہ اپنے سامنے نصف درجن فوجیوں کو دیکھ کر ... گیا تھا۔ انہوں نے نہ تو روشنی جلائی تھی اور نہ ہی ... تھے۔ وہ غالباً گشت کے بعد سستا رہے تھے، مجھے ... دم بخود رہ گئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں ... نصف درجن خودکار رائفلیں میری طرف اٹھ ... ان کے بولٹ چڑھنے کی آواز سن کر میرا رہا سہا ... جواب دے گیا۔ اب ایک غلط حرکت کا مطلب تھا ... درجنوں سوراخ ہوجائیں۔

... انہوں نے مجھے پکڑ کر میرے ہاتھ پشت ... تھے۔ میں نے ایک بار پھر سفر شروع کیا مگر اس بار ... واپس K49 کی طرف تھا۔ جب میں کیمپ میں ... میرا تھکن سے برا حال تھا۔ مایوسی کے عالم میں ... کو قائم رکھنے کے لیے میں نے امریکا کا قومی ترانا گانا ... اور سپاہیوں کے رائفل کے بٹ مارنے کے ... خاموش نہیں ہوا تو انہوں نے مجھے میرے حال پر ... تھا۔ مجھے سیدھا کیمپ کے مرکزی میدان میں کیمپ ... کے سامنے لے جایا گیا۔ جہاں پچاس کے قریب فوجی ... میرے فرار کے بعد پورا فوجی دستہ طلب کرلیا گیا ...

... حرام زادے! تم نے فرار کو کیا اتنا ہی آسان سمجھا ... انچارج نے مجھے مکا مار کر کہا۔

... گزشتہ تیس گھنٹے سے مسلسل سفر میں تھا۔ خوراک، ... کی کمی سے میرا برا حال تھا۔ لہٰذا جب انچارج نے ... ایک کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا تو میں فوراً ... ہوگیا تھا۔ ہوش میں آنے پر مجھے میرے سیل تک ... بطور سزا مجھے میز، اسٹول اور بستر کے گدے ... کردیا گیا تھا۔ اس بار مجھے اپنی ناکامی کا بے حد دکھ ... حوصلہ پست ہو رہا تھا۔ میں نے کتنی محنت اور دماغ ... بعد ایک منصوبہ بنایا اور کامیابی سے اس پر عمل ... فرار ہوگیا تھا اور جب میں بہت دور نکل گیا تو شامت

اعمال نے مجھے گرفتار کرادیا تھا۔ اگلے روز مجھے جینے ویور کا پیغام ملا۔

”شاندار بین! تمہارے فرار نے ان کے سیکورٹی سسٹم کی کمزوریاں عیاں کردی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہمیں جنگ کے بعد بارگیننگ کے لیے قید رکھیں گے۔ بہرحال مایوس مت ہو۔ تمہارے فرار سے اس خفیہ قیدخانے کا راز فاش ہوگیا ہے۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔“

۱۹۶۸ء میں گرفتاری کے بعد میرے لیے سب سے اندوہناک بات اپنی شادی کی انگوٹھی سے محرومی تھی۔ یہ اپنے کے پیار کی واحد نشانی تھی۔ جو ایک لالچی شخص کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اس کی تلافی کے طور پر میں نے ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کے ایک حصے کو کاٹ کر اسے اپنی شادی کی انگوٹھی تصور کرلیا تھا۔ المونیم کی یہ ٹیوب ہمیں ہر ایک مہینے بعد ملتی تھی۔

پہلی بار فرار کے وقت میں یہ انگوٹھی پہنے ہوئے تھا۔ پکڑے جانے کے بعد تلاشی کے دوران میں مجھ سے یہ انگوٹھی بھی چھینی گئی۔ اس کے بعد میں نے المونیم ٹیوب سے دوسری انگوٹھی بنائی تھی اور اسے سب سے چھپاکر رکھتا تھا۔ یہ انگوٹھی ایک طرح سے نشانی تھی، اپنے کی اور ہمارے پانچ بچوں کی۔ جو ہمیشہ میری یادوں میں رہے۔ مگر میں نے گزشتہ چار سال سے ان کی ایک جھلک نہیں دیکھی تھی۔ ڈیوڈ اب انیس سال کا نوجوان ہوگا۔ ممکن ہے کسی یونیورسٹی میں پڑھ

عصرِ حاضر کی الف لیلہ۔ اُردو زبان کی طویل ترین کہانی

ایک ایسے انسان کی داستان جو سوچ کی لہروں سے دوسروں کے دماغ ٹٹولتا اور لوگوں کو اپنی سوچ کے اشاروں پر چلاتا ہے

ٹیلی پیتھی کے ماہر فرہاد علی تیمور کی داستانِ حیات

سسپنس ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ جو پچھلے کئی برسوں سے چھپ رہا ہے اور آج بھی مقبولیت میں پہلے نمبر پر ہے۔

دیوتا اپنی طوالت کی بنا پر دنیا کی طویل ترین کہانیوں کے ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ ڈائجسٹ میں اب تک اس کے ۱۲۰۰۰ صفحات شائع ہوچکے ہیں۔ جو عام کتاب کے ۴۸۰ صفحات ہوتے ہیں۔

کتابیات پبلی کیشنز

رہا ہو۔ اب تو میری سب سے چھوٹی بیٹی بھی خاصی بڑی ہو گئی ہوگی۔

مجھے اپنے اور تمام بچوں کی تاریخ پیدائش ازبر تھیں۔ لہٰذا جب ان کی سالگرہ کا دن آتا تو میں تصور میں ان کے لیے تحفے منتخب کرتا تھا۔ اس کے لیے میں نے یہ طریقہ نکالا کہ الفابیٹ کی ترتیب سے تحفے دیتا تھا۔ لہٰذا گزشتہ سالوں کے دوران میں ایکس سے ایکسرے مشین اور زیڈ سے زیبرا تک تحفے میں دے چکا تھا۔ دوسری ناکام کوشش کے بعد میں نے فرار کا خیال دل سے نکال دیا تھا اور اب خود کو مصروف رکھنے کے لیے ناکارہ اشیا سے دست کاریاں بناتا تھا۔ میرا قابلِ فخر شاہ کار ایک چرچ کمیونین سیٹ تھا۔ جو میں نے ایک پلیٹ، چاک اور ٹوتھ پک کی ٹیوبوں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ جب میں یہ کمیونین سیٹ بنا رہا تھا تو مجھے وہ تمام کمیونین سیٹ یاد آرہے تھے۔ جو میں نے اور اینے نے مل کر بنائے تھے۔ اینے جو جسمانی طور پر مجھ سے دُور تھی لیکن میں اس کی روح کو اپنے پاس محسوس کرتا تھا۔

دوسری بار فرار کے دوران میں مجھے موقع ملا تھا کہ میں دوسرے سیلوں میں قید امریکی فوجیوں کو ایک نظر دیکھ لوں۔ یہ چار سال میں پہلا موقع تھا جب مجھے کوئی ہم وطن نظر آیا تھا۔ کوئی امریکی آواز صرف اس وقت سنائی دیتی جب کوئی قیدی اپنے سیل میں چلّانے لگتا تھا۔ یا جب ریڈیو پر پروپیگنڈے کے لیے امریکی جنگی قیدیوں کے تاثرات نشر کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے یہ تاثرات جنوبی ویت نام کے حق میں ہوتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیسے ریکارڈ کیے جاتے تھے۔ تشدد کے ذریعے یا پھر بہتر سہولیات کا لالچ دے کر۔

امن کے بارے میں خبریں مستقل آرہی تھیں۔ میں ان پر یقین نہیں کرتا تھا کیونکہ خبریں ویت نامی ذرائع سے ملتی تھیں۔ لیکن ۱۹۷۲ء کے خزاں میں مجھے ایسے آثار نظر آنے لگے کہ اب جنگ خاتمے کے قریب ہے۔ گارڈز کا رویہ بہتر ہو رہا تھا اور ساتھ ہی خوراک کا معیار اور مقدار بھی بڑھی تھی۔ خوراک کے ساتھ مجھے وٹامن بی ون دیا جانے لگا تھا تاکہ میری ٹانگوں کی سوجن ختم ہو۔ نومبر میں مجھے فوجی ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ وہاں میرے علاوہ پانچ اور امریکی فوجی افسران موجود تھے۔ مجھے خوش خبری ملی کہ میں ہفتے میں ایک بار اپنے ساتھیوں سے مل سکتا تھا اور ان کے ساتھ لنچ کر سکتا تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء کے دن ایک گارڈ میرے سیل میں آیا۔ اس نے مجھے کاغذ قلم دے کر کہا کہ میں چاہوں تو اپنی بیوی کے نام خط لکھ سکتا ہوں۔ اس موقع کا میں پانچ سال سے منتظر تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کاغذ بہت چھوٹا تھا اور میرے جذبات بہت زیادہ۔ میں نے خوب باریک کر کے لکھا اور صفحے کو دونوں جانب سے پوری طرح بھر دیا۔ رات کو گارڈ آکر مجھ سے خط لے گیا۔ اگلی صبح جب گارڈ دوبارہ آیا کہ مجھے ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا ہے تو میں سمجھا کہ خط میں کوئی قابلِ سنسر بات ہوگی مگر ہیڈ کوارٹر میں کرسکو موجود تھا اور بے حد خوش گوار موڈ میں تھا۔ اس نے کہا۔

"تم لوگوں کے لیے خوش خبری ہے۔ ہماری حکومت معاہدۂ امن پر راضی ہو گئی ہے اور اس معاہدے کی رو سے سب سے پہلے دونوں طرف کے جنگی قیدیوں کا تبادلہ ہوگا۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ خوشی سے میری حرکتِ قلب کیوں نہ رُک گئی۔ ہم نے کیمپ میں دوپہر کا آخری کھانا کھایا اور پھر ہم چھ افراد کو ایک ٹرک میں سوار کر کے ہوئی لو کے بندی خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اب میں اکیلا نہیں تھا۔

جنوبی ویت نام کے پاس ہزاروں کی تعداد میں امریکی جنگی قیدی تھے، جو روانہ ہو جاتے تھے۔۔ رہ جانے والے انھیں مبارک باد دیتے۔ پورا ہفتہ ہم ایک سنسنی خیز انتظار میں گزارتے تھے کہ اب اگلے گروپ میں کون کون شامل ہوگا۔ بالآخر مارچ کی ۲۷ تاریخ کو جو گروپ روانہ ہوا اس میں میرا نام بھی تھا۔ اسی شام ایک فوجی طیارہ ہم [illegible] افراد کے گروپ کو لے کر فلپائن کے امریکی فوجی اڈے کلارک ائربیس پر پہنچا۔ وہاں ہمارا طبی معائنہ ہوا اور ضرورت کے مطابق طبی امداد دی گئی۔ میں نے پورے پانچ سال بعد ڈھنگ سے انسانوں کی طرح انسانوں والی خوراک کھائی تھی۔ اگلے روز ایک سی ون تھرٹی طیارہ ہمیں لے کر امریکا کے لیے پرواز کر گیا۔

۳۰ مارچ ۱۹۷۳ء کی سہ پہر میں جارجیا کے شہر اگوسٹا کے ہوائی اڈے پر اترا تو میرے استقبال کے لیے اینے اور بچوں کے ساتھ میری ماں اور دیگر رشتے دار اور دوست احباب بھی تھے۔ میرے طیارے سے اترتے ہی سب میری طرف دوڑے تھے اور پھر مجھے ہوش نہیں تھا کہ میں رو رہا تھا یا ہنس رہا تھا۔ شاید دونوں ہی کام کر رہا تھا۔

آج میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ہمت دی۔ مجھے زندہ رکھا اور مجھے بچھڑے ہوئے پیاروں سے ملوایا۔ اینے نے میری غیر موجودگی میں فریج کے دروازے پر ایک کارڈ لگا رکھا تھا جس پر تحریر تھا۔

"معجزہ خدا کے وجود کی دلیل ہے۔"

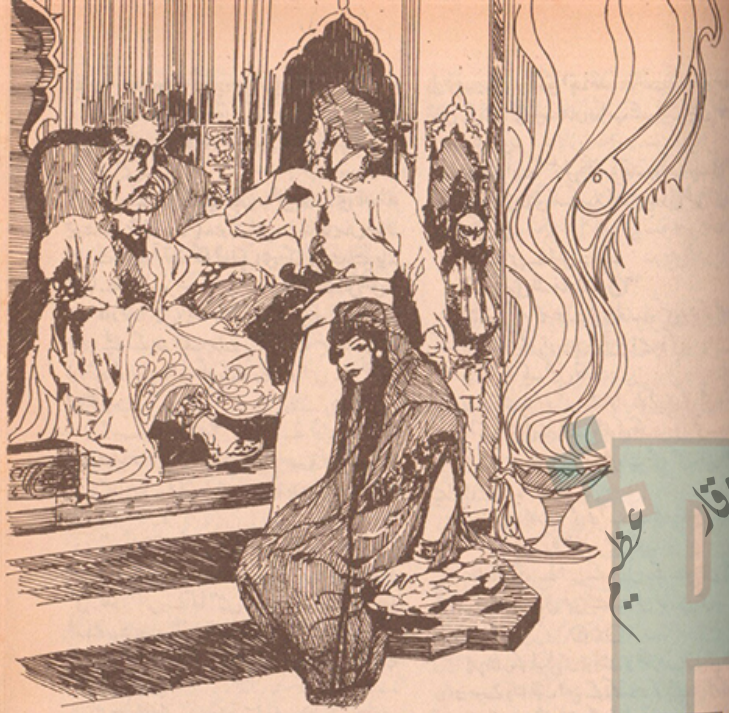

مشکوک کردار

احمد صغیر صدیقی

تاریخ ایسے ناموں سے بھری پڑی ہے جن کے کرداروں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ دہلی میں قتلِ عام کرانے والے نادر شاہ نے ایک کنیز کو اپنی ملکہ بنایا تھا، یہ عجیب کردار تاریخ میں آج تک مشکوک حیثیت رکھتا ہے۔

اس بیوی کا قصہ جس کی وفا آج تک مشکوک ہے

یہ اُس وقت کی دِلّی ہے جب نادر شاہ دُرّانی کی یلغار نے اہلِ سلطنت کو ہلا کر رکھا ہوا تھا۔

محمد شاہ فرماں روائے ہند کا برا حال ہو چکا تھا۔ اسے تاریخ میں محمد شاہ رنگیلا کہا گیا ہے۔ وہ ایک احمق اور عیاش بادشاہ تھا۔

اس روز نادر شاہ خاصا خوش تھا۔ اس کا لشکر دہلی سے ذرا فاصلے پر خیمہ زن تھا اور وہ فرماں روائے ہند کی جانب سے ان تحائف کا منتظر تھا جس کا وعدہ اس شکست خوردہ حکمران نے کر رکھا تھا۔

ذرا ہی دیر کے بعد اس کے خیمے کا پردہ ہٹا اور اس کے خادمِ خاص نے بتایا کہ تحائف آگئے ہیں۔

"تفصیل؟" نادر شاہ نے دریافت کیا۔

"ایک ہاتھی، ایک درجن گھوڑے، پچاس غلام اور درجن بھر حسین و جمیل ہندی دوشیزائیں۔"

یہ تحفے کافی دیر میں پہنچے تھے اور نادر شاہ اس تاخیر پر اندر ہی اندر برہم تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ نادر شاہ

نے ان کا معائنہ دوسری صبح پر ملتوی کردیا لیکن عورتیں۔

نادر شاہ نے ہندی عورتوں کے حسن کی بہت تعریفیں سنی تھیں۔ وہ خیمے سے نکلا اور اس طرف چلا جہاں یہ عورتیں رکھی گئی تھیں۔

جس خیمے میں وہ پہنچا' وہاں داخل ہوتے ہی نادر شاہ حیرت سے ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا یہاں معاملہ اس سے بھی سوا تھا۔ لگتا تھا ایک ہی جگہ پر بہت سے چاند نکل آئے ہوں۔ ہر حسینہ دوسرے سے بڑھ کر لگ رہی تھی۔

نادر شاہ انہیں دیکھتا اور تولتا رہا پھر اس کی نگاہیں سب کا جائزہ لینے کے بعد ایک چہرے پر آکر رک گئیں۔ لڑکی نے نادر شاہ کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو اس نے نظریں جھکالیں۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟" نادر شاہ نے خواجہ سرا سے دریافت کیا جو اس کے عقب میں تلوار سونتے کھڑا تھا۔

"عالی جاہ' یہ ایک راج پوت دوشیزہ ہے" خواجہ سرا نے بتایا۔

"دوشیزہ؟" اچانک اس لڑکی کے گلاب جیسے لب کھلے اور اس کی طنزیہ آواز بلند ہوئی جس میں زبردست بے باکی تھی "غلط!" اس نے کہا "میں دوشیزہ نہیں بلکہ ایک شادی شدہ عورت ہوں۔"

نادر شاہ کو لڑکی کی دلیری اچھی لگی۔ اس نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ستارہ!" لڑکی نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

○☆○

لڑکی' جس کا نام ستارہ تھا' ابھی اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں اسے خواجہ سرا چھوڑ کر گیا تھا۔

یہ خیمہ نادر شاہ کا تھا۔

"ادھر آؤ۔ میرے قریب" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی جھجکی' اس کے چہرے پر وحشت اور اُداسی نے عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے اس ایرانی حملہ آور کی سفاکی کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ مگر اب رہا ہی کیا تھا' وہ تن بہ تقدیر ہو کر آگے بڑھی۔

"مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ" نادر شاہ نے کہا۔

لڑکی نے اسے بتایا کہ وہ نسلاً راجپوت ہے۔ وہ چھوٹی ہی تھی کہ اسے گرفتار کرلیا گیا تھا۔ پھر اس کی شادی ایک مغل سپاہی سے کردی گئی جس کے گھر سے وہ موقع پاتے ہی بھاگ نکلی تھی۔ اسے ایک تاجر گھرانے نے پناہ دی۔ یہ گھرانا اسے دلی لایا۔ یہاں بادشاہ کی ایک ملکہ نے اسے پسند کرلیا اور وہ شاہی محل میں پہنچ گئی۔ جہاں وہ اب تک ایک کنیز کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔

نادر شاہ اسے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ اب ایک پکی عمر کا آدمی تھا' فولادی ذہن کا۔ مگر یہ لڑکی کسی جادو کی طرح اس کے سرچڑھ گئی تھی۔

اچانک اس نے نرمی سے کہا۔

"کیا تم میری ملکہ بننا پسند کرو گی؟"

ستارہ کا جسم آہستہ سے لرزا تھا۔ وہ کسی بوجھ کو محسوس کرتے ہوئے ڈگمگائی اور وہیں فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

یہ تقدیر کا ایک کھیل تھا۔

وہ جو لونڈی بنا کر دشمن کے حوالے کردی گئی تھی۔ ایک دم سے ایک انتہائی باجبروت بادشاہ کی ملکہ بن گئی تھی۔

مگر۔۔۔ اس جگہ ایک اور عورت بھی تھی۔ اس کا نام شیرازی تھا۔

شیرازی وہ عورت تھی جو اَب تک نادر شاہ کی سب سے زیادہ منظورِ نظر ہونے کا شرف رکھتی تھی۔

ستارہ کی آمد نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ کسی ناگن کی طرح غصے سے بل کھا رہی تھی۔

○☆○

پھر ستارہ کو خبر ملی کہ نادر شاہ کا لشکر اب دلی کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ اس کے کچھ حصے کو پیچھے ہی [illegible] تھا اور اس میں نادر شاہ کا حرم بھی شامل تھا۔

پھر نادر شاہ نے آکر اسے بتایا کہ وہ کچھ دنوں تک [illegible] اس سے دور رہے گا۔ اس نے کہا "تم پریشان نہ ہونا۔ [illegible] ایک ہیرا تمہیں دے رہا ہوں' یہ ایک خاص نشان ہے۔ [illegible] تمہیں کبھی میری سخت ضرورت محسوس ہو تو اسے کسی قاصد کے ذریعے میرے پاس بھیج دینا۔ میں فوراً تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔"

پھر اس نے وہ ہیرا نکال کر ستارہ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

○☆○

اس ہیرے کی ضرورت ستارہ کو جلد ہی پیش آگئی۔ اسے خبر ملی تھی کہ نادر شاہ نے دہلی کے شہریوں کے قتل عام کا حکم دے دیا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ نادر شاہ کا غصہ کیا [illegible] رکھتا ہے۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

ستارہ کو دہلی سے پیار تھا۔ اس جگہ اس نے [illegible] گزارے تھے اور بہت سی محبوب شخصیتیں اس کی [illegible]

[illegible] تھیں۔ وہ اس قتلِ عام کو رُکوانا چاہتی تھی۔ جس کی ابھی ابتدا ہوئی تھی۔ اس نے آغاباشی کو طلب کیا اور ہیرا نادر شاہ کے پاس بھجوانے کے لیے قاصد دوڑایا۔

یہ ستارہ ہی تھی جس کی التجا پر نادر شاہ کی تلوار نیام میں گئی تھی۔ پھر بھی اس عرصے میں دلی کے گلی کوچوں میں خون ہی خون پھیل چکا تھا۔ یہ اتنا بڑا قتلِ عام تھا کہ تاریخ میں اس کی نظیریں کم ملتی ہیں۔

○☆○

نادر شاہ نے دلی کی سلطنت کو اچھی طرح پامال کرنے کے بعد بے شمار مالِ غنیمت کے ساتھ اپنے ملک واپسی کا سفر شروع کیا تو ستارہ اس کے ساتھ تھی۔

نادر شاہ ہرات پہنچا تو معلوم ہوا نادر شاہ کا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ رضا خان استقبال کے لیے آرہا ہے۔

نادر شاہ کو بیٹے سے جُدا ہوئے دو سال سے زائد ہو چکے تھے۔ یہ بات تھی کہ وہ بیٹے کو دیکھنے کا متمنی تھا پھر اسے یہ [illegible] ہو چکا تھا کہ اس عرصے میں شہزادے نے اپنی [illegible] سے ملک کا انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔

اس جگہ یہ بتانا ضروری ہے کہ شہزادے کی تعریفیں سن کر نادر شاہ کو کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں بیٹا غرور میں [illegible] کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ کچھ لوگوں کی سازش اس کے [illegible] تھی۔ اور انہوں نے شہزادے کے اندر بھی یہ خیال [illegible] تھا کہ نادر شاہ آتے ہی اسے پھر ایک ادنیٰ عہدے دار [illegible] دے گا۔

پھر ایک روز خلوت میں نادر شاہ نے جب اپنے شبہات کا اظہار ستارہ سے کیا تو اس نے شہزادے کی طرف داری میں [illegible] شروع کردیا' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سمجھا یہ [illegible] شہزادے سے مل گئی ہے۔

دوسری طرف شیرازی نے شہزادے سے پینگیں [illegible] اور اس کی بہت سی باتیں معلوم کرکے نادر شاہ کے [illegible] دلائل دیں۔

[illegible] سے انہی دنوں نادر شاہ پر ایک قاتلانہ حملہ [illegible] الزام رہا۔ شیرازی نے نادر شاہ کو پٹی پڑھائی کہ یہ [illegible] کی ہے جو اب خود بادشاہ بننا چاہتا ہے۔

[illegible] ستارہ نے اس خیال سے کہ باپ بیٹے کی دشمنی [illegible] نادر شاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ بلا تحقیق [illegible] الزام نہ قرار دے۔ بات شاید خراب نہ [illegible] شیرازی نے نادر شاہ کے دل میں ایک خیال اور نہ [illegible] ستارہ شہزادے کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔

ستارہ کی اس سفارش نے نادر شاہ کے اندر ایک اور زہر پھیلا دیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"میں رضا خان کو اندھا کرانے جارہا ہوں تاکہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔"

ستارہ یہ سن کر دہل گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"شاہ' رحم کریں۔ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ اسے اندھا کرا کے کبھی خوش نہیں رہ سکیں گے۔"

نادر شاہ نے غصے سے ستارہ کو دیکھا اور اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گری۔

○☆○

آغاباشی نے نادر شاہ کے حکم پر اسے محل سے دوسری جگہ منتقل کردیا۔

نادر شاہ بے حد چڑچڑا ہو چکا تھا اور ملکی مسائل میں اس طرح دھنس گیا تھا کہ اس نے ستارہ کے بارے میں پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ تب وہ ایک روز خود ہی نکل کھڑی ہوئی۔ وہ نادر شاہ سے ملنے چلی تو آغاباشی سخت پریشان تھا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ نادر شاہ اسے مروا بھی سکتا ہے مگر وہ نہ مانی۔

اسی رات۔۔۔!

نادر شاہ کے خیمے میں دشمن کا آدمی گھسا اور اس کے خنجر نے ہمیشہ کے لیے اس شخص کو دنیا سے رخصت کردیا جس نے شک و شبہے اور حکومت و اقتدار کی لپیٹ میں آکر نہ صرف اپنے چہیتے بیٹے کو اندھا کرادیا تھا بلکہ ایک باوفا بیوی پر الزام لگا کر اسے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا تھا۔

ستارہ نے نادر شاہ کی لاش کو دیکھا۔ پھر اس نے نہایت سکون سے اپنی چٹی سے خنجر نکالا اور وہیں اپنے سینے میں گھونپ لیا۔

○☆○

تاریخ آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی ہے کہ ستارہ کیا واقعی نادر شاہ کی ایک باوفا بیوی تھی یا یہ حقیقت ہے کہ وہ ولی عہد رضا خان کے سامنے دل ہار گئی تھی۔ اور اس کے اندھا ہوجانے کے بعد دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسی نیت سے نکلی تھی کہ وہ نادر شاہ کو ختم کرکے خود اپنا خاتمہ کرلے گی۔ مگر یہ تمام باتیں غیر تصدیق شدہ ہیں۔ محقق تذکرہ نویسوں نے ستارہ اور رضا خان کے رومان کا ذکر ضرور کیا ہے۔۔۔ اور لکھا ہے کہ نادر شاہ کی اس محبوبہ ہی کی وجہ سے رضا خان نے اپنی آنکھیں گنوائی تھیں اور بوڑھے نادر شاہ کی موت میں ستارہ کا بڑا ہاتھ تھا۔

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دُھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرمِ عمل ہوں اور اپنے روزِ اوّل کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُسی کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں اُنھیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دیدہ شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آیئے ہم بھی ان کے وسیلے سے اُس زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

قسط: 72

فلمی الف لیلہ

ادب و صحافت سے فلمی دُنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

علی سُفیان آفاقی کی یادداشتیں

فلم "سکندر" اپنے زمانے میں اتنی مشہور ہوئی تھی کہ جن لوگوں نے محض محاوروں اور کہاوتوں میں ہی سکندر کا نام سنا تھا انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ سکندر دراصل ایک بادشاہ تھا اور اس کا تعلق یونان سے تھا۔ ہم نے بہت سے ان پڑھ بزرگوں کو اس بات پر اظہارِ افسوس کرتے سنا کہ "سکندر تو غیر مسلم نکلا۔" وہ اس کو مسلمان سمجھتے تھے۔

ہمارے خاندان کے ایک پرانے ملازم مجید میاں تھے۔ انہوں نے فلم تو نہیں دیکھی مگر اس کی کہانی مع مکالمے اور گانے ہماری زبانی سن لی تھی۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ چند لمحے خاموش بیٹھے رہے پھر "توبہ توبہ۔ لاحول ولا قوۃ" پڑھتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ ہم حیران ہوئے کہ اس کہانی میں شیطان کا صرف اتنا ذکر ہے کہ ونمالا نے استاد ارسطو کو بہکا دیا تھا مگر یہ ایک عورت کا کارنامہ تھا۔ شیطان غریب کا اس میں کیا قصور تھا۔

مجید میاں نے کہا "میاں سمجھا کرو۔ ابھی بچے ہو۔ شیطان نے عورت کا بھیس بدل کر اتنے بڑے قابل بزرگ کو بہکا دیا۔"

انہیں دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "سکندر" مسلمان نہیں تھا تو اس نے اپنا نام مسلمانوں جیسا کیوں رکھا تھا؟

انہوں نے ہمارے بڑے بھائی سے کہا "میاں بڑا زبردست دھوکا ہوگیا ہے یہ تو۔ ہم خواہ مخواہ "سکندر سکندر" کی رٹ لگایا کرتے تھے۔ اس کو کوئی اور نام نہیں ملا تھا جو مسلمانوں جیسا نام رکھ لیا۔"

مجید میاں اس بات پر کافی عرصے تک ناراض رہے۔ جب انہیں بتایا گیا کہ سکندر نے کس طرح ... پورس کو شکست دی تھی تو ان کی شکایات میں ... کچھ دیر تو خاموش رہے پھر بولے "میاں یہ کون سے کمال کی بات تھی۔ ہندو راجاؤں کو تو سبھی شکست دے دیا کرتے تھے۔ ہمارے کتنے مسلمان بادشاہوں نے انہیں شکست دی۔ سلطان محمود غزنوی کو تو عادت ہی پڑ گئی تھی۔ جب خیال آیا تھا ہندوؤں کو شکست دینے کا، ہندوستان پر حملہ کر دیتا تھا۔"

گویا انہوں نے سکندر کی اس خوبی کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔

ہم نے بہت ضد کی مگر دوسری بار یہ فلم دیکھنے کی اجازت نہ مل سکی۔ ایک ہی بار دیکھنے کے بعد ہمیں اس فلم کے مکالمے، یہاں تک کہ گانے تک ازبر ہوگئے تھے۔ بار بار سنانے کی وجہ سے آموختہ سا ہو جاتا تھا۔ مثلاً سکندر کی فوج نے راجا پورس کو شکست دینے کے بعد مزید پیش قدمی سے انکار کر دیا تو سکندر کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے انہیں سمجھانے اور جوش دلانے کے لیے ان سب کے سامنے پُرجوش تقریر کی۔ ایک زمانے میں یہ تقریر ہمیں ساری کی ساری یاد تھی۔ افسوس کہ اب کچھ حصے بھول چکے ہیں۔ اس لیے کہ سالہا سال سے بلکہ لگ بھگ نصف صدی سے اس کو دہرانے کا موقع نہیں ملا۔

یہ تقریر خطابت کا بہت اچھا نمونہ تھی۔ دراصل پرانے زمانے کے بادشاہ اور فاتح بہت اچھے خطیب اور مقرر بھی ہوا کرتے تھے اور ضرورت کے وقت اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے پُرجوش تقریریں کیا کرتے تھے۔

سکندر نے کہا "میرے بہادر ساتھیو۔ تم نے ایران فتح کیا۔ تم نے توران فتح کیا۔ تم نے ترکمانستان فتح کیا۔ اب تم ہندوستان سے واپس لوٹنا چاہتے ہو جہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ جہاں زعفران کے کھیت لہلہاتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

فوجی بھی آخر سکندر ہی کے فوجی تھے۔ وہ خاموش کھڑے یہ تقریر سنتے رہے مگر آخر میں جب سکندر نے ان سے پوچھا "بولو۔ تمہارا کیا فیصلہ ہے۔ آگے بڑھیں یا واپس جائیں؟"

سب نے شور مچا کر بیک آواز کہا "واپس چلیں۔"

سکندر کو بہت مایوسی ہوئی مگر وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ آخری فیصلہ آسمانی خدا پر چھوڑ دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑے تھال میں گوشت ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا گیا اور اس کے نزدیک ہی اولمپک مشعل کی شکل کی آگ روشن کردی گئی۔ طے یہ پایا کہ اگر کوئی گدھ، عقاب یا اسی قسم کا کوئی پرندہ اس گوشت کو اٹھا کر لے جائے تو فوجیوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ اگر گوشت کو اٹھائے بغیر واپس لوٹ جائے تو فوج کو بھی واپس لوٹنا ہوگا۔

سہراب مودی نے یہ منظر بہت خوب صورتی سے بڑے تجسس کے ساتھ فلمایا تھا۔ فوجی ایک بڑے میدان میں جمع تھے۔ اونچے ٹیلے پر گوشت کا تھال رکھا ہوا تھا۔ آسمان پر دور دور تک کسی پرندے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کچھ دیر بعد ایک عقاب (یا کوئی اور بڑا سا پرندہ) آسمان پر نمودار ہوا۔ وہ ہر طرف پرواز کرتا رہا۔ اس دوران میں فوجی اور سکندر تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے۔ یکایک پرندے نے گوشت کے تھال کی جانب رخ کیا تو فوجیوں اور سکندر کے ساتھ ساتھ فلم دیکھنے والوں کی بھی سانس رک گئی۔ ہدایت کار نے کچھ دیر تک پرندے کو تھال کے آس پاس کافی فاصلے پر اڑتا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ

ہوا دکھایا پھر اس کا رخ گوشت کی طرف ہوگیا۔ ہر طرف سناٹا چھاگیا۔ پرندہ گوشت کے آس پاس پرواز کرتا رہا پھر اس کی جانب بڑھا۔ اس نے ایک بار گوشت کی جانب غوطہ کھایا اور سب کے دل کی دھڑکنیں رک گئیں لیکن پرندہ تھال کے اوپر سے اڑ کر گزر گیا۔ فوجیوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ سکندر کے چہرے پر مایوسی چھاگئی مگر آسمانی خدا کا حکم تھا اس کے لیے سرتابی ممکن نہ تھی لہٰذا سکندر نے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔

یہ منظر سہراب مودی نے بہت مہارت اور ہنرمندی سے فلمایا تھا۔ قریباً پچپن سال کا عرصہ گزر گیا مگر اس کی ایک ایک تفصیل ہمیں یاد ہے۔ پرندے کی پرواز کے ساتھ ساتھ فوجیوں اور سکندر کے تاثرات اس طرح دکھائے گئے تھے کہ فلم دیکھنے والے بھی اس منظر کا ایک حصہ بن گئے تھے۔

سکندر کو عالمی اسٹیج پر ایک اداکار اور ڈرامے کا شوقین ہونے کا جو انکشاف کیا گیا ہے اس کی تائید میں کئی واقعات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اس فلم میں بھی چند ایسے مناظر تھے۔

راجا پورس نے دریائے جہلم کی دوسری جانب پوری طرح ناکا بندی کردی تھی تاکہ سکندر کی فوج کو دریا عبور کرتے ہی تہس نہس کردیا جائے۔ سکندر شب خون مارنے کے حق میں نہ تھا مگر اس نے فیصلہ کیا کہ فوج راتوں رات دریائے جہلم عبور کرلے۔

رات کا وقت تھا۔ موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور دریا بھی چڑھا ہوا تھا۔ پورس اور اس کی فوج کے سپہ سالاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسے خراب موسم میں رات کے وقت کوئی فوج اتنا بڑا دریا عبور کرلے گی اس لیے وہ بے فکری سے اپنے خیموں کے اندر سوئے ہوئے تھے۔

سکندر کی نگرانی میں اس کی فوج نے ایک مناسب مقام کا انتخاب کیا اور سب سے پہلے سکندر نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اس کی پیروی میں دوسرے فوجی سوار اور پیادے بھی دریا میں کود پڑے۔ کچھ ڈوب بھی گئے مگر فوج راتوں رات دریائے جہلم کو عبور کرکے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

صبح ہوئی تو پورس کے فوجی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کے عین مقابل سکندر کی فوج نہ صرف موجود ہے بلکہ حملہ کرنے کے لیے صف آرا ہے۔ پورس کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ابھی وہ پوری طرح جاگے بھی نہیں تھے کہ جنگ کا آغاز ہوگیا اور بالآخر پورس کی فوج کو شکست ہوگئی۔

سہراب مودی نے اس فلم میں پوری طرح یہ کوشش کی تھی کہ پورس کو کسی طور سے سکندر سے کم تر نہ دکھایا جائے۔ پورس کی شکست کے لیے بھی انہوں نے مختلف وجوہات ڈھونڈلی تھیں۔ پورس کا کردار سہراب مودی صاحب نے بذات خود ادا کیا تھا۔ وہی اس فلم کے ہدایت کار اور فلم ساز بھی تھے۔ گویا سیاں بھئے کوتوال تو ڈر کس کا۔ والی بات تھی۔ پورس کا گیٹ اپ انہوں نے بہت اچھا بنوایا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک قد آور اور وجیہہ آدمی تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، نوکیلی ناک، کتابی چہرہ جس کو انہوں نے راجپوتوں کے انداز کی بارعب داڑھی سے سجایا تھا۔ وہ بنیادی طور پر اسٹیج کے اداکار تھے اس لیے آواز میں گھن گرج بھی خوب تھی اس لیے فلم دیکھنے والوں کے دلوں میں پورس کی عظمت انہوں نے پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔

جنگ کے بعد شکست خوردہ راجا پورس کو سکندر کے رو برو پیش کیا گیا۔ یہ بہت شاندار اور یادگار منظر تھا۔ پورس کے جسم پر زنجیریں بندھی ہوئی تھیں مگر گردن تنی ہوئی تھی۔ وہ بہت بارعب انداز میں خیمے کے اندر داخل ہوا۔ اس کو سکندر کے سامنے کھڑا کردیا گیا۔ سکندر نے سر سے پیر تک پورس کا جائزہ لیا اور پھر وہ تاریخی سوال کیا جو تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

سکندر نے ایک فاتحانہ شان سے دریافت کیا "راجا پورس۔ تم شکست کھا چکے ہو۔ بولو، اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

پورس نے بارعب آواز میں جواب دیا "وہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

سکندر یہ جرات مندانہ جواب سن کر پھڑک اٹھا۔ اس نے اپنے زانو پر ہاتھ مارا (فلم میں یہ سکندر کی عادت دکھائی گئی تھی) اور حکم دیا کہ راجا پورس کے جسم پر سے زنجیریں اتار دی جائیں پھر اس نے آگے بڑھ کر پورس کا ہاتھ تھاما اور اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھالیا۔

سکندر لوٹتے وقت پورس کی جیتی ہوئی سلطنت اس کو واپس دے گیا تھا۔

سکندر کو بچپن ہی سے فتوحات کا شوق تھا۔ اس زمانے میں یونان مختلف ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی تھیں۔ سکندر کے باپ نے جو مقدونیہ کا بادشاہ تھا، آس پاس کی کئی ریاستوں پر لشکر کشی کرکے انہیں فتح کرلیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بھی کسی ریاست کے فتح ہونے کی خبر آتی تو نوعمر سکندر خوش ہونے کے بجائے افسردہ ہوکر کہتا تھا "میرے فتح کرنے والی ایک اور ریاست کم ہوگئی۔"

بات اس دریافت سے شروع ہوئی تھی کہ سکندر جتنا بڑا سالار اور فاتح تھا اتنا ہی بڑا اداکار اور ڈرامے کا شوقین بھی تھا۔ دنیا کے اسٹیج پر اس نے اپنی اداکاری کی دھاک بٹھا دی تھی۔

وہ دشمن کو للکار کر اس سے جنگ کرنے کا قائل تھا۔ بے خبری میں حملہ کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ مسیح سے چار سو سال قبل کے زمانے میں وہ یونان کی ایک ریاست مقدونیہ سے اپنی فوج لے کر نکلا اور دور دراز علاقوں تک کی سلطنتوں کو شکست دیتا ہوا، ہندوستان تک پہنچ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نقل و حرکت کے ذرائع انتہائی محدود اور سست رفتار تھے۔ راستے میں دشوار گزار ریگستان، پہاڑی سلسلے اور گھنے جنگل پڑتے تھے۔ فوج کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا بجائے خود ایک مسئلہ ہوتا تھا۔ اتنی بڑی فوج کے ساتھ اپنے راستے میں آنے والی ہر ریاست کو زیر کرکے اس وقت کی دریافت کردہ آدھی دنیا کو فتح کرلینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اگر زندگی مہلت دیتی تو وہ باقی ماندہ نصف دنیا کو بھی فتح کرلیتا۔

جب وہ مرا تو اس کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔ وہ تمام عمر ناقابل تسخیر رہا۔ اس نے کوئی ایک جنگ تو کیا، لڑائی میں بھی شکست نہیں کھائی۔ یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں ایسے انسان بھی ہوتے تھے جن کے کارناموں کو عقل تسلیم کرنے سے قاصر ہے مگر یہ من گھڑت کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن کی صحت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ موجودہ جدید عہد کے مورخین اور محققین نے بھی ان کی تصدیق کردی ہے۔ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ گزشتہ ایک سو سال میں حیرت انگیز برق رفتاری سے ترقی کرنے کے باوجود انسانوں کے معیار میں بتدریج کمی واقع ہوتی رہی ہے۔ تاریخ ایسے انسانوں کے کارناموں اور کمالات سے بھری ہوئی ہے جنہوں نے انتہائی پس ماندہ دور میں بھی مختلف شعبوں میں ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیے جو ہمیشہ کے لیے یادگار بن کر رہ گئے۔ ایسے بے لوث، مخلص، اولوالعزم، بہادر، نڈر، دانائی و حکمت سے بھرپور، عقل و شعور کی صلاحیتوں سے مالا مال اور اپنی لگن میں ہمہ تن مصروف لوگ اب کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ انسانی علم اور وسائل میں بے پناہ ترقیوں نے انسان کو واقعی ناقابل تسخیر بنا دیا ہے مگر وہ انسانیت سے محروم ہوکر رہ گیا ہے۔ اتنی بے پناہ ترقی کرنے کے بعد تو انسانوں کو انسان کامل کا درجہ حاصل ہوجانا چاہیے تھا۔ ان کی زندگی سکون، اطمینان، خوشیوں اور فراغت و آسودگی سے مالا مال ہوجانی چاہیے تھی مگر سب کچھ اس کے برعکس کیوں ہورہا ہے؟ آج کا انسان انسانی قدروں، رشتوں اور عظمت انسان کے تقاضوں کو کیوں فراموش کر بیٹھا ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور چاند پر چہل قدمی کرنے والا انسان اپنے برابر رہنے والوں کے حالات، مسائل اور مصائب سے اتنا بے خبر کیوں ہوگیا ہے۔ بے پناہ مادی، عقلی اور سائنسی ترقیوں کے باوجود وہ اس قدر بے حس کیوں ہے۔ زندگی کو آسان بنانے کے نام پر جو ایجادات ہوئی ہیں ان کے بعد بھی انسانوں کی مصروفیات اور مجبوریاں پہلے سے زیادہ کیوں ہوگئی ہیں۔ جو ملک جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہے وہاں کے عوام اتنے ہی زیادہ بے سکون، تنہا، بے سہارا اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور کیوں ہیں؟ اتنی تیز رفتار سواریوں، کمپیوٹرز اور مہینوں کے کام منٹوں میں سرانجام دینے والی مشینوں کی ایجاد کے بعد بھی انسان کے پاس فرصت اور فراغت کیوں نہیں ہے؟

ایسے بے شمار سوالات ذہن میں کلبلاتے رہتے ہیں مگر ان کا جواب کیوں نہیں ملتا۔ شاید یہ قربِ قیامت کے آثار ہیں۔ اسی لیے تو وہ تمام علامتیں ظاہر ہونے لگی ہیں جو دنیا کی تباہی اور قیامت کے قریب آنے کی گواہی دیتی ہیں۔

دیکھیے۔ فلم سکندر اور مقدونیہ کے سکندرِ اعظم سے چل کر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اسی کو تو جملۂ معترضہ کہتے ہیں۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کتنی بدل گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ فلموں ہی کو دیکھ لیجیے۔ ہمارے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں جیسی فلمیں بنا کرتی تھیں وہ آج بھی دیکھنے والوں کے ذہنوں پر نقش ہیں یہاں تک کہ ان کے مکالمے تک یاد ہیں۔ ان فلموں کی موسیقی کی مٹھاس اور خوب صورتی وقت گزرنے کے ساتھ کم نہیں ہوئی، اس میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے۔ وہ گانے، وہ طرزیں، وہ بول اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک کانوں میں امرت گھولتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے جبکہ آج کی کامیاب ترین فلم اور مقبول ترین گانا دوسرے دن ذہن سے اتر جاتا ہے۔ یہ بھی شاید ترقی کی کوئی قسم ہے۔ فلم تکنیک اور آلات نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ ہدایت کار کہانی نویس کے تصور کو ہوبہو فلم بینوں کے سامنے پیش کرنے پر قادر ہے لیکن اس کے باوجود فلم میں رس، مٹھاس، مقصدیت، دلکشی اور دلچسپی باقی نہیں رہی۔ ایسی بات نہیں ہے کہ پرانے زمانے کے لوگوں

کے لیے ان فلموں کی کشش ختم ہوچکی ہے۔ خود آج کی نسل بھی ان کی شیدائی نہیں ہے۔ کوئی کامیاب ترین فلم اور مقبول ترین اداکار اور اداکارہ چند ہفتوں، مہینوں یا زیادہ سے زیادہ چند سالوں کے بعد فراموش کردیا جاتا ہے۔ دور کیوں جاتے ہیں، آج سے دس سال پہلے کی فلموں اور اداکاروں کو ہی یاد کیجیے۔ ان کی دُھندلی سی تصویر بھی ذہنوں میں نہیں ہے۔ کل کے معروف اداکار اور اداکارائیں قصۂ ماضی بن چکی ہیں، بلکہ یہ بھی درست نہیں ہے۔ ماضی کے قصے تو پھر بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ ان کے تو نام بھی لوگ بھول گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ساٹھ سال پہلے کی فلمیں اور اداکار آج بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہالی ووڈ اور ہندوستان کے پرانے اداکاروں کو آج بھی بھلایا نہیں جاسکا ہے۔ بے شمار نئی نئی فلموں، دلچسپیوں اور ان گنت نئے فنکاروں کی مسلسل آمدورفت کے باوجود وہ اداکار اور وہ فلمیں آج بھی بھلائی نہیں جاسکی ہیں۔ گیری کوپر، مارلن برانڈو، کلارک گیبل، کیری گرانٹ، گریگوری پیک، ریٹا ہورتھ، انگرڈ برگمین یہاں تک کہ مارلن منرو، الزبتھ ٹیلر جیسے درجنوں فنکار ساری دنیا میں مختلف انداز اور خصوصیات کے باعث معروف تھے۔ آج کل کوئی ایک بھی اداکارہ ایسی نہیں ہے جس کا نام سب کو معلوم ہو۔ کوئی ذرا نمایاں بھی ہوتی ہے تو بہت مختصر عرصے بعد گمنام ہو کر رہ جاتی ہے۔ آج سے پندرہ بیس سال، دس سال اور پانچ سال پہلے کی سُپراسٹارز کا نام اب کسے یاد رہ گیا ہے؟

پہلے زمانے میں مختلف ہدایت کار، اداکار، موسیقار اور فلم ساز اپنے مخصوص انداز اور مختلف اوصاف کے حوالے سے شہرت پایا کرتے تھے۔ سوشل فلمیں بنانے والے الگ تھے۔ رومانی فلمیں بنانے والے کچھ اور تھے۔ ایکشن فلمیں اس زمانے میں بہت کم بنتی تھیں اس لیے کوئی ہدایت کار اس حوالے سے شہرت نہ پاسکا۔

فن کاروں کا بھی یہی معاملہ تھا۔ ہدایت کار اور فنکاروں کے نام دیکھ کر اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ فلم کس نوعیت کی ہوگی۔ ہدایت کاروں کی طرح موسیقاروں اور فنکاروں کا بھی منفرد انداز تھا۔ نوشاد، کھیم چند پرکاش، ماسٹر غلام حیدر، خواجہ خورشید انور اور سجاد... ہر ایک کا انداز جُدا اور رنگ مختلف تھا۔ گانا سن کر اور اس کے سازوں کی ترتیب سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کا خالق کون ہے۔

اداکاروں میں بھی یہی درجہ بندی تھی۔ دلیپ کمار، دیو آنند، راج کپور، موتی لال اور اشوک کمار اپنی اداکاری کا منفرد انداز رکھتے تھے۔ مدھو بالا، مینا کماری، وحیدہ رحمان، نرگس اور نمی وغیرہ بھی اپنی اداکاری اور تاثرات کے اظہار میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی سالوں میں پاکستان کی فلمی صنعت کا بھی یہی دستور تھا۔ شوکت حسین رضوی، سبطین فضلی، انور کمال پاشا، مسعود پرویز، شباب کیرانوی، ریاض شاہد، خلیل قیصر اور حسن طارق سبھی اپنے فن کے ماہر اور ایک مختلف انداز کے حامل تھے۔ اس زمانے میں لوگ ہدایت کار اور مصنف کا نام دیکھ کر فلمیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ہاں موسیقار کے نام کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ موسیقی ہماری فلموں کی پہچان اور جان رہی ہے۔ اچھی موسیقی فلموں کی کامیابی میں بے حد مددگار ثابت ہوتی تھی۔ اب نہ کہانیاں ہیں، نہ موسیقی تو ہدایت کاری اور اداکاری بھی نا پید ہے۔ اس پر فلم ساز شکایت کرتے ہیں کہ لوگ فلمیں دیکھنے نہیں آتے۔

سنتوش کمار ایک عرصے تک پاکستان کے اکلوتے ہیرو کہلائے۔ وہ سوشل اور رومانی کرداروں کے لیے موزوں تھے۔ سُدھیر اپنی آواز کی گھن گرج اور تیز و تند تیوروں کی وجہ سے ایکشن ہیرو کہے جاتے تھے۔

درپن کی اداکاری کا انداز جُدا تھا۔ ان سے فلم بین کچھ اور توقع رکھتے تھے۔ بعد کی نسل میں محمد علی، وحید مراد اور ندیم کو دیکھ لیجیے۔ کہنے کو یہ تینوں فلموں کے ہیرو تھے مگر اپنی شخصیت اور اداکاری کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف۔ اداکاراؤں میں بھی صبیحہ خانم اور مسرت نذیر ایک دوسرے کی ہم عصر تھیں مگر دونوں کی اداکاری مختلف تھی۔ شمیم آرا، زیبا، رانی، نیلو اور سلطانہ... سبھی اپنے اپنے انداز کی اداکاری کرتی تھیں اور ان کے لیے مخصوص قسم کے کردار تخلیق کیے جاتے تھے۔ اب یہ سب چیزیں ناپید ہوچکی ہیں۔ اداکار دیکھنے میں ایک جیسا، اداکاری کا انداز بھی یکساں، ہیروئنوں کا بھی یہی حال ہے۔ ایک دستور یہ نکلا کہ تمام ممتاز فنکاروں کو ایک ہی فلم میں اکٹھا کردیا جائے۔ اس میں کرداروں کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں ہے۔ اول تو فنکاروں کی تعداد ہی کم ہے اور پھر ان میں اچھے اداکار اور بھی کم ہیں لیکن جب ہر فلم میں ان سب کو ریوڑ کی شکل میں اکٹھا کردیا گیا، کہانیاں اور کردار بھی یکساں ہونے لگے تو ان کی رہی سہی مقبولیت بھی باقی نہ رہی۔ ہر روز قورمہ، بریانی اور مرغی کھا کھا کر بھی انسان اکتا جاتا ہے۔ ان معدودے چند اداکاروں کو دیکھ دیکھ کر فلم بین تنگ آچکے ہیں۔ اگر کسی میں کوئی خوبی تھی بھی تو اب وہ باقی نہیں رہی۔

بھارت میں بھی فلم سازی کا اب یہی حال ہے۔ وہی بے سروپا اور بے مقصد کہانیاں، بے تکے کردار اور بے ہنگم موسیقی۔ اس کے باوجود مختلف قسم کی فلمیں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اداکاروں کو بھی ان کے انداز اور فلمی کردار کی ضرورت کے تحت منتخب کیا جاتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسٹار سسٹم وہاں بھی موجود ہے لیکن اداکار بھی زیادہ ہیں اس لیے ہر فنکار سال بھر درجنوں فلموں میں نظر نہیں آتا اس کی وجہ سے ان کی مقبولیت اور باکس آفس ویلیو برقرار رہتی ہے۔ جن اداکاروں نے تھوک کے بھاؤ فلموں میں کام شروع کردیا وہ بہت جلد "آنجہانی" ہوگئے۔

ہم نے جب فلمیں دیکھنی شروع کیں تو موتی لال، اشوک کمار، لیلا چٹنس، للتا پوار وغیرہ کا زمانہ تھا۔ اس وقت اتنا زیادہ شعور نہیں تھا اس کے باوجود بچپن میں دیکھی فلموں کی دُھندلی یادیں آج بھی باقی ہیں۔ کچھ بڑے ہوئے تو دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، نرگس، کامنی کوشل کا دور شروع ہوچکا تھا۔ فلموں کے موضوعات اور کرداروں کے مطابق فنکاروں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ اسکرپٹ، مکالموں اور موسیقی پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ کرداروں کے مطابق اداکاروں کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ ہدایت کار فلموں کو پُراثر اور معنی خیز بنانے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فلموں کا معیار بہت اچھا تھا اور ان کا اثر بھی دیرپا ہوتا تھا۔ اس زمانے کی دیکھی ہوئی فلمیں آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

دلیپ کمار اپنی رومانٹک اور الم ناک اداکاری کے اعتبار سے دوسرے اداکاروں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کی اداکاری کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس پر اداکاری کا گمان ہی نہیں گزرتا تھا۔ بعد میں انہوں نے ایکشن اور کامیڈی فلموں میں بھی کام کیا اور ہر کردار میں اپنی اداکاری کا لوہا منوالیا۔

ہم نے جب دلیپ کمار کی فلمیں دیکھنے کا آغاز کیا۔ اس وقت وہ "ٹریجڈی کنگ" کہلاتے تھے۔ بابل، شبنم، ندیا کے پار، آرزو، شہید، ہر فلم میں وہ المیہ کرداروں میں پیش کیے گئے۔ درمیان میں ہلکے پھلکے سین بھی ہوتے تھے جو وہ اپنے فطری انداز میں کرجاتے تھے۔ دلیپ کمار کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر کردار میں خود کو اس طرح ڈھال لیتے تھے کہ حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ طالب علم، امیر، غریب، مزدور، دیہاتی، شہری بابو اور ان پڑھ گنوار ہر قسم کے کردار انہوں نے ادا کیے اور اس خوبی سے کیے کہ دیکھنے والے ان کے دکھ درد اور خوشیوں میں خود بھی شریک ہوجاتے تھے۔ کچھ کہانیوں، اسکرین پلے اور مکالموں کی مدد بھی حاصل ہوتی تھی اور موسیقی بھی بہت سہارا دیتی تھی مگر دلیپ کمار کی اداکاری کا انداز ہمیشہ منفرد اور متاثر کن رہا۔ دلیپ کمار نے شروع میں نرگس کے ساتھ کام کیا۔ اس سے پہلے نورجہاں کے ساتھ بھی وہ "جگنو" میں کام کرچکے تھے۔ ہر اداکارہ کے ساتھ ان کی جوڑی بھلی لگتی تھی۔ نرگس کے ساتھ انہوں نے کچھ یادگار فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ "بابل، انداز اور جوگن" ان دونوں کی یادگار فلمیں تھیں۔ سب کہتے تھے کہ دلیپ کمار اور نرگس سے زیادہ اچھی فلمی جوڑی کوئی اور نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں کی کسی اور کے ساتھ اتنی اچھی جوڑی بن سکتی ہے مگر محبوب صاحب کی فلم "انداز" ان دونوں کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ راج کپور صاحب درمیان میں کود پڑے۔ انہوں نے نرگس کو اپنی محبت بھی پیش کردی اور شادی کا جھانسا بھی دے ڈالا جبکہ دلیپ صاحب شادی وادی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ بہرحال پھر نرگس کافی عرصے کے لیے راج کپور ہی کی ہو کر رہ گئی۔ انہوں نے دوسرے ہیروز کے ساتھ بھی کام کیا مگر راج کپور نے انہیں اپنے دوست اور حریف دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ نرگس اور راج کپور کی جوڑی بھی کافی مقبول ہوئی۔ برسات، آوارہ ان دونوں کی بہت کامیاب اور یادگار فلمیں ہیں مگر دلیپ کمار والی بات پیدا نہ ہوسکی۔

دلیپ کمار نے بھی دوسری ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا مگر نرگس کے بعد ان کی اور کامنی کوشل کی جوڑی نے بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ ان دونوں کی فلموں نے ایسی دھومیں مچائیں کہ لوگ نرگس کو بھول گئے۔ کامنی کوشل مختصر قدو قامت کی اداکارہ تھیں۔ تعلیم یافتہ تھیں اور ریڈیو کا تجربہ بھی رکھتی تھیں۔ وہ بہت اچھی اداکارہ تھیں مگر ان کی بہترین اور یادگار فلمیں دلیپ کمار کے ساتھ ہی ہیں۔ اس زمانے میں یہ بات بھی مشہور ہوگئی کہ وہ دونوں آپس میں محبت کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دونوں کے رومانی مناظر بے حد حقیقی نظر آتے تھے اس لیے یار لوگوں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پس منظر میں ان کی محبت بھی کارفرما ہے۔ کامنی کوشل ایک شادی شدہ خاتون تھیں اس کے باوجود اس زمانے میں بے انتہا مقبول ہیروئن بن گئیں تھیں جب اداکار اپنی شادی کو چھپایا کرتے تھے تاکہ

فلم بینوں کے دلوں سے نہ اُتر جائیں۔ کامنی کوشل کی کہانی یہ تھی کہ ان کی شادی اپنی حقیقی بہن کے مرنے کے بعد بہنوئی سے ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ بہن کے بچوں کو سوتیلی ماں کی بدسلوکی سے بچانے کے لیے کامنی کوشل نے یہ قربانی دی تھی اور جب دلیپ کمار ان کی زندگی میں داخل ہوئے تو ان کے قدم ڈگمگا گئے۔ یہ داستان بذاتِ خود ایک فلمی کہانی بن سکتی ہے۔ بھارت اور پاکستان میں اس موضوع پر کئی فلمیں بھی بنائی جاچکی ہیں۔ اس پس منظر کی وجہ سے بھی لوگوں کو کامنی کوشل اور دلیپ کمار سے بہت ہمدردی اور لگاؤ ہوگیا تھا اور ان دونوں کے رومانی مناظر میں وہ خود بھی جذباتی طور پر ملوث ہوجاتے تھے۔

پاکستان بننے کے بعد جب کامنی کوشل لاہور آئی تھیں تو ایک محفل میں ہم بھی موجود تھے۔ اب وہ ادھیڑ عمر کی ہوگئی تھیں مگر قدو قامت کی وجہ سے ظاہری شکل و صورت میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اداکاری وہ ترک کرچکی تھیں اور دستاویزی فلمیں بناتی تھیں۔ صحافیوں نے ان سے بہت بے تکلفانہ باتیں کیں۔ جب ان سے دلیپ کمار کے رومان کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ ہنسنے لگیں اور کہا کہ یہ سب من گھڑت باتیں ہیں۔ میں ہمیشہ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن رہی ہوں اور میری کامیابی کے پیچھے ان کے تعاون اور روشن خیالی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اُن کے شوہر سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت معقول اور شائستہ تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھے مگر جتنے عرصے تک کامنی کوشل ہیروئن کے طور پر راج کرتی رہیں وہ پس منظر ہی میں رہے اور کبھی اپنی اداکارہ بیوی کے ساتھ نظر نہیں آئے۔

وقت کی گرد بہت سے نقوش اور یادوں کو دھندلا دیتی ہے یا پھر انہیں مٹا دیتی ہے اور گزرے ہوئے زمانے کی باتیں بعض اوقات بہت عجیب اور جذباتی حماقتیں سی لگتی ہیں۔ ممکن ہے کامنی کوشل کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ گزرا ہو۔ جہاں تک دلیپ کمار کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے اتنے لیے دیے رہتے ہیں کہ کسی کو ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں سوال کرنے کی جُرأت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ان معاملات پر وہ خود کبھی لب کشائی کرتے ہیں۔ سوائے مدھوبالا کے انہوں نے اپنے رومانی معاملات پوشیدہ ہی رکھے۔ مدھوبالا سے ان کا اختلاف عدالتی کارروائی کے باعث منظرِ عام پر آیا تھا جب فلم "نیا دور" میں مدھوبالا کے والد نے عین وقت پر کام کرنے سے انکار کردیا تھا اور ان کی جگہ وجنتی مالا کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کئی فلموں میں وجنتی مالا اور دلیپ کمار کی جوڑی بے حد مقبول رہی۔ اس کے ٹوٹنے کا سبب بھی دلیپ کمار کا شادی سے انکار تھا۔ راج کپور حسبِ معمول تاک میں تھے۔ وہ فوراً اپنی فلم "سنگم" کے ذریعے درمیان میں کود پڑے اور اپنی دانست میں وجنتی مالا پر قابض ہوگئے حالانکہ یہ محض ان کی غلط فہمی تھی۔

جہاں تک دلیپ کمار کا تعلق ہے ان کی ذاتی کشش اور اداکاری کی طاقت اتنی زیادہ تھی کہ ہیروئن ان کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ وہ ہر ہیروئن کے ساتھ نبھالیتے تھے اور فلم ہٹ ہوجاتی تھی۔ نرگس، کامنی کوشل، وجنتی مالا، نمی، منور سلطانہ جس نے بھی ان کے ساتھ کام کیا، دلیپ کمار کو ہیروئن کی تبدیلی کا احساس ہوا نہ فلم بینوں کو۔ یوں بھی فلمی دنیا کا یہ دستور ہے کہ مقبول فنکار ایک سے زائد کامیاب فلموں میں کام کرلیں تو ان سے رومانی داستانیں وابستہ کردی جاتی ہیں۔ فلم بین بھی اس کی وجہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگتے ہیں مگر کامنی کوشل کی محبت افسانہ نہیں حقیقت تھی۔ بمبئی کے بہت سے فلم والے اس کے شاہد تھے۔ دلیپ کمار کے قریبی شناساؤں نے بھی ہمیں یہی بتایا کہ ان دونوں کی ملاقاتیں مختلف مقامات پر ہوتی رہتی تھیں اور کم از کم کامنی کوشل اس معاملے میں بہت سنجیدہ تھیں۔

عصمت چغتائی کی لکھی ہوئی اور ان کے شوہر شاہد لطیف کی بنائی ہوئی فلم "آرزو" میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کو جس انداز میں پیش کیا گیا تھا اس کا پس منظر وہی تھا جو کامنی کوشل کا تھا۔ اس وجہ سے بھی "آرزو" فلم بینوں کو بہت اچھی لگی تھی۔

"آرزو" کی کہانی یہ تھی کہ دلیپ کمار اور کامنی کوشل گاؤں میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں۔ دلیپ صاحب کوئی کام نہیں کرتے۔ کامنی کوشل کہتی رہتی ہے کہ کچھ کرو۔ کماؤ ورنہ ایک نکھٹو سے میرے ماں باپ مجھے نہیں بیاہیں گے۔ دلیپ کمار ہر بار کمانے کے لیے شہر جانے کا ارادہ کرتے ہیں مگر دوسرے دن پھر وہیں کے وہیں موجود نظر آتے ہیں۔ کامنی کے ڈانٹنے پر کہتے ہیں کہ کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں کرتا۔ وہ انہیں وارننگ دیتی ہے کہ اگر تم نے کمائی نہ کی تو ہمیشہ کے لیے مجھے کھو بیٹھو گے۔ بالآخر وہ برا بھلا کہہ کر انہیں جانے پر مجبور کرتی ہے۔ دونوں میں بہت وعدے وعید ہوتے ہیں کہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں جئیں گے اور کامنی دلیپ کی واپسی کا انتظار کرے گی۔

شہر میں جاکر دلیپ صاحب محنت مزدوری میں لگ جاتے ہیں۔ دن رات کام کرتے ہیں۔ ان پر کمانے کی دُھن سوار ہے۔ ادھر کامنی کوشل کے گاؤں میں ایک امیر جاگیردار صاحب آتے ہیں جو کامنی کی خوب صورتی اور معصومیت پر فدا ہوجاتے ہیں۔ وہ دلیپ کمار کے انتظار میں ہے مگر اس کے بارے میں یہ مشہور ہوجاتا ہے کہ وہ رات کو آیا تو تھا مگر جھونپڑی میں آگ لگ جانے کے باعث جل کر بھسم ہوگیا۔ جھونپڑی سے ایک جلی ہوئی لاش بھی دستیاب ہوتی ہے جسے دلیپ کمار کی لاش تسلیم کرلیا جاتا ہے اور سب صبر کرلیتے ہیں۔

دلیپ کی موت کا یقین ہوجانے کے بعد کامنی کوشل کو دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ جب ماں باپ جاگیردار سے اس کی شادی کردیتے ہیں اس وقت بھی وہ خاموش رہتی ہے۔ شادی کے بعد وہ ایک باوفا بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر اور اس کے گھر کے لیے اپنی تمام توجہ وقف کردیتی ہے۔ اس کی ایک نوجوان نند بھی ہے۔ بھابی اور نند میں کافی پیار اور بے تکلفی ہے۔

دلیپ کمار دولت مند بابو بن کر شہر سے آتے ہیں تو ان پر یہ بات سن کر پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے کہ کامنی کوشل کی ایک دولت مند جاگیردار سے شادی ہوگئی ہے۔ کامنی مذاق ہی مذاق میں محلوں میں رہنے کا ذکر کیا کرتی تھی۔ دلیپ کو یقین ہوجاتا ہے کہ دولت اور آسائش کے لالچ میں اس نے بے وفائی کی ہے۔ اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔

کامنی کی نند کی ملاقات دلیپ سے ہوتی ہے تو وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے۔ جاگیردار صاحب بھی دلیپ سے بہت خوش ہوتے ہیں اور اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں کرتے مگر جب کامنی کوشل دلیپ کمار کو دیکھتی ہے اور اس کی طنز آمیز اور معنی خیز باتیں سنتی ہے تو سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ دراصل دلیپ کا مقصد اس کو جلانا ستانا اور اس طرح اس کی زندگی عذاب بنا کر انتقام لینا ہے۔ وہ اس شادی کی مخالفت کرتی ہے مگر اس کے لیے کوئی معقول دلیل نہیں دے سکتی۔ شوہر حیران ہے کہ آخر اتنی مخالفت کا سبب کیا ہے۔ اس دوران میں دلیپ کمار نند سے ملنے آتے ہیں مگر ان کی ساری ذو معنی گفتگو کامنی کوشل کو سنانے کے لیے ہوتی ہے۔ کامنی کوشل، نند کو سمجھاتی ہے کہ یہ شخص تم سے کبھی پیار نہیں کرسکتا۔ تم سے مخلص نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی سے بھی پیار نہیں کرسکتا مگر اس پر دلیپ کے پیار کا بھوت سوار ہے۔ فلم کا انجام یہ ہے کہ کامنی کوشل کا شوہر دلیپ کمار کو گولی مار کر ہلاک کردیتا ہے اور کہانی اپنے المناک انجام کو پہنچتی ہے۔

اس کہانی کو عصمت چغتائی نے خوب صورت منظر ناموں اور مکالموں سے سجایا تھا اور شاہد لطیف نے بہت اچھی ہدایت کاری کی تھی۔ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی اداکاری بے مثال تھی۔ موسیقی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کے باوجود یہ فلم کامیاب نہیں ہوسکی۔ کچھ مبصرین کے خیال میں اس کا سبب یہ تھا کہ فلم کے آخر میں دلیپ کمار کو مرتے ہوئے دکھایا گیا تھا جسے فلم بینوں نے پسند نہیں کیا لیکن یہ خیال درست نہ تھا کیونکہ دلیپ کمار کئی فلموں میں موت اور المناک انجام سے دوچار ہوئے تھے مگر یہ فلمیں بے حد کامیاب رہی تھیں۔ مثلاً محبوب کی شاہکار فلم "انداز" ہی کو دیکھ لیجیے۔ اس فلم کے نصف آخر میں اچانک دلیپ کمار ایک ولن میں تبدیل ہوچکے تھے اور اپنی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ فلم کی ہیروئن نرگس نے انہیں گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔ اس کے بعد بھی فلم جاری رہی اور یہ بے حد کامیاب اور سُپرہٹ فلم تھی۔ اسی طرح خود اپنی فلم "گنگا جمنا" میں دلیپ کمار موت کا نشانہ بن گئے تھے۔ فلم کی ہیروئن اور ان کی بیوی وجنتی مالا پہلے ہی پولیس کی گولیوں کا شکار ہو کر ہلاک ہوچکی تھیں۔ اس فلم کا بہت بڑا حصہ ہیروئن سے محروم تھا لیکن کہانی، ہدایت کاری اور دلیپ کمار کی اداکاری اس قدر مؤثر اور پر زور تھی کہ اس کے بعد بھی فلم دیکھنے والے پلک تک نہیں جھپک سکے۔ یہ فلم بھی سُپرہٹ ہوئی تھی۔ یہ صرف دو مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دلیپ کمار کے المناک انجام کے باوجود ان کی کئی فلمیں سُپرہٹ ہوئی تھیں۔

"آرزو" کی نمائش سے پہلے ہی یہ مشہور ہوگیا تھا کہ یہ دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی فلمی جوڑی کی آخری فلم ہوگی کیونکہ کامنی کوشل کے شوہر نے آئندہ کامنی کے، دلیپ کے ساتھ کام کرنے پر پابندی عائد کردی ہے۔ بعد میں یہ بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ "آرزو" ان دونوں کی آخری فلم تھی۔ اس کے بعد کامنی کوشل نے چند اور فلموں میں کام کیا مگر وہ کامیاب نہ ہوسکیں اور بالآخر کامنی کوشل گمنام ہو کر رہ گئیں مگر دلیپ کمار ہیروئن کی وابستگی سے بالکل بے نیاز تھے۔ ہم جیسے جذباتی نوجوانوں کے لیے "آرزو" کئی اعتبار سے ایک اہم فلم تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ دلیپ اور کامنی کوشل کی آخری فلم تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ عصمت چغتائی جیسی افسانہ نگار کی لکھی ہوئی تھی پھر ان کے شوہر شاہد لطیف

ہدایت کار تھے۔ اس سے پہلے ان دونوں کی ایک اور فلم "ضدی" سُپرہٹ ہو چکی تھی۔ اس میں کامنی کوشل کے ساتھ دیو آنند ہیرو تھے اور اس فلم میں دیو آنند نے بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ "ضدی" اپنی کہانی، منظر نامہ، مکالموں اور ہدایت کاری کی وجہ سے بھی بہت اعلیٰ معیار کی فلم تھی۔ کچھ عرصے بعد یہ انکشاف ہوا تھا کہ "ضدی" کی کہانی ایک ترکی ناول سے لی گئی تھی۔ کہانی کے اہم موڑ اور کردار ناول سے ہو بہو لیے گئے تھے۔ اس انکشاف پر عصمت چغتائی کے مدّاحوں کو بہت دکھ اور مایوسی ہوئی تھی۔ عصمت چغتائی جیسی لکھنے والی سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اگر وہ ناول سے کہانی اخذ کرنے کا اعتراف کر لیتیں تو اس سے ان کی ہُنرمندی اور کارکردگی پر کوئی حرف نہ آتا جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر "ضدی" ہر اعتبار سے بہت اچھی فلم تھی۔

شاید عصمت چغتائی کو بھی علم تھا کہ "آرزو" کے بعد دلیپ کمار اور کامنی کوشل حقیقی زندگی اور فلموں میں بچھڑ جائیں گے اسی لیے انہوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس میں ان دونوں کی محبت، علیحدگی اور مجبوریوں کو فلم میں بھی دکھایا گیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی نوجوان طبقے میں "آرزو" کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس کی موسیقی بھی بہت اچھی تھی مگر عام فلم بینوں کو یہ فلم پسند نہیں آئی۔

"آرزو" ہم نے اپنے ایک دوست کے ساتھ لاہور کے پلازا سنیما میں دیکھی تھی۔ یہ سنیما انگریزی فلموں کے لیے مخصوص تھا مگر "آرزو" کی اہمیت کے پیشِ نظر اس میں ایک اردو فلم پیش کر دی گئی۔ فلم کا تاثر اتنا بھرپور تھا کہ فلم کے آخری حصے میں سنیما ہال میں مکمل سناٹا چھا گیا تھا۔ سانسوں کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کئی بار تو لوگوں کے سانس بھی رک گئے تھے۔ جب فلم ختم ہوئی تو ہم کافی دیر تک چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ ہمارا دوست لوگوں کے ہجوم کے ساتھ باہر نکل گیا تھا اور ہم کو وہاں تلاش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم بے حد مغموم اور مایوسی کے عالم میں باہر نکلے تو یوں لگتا تھا جیسے ساری دنیا اداسی اور غمگینی کے پردے میں لپیٹ دی گئی۔ نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا، نہ کہیں جانے کی خواہش تھی۔ ہم چپ چاپ چلتے ہوئے گنگا رام اسپتال کے بس اسٹاپ پر پہنچ گئے اور ایک بس میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ گھر والے خلافِ معمول ہمیں سرِشام آتے ہوئے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

"کیوں بیٹا۔ خیر تو ہے۔ طبیعت کیسی ہے؟" اماں نے فوراً ہماری پیشانی اور گردن کو چھو کر دیکھا۔

ہم نے کہا "کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے اماں۔" یہ کہہ کر ہم اوپر اپنے کمرے کی طرف چلے۔

"کھانا تو کھا لو۔" انہوں نے تشویش سے کہا۔

ہم نے کہا "بھوک نہیں ہے۔ بہت کچھ کھا کر آئے ہیں۔"

دوسرے دن دفتر گئے تو دوست نے ہمیں بہت برا کہا "کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں ایک گھنٹے تک ڈھونڈتا رہا۔"

اس کے بعد ریستوران میں جا کر چائے پینے اور سموسے کھانے کا پروگرام تھا مگر ہم تو کسی اور عالم میں تھے۔ دوسرے دن دفتر سے نکل کر ہم پھر پلازا سنیما پہنچ گئے۔ اس روز بھی وہی تاثر تھا۔ مسلسل تین دن تک ہم "آرزو" دیکھتے اور مغموم ہوتے رہے۔ اس فلم کا تاثر کئی روز تک قائم رہا۔

"انداز" دیکھ کر بھی ہماری یہی کیفیت ہوئی تھی۔

"انداز" میں محبوب صاحب نے آنے والے دور کی تصویر پیش کی تھی۔ کہانی یہ تھی کہ نرگس ایک دولت مند روشن خیال باپ کی بے حد ماڈرن لڑکی ہیں۔ اس زمانے میں بالائی طبقے میں جو رواج جنم لے رہے تھے، اس فلم میں ان کی عکاسی کی گئی تھی۔ ایک اتفاقی حادثے میں دلیپ کمار سے ان کی جنگل میں ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ان کا شکریہ ادا کرتی ہیں اور اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہیں جہاں وہ اپنے ڈیڈی سے انہیں ملاتی ہیں۔ یہ کردار مراد نے بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ اپنے بے باک اور بے تکلف مزاج کے باعث نرگس اور دلیپ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں۔ فلم دیکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ ساتھ گھومنا، ہنسنا بولنا، سالگرہ کی تقریب اور دوسرے مواقع پر گیت گانا۔ محبوب صاحب نے انڈین فلموں میں پہلی بار پیانو پر بیٹھ کر ہیرو کا گانا پیش کیا تھا جو بعد میں انڈین اور پاکستانی فلموں میں ایک معمول بن گیا تھا۔ نرگس کے ڈیڈی بھی دلیپ کمار کو پسند کرتے ہیں مگر جب بیٹی کو اس سے بہت زیادہ شیر و شکر ہوتے دیکھتے ہیں تو سمجھاتے ہیں کہ لڑکیوں کو بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ نرگس جواب میں کہتی ہیں "ڈیڈی، ہم صرف دوست ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

ڈیڈی نے بیٹی کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے۔ صرف اتنا کہتے ہیں کہ بیٹی۔ یاد رکھو۔ ایک دن جب ہم نہ ہوں گے تو ہماری باتیں یاد آئیں گی۔

جب دلیپ اور فلم بین دونوں سمجھتے ہیں کہ عن قریب

ان دونوں کی شادی ہوجائے گی تو اچانک ایک بم کا دھماکا ہوتا ہے۔

نرگس نہایت معصومیت اور مسرت سے دلیپ کو یہ اطلاع دیتی ہیں کہ انگلستان سے راج واپس آرہا ہے۔

"راج کون صاحب ہیں؟"

"وہ میرے منگیتر ہیں۔"

دلیپ کمار حیران ہو کر نرگس کی طرف دیکھتے ہیں۔

وہ ان کے ردِ عمل سے بے خبر اپنے مخصوص شوخ اور بے تکلف انداز میں بتا رہی ہیں "بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

دلیپ کمار اور فلم بین دونوں کے لیے یہ ایک بالکل غیر متوقع صورتِ حال ہے۔ اس سے پہلے ہدایت کار اور مصنف نے جس خوب صورتی سے کہانی کا تانا بانا بنا تھا اس سے یہی تاثر قائم ہوچکا تھا کہ نرگس دلیپ کمار سے پیار کرتی ہیں اور جلد ہی دونوں کی شادی ہوجائے گی۔

ابھی دلیپ اس خبر سے سنبھل نہیں پاتے کہ راج کپور آجاتے ہیں۔ نرگس انہیں دلیپ سے ملانے کے لیے لاتی ہیں اور ان کے سامنے دل کھول کر دلیپ کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں "راج، انہوں نے مجھے تمہاری کمی محسوس نہیں ہونے دی۔"

اس کے بعد کہانی ایک نیا رخ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ رومان کی ایک تکون بن جاتی ہے۔ نرگس اور دلیپ کمار کے میل جول اور اندازِ گفتگو کی وجہ سے راج کپور کے دل میں شک پیدا ہوجاتا ہے اور مختلف واقعات کی بنا پر اس میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ راج کپور کو نرگس کی بے وفائی اور ہرجائی پن کا یقین ہوجاتا ہے۔

ادھر دلیپ کمار کو بھی نرگس سے بے وفائی اور ہرجائی ہونے کا شکوہ ہے۔ فلم کا یہ حصہ ہدایت کار، مصنف اور اداکاروں کی ہنرمندی کا شاہکار ہے۔

نرگس جب دلیپ کمار سے اس کے بدلے ہوئے رویے کا سبب معلوم کرتی ہیں تو وہ ان کی بے وفائی کا تذکرہ کرتے ہیں۔

"یہ آپ کی غلط فہمی تھی۔ میں تو آپ کو دوست سمجھتی تھی۔ بہترین اور قابلِ اعتماد دوست۔"

لیکن دلیپ اپنی جگہ حق بجانب تھے۔ نرگس کے طرزِ عمل سے ہر کسی نے یہ تاثر لیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہیں۔ نرگس کے باپ نے بارہا اسے سمجھایا تھا کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے ملاقات میں ایک فاصلہ رکھنا چاہیے ورنہ حادثے جنم لیتے ہیں اور پھر یہی ہوتا ہے۔ ایک طرف ان کا منگیتر شکوک و شبہات میں مبتلا ہوچکا ہے، دوسری طرف دلیپ ان کی بے وفائی کے شاکی ہیں۔ ایک روز جنونی کیفیت میں وہ نرگس کے پاس جاتے ہیں اور ان کی دیوانگی کو دیکھ کر وہ پستول نکال کر انہیں رک جانے کو کہتی ہے "رک جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گی۔"

"تم مجھے گولی نہیں مار سکتیں۔" وہ اس کی طرف بڑھتے ہیں اور نرگس واقعی ان کو گولی ماردیتی ہے۔

مقدمہ چلتا ہے۔ بدنامی ہوتی ہے۔ ڈیڈی اب دنیا میں موجود نہیں ہیں مگر ان کی باتیں جو کسی وقت بے معنی معلوم ہوتی تھیں بالآخر تلخ حقائق کی صورت میں سامنے آچکی ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے

"جب ہم نہیں ہوں گے تو ہماری باتیں یاد آئیں گی۔"

نرگس کے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ باپ کی پیش گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوچکی ہے۔

"انداز" بھی اپنے موضوع اور پیشکش کی وجہ سے ایک یادگار اور شاہکار فلم تھی۔ یہ وہ فلم تھی جس نے انڈیا کی فلمی صنعت میں ایک نیا رجحان اور نیا انداز پیدا کیا تھا۔ اس کا اعتراف کٹر متعصب ہندو بھی کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ بھی ایسی فلم تھی جو دیکھنے والوں پر اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ یہ ایک سبق آموز موضوع تھا مگر انتہائی خوب صورت اور دلکش انداز میں محبوب نے یہ پیغام آنے والی نسلوں تک پہنچایا تھا۔ فلم کے تمام گانے جو نوشاد صاحب نے ترتیب دیے تھے سُپرہٹ تھے۔ ہر لحاظ سے یہ ایک ناقابلِ فراموش فلم تھی۔ اس زمانے میں ایسی فلمیں بنتی تھیں جو دیکھنے والوں پر گہرا تاثر چھوڑتی تھیں۔ بھرپور تفریح فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں سوچنے پر بھی مجبور کردیتی تھیں۔ وہ برصغیر میں مغربی تہذیب کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شروع میں اس کے پھیلنے کی رفتار بہت ہلکی اور سُست تھی مگر جب دنیا میں تیز رفتاری میں اضافہ ہوا تو ساری دنیا سکڑ کر رہ گئی۔ امریکی ذرائع ابلاغ اور تہذیبی اثرات نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے خلاف اُٹھنے والی آوازیں اب روز بروز کمزور تر ہوتی جارہی ہیں۔

دیکھیے آگے کیا کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا کا آغاز ہی سے یہ دستور رہا ہے۔ مختلف تہذیبیں فروغ حاصل کرتی ہیں اور پھر فنا ہوجاتی ہیں۔ ان کی جگہ نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں مگر اس وقت دنیا نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جتنی حیرت انگیز ترقی کرلی ہے اس کے پیشِ نظر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا اور دنیا والوں کا مستقبل کیا ہوگا؟

مغربی ملکوں اور خود ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں یہ رواج ہے کہ شوبزنس سے تعلق رکھنے والے افراد کے بچے بھی اسی پیشے سے وابستہ ہوجاتے ہیں اور اسی طرح نسل در نسل یہ خاندان اسی کاروبار اور پیشے سے منسلک رہتے ہیں۔ بھارت کی فلمی دنیا میں کئی قابلِ ذکر فلم سازوں، ہدایت کاروں اور اداکاروں کی اولادیں آج وہاں فلم اور ٹیلی وژن کی دنیا میں موجود ہیں۔ پرتھوی راج اور راج کپور کے بعد اب ان کی تیسری نسل بھی فلموں سے وابستہ ہے۔ پہلے اس خاندان کی یہ روایت تھی کہ اس سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں فلموں سے دور رہتی تھیں مگر اب یہ روایت بھی ختم ہوگئی۔ کرشمہ کپور اسی خاندان کی بیٹی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس خاندان کی بہوئیں ہمیشہ شوبزنس سے لاتعلق رہیں۔ شمی کپور، ششی کپور نے اپنی بیگمات سے فلموں میں کام نہیں لیا۔ رشی کپور نے اپنے زمانے کی نامور ہیروئن سے شادی کی مگر وہ فلمی دنیا میں نظر نہیں آئیں۔ اسی طرح ببیتا نے شادی کے بعد فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ شمی کپور نے گیتا بالی سے شادی کی تھی مگر اس غریب کی زندگی مختصر تھی۔ راجیش کھنہ اور ڈمپل کی بیٹی بھی اب معروف ہیروئن ہے۔ دھرمیندر کے بیٹے فلموں میں کام کر رہے ہیں۔ دیو آنند کا بیٹا بھی اداکاروں کی صف میں شامل ہے۔ مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ پہلے اداکارہ تھی اب فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن چکی ہے۔ نرگس اور سنیل دت کا بیٹا سنجے دت کافی عرصے سے فلموں میں کام کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ بھارت میں اس وقت شوبزنس سے تعلق رکھنے والوں کی دوسری اور تیسری نسل بھی شوبزنس سے وابستہ ہے۔ عامر خان اور سلمان خان بھی فلم سے تعلق رکھنے والوں کی اولادیں ہیں۔ یہ ایک طویل فہرست ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

پاکستان میں اس قسم کی روایت قائم نہیں ہو سکی البتہ اکا دکا ایسی مثالیں ضرور موجود ہیں۔ کسی زمانے میں سنتوش کمار اور ان کا خاندان پاکستان کی فلمی دنیا پر چھایا ہوا تھا مگر ان کی دوسری نسل فلموں سے بہت دور ہے۔ سنتوش کمار، درپن، سلیمان، صبیحہ خانم کے بچے اس کوچے میں کبھی نظر نہیں آئے۔ اس زمانے کے ایک اور معروف ہیرو سدھیر تھے، ان کی اولاد نے بھی فلمی دنیا میں دلچسپی نہیں لی۔ یوسف خان، اسلم پرویز اور حبیب کی اولادیں فلموں سے لاتعلق ہیں۔ کمال کے بیٹے غالب کمال نے فلموں اور ٹیلی وژن کا رخ کیا تھا مگر کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔

اداکاروں کے علاوہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے بچوں نے بھی اپنے والدین کی پیروی نہیں کی۔ اگر کوئی اس دنیا میں آیا بھی تو تھوڑے عرصے بعد رخصت ہوگیا۔ شوکت حسین رضوی کے بڑے بیٹے اکبر نے ہدایت کاری کے میدان میں قدم رکھا تھا مگر پھر اسے سلام کرلیا۔ سبطین فضلی کے بیٹوں نے ہدایت کاری میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ انور کمال پاشا کے بیٹے صرف مصنف بن کر رہ گئے۔ ڈبلیو زیڈ احمد کے صاحب زادے فرید نے باقاعدہ فلموں سے وابستگی اختیار کی تھی۔ شروع میں کامیاب نہیں ہوئے مگر "عندلیب" کے بعد بڑے ہدایت کار بن گئے تھے لیکن بدقسمتی سے یہ ان کی واحد کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ مسلسل ناکامیوں سے تنگ آکر وہ کینیڈا چلے گئے تھے جہاں ٹی وی سے وابستہ رہے۔ چند سال قبل کینسر میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ شوکت حسین رضوی اور نورجہاں کے بچوں نے شوبزنس میں کوئی دلچسپی لی اور نہ ہی کوئی کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میڈم نورجہاں بذاتِ خود اپنی بیٹیوں کے فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی سخت مخالف تھیں اور انہیں گھریلو عورتوں کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی بیٹیاں گھریلو زندگی گزارتی رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ عرصے بعد انہوں نے طلاق حاصل کرکے دوسری شادی کرلی۔ ان کی اور شوکت صاحب کی صاحب زادی ظلِ ہما کی اداکار عقیل سے شادی ہوگئی تھی۔ عقیل نے شوق کی حد تک اداکاری کی تھی۔ ان کا اصل پیشہ زرگری تھا۔ فلموں کو چھوڑ کر وہ جیولری کے بزنس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ لگ بھگ بیس سال تک ان کی اور ظلِ ہما کی شادی قائم رہی اور پھر اچانک علیحدگی ہوگئی۔

ظلِ ہما ہمیشہ اپنی ماں کی پرستار بلکہ عقیدت مند رہی ہیں مگر انہوں نے باقاعدہ گلوکاری اور گائیکی کبھی نہیں سیکھی۔ طلاق کے بعد اچانک انہوں نے گلوکاری کی طرف رخ کیا۔ ملکۂ ترنم جیسی شہرت تو حاصل نہ کرسکیں مگر کاروباری اعتبار سے تقریبات کی حد تک بہت کامیاب رہیں۔ ان کے والد شوکت حسین رضوی کو ان کا یہ روپ سخت ناپسند تھا۔ وہ بیٹی کی اس حرکت سے اتنے ناراض تھے کہ مرتے وقت بھی ان کی شکل دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔ ظلِ ہما کو ہمیشہ یہ صدمہ رہے گا کہ گلوکاری کے باعث وہ اپنے والد کی محبت سے محروم رہیں۔ بہرحال۔ پیسہ انہوں نے خوب کمالیا۔ اشک شوئی کے لیے یہی غنیمت ہے۔

پاکستان میں نگار خانوں کے مالکوں میں آغا جی اے گل،

سید شوکت حسین رضوی، باری ملک اور اشفاق ملک امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ شوکت صاحب کا اسٹوڈیو تو حصے بخرے ہوگیا۔ ان کے بچے اب اپنے اپنے حصے کا اسٹوڈیو چلا رہے ہیں مگر صرف نام کی حد تک ورنہ یہ مشہور و معروف نگار خانہ اب ویرانی اور عبرت کی تصویر پیش کرتا ہے۔

باری ملک کے بیٹوں نے اس کا انتظام سنبھالا تو یہ پاکستان ہی نہیں شاید برصغیر کا سب سے بڑا اسٹوڈیو تھا۔ جس میں دس فلور اور آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے باغ، کھیت، گاؤں، نہریں، سبھی کچھ موجود تھا مگر اب یہ اسٹوڈیو صرف زندگی کے دن پورے کررہا ہے۔ وہ شان و شوکت اور گہما گہمی نظر نہیں آتی جس کے لیے کسی زمانے میں یہ مشہور تھا۔

شباب کیرانوی نے بھی شہر سے دور ایک اسٹوڈیو "شباب اسٹوڈیو" بنایا تھا ان کے بعد اب یہ بھی محض زندگی کے دن پورے کررہا ہے۔ صرف آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے فلم ساز ادھر کا رخ کرتے ہیں۔

اشفاق ملک کا اے، ایم اسٹوڈیو سالہا سال سے ٹکڑے ٹکڑے ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کے ایک حصے کو انہوں نے کولڈ اسٹوریج میں تبدیل کردیا تھا۔ اس کے بعد یہ محض صدا بندی کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ آج کل صدا بندی بھی یہاں نہیں ہوتی۔ یہ مشہور اور معروف اسٹوڈیو بھی اب قصۂ پارینہ بن کر رہ گیا ہے۔ اشفاق ملک کی اولاد نے فلمی دنیا سے کبھی تعلق نہیں رکھا۔ یہ روایت ان کی ذات ہی تک محدود رہی حالانکہ کسی زمانے میں پاکستان اور بھارت میں یہ خاندان فلمی دنیا میں بہت نامور تھا۔

چوہدری ثنا اللہ نے بھی فلم ساز شیخ رشید کے اشتراک سے ثنائی اسٹوڈیو کے نام سے ایک بہت اچھا اسٹوڈیو بنایا تھا مگر کافی عرصہ قبل ہی اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ آج کل یہ اسٹوڈیو جماعت اسلامی کا ہیڈ کوارٹر "منصورہ" کہلاتا ہے۔ کہاں فلموں کی رنگینی اور کہاں جماعت اسلامی کا صدر مقام۔ زمین آسمان ہی بدل گئے ہیں۔ چوہدری ثنا اللہ فلم ساز، تقسیم کار اور سینما گھروں کے مالک تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے فلم سازی ترک کردی۔ تقسیم کاری سے بھی قطع تعلق کرلیا۔ سینما گھر فروخت کردیے۔ آج کل وہ اور ان کے بیٹے "ثنائی ہوٹل" کے نام سے ایک ہوٹل چلا رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے ان کا صرف اتنا تعلق باقی رہ گیا ہے کہ فلمی لوگ یہاں قیام کرتے ہیں اور کبھی فلمی تقاریب بھی منعقد ہوجاتی ہیں لیکن فلمی سرگرمیوں سے ان کا خاندان "تائب" ہوچکا ہے۔

ان حالات کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ پاکستان فلمی صنعت آہستہ آہستہ اپنی اہمیت اور رونق کھو ہے۔ یہاں تک کہ اب کہنے کو کچھ بھی کہہ لیں مگر یہ محض کو تسلی دینے کی باتیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان میں فلمی صنعت کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ اسے اس صو حال تک پہنچانے میں زیادہ کرم فرمائی ایک کے بعد ایک والی حکومتوں کی ہے مگر خود فلم والوں نے بھی اس صنعت سنوارنے اور ترقی دینے کے سلسلے میں کبھی کوئی مثبت نہیں اٹھایا۔ رفتہ رفتہ حالات خراب ہوتے گئے۔

جب اسمگلروں، ناجائز ذرائع سے دولت کمانے وا اور فلم سے ناواقف پیسے والوں نے فلمی دنیا کا رخ کیا تو ہی دیکھتے ماحول اور حالات بدل کر رہ گئے۔ اچانک سیلاب آیا کہ پرانے، تجربہ کار اور اس کام کو جاننے وا دل اور مایوس ہو کر بوریا بستر باندھ کر رخصت ہونے ہوگئے۔ ان کی جگہ جن لوگوں نے سنبھالی وہ غیر تعلیم یافتہ ہنر، بے بصیرت اور قطعی ناتجربہ کار تھے۔ ان میں اک چمک دمک کے شائقین اور عیش پرست لوگوں کی تھی شعبہ انحطاط کا شکار ہوگیا۔ معیاری فلموں کا قحط پڑا تو گھروں کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ غیر معیا فلموں، خراب اور گندے سینما گھروں اور سینما ٹکٹوں بڑھتے ہوئے نرخوں نے اس پر مزید ستم ڈھایا۔ جو دلیل پیش کرتے ہیں کہ آخر لوگ تھیٹر کا ٹکٹ روپے میں بخوشی خریدتے ہیں تو فلم کے بیس پچیس انہیں کیوں کھلتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ سارے میں ایک دن میں تھیٹر دیکھنے والوں کی تعداد بمشکل دو چار یا پانچ ہزار ہوتی ہے۔ جبکہ ایک سینما کے ایک شو میں سو افراد کی ضرورت ہوتی ہے اور فلم کے دن میں تین شو ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تھیٹر ہال سینما گھروں کی نسبت زیادہ پُرسکون، صاف ستھرے اور شائستہ ماحول حامل ہوتے ہیں جہاں انتظامیہ کی طرف سے کسی بد تمیزی کیا، آواز لگانے یا سگریٹ نوشی کرنے کی اجازت بھی دی جاتی اس لیے ناظرین بہت سکون، اطمینان اور شا سے ڈراما دیکھتے ہیں حالانکہ اکثر ڈرامے شائستگی سے ہوتے ہیں۔ ایک سب سے اہم فرق یہ ہے کہ تھیٹر کو سا دنیا میں ہمیشہ فلم پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ تھیٹر کے اداکا کو معاوضے قدرے کم ملتے ہیں مگر ان کی قدر و منزلت پذیرائی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تھیٹر کے ٹکٹ ہر جگہ فلم مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ تماشائی اپنے

اداکاروں کو اپنے سامنے گوشت و پوست کے انسانوں کی صورت میں دیکھتے ہیں جبکہ سینما اسکرین پر وہ محض تصویریں دیکھ سکتے ہیں۔

اس قسم کی وجوہات کی بنا پر فلموں کی جانب لوگوں کا رجحان کم ہوتا رہا۔ فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار، اداکار، مصنف، ہنرمند سبھی شعبے تجربہ کار اور بلند معیار شخصیات سے محروم ہونے لگے جو فلم کے نئے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ مجبوراً فلمی صنعت سے برگشتہ اور دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ بیٹھے۔ اس میں ان کی خوشی یا انا کا کوئی دخل نہ تھا۔ جن لوگوں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام فلمی صنعت کی نذر کردیے ہوں اور فلموں کو عالمی معیار پر لانے کے خواب دیکھتے رہے ہوں جب نئی لہر آئی تو اس سیلاب میں ان کے تمام خوابوں کے محل چکنا چور ہو کر رہ گئے اور وہ اس ماحول اور طور طریقوں کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ناکام رہے اس لیے ایک ایک کرکے فلمی دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حالانکہ اس زیاں کا دکھ انہیں ساری عمر رہا۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا اوڑھنا بچھونا ہی ساری زندگی فلم رہا تھا۔ وہ کوئی اور کام کرنے کی صلاحیت اور آمادگی سے محروم تھے۔ ان میں سے بیشتر جو فلمی دنیا کے آفتاب و ماہتاب تھے، ایسے گہنائے کہ ٹوٹے ہوئے تاروں کی مانند خاک ہی میں مل کر رہ گئے مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ ان کی باقی ماندہ زندگی پچھتاووں، مایوسیوں اور محرومیوں میں ہی گزری۔ اس وقت جو گنتی کے کچھ لوگ باقی ہیں وہ سوائے سوگ منانے کے اور کیا کرسکتے ہیں!

ان حالات میں جبکہ نئے لوگوں کی آمد کے لیے بھی فلم کے حالات سازگار نہ تھے، پرانے خاندان اس سے کیوں وابستہ رہ سکتے تھے۔ فلمی صنعت میں اگلی نسلوں کے نہ آنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ نوجوان نسل کو اس انحطاط پذیر دم توڑتی ہوئی صنعت میں درخشاں مستقبل کی ایک کرن تک نظر نہیں آتی تھی۔ مختصر یہ کہ بہت سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں فلمی صنعت پر حکمرانی کرنے والوں کی اگلی نسلوں نے فلمی صنعت کو دور ہی سے سلام کرنے میں عافیت جانی۔

اس کے باوجود دو گھرانے ایسے ہیں جو آج بھی رسم وفا نبھاتے ہوئے فلمی صنعت اور شوبزنس سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے بدترین حالات کے باوجود ہار نہیں مانی۔ جیسے تیسے شوبزنس کی روایات کو نبھاتے رہے۔ ان میں ایک تو آغا جی اے گل کا گھرانا ہے۔ ان کے دو صاحب زادے شہزاد گل اور سجاد گل آج بھی فلم اور شوبزنس سے وابستہ ہیں۔ فلم سازی اور تقسیم کاری کررہے ہیں۔ سینما بھی چلا رہے ہیں۔ اگرچہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت انہوں نے محض فلم پر اکتفا کرنے کے بجائے مستقبل کے الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹیلی وژن کی جانب بھی توجہ دی ہے اور اس میدان میں کافی پیش قدمی کی ہے۔

○☆○

جگدیش چندر آنند کی داستان اس سے پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ انہوں نے بہت چھوٹے درجے سے اتنی ترقی کی تھی کہ ضرب المثل بن گئے تھے۔ وہ پاکستان میں صرف اس لیے نہیں رہے تھے کہ دولت کمائیں گے۔ انہوں نے بہت بڑا رسک لے کر پاکستان میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر دل و جان سے اس فلمی صنعت کی خدمت کرتے رہے۔ پاکستان میں فلمی صنعت کے قیام اور استحکام کے سلسلے میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی پاکستان چھوڑنے کا ارادہ نہیں کیا اور اپنا سب کچھ جو کہ انہوں نے اسی ملک سے کمایا تھا، پاکستان ہی کی نذر کردیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ ان کی پاکستان سے محبت اور عقیدت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ بے پناہ دولت کمانے کے باوجود انہوں نے اپنا سرمایہ پاکستان سے باہر منتقل نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی خالص پاکستانی بنا دیا۔ جگدیش صاحب کو ہمیشہ یہ احساس و اعتراف رہا کہ پاکستان نے انہیں بہت کچھ دیا ہے اس لیے اس کی خدمت کرنا ان کا فرض ہے۔ انہوں نے بہت سی فلمیں بنائیں اور لاتعداد فلمیں بنانے کے لیے سرمایہ فراہم کیا۔ انہوں نے ہزاروں فلمیں بطورِ تقسیم کار نمائش کے لیے پیش کیں۔ ان کے دفاتر کراچی، لاہور اور ڈھاکا میں تقسیم کاری کے سب سے بڑے مراکز تھے۔ سقوط ڈھاکا کے باعث ان کی ہزاروں فلمیں اور شاندار دفتر وہیں رہ گیا تھا مگر ان کی پیشانی پر بل تک نہیں آیا۔ نہ انہوں نے کبھی اس بات کا شکوہ کیا۔ وہ بدستور کراچی اور لاہور کے دفاتر کو ترقی دینے میں مصروف رہے۔ ان کے ابتدائی دنوں میں جن لوگوں نے ان کی مدد کی تھی انہیں جگدیش صاحب نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ دامے درمے سخنے ہمیشہ ان کی خدمت میں مصروف رہے۔ وہ فلمی دنیا میں جے سی، یا جے سی آنند کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں لوگ "سیٹھ صاحب" بھی کہتے تھے مگر انہوں نے یہ لقب کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ بہت سادہ اور منظم زندگی بسر کرتے تھے۔ گھر کا سودا ہر روز خود

بازار سے لایا کرتے تھے۔ غرور یا تکبر ان کو چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ اس کے برعکس انکسار اور عاجزی ان کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ان کے مقابلے میں کئی بار بڑی دھوم دھام اور کثیر سرمائے کے ساتھ نئے تقسیم کار ادارے قائم کیے گئے مگر جلد ہی غائب ہو گئے جبکہ ایور ریڈی پکچرز آج بھی قائم ہے۔

جگدیش صاحب کے اکلوتے بیٹے ستیش چندر آنند ۱۹۵۱ء میں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ یہ سونے کا چمچہ آج بھی ان کے استعمال میں ہے۔ قدرت نے ان کو اس سے محروم نہیں کیا ہے جس کا بڑا سبب ان کے والد کی تربیت اور محنت اور اب خود ان کی ذہانت اور صلاحیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ بے شمار پاکستانی سیاست دانوں، بیورو کریٹس اور صنعت کاروں کے بچے تعلیم کے لیے بیرون ملک گئے اور پھر وہیں کی رنگینیوں اور آسائشوں میں گم ہو کر رہ گئے مگر جگدیش صاحب ان سے بالکل مختلف تھے۔ وہ آخر دم تک ایک پاکستانی رہے اور ان کا بیٹا بھی ہر طرح کے مسائل سے دو چار ہونے کے باوجود ایک خالص پاکستانی ہے۔ ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو وہ دوسرا دروازہ تلاش کر لیتا ہے۔ فلمی صنعت زوال کا شکار ہوئی تو اس سے متعلق بڑے بڑے ادارے اور گھرانے نیست و نابود ہو گئے مگر ستیش آنند نے آنے والے حالات کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں جمع کر دینے کے بجائے انہوں نے دوسرے شعبوں کا بھی جائزہ لیا۔ شوبزنس کے نئے تقاضے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پورے ہو سکتے تھے۔ چھ سات سال قبل ٹیلی وژن کے کاروبار کا بظاہر کوئی مستقبل نظر نہیں آ رہا تھا مگر ستیش آنند کی دوربین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا اور اندازہ لگا لیا تھا کہ شوبزنس کا اگلا روپ ٹیلی وژن ہی کی صورت میں ابھرے گا لہٰذا انہوں نے اس وقت ٹیلی وژن کے شعبے میں کام کا آغاز کیا جبکہ دوسرے لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ تک نہیں تھا۔ آج وہ پاکستان میں ٹیلی وژن کے شعبے میں ایک بہت بڑا نام ہیں۔ اپنا پرائیویٹ چینل قائم کرنے کے لیے بھی انہوں نے بہت کوشش کی ہے اور ان کا یہ خواب بھی یقیناً شرمندۂ تعبیر ہو گا کیونکہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت پاکستان میں بھی پرائیویٹ ٹی وی چینل قائم کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔

ستیش آنند نے کالج تک کراچی ہی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۷۷ء میں ان کے والد اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے تو نوجوان ستیش آنند نے پاکستان آ کر ان کا تمام کاروبار سنبھال لیا۔ انہیں اپنے آنجہانی والد کے طریقۂ کار کا علم تھا۔ ان کے اصولوں سے بھی واقف تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جے سی آنند جن لوگوں کے قدر دان تھے، ستیش صاحب نے انہیں بھی سر آنکھوں پر جگہ دی۔ پرانے لوگوں کا احترام اور ان کی عزت افزائی ان کی ایک نمایاں خوبی ہے۔ وہ ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو نئے تقاضوں کے مطابق کام کر سکیں اور نئی نسل کو اپنے تجربے اور لیاقت کی روشنی فراہم کر سکیں۔

ستیش صاحب کو ہم نے پہلی بار دیکھا تو وہ نو عمر اور ناتجربہ کار نظر آئے۔ نو عمر تو وہ تھے مگر ناتجربہ کار نہ تھے، بہت جلد انہوں نے اس بات کا ثبوت فراہم کر دیا۔ فلمی کاروبار کو انہوں نے مشکل حالات میں بھی ترک کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ خود بھی فلم سازی کی اور سرمایہ کاری اور تقسیم کاری کے ذریعے فلمی صنعت کو سرمایہ بھی فراہم کرتے رہے۔ فلمی صنعت کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے اور بڑے بڑے ادارے دل برداشتہ ہو کر فلم سے قطع تعلق کر رہے تھے مگر ستیش صاحب بدستور فلمی کاروبار سے وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے کچھ عرصے بعد ٹیلی وژن کی جانب بھی توجہ دی اور رفتہ رفتہ اتنی پیش قدمی کی کہ اس وقت ٹیلی وژن کی دنیا میں وہ ایک بڑا نام بن چکے ہیں۔ "ایور ریڈی گروپ آف کمپنیز" کے تحت ان کے مختلف کاروبار ہیں جن میں ٹیلی وژن سرفہرست ہے۔ اپنے والد کے پرانے دفتر کو انہوں نے قائم رکھا ہے جو ایم اے جناح روڈ پر آج بھی اسی طرح موجود ہے لیکن چندریگر روڈ پر ایک بلند و بالا عمارت میں "ایور ریڈی چیمبرز" بھی قائم ہو چکا ہے۔ یہ ایک وسیع ادارہ ہے جو پاکستان اور بیرون ملک ٹیلی وژن کے کام کرتا ہے۔ انہوں نے نوجوان، ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائی ہے جو مختلف کاموں میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے۔

ستیش صاحب سے ہماری پہلی ملاقات ہماری امریکا سے واپسی کے بعد ہوئی تھی۔ ہم نے فلم سازی ترک کر دی تھی اور فلمی دنیا سے بھی برائے نام تعلق رہ گیا تھا۔ شباب صاحب کے بیٹے نذر شباب نے ایک فلم کے لیے ہمیں لکھنے کے لیے کہا تو انکار نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں ہم پرانے دوست پرویز ملک کے لیے بھی چند اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ ان میں گمنام، مہربانی اور کامیابی شامل ہیں۔

نذر شباب نے ایک انگریزی ناول ہمیں دیا اور فرمائش کی کہ اس پر فلم کا اسکرپٹ بنایا جائے۔ یہ فلم "کبھی الوداع نہ کہنا" کے نام سے بنائی گئی تھی۔ اس کی تفصیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ اس فلم کا ایک حصہ سری لنکا میں فلمایا گیا تھا جس کے لیے ہم نے بندوبست کیا تھا۔ ایک ہیروئن (سبیتا) اور چند مقامی اداکاروں کا انتخاب بھی ہم ہی نے کیا تھا جس پر نذر شباب نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

ستیش صاحب سے ہماری پہلی ملاقات اسی فلم کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ فلم کا ابتدائی منظر نامہ ہم نے لکھ لیا تھا۔ اداکاروں کے سلسلے میں سری لنکا سے سبیتا اور پاکستان سے شبنم کے ساتھ ہم جاوید شیخ کو ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔ اس تجویز پر نذر شباب نیم رضامند ہو گئے مگر معلوم ہوا کہ ستیش صاحب اس کے حق میں نہیں ہیں۔

نذر نے ایک دن ہم سے کہا "آفاقی صاحب۔ ستیش لاہور آنے والے ہیں تاکہ اس فلم کے بارے میں فیصلہ کر لیے جائیں۔"

نذر شباب کو معلوم تھا کہ ستیش صاحب کو مطمئن کیے بغیر ان کا پراجیکٹ آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ ستیش صاحب نے جب اپنے والد کا کاروبار سنبھالا تو بہت جلد پاکستان کی فلمی صنعت اور فلمی معاملات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ شباب صاحب کے بیٹوں کی فلموں کے تمام مراحل اور مسائل وہ خود ہی طے کیا کرتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ستیش صاحب کو نذر شباب پر مکمل بھروسا نہیں تھا اس لیے وہ خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے کے بعد یہ سودا شروع کرنا چاہتے تھے۔

ستیش صاحب سے ہماری پہلی ملاقات لکشمی چوک پر واقع ان کے دفتر میں ہوئی۔ وہ بے حد احترام سے ملے۔ کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ بہت عزت افزائی کی اور کہا کہ آپ سینئر اور تجربہ کار ہیں۔ ڈیڈی کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے تجربے اور صلاحیت سے ہم نوجوان بھی فائدہ اٹھائیں۔ نذر بھی میری طرح نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان کی بھی رہنمائی کریں۔

اس تمام گفتگو میں ستیش صاحب نے انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ بہت شستہ اور رواں اردو میں باتیں کرتے رہے۔ چائے منگائی اور پھر سنجیدگی سے حرفِ مطلب زبان پر لائے۔

انہوں نے کہا "آفاقی صاحب۔ آپ اپنے تجربے اور ہنرمندی کے تحت مجھے نہایت دیانت داری سے اس پراجیکٹ کے بارے میں اپنی رائے بتائیے۔ اطمینان رکھیے کہ یہ باتیں میرے اور آپ کے درمیان ہی رہیں گی۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ کہانی کا موضوع بہت اچھا ہے۔ اس اسکرپٹ پر بہت اچھی فلم بنائی جا سکتی ہے۔ نذر ایک تجربہ کار ہدایت کار ہیں۔ وہ یقیناً اس کے ساتھ انصاف کریں گے۔

بولے "یہ آپ اسے اپنے دوست کا بیٹا سمجھ کر کہہ رہے ہیں یا واقعی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟"

ہم نے کہا "وہ ہمارے بے حد عزیز دوست کے بیٹے ہیں مگر کام کے بارے میں ہم کبھی غلط رائے نہیں دیتے۔"

اس کے بعد موسیقار اور اداکاروں کے بارے میں گفتگو ہوئی۔

"سبیتا کیسی ہیروئن رہے گی؟" انہوں نے پوچھا "مجھے تو اس کی تصویریں زیادہ اچھی نہیں لگیں۔"

ہم نے کہا "وہ سری لنکا کی نوخیز ابھرتی ہوئی ہیروئن ہے۔ باصلاحیت بھی ہے۔ تصویروں سے آپ اندازہ نہ لگائیے۔ ہم نے اس کی فلمیں دیکھی ہیں اور بذاتِ خود بھی اس سے ملے ہیں۔ یہ کردار ہلکا پھلکا ہے۔ کہانی کا سارا بوجھ شبنم پر ہو گا اس لیے سبیتا اس کے لیے بہت موزوں ہیں۔ نیا چہرہ ہونے کی وجہ سے دیکھنے والے بھی ان میں دلچسپی لیں گے۔"

پوچھا "ہیرو کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"ہمارے خیال میں جاوید شیخ اس کے لیے بہت موزوں ہیں۔ کامیڈی کے ساتھ ساتھ وہ ڈرامائی کردار بھی کر سکتے ہیں۔ ٹی وی کا تجربہ بھی ہے اور ٹی وی ڈراموں میں پسند بھی کیے جاتے ہیں۔"

"مگر جاوید کی پہلی فلم ایک سال پہلے بنی تھی اور فلاپ ہو گئی تھی۔"

ہم نے کہا "اس میں جاوید سے زیادہ کہانی اور ہدایت کار قصوروار تھا۔ جاوید ایک باصلاحیت اداکار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت کامیاب ہیرو ثابت ہو گا اور ہمارے فلمی اداکاروں میں ایک اچھا اضافہ ہو گا۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے "بس۔ جاوید شیخ کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہے کیا وہ شبنم جیسی اداکارہ کے سامنے ایک مشکل کردار کر سکے گا؟"

ہم نے کہا "ستیش صاحب۔ اس نے دس سال پہلے

بھی شبنم کے ساتھ ہی کام کیا تھا۔ ویسے بھی اب وہ زیادہ پُر اعتماد ہوچکا ہے۔ ٹیلی وژن ڈراموں سے اس کو بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ندیم کے بعد اگر کوئی اس کردار کے ساتھ انصاف کرسکتا ہے تو وہ جاوید شیخ ہے۔"

ستیش صاحب نے چند لمحے مجھے دیکھا پھر کہا "آپ نے تو بہت بڑی تعریف کردی ہے۔ اس کے بعد مزید گنجائش نہیں رہتی مگر آپ برا نہ مانیں۔ دراصل نذر کے ساتھ میری یہ پہلی فلم ہے جو پاکستان سے باہر بھی بنے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس سلسلے میں نذر کی پوری پوری مدد کریں گے۔"

اسی شام ستیش صاحب نذر شباب کے دفتر میں آئے۔ ایم اشرف کی بنائی ہوئی دھنیں سنیں، کہانی ایک بار پھر سنی۔ انہیں ہر بات سے اتفاق تھا سوائے جاوید شیخ کے۔ نذر کا بھی اس معاملے میں "نیمے دروں نیمے بروں" والا معاملہ تھا۔ ہماری سنتے تو قائل ہوجاتے تھے۔ مخالف دلائل سن کر ڈانواں ڈول ہوجاتے تھے۔

ستیش صاحب کچھ دیر بعد چلے گئے۔ لاہور سے کراچی جانے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر اپنے دفتر میں ہم سے ملاقات کی اور ہم نے ایک بار پھر جاوید شیخ کی پر زور وکالت کی۔ آخر وہ مان گئے اور اس طرح یہ منصوبہ شروع ہوگیا۔ اس فلم کے یونٹ کے لیے پاکستان اور سری لنکا میں اجازت نامے حاصل کرنے کے لیے ہم نے جو بھاگ دوڑ کی تھی وہ تفصیل پہلے بیان کرچکے ہیں۔

سری لنکا میں شوٹنگ کے دوران میں بھی ہم کولمبو میں ہی مقیم رہے۔ دوسرے تیسرے دن ستیش صاحب ٹیلی فون کے ذریعے ہم سے صورتِ حال دریافت کرتے رہتے تھے۔ واپسی پر انہوں نے مزید تصدیق کے لیے ہم سے علیحدگی میں فلم کے بارے میں دریافت کیا اور ہم نے انہیں اطمینان دلا دیا۔ اس طرح ستیش صاحب سے ہمارا تعلق قائم ہوگیا۔

"کبھی الوداع نہ کہنا" بہت کامیاب رہی جس کی وجہ سے ستیش صاحب کو ہماری رائے پر زیادہ اعتماد ہوگیا۔

جب بھی وہ لاہور آتے، فون کرکے ملاقات کے لیے ہمیں ضرور بلاتے تھے۔ فلمی صنعت کے بارے میں پوچھتے رہتے۔ اپنی زیرِ تکمیل فلموں کے بارے میں رائے معلوم کرتے۔ اکثر وہ کہتے "آفاقی صاحب۔ آپ جیسے لوگوں کو فلمیں بنانا چاہیے۔ آپ خود کیوں فلم نہیں بناتے؟"

ہم مختلف وجوہات پیش کرکے اپنا نقطۂ نظر اور مجبوریاں بیان کردیتے تھے۔ اسی طرح یہ سلسلۂ ملاقات پابندی سے جاری رہا۔

چند سال قبل انہوں نے ٹیلی وژن کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ لاہور آکر ہم سے ملاقات کی اور کہا کہ فلمی صنعت جیسے تیسے چل رہی ہے مگر مستقبل ٹی وی کا ہے۔ آپ ٹی وی کے لیے کام کیوں نہیں کرتے۔ ہم جواب میں انہیں بتاتے کہ اپنے موجودہ کام سے ہم مطمئن ہیں۔ کوئی جھگڑا ٹینشن، پرابلمز نہیں ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں اور جو دال دلیا مل جاتا ہے اس پر قانع ہیں۔

ایک بار ستیش صاحب نے کراچی سے فون کیا کہ وہ کل لاہور آرہے ہیں "آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ کچھ بات بھی کریں گے۔"

دوسرے دن ہم ان کے دفتر گئے تو ظفر صمدانی صاحب بھی موجود تھے۔ صمدانی صاحب سے ہماری پرانی ملاقات اور نیاز مندی ہے۔ وہ ٹیلی وژن کے ابتدائی معماروں میں سے ہیں۔ صحافت اور دستاویزی فلموں کے شعبوں میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر قادر ہیں۔ بہت نفیس اور دیانت دار آدمی ہیں۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوتی ہے اور بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔ صمدانی صاحب کا شمار بھی جگدیش صاحب کے شناساؤں میں ہوتا ہے۔ اس لیے ستیش صاحب ان کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔

اس ملاقات میں کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ ستیش صاحب ٹیلی وژن کے لیے پروگرام متعارف کرانے کے خواہش مند تھے۔ ہم نے انہیں کئی آئیڈیے دیے جو انہیں پسند آئے۔ ان میں سے کئی پر انہوں نے بعد میں عمل بھی کیا۔

انہوں نے ہم سے کہا "آپ بھی میرے لیے کچھ کیجئے۔ پروڈکشن، ڈائریکشن، رائٹنگ۔ جو بھی کرسکیں، مجھے منظور ہے۔ آپ جیسے تجربہ کار پرانے لوگوں کو ٹیلی وژن کی طرف آنا چاہیے۔"

ہم نے پھر اپنی مجبوریاں بیان کیں۔ موجودہ مصروفیات کے بارے میں بتایا۔

وہ بولے "آفاقی صاحب۔ آیئے۔ ہم سیدھی اور کاروباری بات کریں۔ آپ اس وقت کام کرکے جو حاصل کررہے ہیں میں اس سے دگنے معاوضے کی پیشکش کرتا ہوں۔ آپ ٹیلی وژن کے لیے جو بھی کرسکتے ہیں، ضرور کیجئے۔"

اس وقت کچھ ایسی مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے ہم

...فراخ دلانہ پیشکش قبول نہیں کرسکتے تھے لیکن ہم نے ...لف پروگراموں کے سلسلے میں تجاویز دیں جن میں ...انہوں نے عمل درآمد بھی کیا۔

...والد کی طرح ستیش صاحب میں بھی یہ خوبی ہے ...اور اچھی تجویز انہیں پسند آجاتی ہے اور وہ اس پر ...میں دیر نہیں لگاتے۔ جس زمانے میں پاکستان میں ...پنجابی فلمیں بنائی جارہی تھیں اور اردو فلم بنانے ...میں کوئی سوچتا تک نہیں تھا اس وقت ستیش ...کو یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک اردو فلم بنائی جائے۔ ...کی ہدایت کاری کے لیے انہوں نے شمیم آرا کا ...کیا حالانکہ اس وقت شمیم آرا کئی فلمیں بنانے کے ...ی سے گھر بیٹھ گئی تھیں۔ ستیش صاحب نے اردو ...کا پروگرام انہیں بتایا تو وہ اس فلم کی ہدایت کاری ...آمادہ ہوگئیں۔ اس فلم کے لیے انہوں نے ایک ہلکی ...انتخاب کیا اور سری لنکا میں "ہاتھی میرے ...ساتھی"... یہ فلم سپرہٹ ہوگئی اور ہماری فلمی صنعت ...چال کے عادی دوسرے فلم سازوں نے بھی ایک بار ...فلمیں بنانی شروع کردیں۔ اس طرح اردو فلموں کا ...دور شروع ہوگیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو فلموں کا دور ...لانے میں شمیم آرا کی فلم "ہاتھی میرے ساتھی" اور ...کی فلم "جیوا" کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ان دونوں فلموں ...نے فلم سازوں کو ایک بار پھر اردو فلمیں بنانے کی ...راغب کردیا۔

...ش صاحب کی زندگی کا ایک پہلو بہت عجیب ہے۔ وہ ...روایت پسند ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے والد اور ...ہم عصر لوگوں نے شوبزنس میں جو کام کیا ہے اسے ...رکھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایور ریڈی پکچرز ہمارے ...کی عظیم جدوجہد کی نشانی ہے۔ اس کو سنبھال کر رکھنا ...فروغ دینا ہماری ذمے داری ہے۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر ...انہوں نے مختلف فلم سازوں سے فلمیں بنوائیں اور ...سرمایہ فراہم کیا۔ ان کی فلموں کے تقسیم کاری کے ...حاصل کیے اور فلمی صنعت کو زندہ رکھنے کی ہر طرح ...کی لیکن فلمی صنعت جس تیزی اور تسلسل سے ...کا شکار ہوتی رہی ہے اس کے پیشِ نظر ستیش صاحب ...پر پہنچے کہ فی الحال فلم سازی کے لیے فضا سازگار ...ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تمام توجہ ٹیلی وژن ...کردی ہے لیکن یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے والد کے ...ہوئے ادارے کو زندہ رکھا ہے اور اسے مزید ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

ستیش صاحب کو شوبزنس سے وابستہ ہوئے لگ بھگ ۳۳ سال گزر چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور کردار کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی ذات سے کبھی کوئی اسکینڈل منسوب نہیں ہوا۔ وہ ایک پر مسرت گھریلو زندگی گزارتے ہیں۔ کاروبار اور گھر کو انہوں نے بالکل علیحدہ رکھا ہے اور اپنی جگہ دونوں کے حقوق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

جگدیش صاحب کی طرح آغا جی اے گل کے بیٹوں نے بھی اپنے ادارے کو زندہ رکھنے کے لیے بہت کام کیا ہے۔ سجاد گل اور شہزاد گل فلم سازی کرتے رہتے ہیں۔ سجاد گل نے ٹیلی وژن کے شعبے میں بھی بہت نام پیدا کیا ہے۔ ان کی زیادہ تر توجہ کا مرکز ان دنوں ٹیلی وژن ہی ہے۔ حال ہی میں ان کی تازہ ترین فلم "تو پیسہ نو پرابلم" ریلیز ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ "جو ڈر گیا وہ مرگیا" بنا چکے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی شہزاد گل کی فلم "گھر کب آؤ گے" سپرہٹ فلم ثابت ہوئی ہے اور آج کل وہ ایک نئی فلم بنانے میں مصروف ہیں۔ دیکھا جائے تو صحیح معنوں میں یہی دو گھرانے ہیں جو دوسری نسل میں بھی فلمی روایات نبھا رہے ہیں۔ ان کی اگلی نسل کا کیا رویہ ہوگا اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

○☆○

نازیہ حسن کی زندگی بھی ایک افسانوی داستان معلوم ہوتی ہے۔ جیسے بچوں کو سنائی جانے والی پریوں کی کہانی۔ وہ بھی ایک پری ہی تھی۔ ننھی منی، خوب صورت، خوش گفتار، خوش آواز۔ جب وہ گاتی تھی تو اس کی خوب صورت معصوم آواز دلوں میں اتر جاتی تھی۔ جب وہ بولتی تھی تو اس کی باتیں سننے کو جی چاہتا تھا۔ جب وہ مسکراتی تھی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود ایک اداسی سایہ فگن رہتی تھی۔ حالانکہ اسے دنیا کی ہر نعمت اور خوشی میسر تھی مگر اس کی مسکراہٹ میں ہمیشہ ایک پراسراریت اور غم گینی جھلکتی رہتی تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ اسے کس چیز کی کمی تھی پھر بھی اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے پیچھے اداسی اور ہنستے ہوئے چہرے کے تاثر میں غم و الم کی ملاوٹ کیوں محسوس ہوتی تھی؟ شاید اس لیے کہ وہ اپنے المناک انجام سے شروع ہی سے آگاہ تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک پری تھی۔ دور دیس سے آئی تھی۔ کوہ قاف کی وادیوں کا طویل راستہ طے کرتے ہوئے اسے ایک طویل مدت گزر چکی تھی۔ اس کو اپنے انجام کا بھی علم تھا شاید اسی لیے وہ ایسی پُراسرار، تنہا اور اداس اداس سی نظر آتی تھی۔

نازیہ حسن سے میں کبھی نہیں ملا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے میرے پڑوس میں رہتی آئی ہے اور ہر وقت میرے آس پاس ہی رہتی ہے۔ میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی مگر اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ اور اس کے گیت مجھ سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اسے ہمیشہ سے جانتا ہوں اور وہ بھی اپنے بارے میں میرے جذبات اور احساسات سے بے خبر نہیں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس سے کوئی بات کہوں گا تو وہ بڑی توجہ سے سنے گی اور اس پر ضرور دھیان دے گی مگر میں نے اس سے کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ کوئی فرمائش نہیں کی یہاں تک کہ وہ تقدیر کے ہاتھوں اور اپنوں کے ذریعے جس المناک انجام کو پہنچی، میں نے اس کی شکایت بھی نہیں کی مگر اب جبکہ وہ اس دنیا سے چلی گئی ہے تو میں اس کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہ خوشیاں بخشے جن سے وہ اس دنیا میں محروم رہی ہے۔ اس عذاب سے اس کو محفوظ رکھے جیسے عذاب سے وہ جیتے جی زندگی کے آخری سالوں میں گزرتی رہی ہے۔ وہ اپنوں کے ستم کا نشانہ بنتی رہی۔ یہاں تک کہ ان سب سے مایوس ہو کر اپنے پریوں کے دیس میں واپس چلی گئی۔

نازیہ حسن کا چہرہ اور آواز پاکستان میں کسی کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ وہ ہمارے سامنے ایک بچی تھی اور اپنی معصوم آواز میں گیت سنایا کرتی تھی۔ موسیقار سہیل رعنا کے پروگرام "ہم سورج چاند ستارے" نے پاکستانی موسیقی میں کئی گلوکاروں کو تربیت دے کر موسیقی کی دنیا سے متعارف کرایا اور انہوں نے خوب شہرت سمیٹی۔ نازیہ حسن کے گروپ میں ان کا بھائی زوہیب حسن اور عدنان سمیع بھی شامل تھے۔ جب بچوں کا گروپ مل کر نغمے گاتا تھا تو ان تینوں کی آوازیں ان میں نمایاں ہوتی تھیں۔ سہیل رعنا کی تجربہ کار نگاہوں نے بھی جانچ لیا تھا کہ یہ بچے مستقبل کے منتخب گلوکار ہوں گے۔

پھر نازیہ حسن اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ انگلستان چلی گئیں۔ ان کی بیشتر تعلیم وہیں مکمل ہوئی مگر انگلستان کے مغربی ماحول نے نازیہ حسن کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ انگریزوں میں رہ کر بھی وہ خالص مشرقی لڑکی تھیں۔ مشرقی لباس پہنا کرتی تھیں۔ مشرق کی روایتی شرم و حیا کا دامن انہوں نے کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی لندن میں پلی بڑھی اور پڑھی ہے۔ ان کا اردو لب و لہجہ اور تلفظ بے عیب تھا یہاں تک کہ جب انہوں نے ایک پنجابی گیت گایا تو اس میں بھی کوئی ملاوٹ نہیں محسوس ہوئی۔ انہوں نے پنجابی کے ساتھ بھی پورا انصاف کیا تھا۔

موسیقی نازیہ اور اس کے بھائی کا شوق ہی نہیں ان کا جنون تھا۔ نازیہ حسن نے ایک بار کہا تھا کہ موسیقی میری زندگی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دیکھ لیجیے شادی کے بعد جب وہ موسیقی سے دور ہوئیں تو زندہ نہ رہ سکیں۔ حالات اور بیماری دونوں نے مل کر ان کا کام تمام کر دیا۔ ان دونوں میں سے زیادہ مہلک کون سی چیز تھی یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے مگر زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ کینسر سے جنگ کر رہی تھیں اس وقت ازدواجی جھگڑوں اور مقدموں کے بارے میں انہوں نے جو بیانات جاری کیے وہ ان کے دکھوں کے ترجمان تھے۔ نازیہ حسن کی جان کس نے لی ہے۔ کینسر نے یا انسانوں کے بخشے ہوئے دکھوں نے؟ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔

نازیہ اور زوہیب بہن بھائی تھے مگر یوں لگتا تھا جیسے جڑواں بہن بھائی ہیں۔ صورت شکل، عادت و اطوار، آواز، گلوکاری کے انداز اور شائستگی میں وہ ایک دوسرے کا پرتو نظر آتے تھے۔ ان کی سوچ ایک جیسی تھی۔ موسیقی سے ان کا لگاؤ بھی یکساں تھا۔ انہوں نے مل کر گانا سیکھا تھا اور مل کر نغمے بناتے اور گاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک دوسرے کے بغیر وہ نامکمل ہیں۔ ان کا جسم و جاں ایک ہے۔ اگر انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا گیا تو وہ ادھورے ہو جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

نازیہ حسن نے سارے کام بہت عجلت میں کیے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھیں جنہیں ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔ شاید انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ زندگی بہت تھوڑی اور کام بہت زیادہ اسی لیے وہ جلدی جلدی تمام کاموں کو نمٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

نازیہ حسن کا پہلا گیت انہوں نے تیرہ سال کی عمر میں ریکارڈ کرایا تھا۔

"آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے... تو بات بن جائے۔"

کتنی معصوم سی خواہش تھی جو پوری نہ ہو سکی۔

یہ گیت انہوں نے ۱۹۷۶ء میں ریکارڈ کرایا تھا۔ اس کی موسیقی بدو نے بنائی تھی۔ نازیہ حسن، زوہیب حسن اور بدو کی ایک ٹیم تھی۔ ان دونوں کے دوسرے مشہور گانوں کی طرزیں اور موسیقی بھی بدو نے ہی بنائی تھیں۔

نازیہ نے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک تجربہ کیا تھا۔ خود نازیہ کو بھی علم نہ تھا کہ یہ ہلکا پھلکا سا گیت دنیا بھر میں مشہور ہو جائے گا اور گلوکارہ کی حیثیت سے ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ اس لحاظ سے نازیہ حسن کو پاکستان کی پہلی پاپ سنگر کہا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ اعزاز کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس کے کئی سال بعد پاکستان میں پاپ سنگرز کا سیلاب آگیا۔ وہی بات ہو گئی کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔

جسے دیکھیے وہ گٹار لے کر کھڑا ہو گیا۔ بے ڈھنگے لباس، بے ہنگم چیخ و پکار اور بے معنی اچھل کود کا ایسا رواج ہوا کہ چند سال پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان میں کچھ اچھے اور مقبول گلوکار بھی ہیں مگر اکثریت بے تکے شور و غل کرنے والوں کی ہے ان کے حلیے، ان کے گیت، چیخ و پکار اور اچھل کود نے ایسا اودھم مچایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ سب مغرب سے مرعوب اور بالکل مغربی انداز کے نقال تھے۔ ہمارے ہاں الیکٹرانک میڈیا پر بھی انگریزی میڈیم کالے گوروں اور میموں کا غلبہ ہے جنہوں نے اس چیخ و پکار کو ٹیلی وژن اور ریڈیو کے ذریعے گھر گھر پہنچا دیا۔ جو چینل کھولیں اس پر یہی شور و غل نظر آتا ہے۔ اس موسیقی کو سننے اور پسند کرنے والوں کی تعداد ایک فیصد سے بھی کم ہے مگر چونکہ ریڈیو اور ٹی وی پر سو فی صدی ان ہی کا غلبہ ہے اس لیے پاپ سنگرز کی سرپرستی اور پاپ موسیقی کی ترقی ان کا نصب العین بن چکا ہے۔

نازیہ حسن کے نغموں کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے۔ ان میں دھیما پن، شائستگی، شرافت اور معنویت ہے۔ ان کی پرفارمنس کا انداز بھی انتہائی معقول اور مہذب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ پاپ میوزک سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اس کے بدترین مخالف ہیں وہ بھی نازیہ حسن کے گیت بڑے شوق سے سنتے اور پسند کرتے ہیں۔ نازیہ حسن اور دوسرے پاپ سنگرز میں یہی فرق ہے۔

نازیہ حسن کے والد بصیر حسن ایک بیورو کریٹ اور خوش حال انسان تھے۔ ان کی بیگم منیزہ حسن ایک خوش شکل اور باوقار شخصیت کی مالک ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ منیزہ حسن کو شوبزنس سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ اپنے شوق کی تکمیل انہوں نے اسلام آباد سے پیش کیے جانے والے چند ڈراموں کے ذریعے کی۔ بعد میں جب نازیہ اور زوہیب حسن نے اپنے گانوں کی وجہ سے شہرت اور مقبولیت حاصل کی تو یہ دونوں بہن بھائی ہی اپنے والدین کی پہچان بن گئے۔ بیورو کریٹ، دولت مند، صنعت کار، جاگیردار تو بہت ہوتے ہیں مگر شہرت اور مقبولیت ان کو میسر نہیں ہوتی۔ اپنے قریبی اور متعلقہ حلقوں کے سوا وہ گمنام ہی رہتے ہیں۔ نازیہ حسن اور زوہیب حسن کے حوالے سے دنیا نے ان کے والدین کو پہچانا اور ان کے بارے میں جانا تھا۔

موسیقی اور گلوکاری کا شوق بلکہ جنون ان دونوں کو بچپن ہی سے تھا۔ موسیقار سہیل رعنا کے بچوں کے لیے مخصوص تربیتی موسیقی کے پروگرام میں ان دونوں نے بھی بڑی باقاعدگی اور لگن کے ساتھ شرکت کی۔ وہ ابتدا ہی سے اپنے گروپ میں منفرد ہو گئے تھے۔ ان کے حسین اور معصوم چہرے، کھنکتی ہوئی شیریں آوازیں سب سے الگ اور نمایاں تھیں۔ ان کی صلاحیتوں اور لگن کو دیکھتے ہوئے سہیل رعنا نے بھی ان پر خصوصی توجہ دی۔ اس زمانے میں ایک اور بیورو کریٹ سمیع صاحب کا گول مٹول پیارا سا بیٹا بھی اس گروپ میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا نام عدنان تھا۔ موسیقی اور گلوکاری اس کا شوق تھا۔ بعد میں یہ موسیقی اور شوبزنس کی دنیا میں عدنان سمیع کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے بہت اچھے گیت گائے اور موسیقی کی طرزیں بھی بنائیں۔ سید نور کی فلم "سرگم" کی موسیقی بھی عدنان سمیع نے ہی بنائی تھی۔ اس فلم میں وہ زیبا بختیار کے بالمقابل ہیرو کا کردار بھی کر رہا تھا۔ وہ اب بھی بچپن کی طرح گول مٹول تھا۔ ایسا موٹا تازہ ہیرو پاکستانی فلموں میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا مگر عدنان میں ایک انوکھی کشش اور دلکشی تھی۔ اس فلم میں عدنان کی اداکاری اور موسیقی دونوں کو بہت پسند کیا گیا۔ یہاں تک کہ فلم کی ہیروئن زیبا بختیار نے بھی عدنان کو پسند کر لیا اور فلم کی نمائش کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ یہ ایک مقبول اور خوب صورت جوڑی تھی۔ انہیں وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی کوئی انسان خواہش کر سکتا ہے۔ قدرت نے انہیں ایک بیٹے سے بھی نوازا جس کا نام "اذان" رکھا گیا لیکن پھر انہیں کسی کی نظر لگ گئی۔ ان کی گھریلو زندگی جہنم بن کر رہ گئی۔ بعد میں ازدواجی زندگی بھی اختلافات اور جھگڑوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ نوبت ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور مقدمے بازی تک جا پہنچی۔

طلاق کے بعد اذان کی ملکیت کا جھگڑا عدالت کچہری سے گزر کر ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ عدنان سمیع بیٹے کو لے کر غائب ہو گئے۔ زیبا بختیار بیٹے کی تلاش میں عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتی رہیں۔ کچھ عرصے بعد یہ پتا چلا کہ عدنان سمیع اپنے بیٹے کے ساتھ امریکا، کینیڈا میں پناہ گزین ہیں۔ زیبا وہاں بھی پہنچ گئیں اور بالآخر "اذان" کو اپنے ساتھ واپس لانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس جھگڑے کی وجہ

سے بہت جگ ہنسائی ہوئی۔ بہت بدنامی ہوئی۔ دو بڑے اور معروف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے اس جوڑے کا انجام بخیر نہ ہوسکا۔ اب عدنان سمیع اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ زیبا بختیار ٹیلی وژن کے بعد فلموں میں اداکارہ اور ہدایت کارہ بن گئی ہیں۔ "اذان" اپنی ماں کے پاس مگر باپ سے بہت دور ہے۔ مستقبل ان کے لیے اپنے دامن میں کیا سمیٹے بیٹھا ہے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ سوائے اللہ کے۔

نازیہ اور زوہیب اپنے والدین کے ہمراہ انگلستان چلے گئے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے لگے مگر موسیقی کا شوق کم نہ ہوسکا۔ زوہیب فارغ اوقات میں گٹار لے کر بیٹھ جاتے اور دونوں بہن بھائی نغمے بناتے اور گاتے رہتے انگلستان میں رہنے اور وہاں کی تعلیم و تربیت یہاں تک کہ شہرت حاصل کرنے کے باوجود وہ خالص مشرقی رہے اور پاکستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے بعد نازیہ حسن نے بھی پاکستان ہی میں رہنا پسند کیا اور ان کے چھوٹے بھائی زوہیب بھی ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کرکے پاکستان ہی میں رہتے ہیں۔ دنیا بھر میں شہرت اور پذیرائی حاصل کرنے کے بعد بھی وہ پاکستانی ہیں حالانکہ جب نازیہ حسن کا گایا ہوا گانا...

"آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے...تو بات بن جائے"

ایک بھارتی فلم "قربانی" میں شامل ہونے کے بعد عالمگیر شہرت حاصل کرگیا اور بھارتی فلم سازوں نے نازیہ حسن پر گلوکاری اور اداکاری کے لیے پُرکشش آفرز کی برسات کردی پھر بھی انہوں نے اپنی شناخت پاکستانی رکھی اور بھارت میں قیام کرنے اور کام کرنے کی ہر پیشکش ٹھکرا دی۔ یہی پاکستانی لڑکی نازیہ حسن بیماری کے بعد علاج کے لیے لندن چلی گئی اور زندگی کے آخری تکلیف دہ المناک ایام وہیں بسر کیے۔ وہیں نازیہ کا انتقال ہوا۔

لندن میں تعلیم پر پوری توجہ دینے کے باوجود نازیہ اور زوہیب کا تمام فارغ وقت موسیقی کی نذر ہوچکا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک بھارتی موسیقار بدّو سے ہوئی جس کے نتیجے میں پاکستان بلکہ برصغیر کا پہلا پاپ نغمہ وجود میں آیا۔ اس وقت نازیہ حسن کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ یہ ۱۹۷۶ء کا واقعہ ہے۔

بھارتی اداکار، ہدایت کار اور فلم ساز فیروز خان حسن خاندان کے ملاقاتیوں میں شامل تھے۔ انہوں نے یہ حیرت انگیز جاں فزا گیت سنا تو اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کو اپنی زیر تکمیل فلم "قربانی" میں شامل کرلیا۔ فلم کے لیے اس کی از سر نو ریکارڈنگ کی گئی۔ فلم میں یہ گانا اس وقت کی نامور ہیروئن زینت امان پر فلمایا گیا تھا۔ "قربانی" ایک سپرہٹ فلم تھی اور نازیہ حسن کا گایا ہوا نغمہ ایک سُپرہٹ نغمہ تھا۔ "قربانی" کی بے مثال کامیابی میں نازیہ حسن کے گانے کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ بھولی بھالی، موہنی صورت والی اسکول کی طالبہ اس نغمے کی گلوکارہ ہے۔ نازیہ کو اللہ تعالٰی نے آواز کے ساتھ ساتھ ایک حسین چہرہ اور دلکش سراپا بھی عطا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ راتوں رات شہرت حاصل کرنے کے بعد نازیہ حسن کو فلموں میں ہیروئن بننے اور بھارتی فلموں میں گلوکاری کرنے کی بے شمار آفرز کی گئیں مگر نازیہ حسن ان پُرکشش ترغیبات کا شکار نہ ہوئی۔ اس کو اپنی تعلیم مکمل کرنی تھی۔ اس کے عزائم کچھ اور تھے۔ گانا تو صرف اس کا شوق اور مشغلہ تھا۔ شہرت اور دولت سے اس قدر بے نیازی کی ایسی مثال اس دور میں مشکل ہی سے ملے گی۔

نازیہ حسن کے اس نغمے کے کیسٹ دو کروڑ سے زیادہ فروخت ہوئے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔

نازیہ حسن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نغمے کے ذریعے اس نے نادانستگی میں برصغیر کی موسیقی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ نازیہ حسن کو پاکستان کی پہلی پاپ سنگر کا درجہ حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گا۔ اس کا یہ مقام کوئی نہیں چھین سکے گا۔

نازیہ حسن کی کھنکدار پُرسوز آواز نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ وہ بدستور اپنی تعلیم میں مصروف رہی مگر موسیقار بدّو کے تعاون سے جب نازیہ حسن کے گانوں کا پہلا البم "ڈسکو دیوانے" سامنے آیا تو اس نے ساری دنیا کو واقعی دیوانہ کردیا۔ نازیہ حسن اور زوہیب ایک ہی جست میں برصغیر کے نامور ترین گلوکاروں کی صف میں شامل ہوگئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ انہوں نے گائیکی کا ایک بالکل نیا اور انوکھا انداز متعارف کرایا تھا۔ اس خطے میں یہ پاپ سنگرز کے باوا آدم تھے۔ "ڈسکو دیوانے" کی مقبولیت نے بھی ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا۔ یہ کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوا حالانکہ برصغیر میں سرقہ کرنے اور دو نمبر کیسٹ اور ویڈیو بنانے کی وبا عام ہے۔ اس کے باوجود "ڈسکو دیوانے" کے البم نے بے پناہ بزنس کیا۔ جو لوگ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ نازیہ حسن کا پہلا نغمہ محض ایک اتفاق یا حادثہ تھا انہیں اپنی رائے

پر نظرِثانی کرنی پڑی۔ نازیہ حسن نے اپنی گلوکاری کا لوہا منوالیا تھا اور اس مہم میں اس کا چھوٹا بھائی زوہیب اس کے شانہ بشانہ تھا۔

نازیہ حسن پاکستان آئیں تو انہوں نے ٹیلی وژن پر اپنے نغمات پیش کیے۔

"آپ جیسا کوئی" پی ٹی وی کا مقبول ترین پروگرام بن گیا۔

اس کے بعد ڈسکو دیوانے کے گانوں نے اودھم مچادیا۔ نازیہ حسن کی دلکشی، سادگی، مشرقیت اور شائستگی نے انہیں ایک منفرد مقام دے دیا تھا اگرچہ بعض حلقوں کی جانب سے اعتراض بھی کیا گیا کہ "بہن بھائی" کو اس طرح ایک ساتھ نہیں گانا چاہیے لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ دونوں بالکل غیر رومانی انداز میں ایک ساتھ گاتے تھے۔ گانوں کے بول اور ان کی حرکات و سکنات بھی انتہائی مقبول اور شائستہ تھیں۔ ان اعتراضات کے باوجود نازیہ کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ پاکستان ٹیلی وژن پر انہوں نے "سنگ سنگ چلیں" کے عنوان سے ایک پروگرام بھی کچھ عرصے تک پیش کیا۔ وہ جب بھی پاکستان آتی تھیں ٹیلی وژن پر اپنے پروگرام ضرور پیش کرتی تھیں پھر ان کی پاکستان آمد اور پروگراموں میں رفتہ رفتہ کمی ہونے لگی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں بہت زیادہ مصروف ہوچکی تھیں۔ اس کے باوجود موسیقی سے وابستہ تھیں۔ ان کا ایک اور البم "بوم بوم" منظرِعام پر آیا تو اسے بھی بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔

۱۹۸۷ء میں ای ایم آئی نے نازیہ حسن اور زوہیب کا ایک البم "ہاٹ لائن" کے نام سے پیش کیا تھا جس کے تمام گانے مقبول ہوئے تھے۔ خصوصاً یہ دو گانے۔

ہم اور تم۔ تم اور ہم

دل کا کیا ہے پیر

پاکستان ٹیلی وژن سے پیش کیے جانے والے پروگرام "میوزک ... اولی" میں بھی انہوں نے اپنے گانے پیش کیے۔ انور مقصود ... کے ایک اور پروگرام "اسٹار شو" میں بھی نازیہ اور زوہیب نے شرکت کی۔ ہر بار انہوں نے بے پناہ داد وصول کی۔

ان کے نغموں میں اب وقفے آنے لگے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا پھر بھی وہ شائقین کی فرمائش کو پورا کرنے کے لیے "وقت" چرا لیتے تھے۔ ٹیلی وژن سے ان کا ایک پنجابی نغمہ "ٹالی دے تلے بیہہ کے" نازیہ نے پیش کیا اور ایک بار پھر میلہ لوٹ لیا۔ اس گانے میں نازیہ حسن پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی موسم بہار کے رنگوں کے لباس پہنے ہوئے مسکراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ خوشی، اطمینان اور آسودگی کا وہ منظر آج بھی دیکھنے والوں کی نگاہوں میں خوشیاں اور رنگینیاں بکھیر دیتا ہے۔

نازیہ حسن کا آخری البم "کیمرا کیمرا" تھا۔ کامیابیوں اور خوشیوں نے تو جیسے نازیہ کو اپنا مرکزِ توجہ بنالیا تھا۔ وہ ہر گانے اور ہر میدان میں کامیاب اور کامران تھیں۔ اتنی کامیابیاں اور خوشیاں اتنی کم عمری میں انہیں مل گئی تھیں جن کی تمنا میں بہت سے لوگوں کی عمریں بیت جاتی ہیں۔ یہ البم ۱۹۹۰ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس وقت نازیہ کی عمر صرف ۲۵ سال تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ جنم جنم سے گا رہی ہیں اور کامیابیاں اور داد سمیٹ رہی ہیں۔ اس سے پہلے ان کا اور زوہیب کا ایک

صحیح اور باکفایت
ہومیوپیتھک علاج

مرض کچھ بھی ہو کوالیفائڈ اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی نگرانی میں امپورٹیڈ دواؤں کے ذریعے علاج کے لئے رجوع کریں۔

معلومات کے لئے
فون: 5058064

کلینک کے اوقات
شام 5 بجے سے رات 10 تک (جمعہ تعطیل)

ہومیو ڈاکٹر محمود احمد مودی

کلینک کا پتا:
I-H-6 پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی
نرسری اسٹاپ۔ نزد نظام ملک شاپ۔
(پلاٹینم بینک والی گلی)

البم "ینگ ترنگ" بھی بے حد کامیاب اور مقبول ہو چکا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق نازیہ حسن کے کیسٹ اور البم ساڑھے تین کروڑ اور چار کروڑ سے زیادہ فروخت ہو چکے ہیں جو کہ بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔

پاکستان میں پاپ سنگرز کے طور پر جن گلوکاروں نے اس نئے انداز کو متعارف کرایا تھا ان میں محمد علی شہکی اور عالمگیر کا نام بھی شامل ہے مگر نازیہ حسن کی پیہم کامیابیوں نے سب کو دُھندلا کر رکھ دیا تھا۔

نازیہ حسن نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اقوام متحدہ میں سیاسی تجزیہ کار کی حیثیت سے بھی کام کیا اور اس سلسلے میں امریکا میں مقیم رہیں۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر نازیہ حسن کے نغمات بھی وقفے وقفے کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ پاکستان میں؛ اس دوران میں پاپ سنگرز کا طوفان سا آگیا۔ گلوکاروں نے نئے نئے انداز متعارف کرائے۔ بعض نے مقبولیت اور کامیابی بھی حاصل کی مگر بیشتر بے ہنگم، بے معنی گیتوں اور بے سُرے شور و غل اور اچھل کود کے نمونے پیش کرتے رہے۔ اس ہجوم میں نازیہ حسن سب سے الگ تھلگ، بلند و بالا اور نمایاں نظر آتی ہیں۔ باقاعدہ موسیقی سے اتنے عرصے دور رہنے کے باوجود نازیہ حسن سے ان کا مقام کوئی نہیں چھین سکا۔

اتنی کم عمری میں اتنی ڈھیر ساری خوشیاں، کامیابیاں اور مقبولیت سمیٹ لینے کے بعد کوئی انسان اور کس چیز کی خواہش کرسکتا ہے؟ نازیہ کے سامنے طویل زندگی اپنی محبت بھری بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ کسی بھی شعبے میں نام اور بلند مقام حاصل کرسکتی تھیں۔ یہ وقت تھا جب انہوں نے اپنی زندگی کو سنوارنے اور بنانے کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور اپنے مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کر رہی تھیں کہ اچانک آسمان سے بجلیاں ٹوٹ پڑیں۔ اچانک یہ معلوم ہوا کہ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ مرض ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ بہترین طبی سہولتیں نازیہ حسن کو حاصل تھیں۔ امریکا اور انگلستان کے بہترین ڈاکٹروں نے ان کا علاج کیا اور وہ اس موذی بیماری کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئیں۔ ایک بار پھر وہ کامیاب اور کامران رہی تھیں۔ انہوں نے اس مرض سے نجات حاصل کرکے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

مگر نازیہ حسن کو علم نہیں تھا کہ ان کی خوشیوں، شادمانیوں اور سکون و آسائش کا دور ختم ہو چکا ہے۔ خوش قسمتی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور ان کی بد قسمتی کا دور شروع ہو چکا ہے۔ نازیہ حسن جن کا آئیڈیل ملکۂ ترنم نور جہاں تھیں اور جو میڈم نور جہاں جیسی شہرت حاصل کرنا چاہتی تھیں یہ نہیں جانتی تھیں کہ موسیقی کی دنیا کے لیے اجنبی ہو کر رہ جائیں گی۔

نور جہاں ان کا آئیڈیل ضرور تھیں مگر نازیہ کو یہ معلوم تھا کہ گائیکی میں وہ ملکۂ ترنم جیسی حیثیت حاصل نہیں کرسکتیں۔ انہوں نے موسیقی اور گلوکاری کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں کی تھی۔ ان کی تمام کامیابیاں خداداد صلاحیتوں اور خوش نصیبوں کی محتاج تھیں پھر بھی ان کی آرزو تھی کہ جیسی شہرت اور مقبولیت ملکۂ ترنم کے حصے میں آئی ہے اس کا عشر عشیر بھی انہیں مل جائے تو وہ مطمئن ہو کر اللہ کا شکر ادا کریں گی۔ آج کے بیشتر پاپ سنگرز کے برعکس نازیہ حسن سُریلی گلوکارہ تھیں۔ یہاں تک کہ استاد سلامت علی خاں جیسے ہنرمند نے انہیں "سُریلی گانے والی" ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔

بظاہر نازیہ حسن کے لیے ساری دنیا منتظر تھی۔ ان کی شکل و صورت، شہرت اور ذاتی خوبیوں کی بنا پر بے شمار دولت مند، نامور اور کامیاب لوگ انہیں اپنا جیون ساتھی بنانے کے آرزو مند تھے مگر شاید آپ نے بھی سنا ہو گا کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ البتہ زمین پر انہیں یکجا کرنے کے بہانے مل جاتے ہیں۔

۱۹۹۵ء میں جب اچانک یہ خبر آئی کہ نازیہ حسن کی شادی ہو رہی ہے تو سب حیران رہ گئے۔ ان کے ہونے والے شوہر کے بارے میں اس سے پہلے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ ان کا نام اشتیاق بیگ ہے۔ وہ ایک صنعت کار ہیں۔ کراچی اور دبئی میں ان کا وسیع کاروبار ہے۔ مزید کریدنے پر پتا چلا کہ وہ عمر میں نازیہ حسن سے کافی بڑے ہیں اور شادی شدہ ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے چکے ہیں مگر آخری دنوں میں نازیہ حسن نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ یہ غلط تھا۔ اشتیاق بیگ کا ایک سولہ سالہ بیٹا ہے اور نازیہ سے شادی کے وقت انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق کبھی نہیں دی تھی۔ نازیہ حسن نے بیماری کے دنوں میں اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لیے مقدمہ دائر کیا تھا اور اپنے تین سالہ بیٹے "ازیر" کی ملکیت حاصل کرنے کی خواہش مند تھیں۔ انہوں نے اشتیاق بیگ اور ان کے گھر والوں کے خلاف بد سلوکی اور ظلم کے الزامات بھی عائد کیے تھے اور کہا تھا کہ ازیر ایک سال کا تھا جب انہوں نے نازیہ حسن کو گھر سے نکال دیا تھا۔ ادھر اشتیاق بیگ کا کہنا تھا کہ نازیہ حسن ان سے طلاق حاصل نہیں کرنا چاہتیں۔ ان کے والدین ان کا گھر برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا

تھا کہ میں نازیہ کو ہرگز طلاق نہیں دوں گا اور نہ ہی اپنے بچے کی ملکیت سے دستبردار رہوں گا۔

نازیہ حسن ہمیشہ شہرت سے دور ہی بھاگتی رہیں۔ وہ انٹرویو دینے سے گریز کرتی تھیں اور اپنی ذاتی زندگی کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شوبزنس سے وابستگی اور بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کرلینے کے باوجود ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ وہ اپنی زندگی گوشۂ عافیت میں، اپنی ذات اور اہلِ خاندان کے ساتھ رہ کر شہرت کی چکاچوند سے دور گزارنا چاہتی تھیں۔ وہ ایک باوقار اور معزز شخصیت کی حیثیت سے جانی جاتی تھیں اور ان کی نجی زندگی کے بارے میں دنیا والے بہت کم جانتے تھے مگر بد قسمتی نے جب اپنے حصار میں لیا تو سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ ان کی صحت، ان کی شہرت اور نیک نامی، ان کی شخصیت کا وقار بھی کچھ خاک میں مل گیا۔ ان کی نجی زندگی اخبارات کی خبروں اور تبصروں کا موضوع بن گئی۔ نازیہ حسن جیسی پرائیویسی پر مکمل یقین رکھنے والی لڑکی کے سر پر تو جیسے آسمان گر پڑا تھا۔ ایک طرف بیماری کی اذیت اور دم بدم گرتی ہوئی صحت کا غم تھا تو دوسری طرف بھری بہار میں دنیا کو ترک کرنے کا المناک تصور۔ اس پر مقدمہ بازی۔ الزامات اور جوابی الزامات کی گرم بازاری۔ زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے جان سے بھی زیادہ عزیز بچے سے بچھڑنے کا صدمہ اور پھر یہ خیال کہ کہیں بچہ ان کے شوہر اور سسرال والوں کے حوالے نہ کر دیا جائے جن سے انہیں کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔ ایک معصوم، بے بس اور بے قصور لڑکی کے لیے یہ سب ایک بدترین عذاب سے کم نہ تھا مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ جو مقدر میں لکھا ہے وہ بہر صورت ہو کر رہتا ہے۔ نازیہ حسن ۱۳ اگست کو صرف ۳۵ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئیں تو ایک شکست خوردہ، غم زدہ، پریشان حال، تفکرات میں جکڑی ہوئی ہستی کی حیثیت سے۔ وہ سب کچھ نامکمل اور لاینحل ہی چھوڑ گئیں۔ انہیں طلاق ہو چکی تھی یا اشتیاق بیگ کے دعوے کے مطابق وہ بدستور ان کی منکوحہ تھیں؟ ان کے بچے پر ان کے والدین کا حق ہے یا اشتیاق بیگ کا؟ ان کی دولت اور اثاثوں کے حق دار ان کے ورثا... ہیں یا شوہر اور سسرال والے؟ یہ تمام مسائل جوں کے توں چھوڑ کر وہ دنیا سے منہ موڑ کر چلی گئیں۔ رہی سہی کسر ایک نئے جنم لینے والے اسکینڈل نے پوری کر دی۔

نازیہ حسن کی موت کینسر کے مہلک مرض کی وجہ سے ہوئی یا انہیں زہر دیا گیا تھا اور اگر وہ زہر خورانی سے ہلاک ہوئی ہیں تو اس کا ذمے دار کون تھا؟

ان جھگڑوں کے باعث نازیہ حسن کے نازک جسم کا ایک سے زائد بار پوسٹ مارٹم کیا گیا اور ان کی میت پاکستان نہیں لائی جا سکی۔ جب تک زہر خورانی کے معاملے کا حل نہ نکل آئے اور قانونی طور پر یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوئیں تو اشتیاق بیگ کی منکوحہ تھیں یا مطلقہ ہو چکی تھیں۔ اس وقت تک ان کی میت کس دعوے دار کے سُپرد کی جائے۔ اس کشمکش میں پندرہ دن گزر گئے۔

نہ زندگی میں نہ موت کے بعد یقیناً نازیہ حسن اس سلوک کی مستحق نہ تھیں۔ وطن کی مٹی ان کے بے جان جسم کی منتظر تھی اور لندن میں ان کی قانونی حیثیت اور مقام کا فیصلہ کیا جا رہا تھا۔ ایسے خوب صورت اور خواب آگیں آغاز کا ایسا ہولناک اور عبرت ناک انجام! چند سال پہلے تک کون سوچ سکتا تھا۔

نازیہ حسن نے کچھ عرصے پہلے ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ وہ امریکا میں مقیم تھیں جب ان کی والدہ نے ان کے سامنے اشتیاق بیگ سے شادی کرنے کا مشورہ پیش کیا۔ اشتیاق بیگ اور نازیہ حسن کے مابین کوئی بھی چیز مشترک نہیں تھی۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ نازیہ حسن کو مل سکتا تھا مگر والدہ کا اصرار تھا کہ اشتیاق بیگ ہی ان کے لیے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوں گے۔ نازیہ کے انکار پر اشتیاق بیگ بالکل مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے ہر طرح سے نازیہ حسن کو منانے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا مگر نازیہ حسن کے گھر میں ان کی والدہ کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا ہے لہٰذا پس و پیش اور متواتر انکار کے باوجود نازیہ کو ہار ماننے ہی بنی۔

۱۹۹۵ء میں نازیہ حسن اور اشتیاق بیگ کی شادی ہو گئی جو ہر ایک کے لیے ایک انہونی اور حیرت انگیز بات تھی۔ جس نے سنا وہ انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ نازیہ جیسی ہیرے جیسی لڑکی کے لیے ایک بڑی عمر کے شادی شدہ شخص کا انتخاب ایک انوکھی بات تھی۔ اس وقت اشتیاق بیگ کو نازیہ حسن کی بیماری کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی ہیں۔

شادی کے بعد نازیہ حسن ایک بار پھر گمنام ہو گئیں۔ وہ کہاں ہیں؟ کیسی ہیں؟ کیا کر رہی ہیں؟ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ نہ کوئی خبر، نہ انٹرویو۔ آخر ہم نے کسی نہ کسی طرح فیملی میگزین کے لیے ان کا فیملی انٹرویو حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہمارے کراچی کے نمائندے اس میں کامیاب بھی ہو گئے مگر یہ صرف نازیہ حسن کا انٹرویو تھا۔ ان

کا کمسن بچہ باتیں نہیں کرسکتا تھا اور ان کے شوہر کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ بہرحال بچے کے ساتھ نازیہ حسن کی تصاویر بنالی گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ شوبزنس اور موسیقی سے بالکل قطع تعلق کرچکی ہیں اور ایک خالص گھریلو بیوی کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ انہوں نے کراچی اور دبئی میں چند ایسے فلاحی منصوبوں کا بھی تذکرہ کیا جن میں وہ بے حد مصروف تھیں۔ شوہر کے بارے میں انہوں نے بہت مختصر جوابات دیے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن اور خوش ہیں۔

ان کے بھائی زوہیب حسن کی اسلام آباد میں سادگی سے شادی ہوئی تھی مگر ہمارے نمائندے تصاویر بنانے کے لیے موجود تھے۔ نازیہ حسن کی روایتی مشرقی لباس اور زیورات میں بھائی کی شادی کے موقع پر مسکراتی ہوئی تصویریں بھی ہم نے شائع کیں۔

کچھ عرصے بعد نازیہ حسن کا ایک اور انٹرویو بھی فیملی میگزین میں شائع کیا گیا جس میں وہ سفید کرتے اور شلوار میں بڑی سادگی سے بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ بچے کے ساتھ بھی ان کی تصویریں بنائی گئیں۔ اشتیاق بیگ سے ملنے اور باتیں کرنے کا ہمارے نمائندے اور فوٹوگرافر کو اشتیاق ہی رہا۔ غالباً اس وقت ان کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوچکے تھے اور نازیہ حسن اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔

کچھ اور وقت خاموشی سے گزر گیا۔ نازیہ حسن کی زندگی حسبِ معمول اسرار کے پردوں میں لپٹی رہی۔ اچانک ایک روز خبر آئی کہ بیماری نے ایک بار پھر ان پر حملہ کردیا ہے اور وہ لندن کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

یہ خبر ساری دنیا کے لیے بالکل غیر متوقع اور "اچانک انکشاف" کی حیثیت رکھتی تھی۔ ساری دنیا میں ان کے مداحوں نے ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگنی شروع کردیں۔ جس کسی نے بھی نازیہ کو کسی وقت ٹیلی وژن پر دیکھا تھا یا ان کا نام سنا تھا وہ ان کے لیے دعا گو تھا۔ وہ اسپتال آتی جاتی رہیں۔ کبھی خبر آتی کہ ان کی حالت بہت نازک ہے، دعا کیجیے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ وہ روبہ صحت ہیں۔

ابھی یہ المناک اور تشویشناک سلسلہ جاری ہی تھا کہ شوہر سے ان کے اختلافات اور طلاق کے مقدمے کی خبریں موصول ہونے لگیں۔ ان کی بیماری کی طرح بات بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ بسترِ مرگ سے نازیہ حسن نے انٹرویو دیتے ہوئے اپنا معاملہ بذاتِ خود سب کے سامنے پیش کردیا۔ وہ جو زندگی بھر میڈیا سے دور بھاگتی رہی تھیں، زندگی کی شام میں میڈیا کے سامنے اپنا کیس پیش کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔ المیہ یہ ہے کہ ان کی حالت پر کسی کو بھی ترس نہ آیا۔ کوئی دل نہ پسیجا۔ کسی نے اپنے حق اور موقف سے دستبردار ہونا گوارا نہیں کیا۔ ان کے والدین اور شوہر کے مابین عدالتی اور اخباری جنگ زور و شور سے جاری رہی۔ یہاں تک کہ نازیہ حسن نے ہی سب سے منہ موڑ لیا۔ اس طرح نازیہ حسن کی خوشیوں اور دکھوں سے بھری ہوئی زندگی اختتام کو پہنچی۔

اشتیاق بیگ سے نازیہ حسن کی شادی کیوں اور کیسے ہوئی؟ یہ بھی ایک معما ہے۔ دونوں یکسر مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ مزاج، فطرت، پسند ناپسند، خیالات و احساسات ہر اعتبار سے وہ ایک دوسرے کی ضد تھے پھر بھی یہ شادی ہوگئی۔

اس کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نازیہ حسن کی والدہ منیزہ حسن بے نظیر بھٹو کی ہم جلیس تھیں۔ ادھر اشتیاق بیگ آصف زرداری صاحب کے قریبی حلقے میں شامل تھے۔ بے نظیر بھٹو کا دورِ حکومت آیا تو انہوں نے اپنے قریب رہنے والوں کو خوب نوازا۔ ادھر آصف زرداری دولت کمانے اور اپنوں میں دولت لٹانے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں جب اشتیاق بیگ نے نازیہ حسن کے ساتھ شادی کا اشتیاق ظاہر کیا تو اشتیاق بیگ کی فرماں برداری اور آصف زرداری سے قربت کے باعث انتہائی شان دار مستقبل کے پیشِ نظر نازیہ حسن کی والدہ کو یہ رشتہ بے حد موزوں معلوم ہوا۔ نازیہ نے آخر دم تک اس تجویز کی مخالفت کی مگر پھر ہتھیار ڈال دیے۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہی ہوا مگر کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا تو مہکتی ہوئی پھول جیسی ایک لڑکی کا یہ انجام نہ ہوتا۔ قدرت کے فیصلوں کے سامنے کس کی مجال ہے کہ سرتابی کرے۔

ایک بار پھر غالب یاد آگئے۔ انہوں نے اپنے جواں مرگ بھانجے کی موت پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کا ایک شعر دہرانے میں کیا حرج ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مگر معلوم ہوتا ہے کہ فلکِ پیر کو جوانوں سے سدا کی دشمنی ہے!

خامہ کنگری کی یہ الف لیلہ ابھی جاری ہے۔ اس داستان ہزار رنگ کے مزید واقعات کے لیے آئندہ ماہ کا شمارہ دیکھنا نہ بھولیں

حنوط

مزمل احمد خاں

قدیم مصری تہذیب و روایات میں لاشوں کو محفوظ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مصری اس فن میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ صدیوں پہلے انھوں نے جن لاشوں کو محفوظ کیا وہ آج بھی دنیا کو دعوتِ حیرت دے رہی ہے۔ زیرِ نظر تحریر مصریوں کے اسی فن سے متعلق ہے۔

قدیم مصری تہذیب کی ایک روایت کی اہم تفصیلات

مصر کے قدیم باشندوں کا ایمان تھا کہ مرنے کے بعد انسان کی دوسری زندگی شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی روح اور ہمزاد (جسے وہ باع اور کع کہتے تھے) اس کے جسم سے نکل کر اس کے مقبرے میں رہنے لگتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ روح (باع) کا میل جول مرنے والے کے عزیزوں، دوستوں کے ساتھ رہتا ہے جبکہ ہمزاد (کع) دوسری دنیا میں چلا جاتا ہے اور وہاں دیوتاؤں کے ہمراہ رہنے لگتا ہے۔ کسی آدمی کے ہمیشہ زندہ رہنے کی ان کے خیال میں بس یہی صورت تھی کہ باع اور کع جسم کو پہچانتے ہوں اسی وجہ سے وہ مرنے والے کی لاش کو حنوط کرکے ممی کی شکل دے ڈالتے۔

شروع شروع میں مصری اپنے مُردوں کی قدرتی طور پر ممی بنالیا کرتے تھے۔ لاش کو صحرائی گرم ریت میں دبا دیا جاتا اور تپتی جھلتی ریت لاش کو خشک اور پتھر جیسا سخت کردیتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں دوسرے

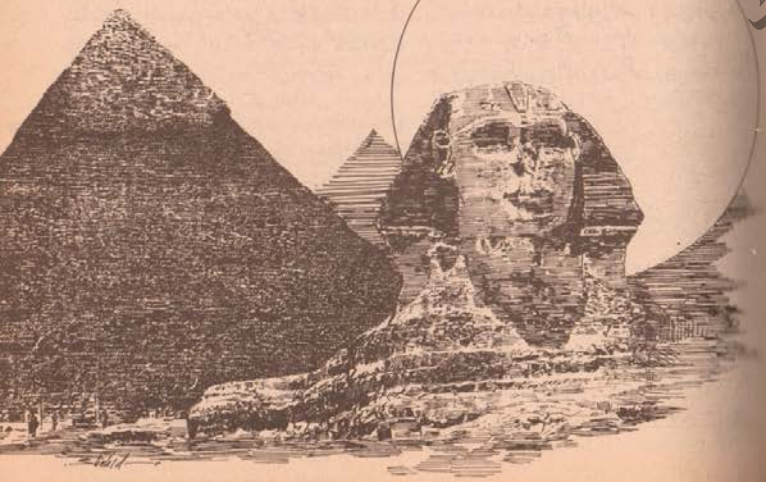

طریقے استعمال کیے جانے لگے۔ مثلاً لاشوں کو کپڑے یا چمڑے میں لپیٹ کر غاروں میں یا گڑھوں میں لکڑیاں اور پتھر بچھا کر دفن کردیا جاتا لیکن اس طریقے سے لاشیں گل سڑ جاتیں۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لاش کو حنوط کرکے ممی بنانے کا طریقہ، کار دریافت کیا گیا جو بہت لمبا، پیچیدہ اور مہنگا کام تھا۔

ممی بنانے والے کاریگر سات دنوں میں ایک لاش کو ممی میں تبدیل کردیتے تھے۔ مندروں کے پروہت ممی بنانے کے ہر مرحلے پر مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ ممی بنانے کے لیے سب سے پہلے دھات کے ایک مڑے ہوئے تار یا ہُک کو مُردے کی ناک میں ڈال کر اس کا بھیجا نکال لیا جاتا۔

اس کے بعد جسم کے بائیں جانب شگاف کرکے جگر پھیپھڑے، معدہ اور آنتیں نکال لی جاتیں۔ باہر نکالے جانے والے ان تمام اعضا کو الگ الگ مرتبانوں میں رکھ دیا جاتا اور گلنے سڑنے سے بچانے کے لیے NATRON نامی کیمیکل استعمال کیا جاتا۔ دل کو لاش کے اندر ہی رہنے دیا جاتا۔ اس کے بعد کپڑے کی پٹیاں NATRON میں ڈبو کر جسم کے اندر رکھ دی جاتیں اور جسم کے اوپر بھی اسی کیمیکل کا لیپ کردیا جاتا۔ یہ کیمیائی مادّہ لاش کو بالکل صحرا کی تپتی جلتی ریت کے مانند سکھا کر خشک کردیتا۔ ۴۰ دن بعد ممی بنانے والے کپڑے کی پٹیاں باہر نکال لیتے، خشک اور سُکڑی ہوئی لاش کو صاف کرکے اس پر مختلف تیل، مرہم، مسالے اور دیگر کیمیائی اشیا ملتے تھے پھر سر اور بدن کے اندر انہی اشیا میں بھیگی ہوئی نئی پٹیاں رکھی جاتیں۔ آنکھوں کے حلقوں میں بھی یہی چیزیں رکھی جاتیں۔ ناک کے دونوں سوراخوں کو موم لگا کر بند کردیا جاتا۔ بازوؤں کو موڑ کر سینے پر رکھ دیا جاتا اور ہاتھوں اور پاؤں کے ناخنوں پر سرخ رنگ پھیر کر ان پر سونے کا خول چڑھا دیا جاتا۔ اس کے بعد جسم کا شگاف سی دیا جاتا۔ اس عمل کے بعد ممی کو ہیرے، جواہرات اور قیمتی پتھروں سے سجایا جاتا پھر اسے بڑی احتیاط سے لمبی لمبی پٹیوں میں لپیٹ دیا جاتا۔ ہاتھ پاؤں اور انگلیوں کو الگ پٹیوں سے لپیٹا جاتا، اس کے بعد لاش پر کپڑے کا کفن بھی لپیٹ دیا جاتا اور اس کی چند تہوں کو گندے بروزے سے چپکا دیا جاتا تھا۔ کفن اور پٹیوں کی ۲۰ تہوں کے بعد سکڑی ہوئی ممی کا سائز اصل جسم کے برابر ہوجاتا۔ ممی کے کفن کے اندر جادو کی چیزیں بھی رکھی جاتیں اور چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی رکھے جاتے تھے جنہیں شبیط کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کھیتی باڑی کے چند آلات بھی رکھے جاتے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ یہ شبیط دوسری دنیا میں

آں جہانی کے لیے زمین سے اناج اُگانے کا کام کریں
ممی کے پٹیوں میں لپٹے ہوئے سر پر نقاب چڑھا دیا جاتا
مرنے والے کی تصویر بنی ہوتی تھی ایسا اس لیے کیا جا
ممی خراب بھی ہوجائے تو اس کی روح (بع) اور اس کا
(کع) اسے پہچان لیں اور بھٹکتے نہ پھریں۔ سر پر
نقاب باندھنے کے بعد ممی کو ایک اور کفن پہنا کر ا
گندے بروزے کا لیپ کیا جاتا تھا۔ اس دوران
دوسرے لوگ مثلاً مجسمے بنانے والے، سنگ تراش اور
وغیرہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔
تابوت تیار کرتے جس کے اندر اور باہر ممی کی حفاظت
لیے دیوی دیوتاؤں کی تصویریں بنائی جاتیں۔ ممی کے
دفن کرنے کے لیے زیورات اور فرنیچر بھی تیار کیے جاتے
پتھر کا نہایت شان دار صندوق یا تعویذ بھی تابوت رکھنے
لیے بنایا جاتا۔ لاش کے مجسمے بھی بنا کر رکھے جاتے تاکہ
ممی کسی وجہ سے خراب ہوجائے تو بع اور کع بھٹکتے نہ پھریں

اس کے بعد ممی کو ایک جلوس کے ساتھ مقبرے
لے جایا جاتا تھا۔ مندروں کے پجاری مرنے والے کے
دوست، نوکر چاکر اور ماتم کرنے والے جنازے کے ساتھ
ساتھ چلتے۔ ان کے آخر میں مزدور مرنے والے کا وہ سامان
اٹھائے ہوتے جو وہ اپنی زندگی میں استعمال کیا کرتا تھا۔
سامان کو بھی اس کے ساتھ ہی مقبرے میں دفنا دیا جاتا
کرنے اور رونے پیٹنے والوں کو اس کام کی اُجرت دی
مصر کے لوگ مکانوں سے زیادہ مقبروں کو اہمیت دیتے تھے
بڑے لوگ عموماً اپنے مقبرے کو اپنی زندگی میں ہی بنوا

صدیوں تک مُردوں کو لاشوں اور پتھروں سے بنے ہوئے
مقبروں میں دفن کیا جاتا رہا جنہیں مستبع کہا جاتا تھا۔ فرعون
کے مستبع میں کئی کمرے ہوتے تھے جن میں اس کی آئندہ
زندگی کی تخیلاتی تصویر کشی کی جاتی۔ کافی عرصے کے بعد
فرعون اپنے لیے بڑے بڑے اہرام بنوانے لگے پھر بعد کے
زمانوں میں فرعونوں کو ایسے مقبروں میں دفنایا جانے لگا جو
زمین کی سطح سے نیچے بنائے جاتے تھے۔ ان مقبروں کو
مہارت سے بنا کر ان پر خوب صورت رنگ و روغن کیا جاتا
تھا۔ زیرِ زمین بنانے کا مقصد یہ تھا کہ چور، ڈاکو ممیوں
کے خزانوں کو چُرا نہ لیں۔ جس ریگستانی علاقے میں یہ مقبرے
بنائے گئے تھے۔ اُسے بادشاہوں کی وادی کے نام سے یاد کیا
جاتا ہے۔

صحارا افریقہ کے ہی نہیں دنیا کے خطرناک ترین اور وسیع و عریض صحراؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا طول و عرض سابق سوویت یونین کے برابر مانا گیا ہے۔ ایک شخص کا ایسے لق و دق، بے آب و گیاہ صحرا کو اکیلے پار کرنے کا عزم کرنا بڑی ہمت و جرأت کی بات ہے لیکن انسان اگر چاہے تو کیا نہیں کرسکتا اور وہ بہرحال ایک انسان ہی تھا جس نے اس ریگ زار میں رقصاں بگولوں کے ساتھ سفر کا پروگرام بنایا تھا۔

تن تنہا صحرائے صحارا کو عبور کرنے والے مہم جو کا قصہ

صحرانورد

کاشف زبیر

مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر چڑیاں چہچہا رہی ہوں۔ سردی لگ رہی تھی لیکن سلیپنگ بیگ کی جالی سے روشنی بتا رہی تھی کہ دن طلوع ہو رہا تھا۔ پھر مجھے بیگی بلانے کی آواز آئی۔ ایسی آواز وہ اس وقت نکالتی تھی کوئی خطرہ یا مصیبت سامنے ہو۔ میں نے اپنے سلیپنگ بیگ کی زپ کھولی اور باہر نکل آیا۔ بستر کی گرمی سے باہر سرد ہوا میں آتے ہی چند لمحے کے لیے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں چلا کر اپنے جسم کو ذرا گرم کرنا چاہا اور اسی دوران میں مجھ سے وہ غلطی ہوگئی جس کے لیے مجھے خصوصی طور پر خبردار کیا گیا تھا۔ میں نے جوتے پہنے بغیر ریت پر پیر رکھ دیا اور اسی لمحے ریت کے ہم رنگ صحرائی بچھو نے اپنا ڈنک میری ٹانگ میں اتار دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پیر میں تیزاب سے بھرا انجکشن گھونپ دیا ہو۔ میں نے بلبلا کر پیر چلایا۔ مگر بچھو اپنا کام کرکے فرار ہوچکا تھا۔ میں

نے بیٹھ کر اپنی ٹانگ کا جائزہ لیا۔ بچھو کا ڈنک میری ٹانگ میں رہ گیا تھا۔ میں نے احتیاط سے اسے نکالا کہ کہیں اس کا کوئی حصہ ٹوٹ کر اندر ہی نہ رہ جائے۔ جلتے درد کا احساس اب پوری ٹانگ میں پھیل چکا تھا اور مزید اوپر کی جانب سفر کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ بچھو کا زہر تکلیف بہت دیتا ہے لیکن جان لیوا نہیں ہوتا اور یہ تو ویسے بھی خاصا چھوٹا سا بچھو تھا۔

"ٹیڈ' پریشان مت ہو۔" میں نے خود سے کہا اور ریت پر برابر میں رکھے سامان سے میڈیکل بیگ نکالا۔ جس میں ان ہی مقاصد کے لیے دوائیاں موجود تھیں۔ میں نے ایک پاؤڈر نکال کر آدھی پیالی پانی میں گھولا اور اس محلول کو قطرہ قطرہ کرکے اس جگہ ٹپکانے لگا جہاں بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ اس سے سوزش میں خاصی کمی واقع ہوئی۔ میں نے ایک جاذب پلاسٹک پٹی زخم کے منہ پر لگائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر یہ دیکھ کر میرے منہ سے خاصی ناگفتنی نکل گئی کہ میرے دس دس گیلن پانی والے چار جیری کین' جو پانی سے بھرے ہوئے تھے' اب زمین پر لڑھکے ہوئے تھے اور بیگی اور ٹریڈ غائب تھیں۔ یہ یقیناً ان ہی کا کارنامہ تھا۔ جیری کین لڑھکا کر وہ خود فرار ہوگئی تھیں۔ میں نے لپک کر جیری کین سیدھے کیے۔ مگر افسوس کہ ڈھیلے ڈھکنوں کی وجہ سے ان کا اکثر پانی رس کر نرم ریت میں جذب ہوچکا تھا۔ میں بیگی اور ٹریڈ کو بُرا بھلا کہتے ہوئے بچ جانے والے پانی کا حساب لگانے لگا۔ جو صرف دس گیلن تھا۔

ابھی مجھے عظیم صحرائے صحارا کے اس ویران اور اجاڑ علاقے میں سفر کرتے ہوئے محض تیسرا دن تھا' میں چالیس گیلن پانی لے کر چلا تھا۔ جو میرے حساب سے تین ہفتوں کے لیے کافی تھا۔ میں اس سے پہلے ہی اپنی منزل پر پہنچ جاتا۔ میں نے مالی کے سرحدی قصبے یا گاؤں آراوینے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور میری منزل موریطانیہ میں واقع قصبہ کولاٹا تھا۔ یہ آراوینے سے ساڑھے تین سو میل جنوب مغرب میں تھا اور اس کے درمیان میں آکلے کا خوف ناک صحرا آتا تھا۔ جس کے بارے میں دہشت زدہ کردینے والی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔

ابھی مجھے بہت دور جانا تھا اور میرے محفوظ پانی کا ستر فیصد حصہ ضائع ہوچکا تھا۔ گویا میری مہم آغاز ہی میں ناکامی سے دوچار ہوگئی تھی۔ میری ٹانگ کے ساتھ سینے میں بھی تکلیف شروع ہوگئی تھی اور ابھی مجھے بیگی اور ٹریڈ کو بھی تلاش کرنا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں نکل گئی تھیں۔ میں نے پہلے ان کے نقش پا تلاش کیے جو خوش قسمتی سے جلد ہی مل گئے۔ اور پھر ان کے نقش پا کے تعاقب میں بالآخر میں نے انہیں ایک ٹیلے کے عقب میں پالیا۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" میں نے انہیں ڈانٹا "تم دونوں نے سارا پانی ضائع کیوں کردیا' چلو اب اٹھو۔"

وہ ذرا بھی شرمندہ نظر نہیں آرہی تھیں۔ بالآخر میں نے بیگی کی ناک کی نکیل پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ بلبلاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹریڈ شرافت سے خود ہی اٹھ گئی۔ میں ان کی مہاریں پکڑ کر انہیں پڑاؤ تک لایا اور ان پر سامان بار کرنے لگا۔ جی ہاں بیگی اور ٹریڈ دو اونٹنیاں ہیں جو اس سفر میں میری ہم سفر تھیں۔

افریقہ اور صحرا ہمیشہ سے ایک پُراسرار سرزمین رہے ہیں۔ یہاں کی کہانیاں اور حکایتیں ہر مہم جُو کو اپنی طرف کھینچتی ہیں تو عام آدمی ان کی دہشت ناکی سے سہم جاتے ہیں۔ افریقہ ہمیشہ سے موت کی سرزمین رہا ہے۔ جہاں صرف زندہ رہنا بھی ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو صحارا نامی ایک صحرا کے آس پاس بستے ہیں اور اس میں سفر کرنا جہنم میں سفر کرنے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ وسعت میں سوویت یونین سے بڑا صحارا افریقہ کے تقریباً نصف رقبے پر حاوی ہے۔ اور ہر سال اس کے رقبے میں کچھ اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ پھیلتا ہوا آہستہ آہستہ افریقہ کی زرخیز زمینوں' جنگلات' آبادیوں اور چراگاہوں کو اپنے اندر سموتا جارہا ہے اور وہ جگہیں جو اس صدی کے آغاز میں زرخیز اور سرسبز تھیں' اب وہاں ریت اُڑتی ہے اور بگولے ناچتے ہیں۔ صحارا کے بعض حصے اتنے ویران اور خوفناک ہیں کہ صحراؤں کے قدیم باشندے بھی وہاں جانے کی ہمت نہیں کرتے' بقول بعض عرب گائیڈز کے' وہاں آج تک کوئی انسان نہیں گیا۔ اگرچہ ان کی بات کو جھٹلانا میرے لیے مشکل ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ گزشتہ کئی سو سال سے ان علاقوں میں کسی انسان کا گزر نہ ہوا ہو۔

سفر کے چوتھے دن میں نے پڑاؤ ڈالا ہی تھا کہ مغرب کی طرف سے آسمان پر سرخی نمودار ہونے لگی جو اتنی بڑھی کہ اس میں سورج بھی چھپ کر رہ گیا اور میں سمجھ گیا کہ کوئی خوفناک صحرائی طوفان آرہا ہے۔ میں نے اونٹنیوں کو بٹھایا اور ان کے اگلے پیروں سے رسّی باندھی پھر ان کی مہاریں اپنی کمر سے بندھی بیلٹ سے منسلک کیں اور خود پلاسٹک کا ہُڈ اور کوٹ پہن کر بیٹھ گیا۔ بیگی خوف زدہ انداز میں بلبلا رہی تھی۔ یعنی اس نے بھی طوفان کی آمد محسوس کرلی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ بیگی کسی مصیبت کے آنے سے پہلے اسے بھانپ لیتی تھی' اس کے برخلاف ٹریڈ اتنی حسّاس نہیں

ہے۔

میرے خیال میں دنیا میں جتنے اقسام کے طوفان رائج ... ان میں سب سے بدتر صحرائی طوفان ہوتا ہے ممکن ہے ... لوگوں کے تجربات اور خیالات مجھ سے مختلف ہوں۔ ... زی ہوائیں' ٹنوں کے حساب سے برستی ریت اور ... کسی جہنمی بلا کی طرح نازل ہوتے تھے۔ اگر انسان ذرا ... اوپر اٹھ جائے تو ہوائیں اسے اُڑا کر لے جاتیں اور ... پر پٹخ پٹخ کر اس کی ہڈی پسلی سب برابر کردیتیں۔ انسان ... ہوائیں اونٹ جیسے وزنی جانور کو اٹھا لے جاتی ہیں۔ ... ریت کا پہلا تھپیڑا مجھ پر گرا تو میں بیگی اور ٹریڈ کے ... پناہ لے چکا تھا۔ میں نے ان کی مہار مضبوطی سے ... رکھی تھی... تاکہ وہ طوفان سے گھبرا کر اٹھ کر نہ بھاگ ... ویسے تو اونٹ سمجھ دار جانور ہوتا ہے لیکن جانور کے ... میں یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ کب کیا حرکت ... کچھ دیر بعد طوفان پوری شدت سے حملہ آور ... بدروحوں کی طرح چیختی چلاتی ہوائیں' مجھ پر یوں ... پھینک رہی تھیں جیسے کسی کو قبر میں ڈال کر اسے دفن ... جاتا ہے۔ اگر فوراً ہی ہوا ہم پر گرنے والی ریت کو نہ ... جاتی تو چند ہی منٹوں میں ہم بچ بچ دفن ہوچکے تھے ... اور ٹریڈ ریت کی اس بوچھار سے قدرتی طور پر محفوظ ... ان کے ناک' کان اور آنکھیں کچھ اس ساخت کی ... کہ ریت ان میں نہیں جاسکتی تھی۔ اور نہ ان پر جمع ... تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ گھبرا کر بھاگی بھی نہیں۔ ... یہ طوفان شاید صبح تک جاری رہا۔ رات کے آخری ... آنکھ لگ گئی تھی اور جب میں جاگا تو سورج طلوع ... تھا۔ سجدے میں پڑے پڑے میرا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔ ... طور سے گھٹنے بڑی مشکل سے سیدھے ہوئے تھے۔ میں ... خدا کا شکر ادا کیا کہ رات کے طوفان نے میری جان نہیں ... جب میں نے دائیں بائیں دیکھا تو میرے اوسان خطا ... بیگی اور ٹریڈ ایک بار پھر غائب تھیں اور اس دفعہ ... نقش پا ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ رات کے طوفان ... صحرا میں ہر نقش کو مٹا دیا تھا۔ بلکہ کل جو میں نے ریت ... ٹیلے دیکھے تھے' وہ غائب ہوگئے اور ان کے بجائے ہموار ... پر نئے ٹیلے اُبھر آئے تھے۔ اگر بیگی اور ٹریڈ نہ ملتیں تو ... واپس جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ صحرا میں پیدل سو میل کا ... طے نہیں کرسکتا تھا اور پانی و خوراک کے بغیر تو ہرگز ... یوں لگ رہا تھا کہ صحارا کی تمام بلائیں میری گھات ... تھیں اور جیسے ہی میں سفر پر روانہ ہوا' یہ یکے بعد دیگرے مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

ایک گھنٹے میں' میں نے اردگرد کا تمام علاقہ کھنگال مارا۔ مگر بیگی اور ٹریڈ یوں غائب تھیں جیسے کبھی تھیں ہی نہیں۔ نہ معلوم وہ ریت کے طوفان میں دب گئی تھیں اور اگر زندہ تھیں تو یقیناً آراوینے کی طرف چلی گئی تھیں۔ یہ اونٹوں کی خاص خوبی ہے کہ وہ ایک بار جس راستے سے گزر جائیں' اسے کبھی نہیں بھولتے اور کہیں سے بھی اپنے مستقر جاسکتے ہیں۔ ہمارے سفری نشان بھی رات کے طوفان نے مٹا دیے تھے۔ اب میرے لیے بغیر سامان کے آراوینے تک پہنچنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کہ بغیر راکٹ کے خلا میں جانا۔

عین اس لمحے جب میں بیگی اور ٹریڈ کو صبر کرچکا تھا' مجھے ریت پر ان کے قدموں کے تازہ نشان نظر آگئے۔ میں ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ ایک ڈھلان سے اُترتے ہی یہ نشانات غائب ہوگئے لیکن اگلی ڈھلان پر پھر مل گئے اور اس سے اگلی ڈھلان پر پھر غائب ہوگئے۔ یہ ملنے اور غائب ہونے کا سلسلہ جاری رہا' حتیٰ کہ بیگی اور ٹریڈ ایک چھوٹی سی وادی میں مع سامان کے مل گئیں ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل بھی گئیں تو ان کا سامان یقیناً غائب ہوگا۔ اونٹ کی چال تو ویسے ہی بے ڈھنگی ہوتی ہے لیکن جب یہ بھڑک کر بھاگتا ہے تو اچھے اچھے ماہر شترسوار خود کو اس کی پشت پر قائم نہیں رکھ سکتے۔ سامان تو فوراً ہی گر جاتا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دونوں طوفان کے بعد اٹھیں اور چہل قدمی کرتی یہاں تک آگئی تھیں۔ یقیناً ان کا ارادہ فرار کا نہیں تھا۔ ورنہ اب تک یہ دس بارہ میل دُور جاچکی ہوتیں۔ بیگی نے آواز نکال کر مجھے خوش آمدید کہا۔ اور میں ٹھنڈی سانس لے کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اسے یہ سمجھانا قطعی بے کار تھا کہ چند لمحے پہلے اس نے میرا خون خشک کردیا تھا۔ میں نے ان کا سامان درست کیا اور آگے چل پڑا۔ میں نے سفر آگے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے اپنا پانی کا راشن نصف کردیا تھا۔ پھر مجھے امید تھی کہ راستے میں کبھی بارش ہوئی تو میں پلاسٹک شیٹ کی مدد سے کچھ نہ کچھ پانی اکٹھا کرلوں گا۔ روانگی سے پہلے میں نے نقشہ اور کمپاس دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میں ٹھیک اپنے راستے پر تھا۔ دراصل اونٹنیاں خود اسی طرف چل پڑی تھیں جو میرا راستہ تھا اور ان کو تلاش کرتا میں بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ یہ بھی ایک غیبی امداد تھی۔ ورنہ مجھے واپس جا کر ازسرِنو اپنے راستے کا تعین کرنا پڑتا۔ یہ وادی تو میرے راستے میں ہی پڑتی تھی۔ اسی خوشی میں' میں رہی سہی ناراضگی بھی بھول گیا۔ اور خاصی ترنگ میں ایک صحرائی گیت گاتا چل پڑا۔ یہ میں

نے اپنے ایک عرب دوست سے سیکھا تھا۔ جو اسے "ہدی خوانی" کہتے ہیں۔ ان کے مطابق اس قسم کے گیت اونٹوں کو جوش دلانے اور ان کا مورال بلند رکھنے کے لیے گائے جاتے ہیں اور جیسے ہی میں نے یہ گیت گانا شروع کیا، میں نے محسوس کیا کہ اونٹنیوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

○☆○

میں انگلینڈ کی کاؤنٹی لنکاشائر کے ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت شہر میں پیدا ہوا، وہاں صحرا نہیں پائے جاتے۔ دس سال کی عمر تک مجھے صحراؤں کے بارے میں کچھ علم تھا بھی نہیں، جب تک میرے ایک انکل نے مجھے بائبل کی کہانیوں پر مشتمل ایک کومک بک نہیں دی تھی۔ اس میں اکثر کہانیاں صحرائی پس منظر میں تھیں۔ کتاب میں ریت کے صحرا اور اونٹوں کی بکثرت تصویریں تھیں۔ صحرا اور اونٹ دونوں میرے لیے بالکل انوکھی چیز تھے لیکن ساتھ ہی بے حد پرکشش اور پُراسرار بھی۔ کامک بک ختم ہوتے ہوتے میں ان دونوں کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ریت کے ناقابلِ یقین طور پر بڑے ٹیلے، جتنے بڑے انگلینڈ میں پہاڑ بھی نہیں پائے جاتے اور اونٹ جیسا عجیب الخلقت جانور۔ کہانیوں میں اسے ایک شریف درندہ بتایا گیا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اونٹ صرف شریف جانور ہوتا ہے، درندہ نہیں۔ کتاب ختم کرکے میں نے فیصلہ کیا کہ بڑے ہو کر میں ایک عدد اونٹ حاصل کروں گا اور کسی صحرا میں سفر کروں گا۔

۱۹۷۹ء میں جب میں چالیس سال کا ہو چکا تھا اور ایک اسٹیل ورکر کے طور پر بے روزگاری الاؤنس لے رہا تھا، میں نے وقت گزاری کے لیے جیوفرے مورہاوس کی خود نوشتِ حیات "فیئرفل وائڈ" پڑھنا شروع کردی۔ اس نے ۱۹۷۲ء میں صحارا کے جنوب مغربی حصے میں تن تنہا آکلے کا حصہ عبور کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش ناکام رہی تھی لیکن اس نے اپنی جراتِ مندانہ کوشش کو بڑی خوب صورتی سے تحریر کیا تھا کہ انسان پڑھ کر صحارا کے خیالی حسن میں کھو جاتا تھا۔ اس کتاب نے میرے اندر خوابیدہ عشق کو ایک بار پھر بیدار کردیا تھا۔ مورہاوس نے دعویٰ کیا تھا کہ آراوینے اور کولاتا کے درمیان واقع اس اجاڑ اور ویران صحرا میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا۔ جدید نقشوں میں اس کا کوئی نام نہیں ہے، البتہ مقامی صحرائی عرب اسے آکلے کہتے ہیں۔ یہ کسی افریقی زبان کا لفظ ہے۔ جو صدیوں سے رائج ہے۔ اس کے معنی کسی کو نہیں معلوم لیکن مقامی طور پر آکلے کا مطلب ہے موت کا راستہ۔ کیونکہ اس طرف جانے والے کبھی واپس نہیں آئے۔ وہاں سبزے کے نام پر ایک پودا یا جھاڑی نہیں پائی جاتی۔ سوائے چند سخت جان صحرائی کیڑوں اور چھپکلی نما جانوروں کے، کوئی جانور نہیں پایا جاتا۔

ملازمتوں کی کئی درخواستیں یکے بعد دیگرے مسترد ہونے سے میں سخت دل برداشتہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسٹیل کی صنعت پر سخت بحران آیا تھا۔ پہلے سے کام کرنے والے نکالے جا رہے تھے تو مجھے ملازمت کہاں سے ملتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ امریکا جاکر قسمت آزمائی کروں یا جرمنی کی طرف نکل جاؤں۔ پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ میں افریقہ کیوں نہ چلا جاؤں۔ ایک لمحے کو یہ خیال ہی مجھے احمقانہ لگا۔ لیکن جیسے جیسے میں اس پر غور کرتا رہا۔ اس کی افادیت اور اس سے میری دلچسپی سامنے آتی چلی گئی۔ حتمی فیصلے سے پہلے میں نے کولاتا اور آراوینے کے درمیانی علاقے کے نقشے حاصل کیے۔ بہ قول جیوفرے مورہاوس آج تک کوئی انسان ان علاقوں میں نہیں گیا۔ یہ نقشے فضا سے کی گئی فوٹوگرافی کی مدد سے تیار کیے گئے تھے۔ نقشوں میں سوائے ریت کے دیو قامت ٹیلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ نہ کوئی وادی، نہ زمین کی بلندی اور نہ کسی راستے کا نشان۔ اگر ان نقشوں پر بھروسا کرکے کوئی آکلے جائے تو اس کے ہلاک ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے حماقت کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اونٹ پر اکیلے ہی آکلے نامی اس صحرا کو عبور کرنے کی کوشش کروں گا اور میرا یہ حال تھا کہ میں نے کبھی صحرا نہیں دیکھا تھا اور اونٹ کے نزدیک بھی نہیں پھٹکا تھا۔

ایک مہینے بعد میں تنزانیہ روانہ ہو گیا۔ اس ملک میں میرے کئی اچھے دوست رہتے تھے اور میرا مقصد اونٹ چلانے کی تربیت حاصل کرنا تھا۔ خوش قسمتی سے میرے عرب دوست مہدی کا کاروبار ہی اونٹ پالنا تھا۔ میں اس کے پاس ٹھہرا۔ اگلے تین مہینے میں اس نے مجھے اونٹوں کے بارے میں گویا سب کچھ گھول کر پلا دیا۔ مجھے معلوم ہوا اونٹ پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا ہے۔ صرف نرم، ریتیلی ہموار ڈھلانوں پر چڑھ سکتا ہے۔ جب یہ کسی ڈھلان سے اترتا ہے تو اس کے تمام جوڑ چٹختے ہیں اور خاصی خوفناک آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور جہاں تک میرے علم میں ہے، اونٹ صرف خوف ناک آوازیں نکال سکتا ہے، یہ خطرناک نہیں ہے۔ ایک دن میں اور مہدی بیٹھے دنیا میں رائج واحد خدا کے ناموں کی لسٹ تیار کر رہے تھے، گاڈ، جیہواہ اور برہما وغیرہ۔ ہم نے بہ مشکل سو اسما بنائی تھی۔ اسی دوران میں مہدی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے، اونٹ ایک مقدس جانور ہے۔ یہ اللہ کے ہزار نام جانتا ہے۔"

مہدی کی بات سے زیادہ میرے لیے اس کے لہجے کا یقین حیران کن تھا۔ اسے اپنے کہے پر سو فیصد یقین تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا "مجھے تو چند مہینے پہلے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اونٹ کھاتا کیا ہے۔ میں اسے صرف سواری اور باربرداری کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔"

اونٹ چلانا اور اسے سنبھالنا بلاشبہ دوسرے جانوروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے جو سواری اور باربرداری میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں نے اس معاملے میں گدھے اور خچر کو سب سے شریف جانور پایا ہے۔ ان کے مقابلے میں اونٹ ایک شرارتی جانور ہے اور اپنے مالک کے ساتھ شرارت سے باز نہیں آتا۔ اس سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ جب میں تنزانیہ سے واپس جا رہا تھا تو مجھے اطمینان تھا کہ میں اونٹوں کے بارے میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔

برطانیہ آکر میں نے پہلے اپنی مہم کے اخراجات کا تخمینہ لگایا۔ ہوائی ٹکٹ کم کرکے بھی پندرہ سو پاؤنڈز بنتے تھے اور یہ خاصی بڑی رقم تھی۔ ایک عام صنعتی مزدور کی سال بھر کی آمدنی کے برابر۔ لیکن جب میں نے اپنے ارادے کا اعلان کیا کہ اسپانسر حاصل کرسکوں تو اسپانسر ملنا تو ایک طرف رہا، دوست احباب اور رشتے دار میری جان کو آگئے۔

"تمہارا سفر خودکشی کی ایک باعزت کوشش ہے" میرے ایک دوست نے فیصلہ صادر کیا۔

دوستوں نے تو جو کہا سو کہا۔ رشتے داروں نے متفقہ طور پر مجھے ابنارمل قرار دے دیا کہ مسلسل بے کاری نے میرا دماغ الٹ دیا تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص جس نے کبھی کسی صحرا میں قدم نہ رکھا ہو اور نہ ہی اونٹ چلایا ہو، جسے صحرا کی حالتوں کا علم ہی نہ ہو اور جس نے کبھی چالیس درجے سینٹی گریڈ سے زیادہ گرمی نہ برداشت کی ہو، وہ اعلان کرے کہ وہ سب سے خطرناک صحرا کے خطرناک ترین حصے کو تن تنہا عبور کرنے جا رہا ہے تو لوگ اس کی دماغی حالت پر شک کرنے میں حق بہ جانب تھے لیکن میں اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا۔ میں نے ان کی مخالفت، لعنت، ملامت اور طنز کی پروا نہیں کی۔ جب لوگوں نے اس بات کو محسوس کرلیا تو خود ہی خاموش ہو گئے۔ لوگوں کو تو میں نے اپنی خاموشی سے شکست دے دی تھی لیکن اسپانسر بہرحال مجھ سے سوالات کرتے۔ انہیں یہ جاننے سے دلچسپی ہوتی کہ میں نے پہلے کس صحرا میں سفر کیا ہے اور کہاں کہاں مہمات پر گیا ہوں۔ اکثر کی دلچسپی میرے جواب کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔ میں نے سنڈے ٹائمز سے اس مہم کو اسپانسر کرنے کو کہا تو ان کی طرف سے جواب آیا۔

"تمہاری سفری لائن سیدھا موت کی طرف جاتی ہے۔"

تقریباً ایسے ہی یا اس سے ملتے جلتے جواب ان اداروں نے دیئے۔ جنہیں میں نے مہم کو اسپانسر کرنے کی درخواست دی تھی۔ کوئی ایسے شخص پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جس نے کبھی کسی مہم میں حصہ نہ لیا ہو اور نہ ہی کسی صحرا میں سفر کیا ہو۔ بلکہ اسے سرے سے مہم جوئی کا کوئی تجربہ نہ ہو۔ اور جس نے اپنی اکتالیس سال کی عمر کا بڑا حصہ ایک صنعتی کارکن کے طور پر گزارا ہو۔ ان کے خیال میں، میں صرف جذبات میں آکر اس خطرناک سفر پر جانے کو تیار ہو گیا۔ جس میں میری کامیابی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ مجھے اسپانسر کرنے کو رقم کا ضیاع سمجھ رہے تھے حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی صرف رقم لگتی، میں نے تو اپنی ایک ہی جان داؤ پر لگائی تھی۔

پھر ایک واقف کار نے مجھے بی بی سی نارتھ ویسٹ ٹیلی وژن کے ایلسٹر مک ڈونلڈ سے ملوایا۔ وہ ٹی وی کے لیے خاص طور سے ڈاکومینٹری تیار کرنے کا ماہر تھا۔ جب میں نے اسے اپنے منصوبے اور مہم کے بارے میں بتایا تو اس کی دلچسپی یک لخت بڑھ گئی۔ اس نے میرے لائے ہوئے نقشے بہ غور دیکھے۔

"تمہارا کہنا ہے کہ صحارا کے ان حصوں میں آج تک کوئی انسان نہیں گیا؟"

"کم از کم جدید دور کا کوئی شخص نہیں گیا۔ آکلے نامی یہ صحرا ابھی غیر دریافت شدہ ہے۔ اس کا کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ہے اور نہ ہی اس سرزمین کی کوئی تصویر ہے۔ تقریباً ستر ہزار مربع میل پر پھیلا یہ علاقہ بالکل اَن چھوا ہے۔"

"میں نے جیوفرے مورہاوس کی کتاب میں اس کے بارے میں پڑھا ہے" مک ڈونلڈ بولا "وہ بھی اس علاقے میں جانے میں ناکام رہا تھا۔ بلکہ میرے خیال میں وہ کسی قدر خوف زدہ تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک ٹیم لے کر جائے۔ تو ہم اس کی مہم کو اسپانسر کریں گے۔ لیکن اس نے انکار کردیا اور تم بہ ضد ہو کہ تن تنہا اس حصے کو عبور کرو گے۔"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ جیوفرے مورہاوس جیسا

دلیر مہم جُو اس علاقے میں جاتے ہوئے خوف زدہ تھا۔ عین ممکن ہے اس نے کوئی خوف زدہ کرنے والی بات دیکھ لی ہو مگر یہ جاننے کے باوجود میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"یہی تو اس مہم کی کشش ہوگی" میں نے کہا "اگر میں ایک ٹیم لے کر جاؤں اور تمام سازو سامان سے لیس ہو کر جاؤں تو عام لوگوں کے لیے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوگی لیکن جب وہ سنیں گے کہ ایک شخص صرف دو اونٹوں کے ہمراہ دنیا کے خطرناک ترین صحرا کو عبور کرنے جارہا ہے تو وہ یقیناً اس میں دلچسپی لیں گے۔"

مک ڈو نلڈ کسی قدر پریشان نظر آنے لگا۔ "لیکن پھر ہم اس سفر کی ڈاکو مینٹری کیسے بنائیں گے؟"

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے" میں نے کہا۔

اس ملاقات کے بعد میں خاصا مایوس تھا۔ میرے خیال میں مک ڈو نلڈ انکار کردے گا۔ وہ کوئی اخبار یا میگزین تو نکالتا نہیں تھا کہ مہم کے بارے میں میرے تاثرات شائع کرکے مطمئن ہوجاتا۔ اسے اپنے ناظرین کو ٹی وی پر دکھانے کے لیے فلم درکار تھی۔ جو صرف ایک کیمرا مین تیار کرسکتا تھا لیکن غیر متوقع طور پر اگلے مہینے مجھے مک ڈو نلڈ کی کال ملی۔ میں اس کے پاس پہنچا۔

"ہم تمہاری مہم کو اسپانسر کرنے کو تیار ہیں" اس نے کہا اور پھر ایک معاہدے کی کاپی نکال کر میرے سامنے رکھ دی "یہ اسپانسر شپ کا معاہدہ ہے۔ اگر تمہیں اس کی شقوں پر کوئی اعتراض ہے تو بتادو۔"

میں نے بہ غور معاہدہ پڑھا اور بولا "مجھے کسی شق پر اعتراض نہیں ہے سوائے ایک کے۔ میں تمہیں صرف ٹی وی کے حقوق دوں گا۔ مہم کے بارے میں باقی حقوق میرے پاس رہیں گے۔"

"ہم تمہیں اسپانسر کررہے ہیں۔" اس نے گویا مجھے یاد دلایا۔

"ٹھیک ہے" میں نے تسلیم کیا "لیکن صرف مہم کے اخراجات کی حد تک۔ اس سے مجھے کچھ نہیں ملے گا اور سارے حقوق تم لے لوگے تو بعد میں، میں خالی ہاتھ رہ جاؤں گا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی لیکن اس نے ظاہر کیا کہ وہ بہت مجبور ہو کر میری بات مان رہا ہے۔ اب سوائے ٹی وی کے باقی تمام حقوق میرے پاس تھے۔ میں اپنی مہم کی تفصیل کسی اخبار یا میگزین کو دیتا یا اسے کتابی شکل میں شائع کرتا، اس کی تمام آمدنی مجھے ہی حاصل ہوتی۔ مک ڈو نلڈ نے شق کی تبدیلی کے بعد معاہدے کا نیا ڈرافٹ تیار کرایا جس میں نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کی رو سے ٹیلی وژن مہم کے تمام اخراجات برداشت کرے گا اور اس کے بدلے میں مہم صرف بی بی سی ٹی وی کو دوں گا۔ اب کیوں کہ میں اکیلے ہی اس مہم پر جارہا تھا اس لیے مک ڈو نلڈ نے میرے لیے کچھ خصوصی آلات کا بندوبست کیا۔ یہ بہت ہلکے اور چھوٹے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر تھے۔ اس نے مجھے ان کو چلانے کی تربیت بھی دی تھی۔ اسی ویڈیو کیمرے کی مدد سے میں صحرا میں سفر کے دوران میں فلم بناتا اور اپنی آواز میں تاثرات ٹیپ ریکارڈر میں محفوظ کرتا۔ یہ دونوں چیزیں بیٹری سے چلتی تھیں۔ میرے پاس دس گھنٹے دورانیے ریکارڈنگ کی حامل آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں بھی تھیں۔

اصل مہم شروع ہونے سے پہلے میں دوبارہ مالی کے قصبے آراوینے تک گیا۔ میں وہاں کئی مہینے مقیم رہا۔ مہم کی تیاری کے ساتھ میرا مقصد وہاں کے قدیم صحرائی باشندوں سے آگلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے مقامی زبان میں شُدبُد..... حاصل کی۔ اس زبان میں عربی کے بے شمار الفاظ تھے لیکن بولنے کا لہجہ افریقی تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ صدیوں پہلے افریقی زبان رہی تھی۔ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عربی زبان اس پر غالب آتی گئی۔ افریقہ کے مشرقی ساحل کے برعکس اس کے مغربی ساحل پر اسلام ایک غالب مذہب ہے۔ یہاں کے مقامی افراد عیسائیوں کو نصرانی کہتے ہیں لہٰذا مجھے بھی وہ نصرانی ہی کہتے تھے۔ اگرچہ ان کے انداز میں نفرت یا عداوت نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود وہ مجھے ناپسند کرتے تھے۔ کئی ایک نے تو صاف کہا۔

"تم صحرا میں جاکر خدا کے قہر کو دعوت دے رہے ہو۔"

میں مسکرا کر کہتا۔ "جب خدا کا قہر میرا مقدر ہی بن گیا ہے تو میں اس سے کیسے فرار حاصل کرسکتا ہوں۔" دراصل آراوینے ایک مختصر جگہ ہے۔ یہاں کے باشندے صدیوں پرانے رسم ورواج کے پابند ہیں اور ابھی تک جدید تہذیب کی رمق ان تک نہیں پہنچی ہے۔ ان کے اوہام اور قدامت پرستی انہیں ایک سفید فام شخص سے بے تکلف ہونے سے روکتی ہے، ویسے میں نے ان جیسے مہمان نواز لوگ نہیں دیکھے۔ وہ بے حد غریب تھے لیکن اکثر میری کسی خدمت کے بدلے معاوضہ لینے سے انکار کردیتے تھے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کی خدمات میں نے خاص طور سے حاصل کی تھیں مثلاً شتربان، کرائے کے اونٹوں کے گائیڈز۔ ان کے ساتھ میں اردگرد کے صحراؤں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ میرا مقصد خود کو

صحرائی زندگی کا عادی بنانا اور وہاں کی صعوبتوں اور پریشانیوں سے آگاہ ہونا تھا۔ میں قصبے کی سرائے میں ٹھہرا تھا۔ جہاں مہمان ہونے کی حیثیت سے مجھے سب سے شاندار کمرا دیا گیا تھا۔ اس میں لکڑی کا بڑا سا بستر تھا جس پر پرندوں کے پروں سے بھرا گدا تھا۔

بالآخر ۶ فروری ۱۹۸۳ء کو میں آگلے کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیسری مرتبہ آراوینے پہنچا تو مک ڈو نلڈ اور اس کے کیمرا مینوں کی ایک ٹیم میرے ساتھ تھی۔ انہوں نے میری سفری تیاریوں کی فلم بندی کرنا تھی۔ میں اکثر سامان ساتھ لے کر آیا تھا۔ سوائے اس سامان کے جو یہیں سے خریدا جانا تھا اور ان میں دو عدد اونٹ سرفہرست تھے۔ نہ جانے کیسے اونٹ والوں کو میری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ قصبے کے باہر ائرفیلڈ پر اپنے اونٹوں سمیت ہمارے منتظر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مجھے کچھ اونٹوں کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ سب سے پہلے اونٹ لے لوں تاکہ وہ مجھ سے مانوس ہوجائیں۔ معاً میری نگاہ دو اونٹنیوں پر پڑی جو ایک ادھیڑ عمر عرب کے ساتھ خاموشی سے جگالی کررہی تھیں۔ ان میں ایک سفید رنگ کی تھی اور دوسری ہلکے بھورے رنگ کی۔ دونوں اونٹنیاں جوان اور تندرست تھیں۔ کم از کم میں نے اس جثے کی اونٹنیاں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ بھوک، پیاس برداشت کرنے کے معاملے میں اونٹنی، اونٹ سے کہیں زیادہ ہمت رکھتی ہے۔ ایک عام اونٹ بھی کھائے پیے بغیر دو ہفتے مسلسل سفر کرسکتا ہے جبکہ یہ دونوں زیادہ صحت مند تھیں اور میرے خیال میں بیس اکیس دن آسانی سے نکال سکتی تھیں۔

میں سیدھا اس عرب کے پاس گیا اور مختصر بھاؤ تاؤ کے بعد دونوں کو خرید لیا۔ عرب نے مجھے بتایا کہ یہ خاص طور سے طویل سفر کے لیے کارآمد تھیں۔ مک ڈو نلڈ نے بھی اونٹنیوں کو پسند کیا تھا۔ اس کے کیمرا مینوں نے ان کی خریداری کی فلم بنالی تھی۔ اس کے بعد ان کے شاٹ لیے جانے لگے۔ سفید رنگ کی اونٹنی کو میں نے روایتی یونانی دیومالا کے ایک کردار پیگاسس کا نام دیا جو پروں والا سفید گھوڑا تھا۔ اور دوسری اونٹنی جو موٹروں اور ہوائی جہاز کے انجن کے شور سے کسی قدر نروس لگ رہی تھی ..... اسے ٹریڈیشنل کا نام دیا۔ بعد میں یہ نام مختصر ہو کر پیگی اور ٹریڈ رہ گئے تھے۔

مک ڈو نلڈ نے ایک معقول مکان کرائے پر لے کر وہیں ڈیرہ جمالیا۔ پیگی اور ٹریڈ کو میں نے ایک اونٹوں کے رکھوالے کے سپرد کردیا۔ تاکہ وہ انہیں سفر کے لیے تیار کرے۔ دن کا بڑا حصہ میں ان دونوں کے ساتھ گزارتا تھا۔

میرے ارادے کی خبر جلد چاروں طرف پھیل گئی تھی اور مقامی عرب مجھے سمجھانے آرہے تھے۔ ان کے خیال میں، میں ایک اچھا نصرانی تھا۔ لہٰذا مجھے اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیے تھا۔ وہ سب متفق تھے کہ میرا یہ سفر خودکشی کے مترادف ہے اور ایک معمر عرب نے مجھے خودکشی کے عواقب سے بھی ڈرایا۔ اس نے کہا "اللہ خودکشی کرنے والے کی مغفرت نہیں کرتا اور اسے تمام عمر جہنم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔"

میں بہ مشکل انہیں سمجھا سکا کہ مجھے مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے بلکہ میں صرف آراوینے اور کولاٹا کے درمیان صحرا کے اس حصے میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں سے آج تک کوئی انسان نہیں گزرا یعنی آگلے سے۔ یہ سن کر جو لوگ پہلے ہی میری دماغی حالت کے بارے میں مشکوک تھے، انہیں پکا یقین ہوگیا کہ میں ایک پاگل ہوں۔ وہ اس صحرا سے اتنے خوف زدہ تھے کہ ان کے خیال میں کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس وہاں کا رُخ نہیں کرسکتا۔ ایک معمر عرب گائیڈ نے مجھے خبردار کیا تھا۔ "تم سفر کے دوران میں آگلے سے دُور رہنا ورنہ صرف تین گھنٹے میں ہلاک ہوجاؤ گے۔"

انہوں نے مجھے آگلے کی جو دہشت ناک کہانیاں سنائیں، ان کے مطابق وہاں قدرتی آفتوں کے بعد اب صرف بدروحوں کا ڈیرہ تھا جو وہاں جانے والے ہر فرد کو ہلاک کردیتی ہیں اور پھر اس کی روح بھی آگلے میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وہاں وقت بے وقت ریت کے طوفان آتے ہیں۔ ان طوفانوں میں ریت کے ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوجاتے ہیں۔ وہاں کہیں پانی کا کوئی قدرتی... چشمہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کنواں ہے۔ وہاں صدیوں سے بارش نہیں ہوئی۔ آگلے میں کسی قسم کا کوئی پودا نہیں پایا جاتا اور نہ ہی وہاں کوئی جانور ہے۔ وہاں صرف ویرانی ہے اور موت ہے۔

یہ سب سن کر خوف کے بجائے میری دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ یعنی اس بات کا پورا امکان تھا کہ وہاں واقعی اب تک کوئی انسان نہیں گیا اور وہاں جانے والا پہلا شخص میں ہی ہوں۔ میری روانگی دس فروری کو تھی اور اسی دوران مک ڈو نلڈ کے کیمرا مینوں نے ہر زاویے سے میری فلم بنائی تھی۔ اونٹوں کے ساتھ چہلیں کرتے ہوئے۔ انہیں سفر کے لیے تیار کرتے ہوئے، پھر کچھ ایسے شاٹ جن میں بہ ظاہر مجھے صحرا میں سفر کرتے دکھایا گیا تھا۔

اگرچہ آراوینے اور کولاٹا کے درمیان فاصلہ ساڑھے

تین سو میل تھا لیکن مجھے جن راستوں سے سفر کرنا تھا' اس سے یہ فاصلہ چار سو میل بن جاتا۔ راستہ بہت خطرناک اور دشوار تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکا' میں پیدل چلوں گا۔ تاکہ اونٹنیوں پر بوجھ کم سے کم رہے۔ اس سے میری رفتار سست ہو جاتی اور یہ فاصلہ میں سولہ دن میں طے کرتا جب کہ ایک اونٹ سوار صحرا میں صرف دو دن میں اتنا فاصلہ طے کر سکتا ہے۔ روانگی سے پہلے میں نے علاقے کا سب سے بہتر نقشہ لیا اور ایسے افراد' جو آکلے کے صحرا سے کسی حد تک واقف تھے' ان کی مدد سے اس نقشے میں تبدیلیاں کیں۔ اب یہ کسی قدر بہتر نقشہ تھا۔

میرے پاس کل چھ سو پاؤنڈ وزن تھا۔ جس کا سب سے بڑا حصہ پانی سے بھرے جیری کینز پر مشتمل تھا۔ پھر خشک خوراک' کچھ کپڑے' ضرورت کی اشیا اور اس سفر پر کام آنے والے آلات تھے۔ میں نے زیادہ وزن ٹریڈ پر رکھا۔ وہ وزن اٹھانے کے معاملے میں آگے تھی۔ جبکہ پیگی سواری کے لیے مناسب اونٹنی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دوران سفر جب بھی سواری کروں گا' صرف پیگی پر کروں گا۔ باڑے والے نے دونوں اونٹنیوں کو اچھی طرح تیار کیا تھا۔ چار دن کی اچھی کھلائی پلائی سے ان کے کوہان کے حجم میں خاصا اضافہ ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے غذا چربی بنا کر اپنے کوہان میں جمع کر لی تھی اور اب وہ ایک مہینے تک کھائے پیے بغیر بھی زندہ رہ سکتی تھیں۔ البتہ پانی کے بغیر وہ بیس دن ہی کام کے قابل رہتیں اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس مدت سے پہلے ہی میں کولاتا پہنچ جاؤں گا۔ ویسے روانگی سے پہلے میں نے انہیں خوب پانی پلا دیا تھا۔

دس فروری کی صبح مجھے رخصت کرنے کے لیے مک ڈونلڈ اور اس کی ٹیم کے ہمراہ میرے مقامی عرب دوست اور قصبے کی نصف آبادی قصبے کے باہر میدان میں جمع تھی۔ مقررہ وقت پر میں نے ٹریڈ کی مہار پیگی کی کاٹھی سے باندھی اور پیگی کی مہار کس کر اپنے سینے سے باندھ لی۔ میں نے مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ ایک تہ بند' اس کے اوپر کرتا نما ایک لباس اور اس کے اندر صدری' سر پر میرے عمامہ تھا۔ البتہ پیروں میں نائک کے بہترین جاگر شوز تھے۔ میرے لباس پر سامنے کی جانب یونین جیک بنا ہوا تھا۔ بہ ظاہر اس قسم کا لباس میرے لیے موزوں نہیں تھا کیونکہ میں اس کا عادی نہیں تھا لیکن سفر کے دوران ہی میں نے دیکھا کہ صحرا میں اس سے زیادہ مفید لباس کوئی تھا نہیں۔

پہلے دن میں نے زیادہ تر پیدل سفر کیا اور صرف پندرہ میل طے ہو سکے۔ البتہ دوسرے دن میں نے بتیس میل [illegible] تھا اور تیسرے دن سے مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ علاج سے [illegible] کے کاٹنے کا اثر تو ختم ہو گیا تھا۔ لیکن میرا جو پانی ضائع ہو [illegible] تھا مجھے اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ سفر کے ساتویں دن میں نے اس پورے راستے میں پہلا درخت دیکھا تھا۔ یہ [illegible] پودا تمارسک تھا۔ اس کا تنا پتلا مگر پتے موٹے اور کانٹے دار تھے اور یہ اونٹ کا مرغوب چارا ہے۔ اس درخت پر نظر پڑتے ہی پیگی اور ٹریڈ خوشی سے آوازیں نکالنے لگیں۔ مگر درخت کے پاس اس وقت تک نہیں گئیں جب تک میں نے ان کی مہار ڈھیلی چھوڑ کر اجازت نہیں دے دی۔ وہ دونوں پتوں پر پل پڑی تھیں۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس درخت کے پتوں میں شکر اور پانی کی بڑی مقدار ہوتی ہے اور مقامی عرب بھی اس کو بہ طور غذا استعمال کرتے ہیں۔ اس روز میں آکلے کی حدود میں داخل ہو گیا۔

صحارا کے صحرا میں ہونے کے باوجود یہ علاقہ بالکل مختلف نظر آتا تھا۔ یہ کسی بلند سطح مرتفع پر تھا اور اس پر [illegible] باریک ریت کے دیو قامت ٹیلے تھے۔ اس نرم اور پھسلواں ریت پر اونٹوں کے لیے چلنا بھی دشوار ہوتا ہے اور انسان کے لیے تو بہت ہی دشوار۔ میں نے تجربے کے طور پر ایک ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش کی۔ اب ہوتا یہ کہ میں ایک قدم اوپر جاتا تو پھسل کر دو قدم نیچے آجاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ پیگی اور ٹریڈ کو بھی اس علاقے میں سفر کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔

اب تک میں خاصے خوش گوار موسم میں سفر کرتا آیا تھا۔ درجہ حرارت شاذ ہی نوے درجے فارن ہائٹ سے تجاوز کرتا تھا۔ میں شام کے وقت آکلے کی حدود میں داخل ہوا تھا اس لیے مجھے وہاں کے معائنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ میں بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ مسلسل پیدل چلنے کی مشقت اور پانی کی کمی اب میرے جسم پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ میں دن میں بہت کم پانی پیتا تھا۔ پانی کا زیادہ حصہ میں رات کے وقت پیتا تھا۔ دن میں پیا پانی پسینے کی صورت میں ضائع ہو جاتا تھا جب کہ رات کو پینے کی صورت میں جسم کو زیادہ فائدہ پہنچتا تھا۔ میں نے ایک مختصر سی وادی میں کھونٹے گاڑ کر پیگی اور ٹریڈ کی رسیاں ان سے باندھیں۔ مزید احتیاط کے طور پر ان کے اگلے گھٹنے بھی باندھ دیے۔ یوں اگر وہ کھل بھی جاتیں تو ان کے لیے زیادہ دور جانا ممکن نہ رہتا۔ ان کے دو مرتبہ غائب ہونے کے بعد میں ان کی طرف سے بے حد محتاط رہنے لگا تھا۔ ان دونوں کو خشک دانہ ڈال کر میں نے اپنے لیے کھانا [illegible]

[illegible] خشک گوشت' روٹی اور پنیر پر مشتمل تھا۔ اس کے [illegible] خشک کیا ہوا دہی بھی تھا۔ دہی اس علاقے میں صحت [illegible] رکھنے کے لیے بے حد ضروری تھا۔ کچھ اونٹنی کا خشک [illegible] بھی تھا۔ جسے میں پانی میں ڈال کر پیتا تھا۔ دن بھر کی [illegible] اور کئی میل پیدل چلنے کی وجہ سے مجھے بھوک بہت [illegible] تھی۔ لیکن میں اپنے راشن کو احتیاط سے استعمال کرنے [illegible] تھا۔ کھا پی کر میں نے اپنا سلیپنگ بیگ نکالا' یہ خاص [illegible] کا سلیپنگ بیگ تھا جس میں لگی جالی سے مکھی' مچھر یا [illegible] اور کیڑا اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سونے سے پہلے [illegible] حسب معمول بی بی سی کی سروس سنی۔ پھر ایک چینل [illegible] ہونے والی موسیقی سنی۔

صبح سورج کی کرنوں کی گرمی نے مجھے بیدار کیا۔ یہ پہلا [illegible] تھا جب میں سورج نکلنے تک پڑا سوتا رہا تھا۔ شاید گزشتہ [illegible] تھکن کا اثر تھا۔ میں نے سلیپنگ بیگ سے سر نکالا۔ سورج کا آتشیں گولا جھانک رہا تھا۔ میرے [illegible] پر کم از کم ایک درجن اقسام کے کیڑے [illegible] چل پھر رہے تھے اور ان کی تاک میں ارد گرد کئی [illegible] اور گرگٹ بیٹھے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک سانپ کنڈلی مارے سو رہا تھا۔ معاً میری توجہ ایک لومڑی کی طرف ہو گئی تھی۔ جو تیزی سے ایک ٹیلے [illegible] کر دوسرے ٹیلے کے عقب میں چلی گئی۔ میں دم بہ خود [illegible] تھا۔ اتنی مختصر سی جگہ میں مجھے زندگی کی درجنوں اقسام [illegible] تھیں اور کہنے والے اس سرزمین کو زندگی سے عاری [illegible] رہے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کرہ ارض کا کوئی [illegible] زندگی سے خالی نہیں ہے۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں' [illegible] برف زاروں' حتیٰ کہ آتش فشانوں کے دہانوں [illegible] بھی زندگی ملتی ہے۔

[illegible] ہی میں نے سلیپنگ بیگ سے باہر قدم رکھا' تمام [illegible] والے کیڑے مکوڑے سیکنڈوں میں غائب ہو گئے۔ [illegible] دوسرے جانوروں کا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب [illegible] ہو چکے تھے۔ میں نے کافی کا پانی رکھا اور ناشتے کی تیاری [illegible]۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے پیگی اور ٹریڈ پر [illegible] کیا اور ان کی مہار تھام کر آگے چل پڑا۔ میرے [illegible] کی سوئی بتا رہی تھی کہ اس وقت ہم سطح سمندر سے [illegible] فٹ کی بلندی پر ہیں۔ جبکہ آکلے کی اصل بلندی ابھی [illegible] نہیں ہوئی تھی۔ دس بجے درجہ حرارت بانوے ڈگری [illegible] تھا جو دوپہر تک دو سو درجے فارن ہائٹ سے تجاوز [illegible]

حیرت کی بات ہے کہ وہاں مجھے کہیں پتھریلا حصہ نظر نہیں آیا۔ اتنی بلندی پر ریتیلا صحرا ایک عجوبہ ہی تھا کیونکہ ہوا ریت کو منتشر کر دیتی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے بھی یہ ایک مختلف علاقہ تھا اور اس کا اپنا الگ نظام تھا۔ جو اس کی ریت کو نشیبی صحرا میں منتقلی سے روکتا تھا۔ یہاں ہوا بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے تھے جو ریت پر موجود سلوٹوں کو یوں بدلتے جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں پانی کی لہریں۔ بلاشبہ یہ بے حد خوبصورت اور مبہوت کر دینے والا منظر تھا۔ مگر جلد ہی ریت انگاروں کی طرح میرے تلووں کو جھلسانے لگی۔ زمین سے جیسے گرم ہوا کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں اور سورج سر پر روشن تھا۔ میرے اگلے چند دن بے حد گرم گزرے تھے۔ سورج طلوع ہونے کے ایک گھنٹے بعد سے لے کر سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد تک بے حد گرمی رہتی تھی۔ اس کے بعد صحرائی ریت تیزی سے ٹھنڈی پڑنے لگتی تھی اور سورج غروب ہونے کے تین گھنٹے بعد فضا خوش گوار حد تک خنک ہو جاتی تھی اور رات بارہ بجے تک شدید خنک۔ رات کو اتنی سردی پڑتی تھی کہ بغیر کسی گرم کمبل کے سونا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اپنے گرم سلیپنگ بیگ میں ہی چین کی نیند آتی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ دن کو جو صحرا جان لیوا حد تک گرم ہوتا ہے' وہ رات کو اس قدر سرد ہو جاتا تھا۔ میں نے دن اور رات کے درجہ حرارت میں بعض اوقات چالیس ڈگری سینٹی گریڈ کا فرق بھی ریکارڈ کیا تھا۔

ٹریڈ اور پیگی دونوں پندرہ سال کی تھیں۔ ایک اونٹ کے لیے یہ بھرپور جوانی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب وہ طاقت سے مالا مال ہوتا ہے۔ لیکن خوف ناک آکلے میں سفر کرتے ہوئے ان دونوں کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ان کے وزن میں سرعت سے کمی ہو رہی تھی۔ ہر روز مجھے وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور ہی نظر آتی تھیں۔ شام کو جب میں انہیں بوجھ سے آزاد کراتا تو وہ نڈھال ہو کر لیٹ جاتیں۔ ان کے تیزی سے گھلتے کوہان مجھے فکر مند کر رہے تھے۔ اگرچہ تمارسک کے پتے کھا کر وہ کچھ سنبھل گئی تھیں لیکن جلد ان کی توانائی زائل ہونے لگی تھی۔ مجھے ایک اور تمارسک کے درخت کی تلاش تھی جو نویں دن مل گیا لیکن بد قسمتی سے اس میں پیگی اور ٹریڈ کے لیے زیادہ چارہ نہیں تھا۔ بہرحال ان کی کسی قدر تشفی ضرور ہو گئی تھی۔

نویں دن میں نے ماریطانیہ کی سرحد میں قدم رکھا۔ یہ میرے پورے سفر کا سب سے گرم دن تھا اور گیارہ بجے ہی

پاکستانی پوائنٹ
وقار عظیم

میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ میں معذرت کر کے پیگی پر سوار ہو گیا مگر اس روز اس کا موڈ بھی خراب تھا۔ اس نے گھوم کر مجھے دیکھا اور اچانک بیٹھ گئی۔ میں نے اتر کر اسے چمکارا... اور دوبارہ اس پر سوار ہوا ہی تھا کہ میرے اچھی طرح بیٹھنے سے قبل ہی وہ اچانک تیزی سے اٹھی۔ میں جھٹکے سے فضا میں اُڑا اور چھ سات گز دور پسلیوں کے بل ریت پر جا گرا تھا۔ تکلیف کی شدید لہر نے مجھے دہرا کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری کئی پسلیاں داغ مفارقت دے گئی ہوں۔ بہ مشکل اٹھ کر میں نے پیگی کی مہار پکڑی۔ اس کی سرکشی ہوا ہو چکی تھی۔ غالباً اسے احساس تھا کہ اس نے اپنے مالک کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا لہٰذا اس نے تلافی کے طور پر خود بیٹھ کر مجھے سوار ہونے کا موقع دیا۔ جب وہ چلی تو اس کے ہر جھٹکے پر میری پسلیوں پر قیامت گزر جاتی تھی۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی۔ میں نے جیسے تیسے معمولات نمٹائے اور درد کش ادویات کھا کر سو گیا۔

ابھی مجھے مزید ایک سو ستر میل کا سفر طے کرنا تھا اور میرے پاس صرف چھ گیلن پانی باقی تھا۔ اکیس میل فی دن کی رفتار سے میں آٹھ... دن میں یہ فاصلہ طے کرتا گویا ایک دن کے لیے میرے پاس ایک گیلن سے بھی کم پانی تھا۔ اس پر میں زخمی بھی ہو گیا تھا۔ واپسی کا راستہ دور تھا اور آگے کا راستہ نامعلوم.... بہرحال صبح میں سو کر اٹھا تو پسلیوں کی تکلیف میں خاصا افاقہ تھا۔ دسویں روز میں کمر کس کر چلنے کو تیار ہوا۔ ابھی مجھے سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزرے تھے کہ ہمارے چاروں طرف عجیب طرح کے بگولے ناچنے لگے۔ پہلے ریت پر ہلکا سا بھنور پڑتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کی رفتار تیز ہونے لگتی اور پھر بگولا بن جاتا جو چاروں طرف بے تحاشا مٹی پھینکتا۔ میرے خیال میں اس وادی کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ ہوا یہاں دائرے میں گھومنے پر مجبور ہو جاتی۔ لیکن بھنور بننے کا سبب میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ بگولے اس طرح نہیں بنتے ہیں۔ کم از کم میرے علم کے مطابق۔ میرا خیال ہے مقامی عرب ان بگولوں کو ہی بد روحوں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ معمولی قسم کے بگولے تھے۔ اگر یہ بڑے اور طاقت ور ہوتے تو مجھے، پیگی اور ٹریڈ سمیت اڑا لے جاتے اور ہمارا بچنا کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ دو بجے تک میں بگولوں کی وادی سے نکل آیا تھا۔ میرے عقب میں کچھ ایسا شور سنائی دے رہا تھا جیسے میرے بچ نکلنے پر بد روحیں ماتم کناں ہوں۔

دوپہر کے بعد موسم حیرت انگیز طور پر خوش گوار ہو گیا تھا۔ شاید اس میں سطح مرتفع کی بلندی کا دخل بھی تھا۔ سطح سمندر سے بلندی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ تھی۔ گہرے بادل آئے تو مجھے امید ہوئی کہ شاید بارش ہو... امید، امید ہی رہی۔ پڑاؤ ڈالنے کے بعد میں نے... کتاب نکالا تو اس کے مطابق میں آکلے کے عین وسط... اور اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ یہاں قدم رکھنے... پہلا بنی نوع آدم میں ہی ہوں۔ میں نے اپنے سامان... یونین جیک نکالا، آپ اسے کوئی اوزار مت سمجھیں... کے پرچم کو یونین جیک کہتے ہیں اور پھر یہ یونین جیک میں... وہاں دستیاب سب سے بلند ٹیلے کی چوٹی پر ایک چھڑی... لگا دیا۔ نیچے آ کر میں نے ایک پائنٹ پانی سے منہ ہاتھ دھو... جو ان حالات میں ایک عظیم عیاشی سے کم نہیں تھا... پورے دس دن بعد منہ ہاتھ دھونے کا ملا تھا اور اس... میری حالت پر خوش گوار اثرات مرتب ہوئے تھے۔

گیارھویں دن میں نے پیگی اور ٹریڈ کو بوجھ سے آزاد... تو وہ بے تابی سے پانی کے خالی جیری کینز کے ارد گرد منڈلانے لگیں۔ جو ان ہی کی حماقت سے خالی ہوئے تھے۔ میں... جیری کین خالی کر کے پانی ایک چھوٹی بوتل میں ڈال دیا... پانی کل پندرہ پائنٹ تھا۔ ایک پائنٹ پانی کا اندازہ تھا... تاک صحرا میں مجھے ابھی مزید چھ دن سفر کرنا تھا... کی حالت کے پیش نظر یہ وقت بڑھ سکتا تھا اور... صرف دو دن کے لیے کافی ہوتا۔ اس رات میں... لیے لیٹا تو میرے ذہن میں یہی خیال گونج رہا تھا کہ ا... خاتمہ قریب ہے۔

تیرھویں دن میں اچانک ہی ڈھلان پر اترنے لگا... لگ رہا تھا کہ آکلے کی حدود ختم ہو رہی ہیں۔ کیونکہ... جنوب مغرب کی طرف جاتا تھا۔ بہرحال آکلے... اندازے سے دو دن پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر بارہ میل... ایک بار پھر چڑھائی شروع ہو گئی اور میں دوبارہ آکلے کی... میں داخل ہو رہا تھا۔ دراصل میں قبل از وقت ہی... مغرب کی طرف مڑ گیا تھا۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ... گھنٹے کی ویڈیو فلم بناتا تھا اور رات کو سوتے وقت... ریکارڈر پر اپنے تاثرات ریکارڈ کر لیتا تھا۔ اس دن کے... میں، میں نے اپنا پیغام ریکارڈ کیا۔

”جہاں تک نظر جاتی ہے آکلے نامی یہ صحرا... ہے۔ ابھی مجھے ایک سو میل سے زیادہ کی مسافت طے... ہے اور میرا پانی ختم ہونے کے قریب ہے۔ میں خود کو... آدمی تصور کر رہا ہوں۔ میرے پاس اتنا پانی نہیں... آب کی طرف جا سکوں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں... اب مغرب کی سمت سفر جاری رکھوں۔“

...ویں دن صبح سے بے حد گرمی تھی۔ ریت توے کی... رہی تھی اور ہوا سے یوں لگ رہا تھا جیسے سیدھی... آ رہی ہو۔ میں نے اپنا رُخ جنوب مغرب کی سمت... اور اب میرا سفر ڈھلان پر تھا۔ اس سے مجھے اندازہ... اب میں آکلے سے باہر نکل رہا تھا۔ یہاں ریت... بہت بڑے اور پر شکوہ تھے۔ ڈھلان تہ در تہ تھی۔... اترنے کی رفتار بے حد سست تھی۔ اونٹ ویسے... ڈھلان چڑھنے اور اترنے کے معاملے میں کمزور جانور... اور ٹریڈ بہت قدم جما جما کر ڈھلان سے اتر رہی... آکلے میں سفر کے دوران میں اکثر مجھے عرب گائیڈ کی... یاد آتی۔ اس نے کہا تھا کہ میں آکلے سے دور... ایک ساعت میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ اکثر مجھے... کہ میں نے اس کی بات کیوں نہیں مانی۔ مگر... کے قریب جب اچانک ہی ناہموار ڈھلان... اور دور تک پھیلے سپاٹ میدان میں بدل گیا تو مجھے... ہوا کہ میں نے بہ خیریت آکلے کو عبور کر لیا تھا۔ میں نے... پر آخری نظر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ نہ جانے کیوں... بوجھل ہو رہا تھا۔ شاید مجھے آکلے سے محبت ہو گئی تھی... بچھڑتے ہوئے مجھے دکھ ہو رہا تھا۔

...پہر کے قریب میں قدرتی کھنڈرات میں داخل ہوا۔ اس علاقے میں لوہے کی آمیزش والی چٹانیں بکثرت... صدیوں سے ہوا، ریت اور پانی نے انھیں گھس گھس... شکل دے دی تھی۔ جیسے کسی قدیم شہر کے کھنڈرات... ستون نما شکلیں اور دیواریں تھیں۔ ایک پتھر پر... ہوا کہ اس پر کچھ نقوش کھدے ہوئے تھے۔ میں نے... کو اپنے ویڈیو کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ ممکن تھا کہ... قدیم زبان نکلتی، شاید اس دور کی جب انسان نے... استعمال شروع کیا تھا، اس جگہ لوہے کی کانیں ہوں۔... میں ان کھنڈرات سے نکل گیا تھا۔

...پاس صرف تین پائنٹ پانی رہ گیا تھا۔ اور ابھی... میل دور تھا۔ یہ مسافت تین دن سے کم میں... سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے سفری منصوبے میں... تبدیلی کی۔ میں نے پہلے امیر سال جانے کا فیصلہ... سے مغرب میں دو دن کی مسافت پر تھا۔ اب... تھکن اور پانی کی کمی سے برا حال ہو چکا تھا۔ میں... سونے کے لیے لیٹتا تھا تو اگلے دن کا سورج ہی مجھے جگاتا تھا۔ اس روز میں جاگا تو میں نے دیکھا اوپر فضا میں گدھ منڈلا رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا ــ عربوں میں مشہور ہے کہ یہ پرندہ کسی انسان یا جانور کی آنے والی موت کو قبل از وقت بھانپ لیتا ہے اور پھر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ مر نہیں جاتا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کل بھی دوران سفر میں کچھ گدھوں کو اپنے اوپر منڈلاتے دیکھا تھا۔ کچھ گدھ مجھ سے دس قدم کے فاصلے پر ریت پر بیٹھے اپنی حریص نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر آوازیں نکالیں اور ہاتھ چلائے تو وہ اڑ کر چند قدم دور چلے گئے۔ لیکن وہ ٹلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔

میرا پورا جسم دکھ رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل رخت سفر باندھا۔ امیر سال ابھی چالیس میل کی مسافت پر تھا۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ دن کے بجائے رات کو سفر کروں گا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے پاس صرف ایک پائنٹ پانی رہ گیا تھا اور دن میں یہ فوراً ہی بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ اگر میں دن کو آرام کرتا اور رات کو سفر کرتا تو میرے جسم میں باقی رہ جانے والا پانی زیادہ عرصے چل سکتا تھا۔ لہٰذا دوپہر کو جب میرے اندازے کے مطابق امیر سال کوئی بیس میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا، میں نے ایک چٹان کی آڑ میں پڑاؤ کیا اور سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ چھ گھنٹے کی نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھانا کھایا۔ اس روز بے حد گرمی تھی اور درجہ حرارت ایک سو بیس درجے فارن ہائٹ تک جا پہنچا تھا۔ میں نے پانی کا آخری گھونٹ پیا اور سامان اونٹنیوں پر بار کر کے چل پڑا۔ سورج سے تپتی زمین کسی قدر ٹھنڈی پڑ گئی تھی اور ہوا کے جھونکوں میں بھی خنکی غالب آتی جا رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رات کے سفر سے پیگی اور ٹریڈ بھی بے حد خوش تھیں۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے شروع ہی سے دن میں آرام کرنے اور رات کو سفر کرنے کی حکمت عملی کیوں نہیں اپنائی۔ دراصل ویڈیو کیمرے سے فلم صرف دن میں بنائی جا سکتی تھی۔ اسی بنا پر میں دن میں سفر کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ بہرحال اس کا حل بھی نکالا جا سکتا تھا۔ اگر میں پہلے ہی سوچ لیتا (البتہ جب میں نے بعد میں ایڈٹ شدہ فلم دیکھی تو مجھے دن میں سفر کرنے کا فیصلہ درست لگا۔ اس میں بہت سارے مناظر ایسے تھے جو رات کو شوٹ کیے ہی نہیں جا سکتے تھے۔ اگرچہ کیمرا سنبھالنے کے معاملے میں مجھے قطعی اناڑی کہا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس فلم نے تہلکہ مچا دیا تھا)

پاکستانی پوائنٹ
وقار عظیم

صبح چھ بجے کے قریب میں نے اس جگہ کو عبور کرلیا۔ جہاں میرے مفروضے کے مطابق امیر سال کو پایا جاتا تھا۔ مگر ابھی تک مجھے کسی آبادی یا سبزے کا نام ونشان تک نظر نہیں آیا تھا۔ چاروں طرف سپاٹ اور ہموار صحرا پھیلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں یہی تھا کہ میں نے ایک دو میل کے فرق سے امیر سال کو مس کردیا تھا۔ لہٰذا میں نے دائرے میں سفر کرتے ہوئے اونٹوں کے سفر کرنے کے تازہ نشان تلاش کرنا شروع کردیئے۔ ایک گھنٹے بعد مجھے یہ نشانات مل گئے اور میں ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ دوپہر بارہ بجے کے قریب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے مجھے خیمے اور اونٹ نظر آئے۔ لیکن یہ امیر سال نہیں تھا۔ یہ صحرائی خانہ بدوشوں کا ڈیرہ تھا۔ وہ رات کو سفر کرتے تھے اور دن میں پڑاؤ ڈالتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ان کے قدموں کے نشانات مل گئے تھے اور میں پیاسا مرنے سے بچ گیا تھا۔

صحرائی خانہ بدوشوں نے کشادہ دلی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے اپنی ناقص عربی میں انہیں بتایا کہ کس طرح میں نے کولاٹا جاتے ہوئے امیر سال کے لیے راستہ بدلا۔ لیکن مجھے امیر سال بھی نہیں ملا۔ یعنی نہ صنم ملا اور نہ خدا۔ اس پر ایک خانہ بدوش نے انکشاف کیا کہ میں کولاٹا سے صرف انیس میل کے فاصلے پر ہوں اور امیر سال تو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں سے اس کا فاصلہ دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی غلطی کروں گا۔ صحرا میں اس قسم کی غلطی کا مطلب سوائے دردناک موت کے کچھ نہیں ہوتا اور اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر مجھے یہ خانہ بدوش نہ ملتے تو میرا انجام ایسا ہی ہوتا اور پیچھے بعد از مرگ مجھے برا بھلا کہنے والوں میں مک ڈونلڈ بھی شامل ہوتا۔ جس نے اس مہم کو اسپانسر کیا تھا۔

مجھے فوراً خانہ بدوشوں کے سردار کے خیمے میں لے جایا گیا۔ حسب توقع وہ ایک معمر آدمی ثابت ہوا۔ لیکن اس کا جسم نوجوانوں سے زیادہ مضبوط تھا اور اس کا ثبوت اس کی تین عدد بیویاں تھیں جن میں سب سے چھوٹی عمر میں اس سے شاید ایک تہائی تھی۔ انہوں نے اونٹنی کے دودھ کی بنی کھیر سے میری تواضع کی۔ دوپہر کے کھانے میں بھیڑ کا گوشت اور خمیری روٹی تھی اور اس کے ساتھ دہی۔ بہت دنوں بعد میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور پڑ کر سو گیا۔ شام کو سورج ڈھلتے مجھے جگایا گیا۔ خانہ بدوش اپنی منزل کی طرف کوچ کرنے کی تیاری کررہے تھے۔ انہوں نے میری اونٹنیوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی تھی اور ازراہِ عنایت انہیں ایک ایک ڈول پانی بھی

دیا تھا۔ بہ قول ساربان، یہ اونٹنیاں غیر معمولی قوت رکھتی تھیں ورنہ عام اونٹ پندرہ دن تک بغیر پانی کے سکتے تھے اور انہوں نے تو آکلے کا دشوار گزار صحرا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خانہ بدوش اس کا احترام کررہے تھے۔ بلکہ وہ پیگی اور ٹریڈ کو بھی وہی درجہ دے رہے تھے۔ انہیں کیونکہ کولاٹا کی مخالف تھا اس لیے میں نے آٹھ بجے وہاں سے رخصت لی۔ پہلے انہوں نے مجھے کھانا کھلایا اور ڈیڑھ گیلن پانی دیا۔ بڑا ایثار تھا جو انہوں نے اس شخص کے لیے کیا تھا ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ یہ خانہ بدوش پانی کی محدود لے کر سفر کرتے ہیں اور اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ نے مجھے واضح طور پر سمجھادیا تھا کہ کولاٹا کس سمت میں اور اس کے راستے میں کیا کیا نشانیاں آئیں گی۔

روانگی کے وقت میں سوچ رہا تھا کہ میں نے تعین میں اتنی بڑی غلطی کیسے کی جبکہ میرے پاس تھا۔ میں امیر سال کی طرف جانے کے بجائے اس ڈگری جنوب میں نکل گیا تھا اور درحقیقت میں جنوب کی طرف ہی محوِ سفر تھا۔ معاً مجھے راستے میں پڑنے والی کانیں یاد آگئیں۔ اُف میرے خدایا میں نے اتنی معمولی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی کی بکثرت موجودگی نے کمپاس میں گڑبڑ کردی ریڈنگ غلط نتیجہ دے رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ خانہ بدوش مل گئے ورنہ اب تک صحرا میں بھوکے بھٹکتے رہنے سے میرا انتقال ہوچکا ہوتا۔

میرا خیال تھا کہ میں صبح تک کولاٹا پہنچ جاؤں گا تقدیر ابھی مجھے مزید آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔ خانہ سردار نے مجھے کولاٹا تک جانے کے لیے جو راستہ میں آخر میں کئی وادیاں آتی تھیں۔ جو جنوب مغرب ناقابل عبور تھیں۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وادی میں اتر کر کولاٹا کی طرف جانا تھا۔ صبح دس بجے میرے سفر کو اٹھارواں دن تھا، میں ایک پتھریلے علاقے پہنچا اور جہاں یہ پتھریلا علاقہ ختم ہوتا تھا، وہاں میرے کے نیچے ہزار فٹ کی گہرائی میں دور تک ایک وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا سرا اتنا دور تھا کہ سے نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ میں تذبذب میں تھا کہ اتروں یا نہ اتروں، میرے پاس غلطی کی گنجائش کیونکہ رات بھر کے سفر میں، میں نے پانی کا استعمال کرلی تھی اور اب میرے پاس بہ مشکل ایک

پیا تھا۔

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ میں پیگی اور ٹریڈ کو لے کر وادی میں اتر گیا۔ پھسلواں ریت کے سلوپ پر ہم پھسلتے ہوئے نیچے تک پہنچے تھے۔ کپڑے جھاڑ کر میں نے ان دونوں کی مہاریں تھامیں اور وادی کے دوسرے سرے کی طرف بڑھا لیکن دو گھنٹے سفر کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو وادی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چاروں طرف پتھروں کی دیواریں کھڑی تھیں جو کہیں کہیں تو نوے درجے کے زاویے پر سیدھی کھڑی تھیں اور کہیں ان میں کسی قدر ڈھلان تھی۔ ایسی ہی ایک ڈھلان کو منتخب کرکے میں نے پیگی اور ٹریڈ سمیت اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار چند قدم چڑھ کر وہ دونوں واپس آجاتیں۔ ان کی توانائی ختم ہوچکی تھی اور رہی سہی کسر رات کے سفر نے پوری کردی تھی۔ ان کے لیے ڈھلان چڑھنا بہت مشکل تھا۔ مجبوراً میں نے کوشش ترک کردی اور پڑاؤ ڈالنے کے لیے دو چٹانوں کے درمیان موجود جگہ کو منتخب کیا۔ مجھے امید تھی کہ دس بارہ گھنٹے کے آرام کے بعد پیگی اور ٹریڈ اتنی تازہ دم ہوجائیں گی کہ اوپر چڑھ سکیں۔ ویسے تو میں ان کے بغیر خود اوپر جاسکتا تھا لیکن میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ ان دو رفیقوں کو یہاں بے یارومددگار چھوڑ جاؤں۔ جن کے بغیر میں یہ سفر نہیں کرسکتا تھا۔ اب رات کو جب میں نے واپس آکر وادی سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو مجھے احساس ہوا کہ تاریکی کے باعث کوئی خطرناک حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔ مجبوراً خانہ بدوشوں کے دیے گئے پانی کا آخری قطرہ میں نے صبح ناشتے میں حلق سے اتار لیا تھا۔ بہ دقت تمام میں پیگی اور ٹریڈ کو اس وادی سے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ ہزار فٹ کی مسلسل چڑھائی چڑھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کہ تنے ہوئے رسے پر چل کر نیاگرہ آبشار عبور کرنا۔ بعض جگہ تو مجھے ان دونوں کو زور لگا کر اوپر کھینچنا پڑتا تھا۔ باہر نکل کر میں نے دوسری وادی کا رخ کیا۔ یہ نسبتاً کم گہری ثابت ہوئی اور یہاں کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے لگتا تھا کہ یہ وادی عام آمدورفت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

ساڑھے تین بجے میری ہمت جواب دے گئی اور میں بادل ناخواستہ کمزور پیگی پر سوار ہوگیا۔ اسے میری حالت کا احساس تھا لہٰذا اس نے خود بیٹھ کر مجھے سوار ہونے میں مدد دی اور مجھے لے کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے چل دی۔ خدا خدا کرکے ہم شام کے قریب اس وادی سے نکلے اور باہر نکلتے ہی میری نگاہ سامنے موجود افراد اور اونٹوں پر پڑی۔ ذرا

فاصلے پر کچے پکے مکانوں کی ایک بستی تھی جس کے درودیوار سورج کی ڈوبتی کرنوں میں جگمگا رہے تھے۔ وہاں موجود اکثر افراد میری طرف دوڑے۔ چند لمحے بعد میں ان میں گھرا کھڑا تھا۔

"کولاٹا؟" میں نے بستی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

"کولاٹا... کولاٹا" ایک سیاہ فام شخص نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔

میری نگاہ بستی سے باہر موجود کنوئیں پر پڑی۔ جہاں مویشیوں کے مالک اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ میں پیگی اور ٹریڈ کو لے کر اس طرف بڑھا۔ کنوئیں سے پانی نکالنے والے نے ہماری حالت کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس نے چمڑے کے بڑے سے ڈول سے پانی نکال نکال کر فولادی ٹب میں ڈالنا شروع کردیا۔ پیگی اور ٹریڈ بے تاب ہوکر ٹب کی طرف لپکیں۔ انہوں نے آخری بار بیس روز پہلے سیر ہوکر پانی پیا تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بیس پچیس گیلن پانی پی لیا تھا۔ ان کے سیر ہونے کے بعد میں نے کنوئیں کے ٹھنڈے میٹھے پانی سے اپنے جسم وجان کو تر کیا۔ مجھے پوری زندگی میں پانی پینے کا ایسا مزہ کبھی نہیں آیا تھا جو اس روز کولاٹا کے اس غریب سے گاؤں کے مویشیوں کے پانی پینے والے ٹب میں سے پانی پی کر آیا تھا۔ شاید ایسے ہی کچھ خیالات پیگی اور ٹریڈ کے بھی ہوں۔

قصہ مختصر مک ڈونلڈ جو مجھے مرحوم تصور کرچکا تھا اور اپنی سرمایہ کاری کو ڈوبا ہوا سمجھ رہا تھا، مجھے زندہ دیکھ کر ایک بار پھر جی اٹھا تھا۔ اس نے میرے اعزاز میں شیمپین کی بوتل کھولی تھی اور میری واپسی کے منظر کو دوبارہ شوٹ کیا تھا۔ اس نے میری بنائی ہوئی ویڈیو فلم کی بھی بے حد تعریف کی تھی۔ لیکن اس ساری تعریف وتوصیف کے بعد مجھے صرف وطن واپس جانے کا ٹکٹ ملا تھا۔ پیگی اور ٹریڈ کو میں نے بھاری دل کے ساتھ ایک مقامی امیر کو بیچ دیا تھا۔ جو خود بھی اونٹوں سے عشق کرتا تھا اور اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ ان عظیم اونٹنیوں سے ان کے شایانِ شان سلوک کرے گا۔

جب میں گھر پہنچا تو پہلی نظر میں مجھے میرے بچپن کے دوستوں نے پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔ میرا وزن دو سو پاؤنڈز سے کم ہوکر صرف ایک سو چالیس پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ میری تین پسلیاں چٹخی ہوئی تھیں اور خون میں بچھو کے کاٹے کے زہریلے اثرات موجود تھے۔ صحارا کا یہ سفر میرے لیے ایک طرف بھیانک یادیں رکھتا ہے تو دوسری طرف میں ایک بار پھر وہیں جانے کی خواہش محسوس کرتا ہوں۔

راوی : شاہ جہاں عرف جہانی استاد

تحریر: طاہر جاوید مغل

اُس شخص کی داستان جسے حالات کی ٹھوکروں نے مجرم بنا دیا تھا۔ اُس کا نام شاہ جہاں رکھا گیا مگر دنیا نے اُسے جہانی اُستاد کے نام سے پہچانا اکڑی ہوئی گردنیں اُس کے روبرو خم ہوتی چلی گئیں۔ جرائم کی دنیا کے بڑے بڑے روشن نام اُس کے سامنے بجھ گئے قانون کے محافظوں کے لیے وہ ہمیشہ ایک مسئلہ رہا لیکن ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا لاہور جیل، پھر اٹک جیل کی صعوبتیں اُس کا مقدر بنیں مگر گردشِ حالات کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے، زندگی جہانی استاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔ حالات کی ہر نئی کروٹ اُسے اُن جانے راستوں پر گھسیٹ رہی تھی اور وہ بادلِ ناخواستہ اُس سمت قدم بڑھانے پر مجبور تھا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر سفر کرتی ہوئی ایک پُرپیچ سرگزشت۔

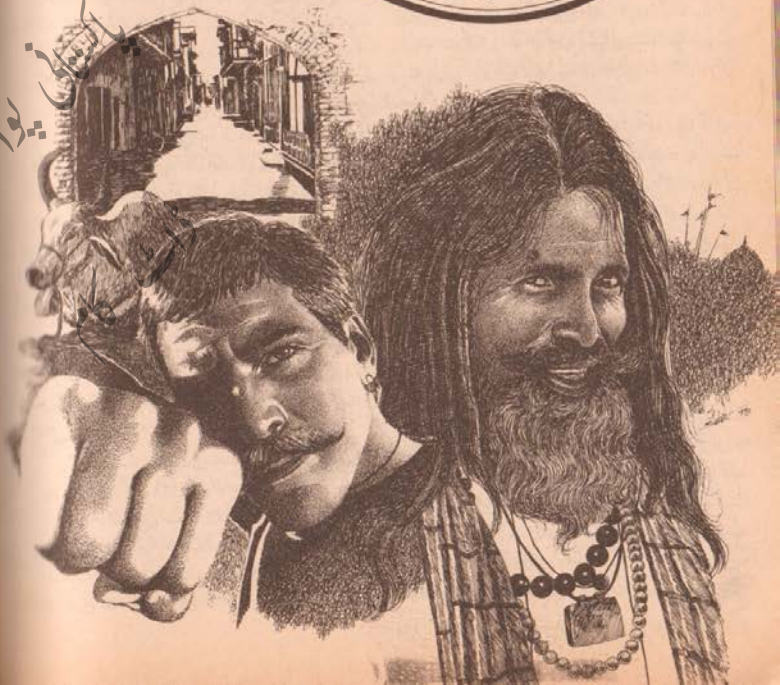

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

گزشتہ قسط کا خلاصہ

مسٹر سالم کے چھوٹے بھائی وسیم نے سارا قصہ سنا دیا تاہم یہ بات واضح ہو گئی کہ جوہری برادران مسٹر جی کلارک کے ساتھ مل کر کام کر رہے تھے۔ پھر مسٹر کلارک کا ایک نائب ملٹن اپنے دیگر ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا تو شاہ جہاں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ملٹن شاہ جہاں کی اہمیت اور مقام سے آگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سالم اور وسیم ان کے سامنے بچھے جا رہے تھے حتیٰ کہ بدر اور اس کے شوہر واحد کو بہ آسانی وہاں سے جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک موقع پر جہانی استاد اینڈ کمپنی مصری حسینہ مامونہ کی معیت میں شہر کی سیر کو نکلے تو مبارک امین نے بہ زورِ بازو انہیں اغوا کروالیا اور تنزانیہ سے 'مائیکل کے پاس ماریطانیہ کے شہر نیما (NEMA) پہنچا دیا جہاں "ماریا ٹرسٹ" نامی ایک بلڈنگ میں انہیں ٹھہرایا گیا۔ ایک رات مبارک امین نے غزالہ کو اپنے پنجۂ ہوس میں دبوچنے کی کوشش کی تو جہانی استاد نے اطالوی دوشیزہ سوزی کے تعاون سے نامبارک امین کی ایسی تیسی کر دی۔ ازاں بعد مسلح گارڈز نے اس پر قابو پا کر قید خانے میں پہنچا دیا۔ کچھ دیر بعد سراپا قہر و غضب مائیکل بہ نفسِ نفیس وہاں موجود تھا۔

قسط: 90

مائیکل کا غیظ و غضب سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ میرے ہاتھوں اس کا دوست مبارک امین قتل ہوا تھا اور یہ واقعہ صرف آٹھ نو گھنٹے پہلے کا تھا۔ مائیکل کے پیچھے ہی پیچھے دو حبشی گارڈ بھی کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ان جلاد نما حبشیوں نے صرف پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ بالائی جسم عریاں تھے۔ میری تمام تر توجہ مائیکل کی طرف تھی۔ میں اس کی انگارا آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک کوٹھڑی کے سلاخ دار دروازے میں سے کوئی شے گزر کر میری طرف آئی۔ ایک دائرہ سا میری آنکھوں کے قریب چمکا۔ دفعتاً مجھے پتا چلا کہ میری گردن میں تانبے کا بنا ہوا وہی مخصوص کڑا ڈال دیا گیا ہے جو میں اس سے پیشتر جہاز ہرکولیس میں دیکھ چکا تھا۔ اس کڑے کا تعلق ایک طویل بانس نما راڈ سے تھا۔ مائیکل کے سخت گیر پہرے دار اس راڈ کو بڑی پھرتی سے قیدیوں کی کوٹھڑی میں داخل کرتے تھے اور تانبے کا حلقہ یا کڑا کسی قیدی کی گردن میں فٹ ہو جاتا تھا' پھر اس قیدی کو کھینچ کر سلاخوں کے قریب لایا جاتا تھا اور بے رحمی سے تشدد کیا جاتا تھا۔ ایک ہی لمحے میں یہ ساری تفصیل میری نگاہوں کے سامنے گھوم گئی۔

سخت کڑے کی پتری میری گردن میں دھنستی چلی جا رہی تھی۔ پھر دونوں حبشیوں نے مل کر زور لگایا اور میں کھنچتا ہوا سا سلاخ دار دروازے سے آ ٹکرایا۔ اب میرا چہرہ آدم خور مائیکل سے فقط چند انچ کی دوری پر تھا۔ اس کی درندے جیسی سانس میرے رخساروں سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ کسی درندے ہی کی طرح غرایا "بھگوڑا کہاں تک بھاگ سکتا ہے۔ آخر پکڑا جاتا ہے یا مر جاتا ہے اور تم بھی مر جاتے تو تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔" اس کے الفاظ میں خوفناک دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔

"تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جو کرنا ہے خدا نے کرنا ہے۔"

"خدا نے جو کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔ اس نے تمہارے ہاتھوں مبارک کو قتل کرا دیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ خدا نے اس ذریعے سے تم پر عذاب نازل کیا ہے۔ ایسا عذاب جو تمہیں جینے دے گا نہ مرنے دے گا۔" اس نے چند لمحے توقف کیا پھر میرے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے بولا "جوزف کہاں ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ مائیکل جلد یا بدیر یہ سوال ضرور پوچھے گا۔ جب ہم پرل فارمز سے فرار ہوئے تھے جوزف کو ہم نے راستے میں ایک جوہڑ کے کنارے چھوڑا تھا۔ بعد ازاں بوڑھے داراب کے گھر ہونے والی فائرنگ میں جوزف کو مبارک ہی کے کسی کارندے کی گولی لگ گئی تھی۔ کئی گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد جوزف نے دم توڑ دیا تھا۔

مائیکل نے میرے بالوں کو مزید جھٹکا دیتے ہوئے اپنا سوال دہرایا "کہاں ہے جوزف؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" میں نے بمشکل کہا۔ تانبے کا حلقہ میری آواز کو گلے میں گھونٹ رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اور تم بتاؤ گے بھی۔ اور اگر نہیں بتاؤ گے تو پھر تمہاری ڈاکٹر بتائے گی۔ اور اس سے میں جس طرح پوچھوں گا اس کا اندازہ بھی تمہیں ہے۔ وہ میرے ہاتھوں زندہ درگور ہو جائے گی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم ہی بتا دو۔" مائیکل نے میرے بالوں کو ایک اور زبردست جھٹکا دیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بند رکھے پھر میری آنکھوں کے سامنے منحوس "کی بوکو" لہرایا۔ بید کی وہی پتلی چھڑی جو بردوں کی کھالیں ادھیڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ہرکولیس میں اسی چھڑی سے میں نے دو قیدیوں کے چہرے کا بھرتا بنتے دیکھا تھا۔ مائیکل نے وحشیانہ انداز میں "کی بوکو" کو ہوا میں الٹ دی۔ "شائیں" کی باریک آواز دل دہلا دینے والی تھی "کیا خیال ہے جہانی! کچھ بتانا ہے یا چہرے پر نقش و نگار بنوانے ہیں۔"

پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی مائیکل نے "کی بوکو" کی ایک شدید ضرب میرے سر پر لگائی۔ واقعی کی بوکو ایک منحوس اور اذیت ناک چیز تھی۔ میں نے اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اس کی ضرب آج پہلی مرتبہ سہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کھوپڑی میں تلوار سی گھس گئی ہو۔ یقیناً دوسری ضرب میرے چہرے کے مزاج پوچھتی اور پھر ہر ضرب کے ساتھ میرے چہرے سے کھال لٹکنا شروع ہو جاتی۔ اپنی بے بسی کا یہ تماشا میرے تصور میں ناچ رہا تھا اور میں یہ تماشا مائیکل کو ہرگز دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں وہ عام قیدی نہیں تھا جسے یہ بردہ فروش جانوروں کی طرح مارتا تھا اور جانوروں ہی کی طرح چیخنے چلانے اور پاؤں میں لوٹنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دروازے کی سلاخیں پکڑیں' دونوں پاؤں اچھل کر سلاخوں سے ٹکائے اور بھرپور قوت سے پیچھے کی طرف زور لگایا۔ میری ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ دونوں حبشیوں کے ہاتھوں سے آہنی راڈ چھوٹ گئی تھی۔ میں مزید پیچھے ہٹا اور اس راڈ کو کوٹھڑی کے اندر لے آیا۔ پلک جھپکتے میں' میں نے تانبے کا حلقہ اپنی گردن سے اتار لیا۔ اب آہنی راڈ ایک طویل نیزے کی طرح میرے ہاتھ میں تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کوٹھڑی سے باہر موجود تینوں افراد بالکل سنبھل نہیں سکے۔ میں نے راڈ نیزے کی طرح ایک حبشی کے سینے میں ماری۔ ضرب کی شدت سے وہ اچھل کر دور جا گرا۔

اسی دوران میں مائیکل پھرتی سے ایک طرف ہو گیا اور اس نے اپنا ریوالور مجھ پر تان لیا "خبردار!" وہ چیخا "گولی مار دوں گا۔"

میں چند لمحے اسے گھورتا رہا پھر گہری سانس لے کر راڈ ایک طرف پھینک دی۔ میں نے راڈ مائیکل کے ریوالور سے ڈر کر نہیں پھینکی تھی' دراصل تینوں افراد دروازے سے دور ہو گئے تھے اور راڈ میرے لیے بیکار ہو گئی تھی۔ جہاں تک مائیکل کی دھمکی کا تعلق تھا وہ صرف گیدڑ بھبکی ہی تھی۔ یہ شخص اتنا ظالم تھا کہ اتنی آسانی سے مجھے مار ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے مارنا اس کے نزدیک اپنے "ظلم" کو قتل کرنے کے مترادف تھا' اور یہ ظلم اسے ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔

اس سے پہلے کہ آتش فشاں کی طرح ابلتا ہوا مائیکل مجھے کسی دیگر انداز سے سفاکی کا نشانہ بناتا' ایک حبشی تیز قدموں سے وہاں پہنچا۔ اس نے مائیکل کے بالکل قریب کھڑے ہو کر دھیمے لہجے میں کوئی بات کہی۔ اس کے فقرے میں سے صرف "کنگ" کا لفظ میری سمجھ میں آیا۔ حبشی کی بات سننے کے بعد مائیکل کے غضب کا بپھرا ہوا دریا جیسے ایک دم اتر گیا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے مجھے گھورا پھر ریوالور جیب میں رکھا اور حبشی پہرے داروں کو مقامی زبان میں ہدایات دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

حبشی پہرے دار رکھوالی کے خوں خوار کتوں کی طرح کوٹھڑی کے سامنے ٹہلنے لگے اور گاہے گاہے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگے۔ بردوں کی گردنیں ناپنے والا مخصوص پھندا اپنی طویل راڈ سمیت کوٹھڑی کے اندر ہی پڑا تھا' مگر پہرے دار اسے نکالنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے' یا شاید مائیکل ہی انہیں ہدایت دے گیا تھا کہ "قیدی" خطرناک ہے لہٰذا وہ پھندا باہر نکالنے کی کوشش نہ کریں۔

میں کوٹھڑی کی خستہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جسم کے کئی حصے پھوڑے کی طرح دکھ رہے تھے۔ نچلے ہونٹ اور ایک کہنی سے بھی گاہے گاہے خون رِسنے لگتا تھا۔ مجھے اس وقت سب سے زیادہ فکر غزالہ کی تھی...... اپنے کمرے میں لے جانے سے پہلے بدبخت مبارک امین نے اسے خواب آور دوا پلائی تھی۔ اس دوا کے زیرِ اثر غزالہ کی حالت مبارک کی خواب گاہ میں بہت پتلی نظر آ رہی تھی۔ میں غزالہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا مگر ہر طرف سنگلاخ دیواروں اور آہنی سلاخوں نے راستے روک رکھے تھے۔ امید کی ایک ہلکی سی کرن تھوڑی دیر پہلے نمودار ہوئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جس شخص کا پیغام مائیکل کو پہنچایا گیا تھا وہ کنگ براؤن تھا۔ یہ پیغام سن کر مائیکل کا ساتویں آسمان کو چھوتا ہوا پارا ایک دم نیچے آ گیا تھا۔ اب تک کنگ براؤن کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا تھا' اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک نہایت سخت منتظم اور قاعدہ پسند شخص ہے۔ مائیکل کے جو دوست اس ٹرسٹ میں عیاشی کی غرض سے آتے تھے وہ یہ کام کنگ براؤن سے چھپ چھپا کر کرتے تھے۔ نامبارک امین نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اب وہ میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کنگ براؤن کی ضابطہ پسندی کی وجہ سے میرے لیے بہتری کی کوئی صورت نکل آتی۔

سہ پہر تک میں بھوکا پیاسا اس کوٹھڑی میں بند رہا۔ پہرے دار بدستور دروازے کے سامنے موجود تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کے نہایت چوڑے اور مضبوط جبڑوں کی وجہ یہی ہے

پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

کہ وہ دونوں شیاطی ہیں اور اس لحاظ سے خطرناک درجے کے آدم خور ہیں۔ ڈھائی تین بجے کا وقت ہو گا جب مجھے سوزی کی شکل نظر آئی۔ اس کی تیوری پر بل تھے اور وہ بالکل خاموش نظر آ رہی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے عین سامنے وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے انگلش میں مجھ سے پوچھا "تمہارا حال کیا ہے؟"

"بہت مزے میں ہوں۔ انگ انگ خوشی سے جھوم رہا ہے۔"

"کھانا وغیرہ کھایا ہے؟"

"کھانا تو نہیں "وغیرہ" کھایا ہے۔ شاید مزید بھی کھاتا لیکن اس دوران میں تمہارے باس مائیکل کو کنگ کا بلاوا آ گیا اور وہ واپس چلا گیا۔"

سوزی کوٹھڑی میں پڑے پھندے اور راڈ کو دیکھ کر بولی "مجھے اس واقعے کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ بہرحال میں تمہیں یہی بتانے آئی ہوں کہ دماغ ٹھنڈا رکھو۔ زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کنگ براؤن تمہارے ساتھ نرمی کا سلوک کریں گے۔"

"میں کسی کی سختی سے خوف زدہ ہوں اور نہ کسی کی نرمی کا امیدوار ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ فی الوقت مجھے صرف اپنے ساتھیوں کی فکر ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولی "تمہیں ساتھیوں کی اور خاص طور سے اپنی ڈاکٹر کی فکر ہے۔ ڈاکٹر ہی کے بارے میں بتانے آئی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اسے اپنے ذاتی کمرے میں رکھا ہوا ہے اور ایک ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ خواب آور دوا کا اثر اس کے ذہن سے ختم ہو گیا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے دودھ بھی پیا ہے۔"

"اس عنایت کی وجہ؟" میں نے پوچھا "میں تو تمہاری کنپٹی پر پستل رکھ کر تمہیں گیسٹ ہاؤس میں لے گیا تھا۔"

"وہ تمہارا فعل تھا یہ میرا فعل ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ویسے سوزی! اگر تم میری بات پر یقین کر سکو تو کہوں گا کہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ پستل بھرا ہوا بھی ہوتا تو میں تم پر کبھی گولی نہ چلاتا۔"

اس نے میرے ہی انداز میں کہا "اگر تم بھی میری بات پر یقین کر سکو تو میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں کہو۔"

"مجھے معلوم تھا کہ میرا پستل خالی ہے۔ اس کے باوجود میں تمہارے آگے لگ کر گیسٹ ہاؤس چلی گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ ایک اچھی ہمدرد ثابت ہوئی تھی۔ وہ اب تک بالکل سپاٹ لہجے میں بات کرتی رہی تھی، پہرے دار انگلش نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سوزی کے تاثرات سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ غالباً ان کا خیال یہی تھا کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی بازپُرس کر رہی ہے۔

"تمہارا ایک اور احسان بھی تو ہے ہم پر؟"

"کون سا احسان؟"

"انجان مت بنو۔ جب ہم پرل فارمز سے فرار ہوئے تم لوگوں نے ہمارا تعاقب کیا۔ تم بھی تعاقب کرنے والوں میں شامل تھیں، اور تم نے ہمیں سرکنڈوں میں چھپے ہوئے دیکھا بھی تھا۔"

اس کے چہرے پر گلابی رنگ سا بکھر گیا۔ شاید پہرے دار موجود نہ ہوتے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی آ جاتی۔ اب وہ اپنا چہرہ اور لہجہ سپاٹ رکھنے پر مجبور تھی "شاید تم شکریہ ادا کر کے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ ہم بدستور دوست ہیں۔"

"ٹھیک ہے، نہیں ادا کرتا شکریہ... [illegible]"

"بس تمہاری یہی خدمت کافی ہو گی کہ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو اور باس مائیکل کو بھڑکنے کا موقع نہ دو۔ ایک بات اور یاد آئی۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی "کیا میں امید کروں کہ تم سچ سچ بتاؤ گے۔"

"ہاں پوچھو۔"

"کیا تمہیں واقعی جوزف کے بارے میں معلوم نہیں؟"

"معلوم تو ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ اس بارے میں مائیکل کو بتانا چاہیے یا نہیں۔"

"کیا معلوم ہے۔ کم از کم مجھے تو بتاؤ۔"

"جوزف ہلاک ہو چکا ہے۔ اور اسی نامبارک اسٹین گن کی گولی سے ہوا ہے جسے مائیکل اپنا پیارا دوست بتاتا ہے۔"

میں نے اس سارے واقعے کے بارے میں مختصراً اس کو بتایا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ آخر میں بولی "مجھے یقین ہے تم سچ کہہ رہے ہو، لیکن باس کو اس کا یقین دلانا خاصا مشکل کام ہو گا۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ خوامخواہ پریشان نہ ہوں۔ مجھے اپنے حالات سے نمٹنا آتا ہے۔"

وہ بولی "تمہاری ہمت پر شک نہیں لیکن تم نہیں جانتے کہ تم کس چار دیواری میں پہنچ گئے ہو۔ اگر میں نرم سے نرم لفظ بھی استعمال کروں تو یہی کہوں گی کہ تم خود کو اور اپنے ساتھیوں کو بدترین مشکلات کے لیے تیار کر لو۔"

اسی دوران میں بیرونی دروازے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ سوزی نے تسلی آمیز انداز میں سر ہلایا اور بولی "اچھا میں رات کو پھر آؤں گی۔ تم خود کو بالکل پُرسکون رکھو۔ اگر کنگ براؤن تم تک پہنچیں تو انہیں جوزف اور مارک کے قتل کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دینا۔"

وہ پہرے داروں کو چند ہدایات دینے کے بعد باہر نکل گئی۔

رات تک میں کوٹھڑی میں پڑا اینٹھتا رہا۔ زخموں سے ابھی رس رہا تھا۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ مجھے گھونٹ پانی کے لیے ہی پوچھ لیتا۔ میں نے پیاس سے بے تاب ہو کر پہرے داروں کو کئی بار آواز دی تھی مگر وہ جیسے قوت گویائی سے محروم تھے۔ غالباً وہ میرا شمار نہایت خطرناک قیدی کی حیثیت سے کر رہے تھے اور سلاخوں کے قریب آنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ کوٹھڑی میں گرمی تھی اور مچھر بھی پایا جاتا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے ہوں گے جب ایک تیسرا پہرے دار وہاں پہنچا اور پہلے دونوں پہرے داروں کو لے کر چلا گیا۔ اس کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے سوزی کی شکل نظر آئی۔ وہ نیلی شرٹ اور سفید پتلون میں تھی، سنہری بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کینوس کا ایک تھیلا تھا۔ اس نے چابی سے کوٹھڑی نما کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔ خستہ حال کمرا پرفیوم کی خوشبو سے مہک اٹھا۔ "کیسے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بتایا تو ہے کہ انگ انگ جھوم رہا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تمہارے انگ انگ کے لیے مرہم کا انتظام کیا ہے میں نے۔"

اس نے بڑے اطمینان سے کینوس کا بیگ کھولا۔ اس میں سے ایک دری نما کپڑا نکالا۔ یہ دری اس نے کمرے کے گندے فرش پر بچھا دی، پھر اس نے بیگ میں سے ربر کا تکیہ نکالا، اس میں ہوا بھری اور دری پر رکھ دیا۔ تب اس نے بیگ کے اندر سے ایک ٹفن کیریئر برآمد کیا اور ایک کونے میں رکھ دیا۔ ٹفن کے اندر سے مسالے دار گوشت کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ تاہم اس نے ٹفن کیریئر کھولنے کے بجائے میری قمیص کے بٹن کھولنے شروع کر دیے "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"بس چپ چاپ دیکھتے جاؤ۔" وہ بولی۔

میری قمیص اتارنے کے بعد اس نے میری پتلون کے پائنچے اوپر تک چڑھا دیے۔ بیگ کے اندر سے ہی اس نے مرہم پٹی کا سامان نکالا اور میرے ہونٹوں اور کہنی کے زخم کو صاف کر کے پٹی کر دی "یہ پین کلر گولیاں ہیں۔" وہ بولی "تمہارا انگ انگ بالکل پُرسکون ہو جائے گا۔"

میں نے گولیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا "نہیں بھئی، خالی پیٹ نہیں۔ پہلے کھانا پھر دوا۔" وہ ادا سے بولی۔

اس کے ناز و انداز مجھے اندیشے میں مبتلا کر رہے تھے بہرحال میں خاموش رہا۔ اس نے ٹفن کھولا۔ اس میں چاول تھے، گوشت کا سالن تھا، ڈبل روٹی کے سلائس تھے اور خاص قسم کا حلوا تھا۔ وہ بولی "یہ مخصوص افریقی حلوا ہے۔ اس میں کئی جڑی بوٹیاں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ توانائی بحال کرنے کے لیے بے مثال چیز ہے۔"

"کہیں اسے ہی تو حبشی حلوا نہیں کہتے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی "نہیں یہ اور چیز ہے۔"

اس کی بلند ہنسی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے۔ اب تو بڑے سکون سے بیٹھی ہو۔ وہ پہرے دار نہیں ہیں۔"

سرگزشت میں سلسلہ وار شائع ہونے والی کہانی کتابی شکل میں

تاوان

زندگی کے پُرپیچ اور انوکھے راستوں پر سفر کرتی
ثمانجہان عرف جہانی اُستاد کی ایک ہنگامہ خیز سرگزشت

ایک ناقابلِ فراموش سلسلہ جو آخر تک دلچسپی قائم کیے ہوئے ہے!

مصنف: طاہر جاوید مغل

اپنے قریبی بک اسٹال سے یا ہاکر سے طلب فرمائیں۔

(سی بھیجے ذریعہ ڈاک وی پی ایم بی فی جلد ۶۰ روپے)

براہِ راست منگوانے کا پتہ:

علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار۔ لاہور فون ۷۲۳۱۴۱۳۱

اسٹاکسٹ: علی بک اسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور فون ۷۲۲۳۸۵۳

"اب پہرے دار، گارڈ، انچارج سب کچھ میں ہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ لاکس اپ اس ہوسٹل سے ملحق ہیں جہاں کی میں انچارج ہوں۔ اکثر یہ خالی ہی پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ قیدی یہاں رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان لاکس اپ کا اضافی چارج بھی میرے پاس ہے۔ میں نے پہرے داروں کو واپس بھیج دیا ہے۔ جن نئے پہرے داروں کی ڈیوٹی تھی انہیں میں نے کال نہیں کیا، لہٰذا اب صبح آٹھ بجے تک یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، میرے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے۔ سوزی توبہ شکن جسم اور قیامت خیز اداؤں کی مالک تھی۔ اس کے نازو انداز دیکھ کر میرے ذہن میں سروج المعروف الّو کی پٹھی کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی ایک شوریدہ سر دریا کی طرح نظر آتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہر شے اپنے ساتھ بہا لے جانے کی آرزو مند ہے۔ مگر پھر بھی سروج اور سوزی میں ایک فرق نظر آتا تھا۔ کچھ بھی تھا سروج کا تعلق مشرق سے تھا، سوزی مغرب کی بیٹی تھی۔ میں نے سوزی کی حرکات و سکنات دیکھی تھیں اور بات چیت سنی تھی۔ وہ محبت، جنس اور جسمانی ملاپ وغیرہ کے بارے میں آزادانہ باتیں کرتی تھی۔ جنسی تقاضے کے بارے میں تبصرہ کرنا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے بھوک اور پیاس وغیرہ کے بارے میں بات کی جائے۔

وہ میرے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں ہی اس نے بیگ میں سے شیمپین کی یخ بستہ بوتل نکال کر دری پر سجا دی پھر بیئر کے ٹن نکال کر میرے سامنے رکھ دیے "میں جانتی تھی کہ تم سخت پیاس محسوس کر رہے ہو گے۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیا پانی وغیرہ نہیں مل سکے گا؟"

"اس وقت جو کچھ مل سکتا تھا وہ لے آئی ہوں۔"

"تم یہ سب کچھ میرے لیے کیوں کر رہی ہو؟" میں نے مجبوراً حلق تر کرتے ہوئے کہا۔

"بتا دوں؟"

"ہاں بتاؤ۔"

"آدم خور ٹام جسے تم نے دوبدو مقابلے میں ہلاک کیا، میرے لیے ایک نہایت قابلِ نفرت شخص تھا۔ وہ میری عزت کا قاتل تھا، میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتی۔" اس نے ایک لمحہ توقف کر کے میری طرف دیکھا اور بولی "شاید تم سوچ رہے ہو کہ میرے جیسی لڑکی کی بھلا کیا عزت ہو سکتی ہے۔ یہ اپنی جگہ ٹھیک ہو لیکن ایک وقت تھا کہ میری بھی عزت تھی۔"

اس نے ایک قیمتی برانڈ کا سگریٹ سلگایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میرا اصل تعلق ساؤتھ افریقہ سے ہے۔ میں کیپ ٹاؤن کی رہنے والی ہوں۔ ہمارا گھرانا کٹر کیتھولک تھا اور والدین سخت مذہبی تھے۔ میں چار بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ ہمارے گھرانے میں بیٹی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے اندر بغاوت کے جراثیم موجود تھے۔ میں کچھ کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ کوئی بڑا کام [illegible] کے سبب خاندان میں اور خاندان سے باہر میری عزت ہو۔ جس طرح والدین بھائیوں کو اہمیت دیتے ہیں اسی طرح مجھے بھی اہمیت دیں اور میری صلاحیتوں کے قائل ہوں۔ [illegible] کالج میں تھی جب میری اسی معصوم خواہش نے مجھے [illegible] دیا۔ میں نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا۔ اشتہاری فلمیں بنانے والے ایک ادارے کو نئے چہروں کی ضرورت تھی۔ درجنوں دیگر لڑکے لڑکیوں کی طرح میں بھی اس ادارے کے آفس پہنچی۔ ہم میں سے چھ لڑکیوں اور دو لڑکوں کو [illegible] گیا۔ ہمارے کچھ سین بھی شوٹ کیے گئے۔ اس [illegible] معقول معاوضہ بھی ہمیں دیا گیا۔ بعد ازاں ادارے والے یہ لوگ ہمیں بہلا پھسلا کر ایک دوسرے شہر [illegible] الزبتھ لے گئے اور ویرانے میں ایک عمارت میں بند کر دیا۔ یہ عمارت مضافاتی علاقے میں واقع تھی۔ [illegible] تک کسی ذمے دار شخص نے ہم سے رابطہ قائم نہیں [illegible] ایک روز مجھے عمارت کی ایک نہایت بوڑھی اور قریب المرگ ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا کہ میں بردہ فروشوں کے [illegible] چڑھ گئی ہوں۔ ان لوگوں کا جال پورے [illegible] اور [illegible] سے باہر بھی پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ اس سے [illegible] شہروں اور دیہات سے بہت سی لڑکیاں اغوا کر کے [illegible] ہالینڈ وغیرہ میں اسمگل کر چکے ہیں۔ اس عورت نے کہا [illegible] میں اپنے ساتھیوں سمیت کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں [illegible] ہم سب کے لیے بہت اچھا ہو گا۔"

"میں نے اپنے ساتھیوں کو تمام صورت حال بتائی [illegible] یہاں موجود پہرے داروں اور رکھوالی کے کتوں [illegible] خوف زدہ تھے اور کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ [illegible] اس رات بڑی سوچ بچار کے ساتھ فرار کی منصوبہ [illegible] اور اس منحوس دیہاتی عمارت سے نکل گئی۔ بردہ فروشوں [illegible]

گھوڑوں اور کتوں کے ذریعے میرا تعاقب کیا۔ مجھے واپس اسی منحوس عمارت میں لایا گیا۔ مجھے بری طرح مارا گیا، اور پھر دوسروں کے لیے عبرت کا سامان کرنے کے لیے سب کے سامنے میری عصمت دری کی گئی۔ میری بے بسی کا تماشا دیکھنے والوں میں میرے تمام ساتھی شامل تھے۔ اس بدمعاش ماں بیٹے ٹام نے مجھے کئی گھنٹے تک وحشیانہ سلوک کا نشانہ بنایا۔ اس تمام واقعے کی فلم بندی کی گئی اور بے شمار تصویریں کھینچی گئیں۔

"بعد ازاں یہ شرمناک تصویریں، ایک درجن لفافوں میں رکھی گئیں۔ ان لفافوں پر میرے گھر اور اڑوس پڑوس کے گھروں کے ایڈریس لکھے تھے۔ ایک بردہ فروش نے مجھ سے کہا "تمہارے گھر جانے کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ لفافے پوسٹ کر دیے جائیں گے۔"

"میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔ پھر دھیرے دھیرے میں ایک نئے رنگ میں ڈھلتی گئی۔ میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ بردہ فروشوں کا انچارج ٹام ہی میرا مداح تھا، اس نے مجھے [illegible] کی حیثیت دے دی تھی۔ وہ میری اس منصوبہ بندی سے بے حد متاثر ہوا تھا جو میں نے فرار ہونے کے لیے کی تھی۔ وہ کہتا تھا تمہاری چالاکی بڑے کام کی چیز ہے۔ تم ہمارے ساتھیوں میں شامل ہو جاؤ۔ عیش کی زندگی گزارو، ملک ملک کی سیر کرو اور موجیں اڑاؤ۔۔۔ اور پھر ایسا ہی ہوا میں ایک اور رنگ میں ڈھلتی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ بہت کچھ بدل گیا، لیکن وہ نفرت نہیں بدلی جو ٹام اور اس کے [illegible] کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں گھر کر چکی تھی۔ اس پہلے واقعے کے بعد اس نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچایا [illegible] وہ میرے اردگرد موجود تو ہوتا تھا، اسے دیکھ کر میرے [illegible] زخموں سے لہو بہنے لگتا تھا۔ طاقت اور سخت جانی میں [illegible] اپنی مثال آپ تھا۔ کوبرا سانپ کی طرح مدمقابل کو [illegible] کے ڈنک مارتا تھا اور دوسرا سانس نہیں لینے دیتا [illegible] تم نے ہرکولیس پر اسے بزورِ بازو زیر کیا اور اس [illegible] منہ سے خون کی پچکاریاں نکلیں تو خدا گواہ ہے وہ [illegible] کی پُرمسرت ترین لمحے تھے۔"

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کھانا ختم ہو چکا تھا۔ اب [illegible] گلاس ہاتھ میں لیے شیمپین کے چھوٹے چھوٹے [illegible] لے رہی تھی۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے میں نے [illegible] گلاس تھام رکھا تھا۔ وہ اس زنداں میں یوں بیٹھی تھی جیسے گھر کے ڈرائنگ روم میں ہو۔ کسی قسم کا فکر فاقہ نہیں تھا اسے۔ اس نے جو تیز پرفیوم لگا رکھا تھا وہ غالباً ملٹی پرپوز تھا، اس کی وجہ سے صحت مند اور افریقی مچھر ہمارے قریب بھی نہیں پھٹک رہا تھا۔ وہ نیم دراز ہو کر میرے کندھے سے لگ گئی۔ میں نے اپنا بازو اس کے شانے پر سے گزار کر ہاتھ کو ہوا میں معلق کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ سوزی مجھے اس "ٹرسٹی ادارے" کے اسرار و رموز کے بارے میں اہم باتیں بتائے گی یہی وجہ تھی کہ میں اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے کسی گریز کی وجہ سے بدک جائے۔ وہ جس ماحول میں رہ رہی تھی اس میں یہ سب کچھ ایک کھیل کی سی حیثیت رکھتا تھا، جیسے بوریت محسوس کر کے تھوڑی دیر کے لیے تاش کھیل لیا جائے، یا موڈ بہتر کرنے کے لیے چٹکلے وغیرہ سن لیے جائیں۔ کسی مرد سے تھوڑی دیر کے لیے جسمانی تعلق قائم کر لینا سوزی جیسی لڑکی کے لیے ایک ہلکی پھلکی تفریح کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے دو تین بار اس کے گرم ہونٹوں کا لمس اپنے رخسار پر محسوس کیا اور تصور ہی تصور میں سوچا کہ اگر زریں گل یہاں ہوتا تو کس قیامت کا منظر ہوتا۔ میں نے سوزی کے سنہرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "یہ ماریا ٹرسٹ مجھے ایک بہت بڑے گورکھ دھندے کی طرح نظر آ رہا ہے۔"

"تم اسے جتنا بڑا گورکھ دھندا ابھی سمجھ لو، یہ اس سے بڑا گورکھ دھندا ہی نکلے گا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"تم تو یہاں بہت عرصے سے ہو۔ تمہارے لیے تو یہ گورکھ دھندا نہیں ہو گا؟"

وہ مسکرائی "ساحل پر کھڑے ہو کر سمندر کے بارے میں جتنا جانا جا سکتا ہے، میں شاید اتنا ہی جانتی ہوں۔"

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"نہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے نشیلے انداز میں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کے توبہ شکن جسم کا قرب کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

"کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو؟"

"یہی کہ جسے تم ایک فلاحی ادارے کی چھوٹی سی عمارت سمجھ رہے ہو، یہ ایک بہت عظیم الشان جال ہے۔ جس میں میرے اور تمہارے جیسی ہزاروں چھوٹی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں۔ یا تم یوں سمجھ لو کہ یہ ایک بہت بڑا آکٹوپس ہے۔ اس خونی آکٹوپس کے بازو دنیا کے دور دراز ملکوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت کچھ جکڑ رکھا ہے اس آکٹوپس نے اور ابھی جکڑتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ایسا خبیث عفریت ہے کہ اگر اس کا

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

ایک بازو کاٹا جاتا ہے تو وہاں دس بازو اور نکل آتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم معمولی شخص نہیں ہو، لیکن تم جیسے بہت سے غیر معمولی شخص یہاں آکر بے بس ہو چکے ہیں۔ اپنی بے بسی کی ایک چھوٹی سی مثال تم دیکھ ہی چکے ہو۔ تم نے پرل فارمز سے فرار ہونے کی کامیاب کوشش کی، مگر آخر میں نتیجہ کیا نکلا۔ اس خونی آکٹوپس کے بازو تمہیں باندھ کر پھر وہیں لے آئے۔ تم دس بار ایسی کوشش کرو گے تو دس بار یہی نتیجہ نکلے گا۔ لہٰذا۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "لہٰذا مسٹر شا! تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مزاحمت کا رویہ چھوڑ دو۔ خود کو حالات کے دھارے پر بہنے دو۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح تم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے کچھ رعایتیں حاصل کرلو گے۔ تم نے بحری سفر کے دوران میں ایک دو موقعوں پر اپنی شان دار صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً اس بارے میں باس مائیکل اپنی رپورٹ کنگ کو دے چکا ہوگا۔ اگر تم اطاعت مندی کا اظہار کرو گے تو کنگ کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ پیدا ہوتے دیر نہیں لگے گی۔"

"کیا تم مجھے کنگ اور ماریا ٹرسٹ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گی۔" میں نے اس کا سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ میرے بازو سے چمٹ کر بولی "میں نے تمہیں بتایا ہے ناں شا کہ میرے سامنے ایک سمندر ہے اور میں اس بھیدوں بھرے پانی کے کنارے پر کھڑی ہوں۔ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ اس سارے "سیٹ اپ" کا ماسٹر مائینڈ کنگ براؤن ہے۔ وہی یہاں کے سیاہ و سفید کا مالک ہے لیکن یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیا پتا کہ اس ماسٹر مائینڈ کے اوپر بھی کوئی ماسٹر مائینڈ ہو، یا پھر کنگ براؤن کا ہی کوئی ایسا چہرہ ہو جو ہماری نظروں سے اوجھل ہو۔ ماریا دراصل کنگ براؤن کی چہیتی بیوی کا نام تھا۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد وہ ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئی تھی۔ کنگ نے اس فلاحی ادارے کی بنیاد اس کی موت کے دو سال بعد رکھی تھی اور اسے ماریا ٹرسٹ کا نام دیا تھا۔"

شیمپین کی ایک چسکی لے کر وہ بولی "کہنے کو تو ماریا ٹرسٹ صرف دو لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ ظلم و ستم کا ایک سیاہ نظام ہے۔ جس نے شاخ در شاخ دنیا کے ایک بڑے حصے کو لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میں پھر کہوں گی کہ یہ ایک آکٹوپس ہے۔ جس کی جسامت اور خوں خواری پچھلے پندرہ برسوں میں دن رات بڑھی ہے۔ اب اس بلا کی پہنچ دنیا کے دو ... حصے تک ہے، تم لوگ بھی اسی بلا کے ایک بازو میں ... یہاں تک پہنچے ہو۔"

مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ سوزی گول مول ... کر رہی ہے۔ وہ میرے سوالوں کے جواب وضاحت ... نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ جسمانی طور پر میرے بہت قریب ... تھی اور ابھی مزید آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہا "... مجھے پروفیسر اور اس کی بیٹی شائستہ کے بارے میں کچھ ..."

"شائستہ باس مائیکل کے ساتھ ہے۔ دو تین ماہ ... ایک آدم خور کو جنم دے دے گی۔ پروفیسر کے بارے ... صرف اتنا معلوم ہے کہ باس مائیکل کے ساتھ اس کی ... کلامی ہوئی تھی۔ جس کے بعد باس نے اسے قید تنہائی ... دی تھی۔ غالباً ساتھ والی کوٹھڑی میں اسے بند کیا گیا۔ وہ چار روز بھوکا پیاسا یہاں رہا تھا۔ اس کے بعد اسے یہاں ... نکال لیا گیا تھا۔ شاید شائستہ نے ہی اس کی رہائی کے ... کوشش کی ہوگی۔ اب اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"اور وہ تینوں لڑکیاں کہاں ہیں جو کبھی سے جہازی ... ہوئی تھیں؟ ان میں سے دو براؤن آنکھوں اور سیاہ بالوں والی تھیں؟"

"وہ تینوں سیکنڈ انٹری میں جا چکی ہیں۔" سوزی ...

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے ہونٹ بند کر ... جانتی تھی کہ میں پھر فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری کے ... میں استفسار شروع کردوں گا۔ بہرحال اس نے میرے ... بند کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ سوزی جیسی لڑکی ... کرسکتی تھی۔ اس نے میرے ہونٹ اپنے ہونٹوں سے ... تھے۔

شیمپین اس کی خوب صورت آنکھوں سے چھلک ... تھی اور اس کے جسم میں تپش بن کر دوڑ رہی تھی۔ وہ ... ساتھ مجھے بہالے جانا چاہ رہی تھی۔ وہ مغرب کی بیٹی ... اس کے لیے یہ سب ایک کھیل تھا۔ ایک ایسی تفریح ... جس کا تعلق تاش کے پتوں یا سوئمنگ پول وغیرہ ... تھا بلکہ سیکس سے تھا۔ لیکن میرے لیے یہ کھیل نہیں ... میں اپنے تمام تر جسمانی تقاضوں کے باوجود اس کوشش ... تھا کہ سوزی کا دل توڑے بغیر اس کی پیش قدمی کو ... سکوں۔ اس نے میرے گریز کو محسوس کرتے ہوئے کہا "تمہیں میری ضرورت محسوس نہیں ہو رہی؟"

"بہت شدت سے ہو رہی ہے لیکن۔۔۔"

... کیا۔۔۔"

... نے میری مشکل آسان کر دی۔ کال بیل کی سی ... آواز سنائی دی "اوہ! مائی گاڈ۔" سوزی نے کہا۔ ... کو جھٹکا سا لگا تھا۔

... کر بیٹھی اور پھر فوراً کھڑی ہو گئی۔ اپنی شرٹ کے ... ہوئے ہانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ ابھی تک ... تھا۔ کال بیل پھر ہوئی۔ وہ اپنے منتشر بال سمیٹ ... میں بڑبڑائی۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"... غزالہ۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا "شاید اسے ... کہ تم اس کی امانت میں شدید قسم کی خیانت ... تھے۔" (وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ میری طرح ... معلوم نہیں تھا کہ دروازے پر کون ہے)

... طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کا ... لیے نیا تھا۔ دو تین منٹ بعد وہ پھر تیزی سے ... وہ تھوڑی پریشان تھی۔ بولی "ہیڈ انچارج آنے ... اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں یہاں آئی ..."

اس نے جلدی جلدی کھانے پینے کا سامان سمیٹا۔ بس ... ایک پلیٹ ایک چمچ اور ایک کوارٹر پلیٹ وہاں ... باقی سب کچھ بیگ میں ڈال لیا اور رفوچکر ہو گئی۔

... اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ دو گارڈز ... حکیم نیگرو اس کے ساتھ تھا۔ یہی یہاں کا ہیڈ ... تھا۔ وہ صورت سے ہی بے حد سخت گیر اور خشک نظر آتا تھا۔ سوزی اس کے سامنے سہمی سہمی سی تھی۔

... نے سلاخوں کی دوسری جانب سے ہاتھ بڑھایا اور مصافحہ کیا "میرا نام مرقص ہے۔ میں اس ہوسٹل کا ... انچارج ہوں۔" اس نے انگریزی میں اٹک اٹک کر کہا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے طنزیہ لہجے ... "میرا نام شاہ جہاں ہے اور میں پچھلے چوبیس گھنٹے سے ... کوٹھڑی میں رہائش پذیر ہوں۔"

ہیڈ انچارج نے میرے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا ... نے تمہیں اس کوٹھڑی سے نکالنے کا حکم دیا ہے۔ ... ہے کہ چند روز تک وہ تمہیں شرفِ ملاقات بھی ...

"اس عنایت کی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"وضاحت سے تو کنگ ہی بتا سکتے ہیں مگر کچھ کچھ میں بھی ... ہوں۔ صبح تم سے آفس میں ملاقات ہوگی تو بتاؤں گا۔"

تھوڑی دیر تک مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد ہیڈ انچارج مرقص واپس چلا گیا۔ اس کے نام سے پتا چلتا تھا کہ وہ عیسائی ہے۔

سوزی نے مجھے کوٹھڑی سے نکلوایا اور واپس اسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں میرے ساتھی موجود تھے۔ یعنی یارِ غار صفدر اور ایرانی جعفر رضا۔ صفدر سخت پریشان تھا۔ اسے مبارک امین کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ کل رات اس قتل کے بعد مائیکل کے مسلح کارندے مجھے زدوکوب کرتے ہوئے کسی نامعلوم مقام پر لے گئے تھے۔ بہرحال اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ہنگامہ کیوں کر ہوا اور ایسا کیا واقعہ پیش آیا کہ مجھے مبارک امین کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے۔

میں نے صفدر کو مختصر الفاظ میں مبارک کی شیطانیت کے بارے میں بتایا۔۔۔ اور یہ بتایا کہ اپنی موت سے چند منٹ قبل وہ غزالہ کے ساتھ کیا سلوک کرنے جا رہا تھا۔ صفدر کے چہرے پر جوش سا لہرا گیا۔ بولا "کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔ اس کارِ ثواب میں ایک آدھ گولی کا حصہ میں بھی ڈال دیتا۔"

"گھبراؤ مت۔" میں نے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں تمہیں ایسے بہت سے مواقع فراہم ہونے والے ہیں۔"

"انشاء اللہ۔۔۔ انشاء اللہ۔" صفدر نے بڑے خلوص سے سر ہلایا۔

مبارک امین کی موت کے بعد یقیناً میں اور صفدر خطرناک قیدی شمار ہونے لگے تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اب کمرے کے دروازے سے باہر تالا نظر آرہا تھا اور ایک کے بجائے دو مسلح محافظ ہماری نگرانی کے لیے موجود تھے اور تو اور ہمارا روم میٹ یعنی ایرانی جعفر رضا بھی ہم سے ڈرا ڈرا نظر آرہا تھا۔ وہ رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ علی الصباح ناشتے کے فوراً بعد مجھے دو محافظوں کی زیرِ نگرانی ہیڈ انچارج مرقص کے آفس میں پہنچا دیا گیا۔ یہ ایک کشادہ دفتر تھا، سجاوٹ کے بجائے سادگی نظر آرہی تھی۔ دیواروں پر بہت سی تصویریں آویزاں تھیں۔ یہ ماریا ٹرسٹ میں ہونے والی مختلف تقریبات کی تصویریں تھیں۔ معزز قسم کے افراد بچوں بچیوں اور نوجوانوں کو انعامات وغیرہ دیتے نظر آتے تھے۔ ایسی ہی ایک دو تصویروں میں مجھے لیبیا کے کرنل معمر قذافی اور ماریطانیہ کے مصطفےٰ سالک وغیرہ بھی نظر آئے۔

میں اور مرقص آفس میں تنہا تھے۔ مرقص نے مجھے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا "مائیکل کے قریبی دوست مبارک امین کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ اگر کنگ نے تمہارے بارے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ مبارک ٹرسٹ کے قانون کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ تمہاری ساتھی ڈاکٹر اس کے بیڈ روم سے برآمد ہوئی ہے اور یہی اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہے لیکن قانون کے مطابق کارروائی تو بہرحال ہوگی اور ممکن ہے کہ تمہیں سزا کا سامنا بھی کرنا پڑے۔" میں خاموشی سے سنتا رہا۔

مرقص نے میری طرف جھکتے ہوئے قدرے دوستانہ لہجے میں کہا "تمہارے لیے سزا سے بچ نکلنے کے امکانات روشن ہیں اور یہ امکانات بھی روشن ہیں کہ تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس ٹرسٹ میں کچھ خاص قسم کی رعایتیں مل جائیں۔"

"رعایتوں سے آپ کی مراد؟"

"فی الوقت تمہاری حیثیت یہاں قیدیوں کی سی ہے۔ مگر ممکن ہے کہ تمہیں کچھ آزادیاں مل جائیں اور کوئی ذمے داری وغیرہ بھی تمہیں سونپ دی جائے۔ بالکل جیسے جہاز.... ہرکولیس پر مائیکل نے کیا تھا۔ مگر اس کے لیے تمہیں دو کام کرنے ہوں گے۔ نمبر ایک کنگ کی غیر مشروط اطاعت۔ نمبر دو مائیکل کے ساتھ کسی بھی قسم کی مخاصمت سے گریز۔ مائیکل کو فی الوقت یقیناً تم پر بہت طیش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس کے سخت رویے کا سامنا بھی کرنا پڑے، مگر تمہیں برداشت اور حوصلے کا ثبوت دینا ہوگا۔"

"میں اپنی ذات پر ہر طرح کی تکلیف برداشت کرلوں گا لیکن اگر میری ساتھی خواتین پر...."

"ایسا اب نہیں ہوگا۔" مرقص نے جلدی سے میری بات کاٹی "اس سلسلے میں تم بالکل بے فکر رہو۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مرقص نے ریسیور اٹھا کر چند سیکنڈ تک بات کی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "ان انڈین قیدیوں کو جانتے ہو جو ہرکولیس میں تمہارے ساتھ ہی یہاں پہنچے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا "مائیکل کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم ان قیدیوں کی زبان سمجھتے ہو اور وہ تمہاری بات مانتے بھی ہیں؟"

"وہ ہر اس شخص کی بات مان سکتے ہیں جو انہیں انسان سمجھے اور ان کے ساتھ محبت سے بات کرے۔"

"ہم بھی یہ سب کچھ کر رہے ہیں مگر لگتا ہے کہ وہ تم پر کچھ زیادہ ہی بھروسا رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ تم ان سے مل لو۔" مرقص نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے؟ کیا وہ پریشان کر رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔"

کچھ ہی دیر بعد میں مرقص کے ساتھ عمارت کے ایک اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ اس عمارت کے خدوخال اور اندر کا ماحول مکمل طور پر ایک رفاہی ادارے جیسا تھا۔ یہاں قالین بافی بھی ہو رہی تھی، لڑکیاں کڑھائی سلائی بھی کر رہی تھیں۔ ایک ورکشاپ اور اسکول بھی اس عمارت کے اندر ہی موجود تھا۔ بلا تخصیص مرد اور عورت، سب نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان میں کہیں کہیں نیلی دھاریاں تھیں۔ انتظامیہ کے ارکان کا لباس مختلف تھا۔ اس ادارے کا نظم و ضبط مثالی نظر آ رہا تھا۔ ایک پورچ نما مقام پر پہنچ کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئیں اور کانوں میں ایئر ڈاٹس دے دی گئیں۔ ایک رنگ دار شیشوں والی ویگن میں مجھے سوار کیا گیا۔ یہ ائر کنڈیشنڈ ویگن مجھے لے کر روانہ ہوئی اور مختلف سڑکوں پر پھسلنے لگی۔ ٹریفک کا بس ہلکا ہلکا شور میرے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ شاید ہم شہر کے بیچوں بیچ سے گزر رہے تھے۔ آخر کسی مقام پر گاڑی رکی۔ میری آنکھوں اور کانوں کو آزاد کیا گیا۔ یہ ایک شان دار عمارت کا اندرونی حصہ تھا۔

مختلف راہداریوں سے گزر کر ہم ایک ہال نما کمرے میں پہنچے۔ یہاں عام افراد کا داخلہ ممنوع تھا اور ہال تک پہنچنے کے لیے ہمیں سکیورٹی کے کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ یوں لگا جیسے ہم وائٹ ہاؤس یا ڈاؤننگ اسٹریٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہال نما کمرے میں لفٹ دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ عمارت ایک منزلہ تھی، بس کہیں کہیں دو منزلہ تعمیر نظر آتی تھی۔ اس تھوڑی سی ضرورت کے لیے جدید قسم کی چار لفٹوں کا ہونا [illegible] کی بات تھی۔ ان لفٹوں کے سامنے بھی باوردی گارڈز موجود تھے۔ پوری عمارت میں یہ واحد جگہ تھی جہاں میں نے گارڈز کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھا۔ لفٹوں کے سامنے سکیورٹی گارڈز نے ایک مرتبہ پھر میری تلاشی لی۔ اس کے بعد ہیڈ انچارج مرقص نے ایک بڑے رجسٹر پر دستخط کیے۔ رجسٹرار کی طرف سے مرقص کو ایک سکہ دیا گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ ایک خاص قسم کا ٹوکن تھا اور اس ٹوکن کے بغیر کوئی شخص ان لفٹوں میں سوار ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم لفٹ میں سوار ہوئے، مجھے اس وقت حیرت کا ایک اور دھچکا لگا جب لفٹ اوپر جانے کے بجائے نیچے کی طرف متحرک ہوگئی۔ ہم پہلے ہی گراؤنڈ فلور پر تھے، اس کا مطلب تھا کہ ہم

زیرِ زمین جا رہے ہیں۔ اگلے چند سیکنڈ میں میری حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ہم کم از کم چار منزل نیچے گئے تھے پھر لفٹ رکی، دروازہ کھلا اور میں نے اپنے سامنے ایک طویل راہداری پائی۔ راہداری کی دیواریں اور فرش چکنے اور چمک دار تھے۔ ٹیوب لائٹس نے سارا منظر روشن کر رکھا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں ٹرسٹ کی عام سی سادہ عمارت سے نکل کر کسی جدید کمپلیکس میں آگیا ہوں۔ یہاں میں نے نیلی وردیوں والے نگرو دیکھے، ان کے لباس پر سفید نشانات تھے۔ بعد میں معلوم ہوا یہ مقامی زبان "پولر" کے الفاظ تھے۔ نیلی وردیوں والے یہ سارے افراد نہایت چوکس اور صحت مند تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور نوجوان عورتیں بھی۔ ان میں سے کئی ایک کے پاس اسلحہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یہ اسلحہ ریوالور تھا جو ہولسٹر میں بند کر کے کمر سے لٹکایا گیا تھا۔

راہداری میں سے کئی ذیلی راہداریاں بھی نکلتی تھیں۔ ہم لفٹ سے نکل کر آگے بڑھے تو کئی باوردی افراد نے مرقص کو پہچان کر سلام کیا۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو پچھلی رات میں نے پہلے پہرے دار انیس سے اور پھر سوزی سے سنے تھے۔ یعنی فرسٹ انٹری اور سیکنڈ انٹری۔ شاید لفٹ میں داخل ہونے کے بعد میری سیکنڈ انٹری ہوئی تھی۔ یعنی میں اس "ٹرسٹ" کے خاص الخاص حصے میں داخل ہوگیا تھا۔ راہداری میں ہمیں باوردی افراد کے علاوہ بھی کچھ لوگ ملے۔ ان میں عورتوں اور مردوں کے علاوہ بچے بھی تھے۔ ان سب افراد نے مختلف رنگوں کے چغے پہن رکھے تھے، ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ سب کے سب نہایت صاف ستھرے تھے اور انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کے حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ان میں زبردست قسم کا نظم و ضبط بھی نظر آتا تھا۔

یہ زیرِ زمین دنیا دیکھ کر میں دنگ تھا۔ ابھی میں اس حوالے سے مرقص سے کچھ پوچھنا ہی چاہ رہا تھا کہ ہم ایک بند دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ مرقص نے ایک بٹن دبایا تو یہ گیٹ نما دروازہ سلائیڈ کر کے اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میں اپنی جگہ سن رہ گیا۔ یہ ایک بہت بڑا لاک اپ تھا۔ یہاں فرش پر بڑی بڑی دریاں بچھی تھیں اور فوم کے بے شمار گدے رکھے تھے۔ اس لاک اپ میں وہ تمام اتر پردیشی قیدی موجود تھے جنہیں میں نے پرل فارمز میں چھوڑا تھا۔ لیکن ان کی حالت.... خدا کی پناہ وہ سوکھ کر ہڈیوں کے ڈھانچے بنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر فاقہ کش مہاتما بدھ کا خاکہ ذہن میں آجاتا تھا۔ وہ فوم کے گدوں پر الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان میں سے کچھ واضح طور پر بیمار بھی دکھائی دیتے تھے۔ میری نظریں کملا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں اب تک اس کے بارے میں بہت فکر مند رہا تھا۔ خاص طور سے جب سے مجھے ایک افسوس ناک خبر ملی تھی، میری فکر مندی کملا کی طرف سے بہت بڑھ گئی تھی۔ سوزی نے مجھے بتایا تھا کہ اتر پردیشی قیدیوں میں سے ایک لڑکی ہلاک بھی ہو چکی ہے۔

چند اتر پردیشی افراد نے مجھے دیکھا اور ایک دم جیسے ان کے مردہ جسموں میں زندگی دوڑنے لگی۔ انہوں نے اپنی ہڈیوں کو سمیٹا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے نیم جاں مرد و زن اٹھ بیٹھے اور میری جانب دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر تحیر کے ساتھ ساتھ مسرت کی چمک بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔

مرقص نے کہا "یہ لوگ پچھلے دو ہفتے سے کچھ بھی کھا پی نہیں رہے۔ چند بار بڑی دشواری سے انہیں انجکشن وغیرہ لگائے گئے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ آٹھ دس روز میں مرنا شروع ہو جائیں گے۔"

اس دوران میں اتر پردیشی افراد لاک اپ کی سلاخوں سے چمٹ گئے تھے اور والہانہ انداز میں میری طرف دیکھنا شروع ہوگئے تھے۔ ان کے خشک لب جذبات سے پھڑک رہے تھے اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ وہ اپنی کمزور اور ناقابلِ فہم آوازوں میں کچھ کہہ رہے تھے۔ شاید مجھے اپنے پاس بلا رہے تھے۔ مرقص اور دیگر پہرے داروں کو اس منظر نے بہت متاثر کیا۔ مرقص کے اشارے پر ایک پہرے دار نے ایک بٹن دبایا اور آٹومیٹک طریقے سے لاک اپ کے دروازے میں اتنا خلا پیدا ہوگیا کہ ایک شخص جھک کر اس میں سے گزر سکے۔ رائفل بردار پہرے دار نے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ اندر گھسنے کے بعد میرے ساتھ اس قسم کی صورتِ حال پیش آئے گی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ چھ سات درجن افراد مجھ سے لگاؤ رکھتے ہیں لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ پچھلے چند ہفتوں میں ان کے جذبات اتنے شدید ہو چکے ہیں اور ان میں ایسا والہانہ پن آچکا ہے۔ جونہی میں اندر داخل ہوا، انہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بوڑھے سیوک کمار نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوم لیا۔ کچھ مرد و زن میرے پاؤں چھونے لگے، کچھ دور ہی سے اپنے ہاتھوں کو ایسے انداز میں حرکت دینے لگے جیسے میری بلائیں لے رہے ہوں، میں بوکھلا کر رہ گیا۔ میں نے کوئی ایسا سنہری کارنامہ انجام نہیں دیا تھا جس کے بدلے یہ لوگ میری

ایسی اندھا دھند عزت افزائی کرتے۔ میں کوئی پیر فقیر نہیں تھا۔ کوئی روحانی یا مادّی طاقت بھی میرے پاس نہیں تھی، پھر خبر نہیں یہ لوگ کیوں مجھے بانس پر چڑھانے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے رونا شروع کردیا۔ وہی پُراسرار نوحہ جو اس سے پہلے میں ہرکولیس میں بھی سنتا رہا تھا۔ وہ ایک کورس کی شکل میں ہم آہنگ ہو کر روتے تھے اور ان کے رونے میں گاہے گاہے کسی چھٹے وغیرہ کا ذکر بھی آتا تھا۔

میری نگاہیں بڑی بے قراری سے کمسن کملا اور اس کے بچے کو تلاش کررہی تھیں، مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے، حالانکہ کملا کو تو سب سے پہلے لپک کر میری طرف آنا چاہیے تھا۔ بڑا خصوصی لگاؤ تھا اسے مجھ سے۔ میں نے ان لوگوں کے درمیان گھس کر بے چینی سے کملا کو تلاش کیا۔ اچانک میری نگاہ کملا کی دبلی پتلی والدہ پر پڑگئی۔ میں نے اس ناتواں عورت کو شانوں سے تھاما اور اپنے ہونٹ اس کے کانوں کے پاس لے جاکر زور سے پوچھا "کملا کہاں ہے۔ تمہاری بیٹی؟"

میرے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ میں اپنی بات کررہا تھا وہ اپنی ہانک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ الٹا مجھ سے کملا کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔ اس کا یہ جملہ واضح طور پر میری سمجھ میں آیا "ہمار کملا کیسو ہے؟" یعنی میری بیٹی کیسی ہے؟

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ عورت کیا کہہ رہی تھی۔ میں اس کی کملا کے بارے میں بھلا کیا بتا سکتا تھا۔ ایک سرد لہر میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے ہیں۔ کم سن کملا کے ساتھ ضرور کچھ ہوچکا ہے۔

اسی دوران میں بوڑھا سیوک بھی میرے قریب آ بیٹھا۔ وہ کملا کی ماں کو دلاسا دیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ اس کی بیٹی ٹھیک ہی ہوگی۔ اس کے بعد وہ میرے پاؤں چھو کر کہنے لگا "مہاراج! ہم کو اتا انتجار تھا تمہارا کہ ہم کیا بتادت۔ تم ان لوگن سے کہو کہ یہ ہم غریبن کو آجاد کردیں۔ ہم اب اپنے گھر جانا چاہت ہیں۔"

نجانے وہ لوگ کیوں سمجھ رہے تھے کہ ان کے سارے دکھوں دردوں کی دوا میرے پاس ہے اور میں جب چاہوں جادو کی چھڑی ہلا کر انہیں کسی اڑن کھٹولے میں بٹھا سکتا ہوں اور یہ اڑن کھٹولا انہیں پلک جھپکتے میں ان کے گھروں تک پہنچادے گا۔

میں نے سیوک سے کہا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن آہستہ آہستہ... کچھ وقت لگے گا۔ پھر میں نے لاک اپ میں نیم جان پڑے مرد و زن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تم لوگ کیا کررہے ہو۔ کیوں بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ ایسا کرکے صرف تم اپنا نقصان کررہے ہو۔ تمہاری بھوک پیاس سے کوئی مسئلہ حل ہوسکتا تو میں جہاز میں تمہیں کھانے پر مجبور کیوں کرتا۔"

جواب میں سیوک نے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا "جب ہم ان آدم خور حبشیوں کو دیکھتے ہیں تو ہماری بھوک ہی نہیں اڑتی ہماری جان بھی ہوا ہوجاتی ہے۔ پھر کئی ہفتوں سے آپ بھی تو ہم کو نظر نہیں آرہے تھے۔ جب آپ نظر نہیں آتے تو ہم سب کو یہی لگتا ہے کہ ہم بالکل بے آسرا ہوگئے ہیں اور یہ کالی رنگت والے درندے ہمارے ساتھ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔" اس نے ایک لحہ توقف کرکے آنکھوں میں آنے والے آنسو قمیص کے میلے دامن سے صاف کیے اور بولا کہ آپ نے تو جہاز میں کہا تھا کہ جہاز سے اتر کر ہمیں کوئی حبشی نظر نہیں آئے گا لیکن یہاں تو جدھر نظر اٹھتی ہے یہی حبشی ہیں۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دیکھو سیوک! کالی رنگت والے ہر شخص سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جہاز میں جن لوگوں کو آدم خوری کرتے دیکھا تھا وہ ایک خاص نسل کے لوگ ہیں اور اس نسل کے بس دو چار بندے ہی یہاں موجود ہوں گے اور شاید اب وہ بھی نہ ہوں۔"

میں سیوک کمار کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک آندھی بھی چل رہی تھی۔ میں کملا کی ماں سے کملا کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا مگر الٹا وہ مجھ سے کملا کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ کملا اپنے بچے سمیت میرے پاس ہے۔ اب اگر میں ایک دم اس بات کی تردید کردیتا تو یہ نامناسب بلکہ خطرناک تھا۔ ان سب لوگوں کو اور خاص طور سے کملا کی ماں کو زبردست شاک لگنا تھا۔

میں نے کملا کا خیال فی الحال ذہن سے جھٹک دیا اور کوشش کرنے لگا کہ یہ لوگ کچھ کھانے پینے پر آمادہ ہوجائیں۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں سیوک کمار اور دیگر دو تین معمر افراد کو لیموں کا شربت پلانے میں کامیاب ہوگیا تو باقی افراد نے بھی یکے بعد دیگرے ہٹ دھرمی چھوڑ دی۔ ان میں سے کچھ عورتیں تو بے حد کمزور ہوچکی تھیں۔ ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا بھی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، ان لوگوں کو میں نے ہیڈ انچارج مرقص کی مدد سے فوراً اسپتال کی طرف روانہ کردیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ جدید سہولتوں سے آراستہ یہ پچاس بستروں کا اسپتال اس زیرِ زمین بستی کے اندر ہی واقع تھا۔ اچانک میرا دھیان اپنے دشمن جاں راجن کی طرف چلا گیا۔ کملا کی طرح وہ بھی مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے سیوک کمار سے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نے آٹھ دس روز پہلے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس نے ریزر کے ایک ٹکڑے سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی اور زیادہ خون بہہ جانے سے بے ہوش ہوگیا تھا۔ بے ہوشی ہی کی حالت میں اسے پہرے داروں نے لاک اپ سے نکال لیا تھا۔

میں نے سیوک سے پوچھا "کیا یہاں کسی لڑکی کا انتقال بھی ہوا ہے؟"

سیوک نے نفی میں سر ہلایا "ناہیں... ایسو تو کوئے در گھٹنا ناہیں ہوئی۔"

میرے ذہن میں پلنے والے اندیشے قوی تر ہونے لگے۔ سوزی نے بتایا تھا کہ اترپردیشی قیدیوں میں سے ایک لڑکی ہلاک ہوئی ہے لیکن اب سیوک ایسے کسی واقعے سے مکمل لاعلمی کا اظہار کررہا تھا۔ میری تشویش کملا کے بارے میں اور بڑھ گئی۔

میں قریباً تین گھنٹے اترپردیشی قیدیوں یعنی بردوں کے ساتھ رہا۔ انہیں کھانا وغیرہ کھلایا اور حوصلے تسلی کی باتیں کیں۔ ان باتوں کے دوران میں مجھے دو تین بار ایک سنگین جھوٹ بھی بولنا پڑا۔ مجھے کملا کی ماں کو بتانا پڑا کہ کملا میرے پاس ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، وہ ایک دو روز تک واپس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں جانتا تھا کہ یہ جھوٹ میرے لیے بہت بڑا مسئلہ بن سکتا ہے لیکن فوری طور پر اس جھوٹ کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اترپردیشی قیدیوں کے لاک اپ سے باہر نکلتے ہی میں نے ہیڈ انچارج مرقص سے پوچھا "مسٹر مرقص! وہ کملا نام کی لڑکی کہاں ہے؟"

مرقص کا بنجر خشک چہرہ اور بھی خشک ہوگیا۔ وہ شانِ بے اعتنائی سے بولا "میں کسی ایسی لڑکی کے بارے میں نہیں جانتا، بردوں کی نقل و حرکت میری ذمے داری نہیں ہے۔"

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے کہا "تم ہیڈ انچارج ہو، تم نہیں جانو گے تو اور کون جانے گا؟"

"بردوں کی گنتی میرا کام نہیں، یہ انچارج کی ذمے داری ہوتی ہے اور ویسے بھی میں تمہارے سوالوں کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر واپس لفٹوں تک پہنچے۔ نجانے کیوں مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ زمین دوز آبادی درحقیقت ماریا ٹرسٹ کی ہی توسیع ہے۔ عین ممکن تھا کہ ان دونوں جگہوں کے درمیان میں نے جو فاصلہ اسٹیشن ویگن میں طے کیا تھا وہ صرف ایک سراب ہو۔ مجھے ماریا ٹرسٹ کے وسیع و عریض احاطے میں ہی گھما پھرا کر اس زمین دوز جگہ پر لے آیا گیا ہو... بہرحال لفٹ نے ہمیں اوپر پہنچایا اس کے بعد دوبارہ ہم تاریک شیشوں والی اسٹیشن ویگن میں بیٹھے۔ میری آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور کانوں میں ایئر ڈاٹس لگادی گئیں۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ وہ ایک سنسان سڑک سے نسبتاً بڑی اور بارونق سڑک پر آئی پھر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی واپس ٹرسٹ کی عمارت میں پہنچ گئی۔ بلند چھت والے گیراج کے اندر میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی گئی اور سماعت کو بھی آزاد کردیا گیا۔ مرقص نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس کا موڈ بتا رہا تھا کہ وہ میری کسی بات کا جواب دینا پسند نہیں کرے گا۔ مرقص کی عمر پینتیس اور چالیس برس کے درمیان تھی۔ وہ کافی دراز قد تھا کندھے تھوڑے سے آگے جھکے ہوئے تھے، میں نے اس کے چہرے پر ایک بار بھی مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی۔ شاید وہ مسکرانا جانتا ہی نہیں تھا۔

مجھے واپس کمرے میں صفدر اور جعفر رضا کے پاس بھیج دیا گیا۔ صفدر نے میرے چہرے کی پریشانی پڑھ لی۔ بولا "کیا بات ہے۔ آپ نے بہت دیر لگادی؟"

میں نے اسے مختصر الفاظ میں روداد سنائی۔ آخر میں میں نے کہا "صفدر ڈیئر! مجھے لگتا ہے کہ بے چاری کملا کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہوگیا ہے۔"

"بات واقعی سوچنے کی ہے۔" صفدر بھی گہری سوچ میں پڑگیا "کملا کے بارے میں یہ جھوٹ کس نے بولا کہ وہ آپ کے پاس ہے؟ اور کیوں بولا؟"

"اور تیسرا سوال یہ ہے کہ سوزی نے جس لڑکی کی ہلاکت کی اطلاع دی ہے وہ کون ہے، جبکہ سارے اترپردیشی قیدی کہہ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی کی ہلاکت نہیں ہوئی۔"

"اور یہی بات زیادہ تشویش ناک ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کملا کے ساتھ ہونے والے کسی حادثے کو ان قیدیوں سے چھپایا گیا ہو۔ یہ ساری عورتیں اور بچیاں یہاں بدترین جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ ان میں سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے!"

○☆○

سوزی سے ہماری ملاقات رات دس بجے کے قریب

ہو سکی۔ اس وقت تک ٹرسٹ میں گہری خاموشی طاری ہو چکی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا کہ رات کے دو بجے ہوئے ہیں۔ سوزی ٹہلنے والے انداز میں ہمارے کمرے کے سامنے پہنچی۔ اس نے باہر موجود نگران کو کسی بہانے وہاں سے ہٹا دیا۔

سوزی نے مجھ سے حال احوال دریافت کیا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "سوزی! میں بڑی شدت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ میں تم سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو یہاں تم لوگوں کی تحویل میں ہلاک ہوئی ہے۔"

"کیوں! ایک دم اتنی پریشانی کیوں لگ گئی ہے تمہیں؟"

"اترپردیشی قیدیوں میں ایک لڑکی اپنے بچے سمیت موجود نہیں۔ اور اس کی خیریت اور سلامتی میرے لیے بہت اہم ہے۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

سوزی کی پیشانی پر سوچ کے بل نمودار ہو گئے۔ کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ اس بارے میں ہیڈ انچارج مرقص ہی تمہیں بہتر طور پر بتا سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کچھ روز پہلے مرقص ایک لڑکی کو لاک اپ میں سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا تھا، اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ جو لڑکی بعد میں ہلاک ہوئی یہ وہی تھی یا کوئی اور....."

ایک بار پھر مجھے اپنا بدن سلگتا ہوا محسوس ہوا۔ مرقص نے لڑکی کی ہلاکت سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ بردوں کو گنتی کرنا یا ان کی نقل و حرکت اس کی ذمے داری نہیں ہے، اب سوزی بتا رہی تھی کہ کچھ روز پہلے وہ ایک لڑکی کو لے کر گیا تھا۔

"یہ مرقص کیسا شخص ہے؟" میں نے سوزی سے پوچھا۔

"جیسے یہاں کے سارے مرد ہیں۔" وہ عجیب بیزاری سے بولی۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ جس لڑکی کو لاک اپ میں سے لے کر گیا تھا اس کے ساتھ اس نے بدسلوکی کی ہوگی؟"

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔ بہرحال میں پھر یہی کہوں گی کہ تم اس معاملے میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ پہلے ہی تم مبارک امین کو....."

"میرے دماغ پر لعنت بھیجو۔" میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی "میں اپنا دماغ ٹھنڈا ہی رکھنا چاہتا ہوں، لیکن شاید تم لوگ نہیں چاہتے۔ اگر تمہاری خواہش ہے کہ یہاں کوئی نیا ہنگامہ برپا نہ ہو تو مجھے بتاؤ کہ مرقص نے اس لڑکی کو لاک اپ سے کیوں نکالا اور قیدیوں کو یہ کیوں بتایا گیا کہ وہ لڑکی میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بتاؤ کہ جس لڑکی کی ہلاکت کی اطلاع تم دے رہی ہو وہ کون ہے؟ اگر تم واقعی اس بارے میں نہیں جانتی ہو تو پھر معلوم کر کے بتاؤ۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ سوزی بہت سنجیدہ ہونے پر مجبور ہو گئی۔ اسی دوران میں برآمدے کی طرف سے پہرے دار کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس آ گیا تھا۔ سوزی نے تسلی دینے والے انداز میں ہم دونوں کی طرف دیکھا اور واپس چلی گئی۔

اب میرے لیے یہ اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں رہا تھا کہ بقول سوزی جس لڑکی کو مرقص نے لاک اپ میں سے نکالا وہ کملا ہی تھی۔ کملا کے لواحقین کو یہ بتایا گیا کہ وہ کملا کو میرے پاس لے جا رہے ہیں۔ اترپردیشی قیدی اب تک یہی سمجھتے تھے کہ میں مائیکل کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک ہوں۔ لہٰذا انہیں اس بیان پر شبہ نہیں ہوا کہ کملا کو میں نے ہی طلب کیا ہے۔ اس کے بعد کملا کے ساتھ کیا ہوا اور اب وہ کہاں تھی؟ یہ سب تاریکی میں تھا۔ اگر کملا کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا تو یہ بہت اندوہناک بات تھی۔ کملا کی معصوم بھولی بھالی صورت میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہ اس عمر میں تھی جب بچیاں جھولے جھولتی ہیں، رسا پھلانگتی ہیں اور دھوم دھام سے گڑیوں کے بیاہ رچاتی ہیں، لیکن بے رحم ننگے سماج نے اس گڑیا سی بچی کی گود میں ایک بچہ دے دیا تھا۔ عورت کی گود میں بچہ ہو تو وہ مکمل نظر آنے لگتی ہے، لیکن کملا کی گود میں بچہ دیکھ کر انسانیت ہی نامکمل نظر آنے لگتی تھی۔ وہ نچلی ذات کی غریب بے آسرا لڑکی تھی۔ پتا نہیں کس ٹھاکر، برہمن یا مہاشے کے دستِ ستم کا شکار ہوئی تھی۔ کسی نامہرباں اندھیرے میں اس کی معصومیت چھین کر اسے ایک ذمے داری سونپ دی گئی تھی۔ وہ اس روتی بلکتی ذمے داری کو سنبھالنے، پچکارنے اور اس کے پوتڑے دھونے پر مجبور تھی۔ بحری سفر کے دوران میں کم سن کملا کو مجھ سے عجیب قسم کا انس ہو گیا تھا۔ وہ تھوڑی بہت اردو جانتی تھی جس کی وجہ سے میں اس کی بات سمجھتا تھا اور اکثر اسے ترجمانی کے لیے بھی استعمال کر لیتا تھا۔ مجھے دیکھ کر کملا کی معصوم آنکھوں میں اطمینان اور سلامتی کا احساس کسی چراغ کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔

وہ ساری رات میں نے کانٹوں پر گزاری۔ کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ صفدر میری بے قراری کو بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ساتھ پوری شدت سے سوزی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے سوزی سے کہا تھا کہ وہ کسی طرح بھی کملا کے بارے میں معلوم کر کے بتائے۔ اب کچھ معلوم

نہیں تھا کہ وہ کیا خبر لائے گی۔ ہم مسلسل انتظار کی پھانسی پر لٹک رہے تھے۔ صفدر نے میرا دھیان بٹانے کے لیے غزالہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح سوزی اسے بہانے سے اپنے آفس میں لے گئی تھی۔ آفس کے ساتھ ہی اٹیچ ایک کمرا وہ اپنی رہائش کے لیے استعمال کرتی ہے اور غزالہ اسی کمرے میں موجود ہے۔ صفدر نے بتایا "میں نے اس سے بات کی ہے، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ جس وقت مبارک امین اسے اپنے بیڈ روم میں لے کر گیا وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر تھی پھر بھی وہ اس جدوجہد سے واقف ہے جو آپ نے اسے بدبخت مبارک کے چنگل سے نکالنے کے لیے کی۔ بعد میں گارڈز آپ پر پل پڑے تھے اور غزالہ نے اوپر تلے تین فائر بھی سنے تھے۔ اس کے ذہن میں یہ شک بیٹھا ہوا ہے کہ شاید وہ فائر آپ پر کیے گئے تھے۔ وہ آپ کی خیریت کی طرف سے بے حد پریشان ہے۔ میں نے اس کے سامنے قسمیں بھی کھائی ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں، لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوئی۔ روتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھی۔"

صفدر بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"یہ وعدہ خلافی ہو جائے گی جناب۔" وہ مسکرایا۔ پھر ذرا توقف سے خود ہی کہنے لگا "وہ کہہ رہی تھی کہ میں ایک بار اسے آپ کی صورت دکھا دوں..... لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وعدہ بھی لے رہی تھی کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میرے رگ و پے میں درد کی میٹھی سی لہر جاگ گئی۔ صفدر سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "شاہ جہاں صاحب! مجھے بارہا محسوس ہوا ہے کہ غزالہ آپ کی توقع سے زیادہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ اسے بے شمار مجبوریوں نے جکڑ رکھا ہے اس کے باوجود کبھی کبھی اس کی محبت برق کی طرح تڑپ کر اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ اس طویل سفر نے اور رات دن کے ساتھ نے آپ دونوں کو ایک بار پھر ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔ اپنے اس تعلق کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"جب اس بارے میں سوچتا ہوں تو دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔"

وہ بولا "دیکھیں شاہ جہاں صاحب! ایک بات تو طے ہے کہ غزالہ اب واپس شیخ عاصم کی طرف نہیں جائے گی۔ وہ خود مجھ سے کہہ چکی ہے کہ یہ ورق اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو چکا ہے۔"

"لیکن وہ قانونی اور مذہبی رشتہ تو موجود ہے جسے نکاح کہتے ہیں۔ وہ دستاویز جو عاصم اور غزالہ کو میاں بیوی [illegible] کرتی ہے، بے شک غزالہ نے وہ سب کچھ حالتِ مجبوری [illegible] کیا لیکن کیا تو..... اب ایک ایسی زنجیر اس کے پاؤں میں [illegible] جسے توڑے بغیر وہ "آزاد" نہیں کہلا سکتی۔ اور یہ بات [illegible] بھی بہت اچھی طرح سمجھتی ہے۔"

وہ خوفناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے شاہ جہاں صاحب [illegible] شاید اس کے دل کی گہرائی میں یہ خواہش موجود ہے کہ [illegible] اسے اس دلدل سے نکالیں۔"

"لیکن دلدل سے نکلنے کے لیے وہ خود بھی تو [illegible] بڑھائے۔ اگر وہ ہاتھ نہیں بڑھائے گی اور میں اسے [illegible] تو پھر یہ دخل در معقولات کہلائے گا۔ ایسے میں مجھ پر [illegible] بھی آسکتا ہے کہ میں نے ایک گھر اُجاڑنے کی کوشش [illegible] ہے۔ تم جانتے ہی ہو، چچی چچا تو مجھے روزِ اوّل سے غزالہ [illegible] دشمن سمجھتے ہیں۔"

"آپ دنیا کی بات چھوڑیں اپنے دل کی آواز سنیں [illegible] بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ غزالہ جہاں [illegible] ہوئی ہے وہ دلدل ہے یا ہنستا بستا گھر ہے۔ باقی جہاں تک [illegible] بات کا تعلق ہے کہ غزالہ خود آپ کی طرف ہاتھ کیوں [illegible] بڑھا رہی تو پھر ایک اور چیز آپ کو ذہن میں رکھنی ہوگی۔ [illegible] ہے کہ میرا اندازہ غلط ہو لیکن کسی وقت مجھے محسوس ہوا [illegible] کہ غزالہ آپ کے حوالے سے احساسِ کمتری کا شکار [illegible] شاید وہ اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ ایک [illegible] حیات کی مساوی حیثیت سے آپ کی زندگی میں آسکے [illegible] اگر یہ بات اس کے ذہن میں ہے تو یہ کوئی عجیب بات [illegible] جس قسم کے بے رحم حالات سے وہ گزری ہے، اس [illegible] نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ تو ہونی ہی ہے۔ اگر آپ واقعی غزالہ [illegible] اپنانا چاہتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ آپ چاہتے ہیں تو [illegible] تعلقات کو معمول پر لانے کا اس سے بہترین موقع اور [illegible] نہیں ہو سکتا۔ حالات کی گردش ایک محدود مدت کے [illegible] آپ کو ایک دوجے کے قریب لے آئی ہے۔ آپ اس انتظار [illegible] میں مت رہیں کہ غزالہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ [illegible] دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ خود اس کی طرف بڑھیں اور [illegible] اس کا یہ اندیشہ ختم کر دیں کہ شاید اب آپ دونوں کی [illegible] مساوی نہیں ہے۔"

میں صفدر کا منہ تکنے لگا۔ کبھی کبھی مجھے صفدر [illegible] خیالات جان کر حیرت کا شدید دھچکا لگتا تھا۔ یوں محسوس [illegible] تھا جیسے جو کچھ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے وہی فوٹو اسٹیٹ [illegible] کر صفدر کے ذہن پر نقش ہو رہا ہے۔ اب جو کچھ صفدر [illegible] کہتا یہ ہو بہو وہی سوچ تھی جو میرے ذہن میں پچھلے کئی [illegible] سے پیدا ہو رہی تھی۔ من و عن یہی خیالات اور یہی [illegible] رات تھے۔ لفظوں میں شاید کچھ ہیر پھیر ہو مگر مفہوم یہی [illegible]

صفدر نے کملا کی طرف سے میرا دھیان بٹانے کے لیے [illegible] غزالہ کا ذکر چھیڑا تھا مگر غزالہ کی باتیں کرتے ہوئے بھی کملا کا [illegible] تصور میرے سینے میں ٹیس جگا رہا تھا۔ جیسے نیم بے ہوشی [illegible] کی حالت میں بھی جسم کی کسی شدید تکلیف کا احساس ذہن کو [illegible] لگاتار ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب رات کے آخری پہر [illegible] راہداری کی طرف سے سوزی کے قدموں کی چاپ سنائی دی [illegible] میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ ممکن تھا کہ سوزی، کملا کے [illegible] میں کوئی اطلاع لے کر آئی ہو۔

سوزی کا چہرہ دیکھ کر میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ وہ گم [illegible] تھی "کیا معلوم ہوا؟" میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ گمبھیر لہجے میں بولی "اطلاع اچھی نہیں ہے۔"

"[illegible] ہے کملا کو؟" میرے ہونٹوں سے بے ساختہ [illegible]

"ابھی ٹھیک سے کچھ معلوم نہیں۔ صرف یہ بات کنفرم ہوئی [illegible] کہ کملا نامی اس لڑکی کو لاک اپ سے نکالا گیا تھا۔ اسے [illegible] والا ہیڈ انچارج مرقص ہی تھا۔ اس وقت شیر خوار بچہ [illegible] کملا کے ساتھ تھا۔"

"کیوں نکالا تھا اس نے؟" میں نے بے قراری سے [illegible]

وہ گہری سانس لے کر کہنے لگی "دیکھو مسٹر شا! تم نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو گے اور کوئی [illegible] قدم نہیں اٹھاؤ گے جس کے سبب یہاں تمہاری اور [illegible] مشکلات میں اضافہ ہو۔ اگر تم نے میری بات سن کر [illegible] کی طرح طیش دکھانا ہے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہونا [illegible] تو پھر میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

نڈھال سا ہو کر میں فرش پر بیٹھ گیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے [illegible] میں نے کہا "ٹھیک ہے سوزی! تم بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں [illegible] میری وجہ سے تمہیں پریشانی نہیں ہوگی۔"

صفدر نے بھی اس سے ملتے جلتے الفاظ کہے۔ سوزی بولی "مرقص نے کملا کو یہ کہہ کر لاک اپ سے نکالا تھا کہ اسے تم [illegible] رہے ہو۔ اس نے کہا تھا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے اور [illegible] چاہتے ہو کہ کملا تمہاری دیکھ بھال کے لیے دو چار روز [illegible] تمہارے پاس رہے۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے دوران کملا کی ماں اور سیوک بار بار میری خیریت کیوں پوچھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں، میں بیمار تھا اور کملا میری سیوا میں مصروف تھی۔

"تو کیا مرقص نے کملا کی جان لے لی؟" میں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ابھی مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ جس اترپردیشی لڑکی کی موت کے بارے میں خبر آئی تھی وہ کملا تھی یا کوئی اور۔"

"اور کیسے ہو سکتی ہے۔" صفدر کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی "اترپردیشی قیدیوں میں سے صرف وہی بدنصیب غائب ہے۔"

"مگر یہاں مزید اترپردیشی قیدی بھی تو موجود ہیں۔ تقریباً ساٹھ افراد کا ایک گروپ اور ہے۔ وہ لوگ تین مہینے پہلے یہاں ٹرسٹ میں پہنچے تھے۔ اب وہ بھی سیکنڈ انٹری میں ہیں۔"

"ان میں بھی لڑکیاں موجود تھیں؟" امید کی ایک کرن میرے ذہن میں نمودار ہوئی۔

"زیادہ تو نہیں تھیں مگر پانچ چھ تو ہوں گی ہی۔" سوزی نے جواب دیا۔

"لڑکی کی موت کی اطلاع تم تک کیسے پہنچی تھی؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا جھجک کر بولی "ہر ماہ پہلے ویک اینڈ کی رات باس مائیکل میرے ساتھ گزارتا ہے، اس رات بھی نو بجے کے قریب اس نے میرے پاس آنا تھا لیکن وہ دس بجے کے قریب آیا۔ جلدی میں تھا، اس نے کہا کہ ایک انڈین (اترپردیشی) لڑکی ہلاک ہو گئی ہے۔ میں کنگ کی طرف جا رہا ہوں۔ دو تین گھنٹے لگ جائیں گے، اب کل ہی ملاقات ہوگی۔ میں نے پوچھا کہ کیسے ہلاک ہوئی، وہ بولا "جیسے یہ لوگ ہوتے ہیں۔ مرنے کی بہت جلدی ہوتی ہیں انہیں۔ بس بیٹھے بیٹھے بھی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں..... " پھر مجھے اپنی زیرِ نگرانی بردوں کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر وہ چلا گیا۔"

صفدر نے کہا "دیکھو مس سوزی! تم ہماری پریشانی کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو۔ وہ زندہ ہے یا خدانخواستہ مر گئی ہے، جو کچھ بھی ہے ہمیں جلد سے جلد معلوم ہونا چاہیے۔ تمہاری ادھوری اطلاع نے ہمیں سولی پر چڑھا رکھا ہے۔ تم انچارج ہو یہاں کی، اگر تم بھی ہمیں اس کے انجام کے بارے میں نہیں بتا سکتی ہو تو اور کون بتائے گا؟"

سوزی نے کہا "میں اپنی پوری کوشش کر رہی ہوں لیکن میں پھر کہوں گی کہ تم جذبات میں آکر اب کوئی اور قدم نہیں اٹھانا۔ مائیکل اپنے دوست کی موت پر پہلے ہی بہت بھڑکا ہوا ہے۔ اگر تم سے کوئی مزید غلطی ہوئی تو وہ کنگ کو تمہارے لیے بدترین سزا پر آمادہ کرلے گا۔ اس کے علاوہ۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔ پھر جیسے حوصلہ جمع کرکے بولی "اس کے علاوہ یہ بھی کہوں گی کہ آپ لوگ انڈین لڑکی کے حوالے سے خود کو کسی بھی بری خبر کے لیے تیار رکھیں۔ کرائسٹ سے دعا ہے کہ وہ بچ گئی ہو مگر آثار اچھے نظر نہیں آتے۔"

وہ واپس چلی گئی۔ ہم دونوں نے رات کا بچا کھچا حصہ نیم غنودگی اور نیم بیداری میں گزار دیا۔ "ارنگا" میں ہم دونوں سے جو شدید مارپیٹ ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی تک جسم پر موجود تھے۔ صفدر دائیں کروٹ پر نہیں لیٹ سکتا تھا، مجھے بھی دائیں کروٹ سے لیٹنا سخت دشوار محسوس ہوتا تھا، لہٰذا ہم چت لیٹتے تھے یا اس طرح لیٹتے تھے جیسے ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہوں۔

اس روز سوزی کی مہربانی سے ایک اور مثبت تبدیلی آئی۔ ایرانی جعفر رضا کو ہمارے کمرے میں سے شفٹ کردیا گیا۔ دراصل مبارک امین کے قتل کے بعد سے جعفر رضا ہم دونوں سے بہت سہما سہما رہتا تھا۔ اس نے ایک پہرے دار کے ذریعے سوزی تک یہ شکایت پہنچائی تھی کہ اسے خطرناک قیدیوں کے ساتھ بند کیا گیا ہے، لہٰذا وہ رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ سوزی نے کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے جعفر رضا کو ہمارے کمرے سے شفٹ کردیا تھا اور اس کی جگہ شہنشاہِ ظرافت زریں گل کو ہمارے پاس بھیج دیا تھا۔

زریں گل گرم جوشی سے ملا لیکن وہ خاصے خراب موڈ میں تھا۔ وہ چھوٹتے ہی بولا "سچ کہتے ہیں استاد صیب کہ بد سے بدنام برا ہوتا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "یہ صیدر صیب بہت اچھا مالش کرتا ہے۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو ایک مرتبہ لاہور میں صیدر صیب نے مجتبیٰ کنور صیب کا مالش کیا تھا اور وہ اش اش کر اٹھا تھا۔ لیکن یہاں کوئی صیدر صیب کو مالش کے لیے نہیں کہتا کیونکہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہے۔ ام چونکہ مالش کے بارے میں بدنام ہوچکا ہے، اس لیے ام کو ہر کوئی مالش کے لیے بلوالیتا ہے۔ خو جہاز کی طرح اب ام کو یہاں بھی مالشیے کا ڈیوٹی مرحمت فرمادیا گیا ہے۔ وہ بدبخت مائیکل اور اس کا یار دوست ام سے یہاں بھی دن رات مالش کروا رہا ہے۔"

"یہ تو بڑی دردناک خبر ہے۔" میں نے ا...
کیا "مستقبل کا کروڑپتی خان زادہ اور ا...
مالش کرنا پڑ رہی ہے۔"

صفدر بولا "یہ سب تمہارے بڑے بول...
فرنگی عورتوں سے فرش پر ناکی پھروانے کی...
تھے، اب تمہیں انہی فرنگیوں کی مٹھی چاپی کر...

"یہ سارا بے عزتی امارے اندر آگ ...
ہے۔ جب یہ آگ پھٹے گا تو آدھا انگلینڈ جل جا...

صفدر بولا "تمہاری دُم کوئی بھی موڑ...
انگلینڈ پر ہی نکلتا ہے۔"

"کیوں نہ نکلے۔ اس نے ایک سو سال ام ...
رکھا ہے۔" زریں تڑخ کر بولا "اب ہر کوئی ام...
سمجھتا ہے۔"

زریں خاصا بھرا ہوا تھا، تاہم اپنے دل کی...
رہا۔ اسے بھی مبارک امین کے قتل کے بار...
ہوچکا تھا اور وہ اس خبر پر دل ہی دل میں بہت...
مگر بعد میں مائیکل اور اس کے ساتھیوں...
کروا کروا کر اس کی ساری خوشی غارت...
باتوں سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ ٹرسٹ...
کے ہیڈ انچارج مرقص کی مالش بھی کرتا رہا...

ہم نے زریں سے مرقص کے بار...
پوچھی۔ وہ کافی کچھ جانتا تھا۔ اس نے بتایا "مرقص...
گاہ، فوارے کے بالکل سامنے ہے۔ دائیں...
راہداری نکلتا ہے وہ تھوڑا سا خم کھا کر سیدھا...
تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وہ پانچ عورتوں...
ہے۔ اس کا اپنا عمر چالیس سال سے اوپر ہی...
کے پاس جو عورتیں ہیں وہ سارا کا سارا کم عمر...
سے کسی کا عمر بھی بیس سے زیادہ نہیں ہوگا...
بردوں میں سے چُنا گیا ہے۔ صرف ان میں...
مقامی ہے۔ وہ فارمی مرغی کی طرح بہت موٹا...
چیں چیں کرتا رہتا ہے۔ صرف اس کا عمر بیس سال...
ہوگا۔ وہ باقی لڑکیوں پر حکم چلاتا ہے اور ڈانٹ...
مرقص چونکہ بہت لمبا ڈھوش ہے، اس لیے اس...
درد رہتا ہے۔ کمر کی مالش کے لیے ہی اس نے ام...
خو وہ بدبخت امارے سامنے ہی شراب پیتا رہا...
لڑکی سے اٹکھیلیاں بھی فرماتا رہا تھا۔ وہ چہرے...
غصیلا اور خشک نظر آتا ہے لیکن شراب پینے کے...
رنگ رنگیلا ہوجاتا ہے۔ ام دو مرتبہ اس کا مالش...

...دونوں مرتبہ اس کا یہی مصروفیات دیکھا ہے۔"

زریں گل جو کچھ بتا رہا تھا وہ ہمارے اندیشوں کو مضبوط ...نے کے لیے کافی ہے۔ اس سے پہلے سوزی نے بھی یہی ...دیا تھا کہ مرقص اپنے چہرے مہرے کے برعکس رنگین ...مس ہے اور اس سے کوئی برائی بھی بعید نہیں۔ اب ...سے یہ نئی بات معلوم ہوئی تھی کہ ادھیڑ عمر مرقص، نو ...ںوں میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ اس بات میں شک شبے ...ائش اب کم ہی دکھائی دیتی تھی کہ مرقص نے اپنی ...کے لیے کملا کولاک اپ میں سے نکالا ہوگا۔

صفدر نے کہا "مگر ایک چیز مجھے شک میں ڈال رہی ہے۔ ...کے بیان کے مطابق لڑکی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے ...ئیکل کنگ براؤن کی طرف گیا تھا۔ اور کنگ براؤن ...نہیں رہتا، وہ اسی زیرِ زمین کمپلیکس میں ہے جہاں کل ...کو لے جایا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یا تو ہلاک ہونے ...والی لڑکی کملا نہیں تھی، یا پھر کملا کو مرقص نے ہلاک نہیں ...

صفدر کی بات واقعی غور طلب تھی۔ ہم دیر تک اس ...کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ دل سے بار بار یہی ...آواز آ رہی تھی کہ جو لڑکی ہلاک ہوئی ہے وہ کملا نہ ہو۔

صفدر کل رات کا جاگا ہوا تھا اس لیے جلد ہی سوگیا۔ ...کل بھی خراٹے لینے لگا لیکن نیند میری آنکھوں سے ...دور تھی۔ میں دیر تک کروٹیں لیتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ...کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ ٹرسٹ کی عمارت میں ...کا راج تھا۔ ہمارے کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل ...سلح پہرے دار دیوار سے ٹیک لگائے لگائے سوگیا تھا۔ ...کا سر کبھی ایک طرف ڈھلکتا تھا، کبھی دوسری طرف۔ میں ...دیر تک اس کے سر کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ آخر ...کا سر ستون کے ساتھ ٹک گیا۔ وہ گہری نیند سوگیا تھا۔ ...گل نے ایک چھوٹا سا کارنامہ انجام دیا تھا، وہ ہمارے ...کمرے میں آنے سے پہلے کہیں سے ایک پیچ کس چرا لایا تھا۔ ...دوپہر اس نے یہ پیچ کس میرے حوالے کردیا تھا۔ زریں ...کا خیال تھا کہ شاید ہم میں سے کوئی کسی وقت اس پیچ کس کو ...ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکے۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ ...پیچ کس آج رات ہی استعمال ہوگا اور اسی کام کے لیے ...استعمال ہوگا جس کام کے لیے بنا ہے، یعنی پیچ کھولنے کے ...لیے۔

میں سلاخ دار دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔ اپنا ایک ...آہستگی سلاخوں سے باہر نکالا، پھر کلائی کو موڑا اور پیچ کس کی مدد سے کُنڈی کے چار پیچ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوشش طویل ثابت ہوئی لیکن لاحاصل نہیں رہی۔ قریباً ایک گھنٹے کی محنتِ شاقہ کے بعد میں دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے سینے میں الاؤ سا دہک رہا تھا اور مرقص کی منحوس صورت بار بار نگاہوں میں گھوم جاتی تھی۔ ٹرسٹ میں ہتھیاروں کی نمائش ممنوع تھی لہٰذا پہرے دار کا ریوالور بھی اس کے لباس میں تھا۔ میں یہ ریوالور حاصل کرنے کی کوشش کرتا تو بنا بنایا کام بگڑ سکتا تھا۔ میں پہرے دار کو اس کے حال پر چھوڑ کر اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کرکے راہداری کی طرف مڑ گیا۔ پیچ کس یعنی اسکریو ڈرائیور میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے چاقو کے طور پر استعمال کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ تھا۔ آج زریں گل نے مجھے مرقص کی قیام گاہ کے بارے میں اتنی وضاحت سے بتایا تھا کہ میں کہیں بھی رکے بغیر مرقص کے رین بسیرے پر پہنچ گیا۔ یہ کوارٹرز کی طرز کے پانچ چھ مکانات تھے۔ بظاہر سادہ نظر آتے تھے لیکن اندر سے کافی آرام دہ تھے۔ بیرونی چار دیواری پھلانگنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ کسی کمرے سے ائر کنڈیشنر چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ میں ابھی صحن میں کھڑا اسی آواز پر غور کر رہا تھا کہ ایک تاریک گوشے میں کسی سایے نے حرکت کی۔ میں گہری تاریکی میں تھا اور سایہ نیم تاریکی میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی پہرے دار انیس تھا جو پہلے روز ہمارے کمرے پر تعینات تھا، وہ انڈین تھا اور اردو انگریزی، پنجابی سب سمجھتا تھا۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہی پوچھا تھا کہ اس وقت اندھیرے میں کون سرگشت کر رہا ہے۔

وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔ میری پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ انیس مجھے غور سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ شاید اسے شک ہوا تھا کہ اس کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ اور یہاں کوئی موجود نہیں۔ جونہی وہ مجھ سے پانچ چھ قدم کی دوری پر پہنچا اور اسے یقین ہوگیا کہ اس کی گناہ گار آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا میں نے لپک کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اس کا دہن چیخنے کے لیے کھلا تھا مگر گردن میرے شکنجے میں آئی تو آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے اسکریو ڈرائیور اس کی شہ رگ پر رکھ دیا "خبردار! آواز نکالی تو یہ گردن میں دھنسا دوں گا۔"

میری آواز پہچان کر اس کے جسم میں تھرتھری سی نمودار ہوئی۔ مبارک امین کے قاتل کی حیثیت سے میری ٹھیک ٹھاک دہشت پھیل چکی تھی۔ نصف درجن گارڈز کی موجودگی

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

میں، میں نے جس طرح اس کی کھوپڑی توڑی تھی وہ ایک اثر انگیز منظر ثابت ہوا تھا۔ میں نے اس کے کان میں پھنکارتے ہوئے کہا "میری بات پورے گیان دھیان سے سنو۔ میرے سر پر خون سوار ہے، تم نے کسی حرام زادے کے ساتھ نمک حلالی کی کوشش کی تو ایک سیکنڈ میں اوپر پہنچادوں گا۔"

میں نے باقاعدہ اس کی گردن اوپر کی۔ اوپر، بہت اوپر ماریطانیہ کے تاریک آسمان پر ستارے ٹمٹمارہے تھے۔ ان کے دل بھی جیسے دہشت زدہ انڈین کے دل کی طرح دھڑک اٹھے تھے۔

میں نے بے رحمی سے اسکریو ڈرائیور کی نوک انیس کی گردن میں چبھوئی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ گیا۔ اس نے غالباً مجھ سے بچنے کے لیے کوئی بدبودار تیل چہرے اور ہاتھوں وغیرہ پر مل رکھا تھا۔ تیل کی بو میرے نتھنوں میں گھستی چلی جارہی تھی۔

اسکریو ڈرائیور کا بے رحم دباؤ محسوس کرکے انڈین انیس کی حالت کچھ اور بھی پتلی ہوگئی تھی۔ میں نے کہا "اگر مزید جینے کی خواہش ہے تو مجھے سیدھا اپنے باپ مرقص کے کمرے میں لے چلو۔ بولو منظور ہے؟"

اس نے جلدی سے اثبات میں سرہلا دیا۔ میں نے اس کا رخ مکان کے اندرونی حصے کی طرف کیا۔ وہ مجھے ایک راہداری کے سامنے لے آیا۔ یہاں جالی دار دروازہ لگا تھا۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ مقفل سے مراد یہ ہے کہ اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے انیس کے گلے پر سے بازو کا دباؤ تھوڑا سا کم کیا "یہ دروازہ کھلواؤ۔" میں نے کہا "اور تمہاری زندگی کی ضمانت بس اسی میں ہے کہ تمہارا دماغ کوئی چالاکی نہ دکھائے۔"

انیس چند لمحے تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ وہ میری بات ماننے کو تیار ہے۔ میں نے اس کی گردن پر سے دباؤ مزید کم کردیا۔ تاہم شہ رگ پر اسکریو ڈرائیور کا بے رحم دباؤ بدستور موجود تھا۔ انیس نے کھنکار کا گلا صاف کیا اور پھر کسی کو مقامی زبان میں آواز دی۔

اس کی دوسری تیسری آواز پر قدموں کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ راہداری میں مدھم روشنی تھی۔ میں نے ایک فربہ اندام ملازمہ کو دیکھا۔ وہ سلیپر گھسیٹتی اور بڑبڑاتی ہوئی دروازے کی طرف آرہی تھی۔ میں پوری طرح چوکس ہوگیا۔ سیاہ فام ملازمہ نے جالی دار دروازے کی کنڈی کھولی۔ نیند سے بیدار کیے جانے پر وہ اتنا تلملائی ہوئی تھی کہ اس بھلی مانس نے انیس پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بڑبڑاتی ہوئی اور اپنے چوڑے کولھوں کو ہلکورے دیتی ہوئی وہ واپس چلی گئی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں انیس سمیت اندر داخل ہوا۔ ایک کمرے کی کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اندر نیلگوں بلب کی روشنی تھی۔ اس روشنی میں دو لڑکیاں آرام دہ بستر پر اوندھی سیدھی پڑی نظر آئیں۔ وہ گہری نیند سورہی تھیں۔ ان میں سے ایک سیاہ فام تھی اور دوسری گندمی رنگت کی۔ یہ نو دمیدہ کلیاں یقیناً مرقص کی پانچ عدد رکھیلوں میں سے تھیں۔ ان پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ پلائی ووڈ کے ایک دروازے کے سامنے جاکر انیس رک گیا "یہی ہے تیرے باپ کا کمرا؟" میں نے پوچھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سرہلایا "تو خاموش کیوں ہے لومڑ... آواز دے اسے۔"

انیس نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ جواب میں انیس نے کچھ کہا۔ چند سیکنڈ بعد کھڑکی میں روشنی ہوئی اور پھر... مرقص نے دروازہ کھول دیا۔ مرقص کے سامنے آنے سے پہلے ہی میں انیس کو فرش پر لٹا چکا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اب اس کے سر پر ڈھول بھی بجائے جاتے تو اس کے کان پر جوں رینگنے والی نہیں تھی۔ میں نے اس پر اپنا مخصوص حربہ آزمایا تھا اور دو تین گھنٹے کے لیے اسے فکر و تکلیف سے آزاد کردیا تھا۔

مرقص نے اپنے ائرکنڈیشنڈ بیڈ روم میں سے اپنی لمبی گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں تھا۔ دفعتاً اسے شدید خطرے کا احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ واپس کمرے میں گھس کر کسی ہتھیار وغیرہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا میں اس کی لمبی گردن ناپ چکا تھا۔ مرقص کے حلق سے اوغ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ وہ بری طرح تڑپا مگر چند سیکنڈ میں بے بس ہوکر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے چہرے کا ایک منظر بڑا دلچسپ تھا۔ وہ بار بار منہ کھول کر اپنے مددگاروں کو آواز دینے کی کوشش کررہا تھا مگر آواز اس کے اندر سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ ہر بار ناکام ہونے کے بعد اس کے چہرے کی حیرت آمیز وحشت کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی "قیامت تک بھی زور لگائے گا تو بغیر آواز کے ہی چیخے گا۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی اور اس نے بار بار منہ کھولنا اور بند کرنا ترک کردیا۔ اس کے سیاہ بدن پر بغیر بازو کی بنیان تھی اور ایک پائجامہ نما چیز تھی۔ اس کے بستر پر ایک قیامت سوئی پڑی تھی۔ یہ لڑکی گندمی رنگ کی تھی مگر خاصی خوب صورت تھی۔ عمر بمشکل سترہ اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ اس کی چھوٹی سی ناک میں ایک طلائی نتھلی تھی جو ٹیوب لائٹ کی روشنی میں دمک رہی تھی۔ یہ نیم عریاں لڑکی بہت گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اسے خواب گاہ میں ہونے والی گڑبڑ کا مطلق پتا نہیں چلا۔

میں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک بغلی دروازہ بھی موجود ہے۔ میں نے ٹانگ کے دباؤ سے دروازہ کھولا، یہ بھی ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ یہاں حبس تھا کیونکہ اے سی کی ہوا یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کمرے میں صوفے رکھے تھے اور ٹی وی پڑا تھا۔ غالباً یہ کمرا ٹی وی لاؤنج کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں مجھے ایک دیوار پر ہولسٹر لٹکا بھی نظر آگیا۔ میں نے مرقص کی گردن چھوڑے بغیر ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا اور اسکریو ڈرائیور پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ بھرا ہوا ریوالور ہاتھ میں آنے کے بعد میرے اعتماد میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے اچھی طرح مرقص کی تلاشی لی اس کے بعد اسے فرش پر اوندھا لٹا دیا۔ وہ میری ہدایات پر بلا چوں چراں عمل کررہا تھا۔ میں نے اسے دھمکایا کہ اگر اس نے کوئی پھرتی دکھائی تو مبارک امین کی طرح کم از کم تین سوراخ اس کی کھوپڑی میں ضرور ہوجائیں گے۔

ویسے بھی امید نہیں تھی کہ مضمحل جسم والا یہ ادھیڑ عمر آدمی کوئی پھرتی دکھا سکے گا۔ جب وہ مجھ سے زور آزمائی کررہا تھا مجھے اس کے بدن میں واضح طور پر کھوکھلا پن محسوس ہوا تھا۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی سیاہ کاریوں نے اس کے چہرے کی طرح اس کے جسم کو بھی بنجر کردیا تھا۔ میں نے بغلی کمرے کا دروازہ کھول دیا اور مرقص کو نظر میں رکھتے ہوئے انیس کو بھی خواب گاہ میں گھسیٹ لایا۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد مجھے تسلی ہوگئی۔ اب کسی کے دخل در معقولات کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔

خواب گاہ کی لائٹ آف کرنے کے بعد میں اس چھوٹے کمرے میں آگیا جو غالباً ٹی وی لاؤنج تھا۔ میں نے مرقص کو صوفے پر بٹھایا اور خود دس بارہ فٹ دور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ موت کے خوف سے مرقص کا سیاہ چہرہ کچھ اور بھی سیاہ ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ اس کپکپی کو چھپانے کے لیے بار بار ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیتا تھا۔

"اس کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟" وہ لرزتی آواز میں بولا۔ اس کا اشارہ انیس کی طرف تھا۔

"کچھ دیر کے لیے انڈیا کی سیر کرنے گیا ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے ملے گا۔ گنگا جل پئے گا۔ تمہارے اور کنگ براؤن کے حق میں دعا کرے گا اور واپس آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں۔"

"اور اگر... یہ... بے ہوشی میں ہی مرگیا تو؟" مرقص ہکلایا۔

"تو میری ڈبل سینچری مکمل ہوجائے گی۔ ایک سو ننانوے بندے میں پہلے ہی پار کرچکا ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

مرقص اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ خاصا خوف زدہ تھا، اگلے آٹھ دس منٹ میں، میں اس کے خوف کو پانچ چھ گنا کرنے میں کامیاب رہا۔ اس کی آنکھیں پیلی پڑ گئیں اور موت اسے اپنے سامنے دکھائی دینے لگی۔ اس کی ساری "ہیڈ انچارجی" ناک کے رستے بہہ گئی تھی اور ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا سارا جسم بھی کانپنا شروع ہوگیا تھا۔

"باقی باتیں چھوڑو۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "مجھے صرف ایک بات کا جواب چاہیے، کملا کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟"

وہ ہکلایا "میں... یہ بات مانتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو لاک اپ سے لایا تھا۔ مم مگر میں نے صرف کنگ کی ہدایت پر ایسا کیا تھا۔ میں نے اسی رات لڑکی کو بچے سمیت کیمپس میں پہنچادیا تھا۔"

کیمپس اس زیر زمین علاقے کو کہا جاتا تھا جہاں دو روز پہلے مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا تھا۔

"کنگ کو اس لڑکی سے کیا کام تھا؟"

"اس بارے میں مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں بتانے میں ایک منٹ کی تاخیر نہ کرتا۔" وہ شکستہ لہجے اور شکستہ انگلش میں بولا "اس کی حالت گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ پتلی ہورہی تھی۔

میں نے کہا "لگتا ہے کہ تمہارے منہ میں اپنی زبان کے بجائے کتے کی زبان پیوند کی گئی ہے۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہو اور اتنے بے غیرت ہو کہ کہیں لڑکھڑاتے بھی نہیں ہو۔"

"میں قسم کھا سکتا ہوں کہ..."

"مجھے معلوم ہے کہ تم بہت طرح کی قسمیں کھا سکتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹی "تم قسم کھا سکتے ہو کہ تم خدا کے عبادت گزار بندے ہو، تم نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں

لگایا۔ تمہیں اس بڑھاپے میں نو عمر لڑکیوں سی کوئی دلچسپی نہیں ہے، تم بردہ فروشی کرکے حق حلال کی روزی کما رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی بہت سی قسمیں تم کھا سکتے ہو۔ لیکن یہ قسمیں تمہاری جان نہیں بچا سکتیں، آج کی رات تمہاری جان صرف سچ بولنے سے بچ سکتی ہے۔ یہ بتانے سے بچ سکتی ہے کہ آدھی رات کو تم کم سن کملا کو لاک اپ سے نکال کر کہاں لے گئے تھے، اور کیا کیا تھا اس کے ساتھ۔۔۔ اور یہ کہ اب وہ کہاں ہے؟"

مرقص نے تھوک نگلنا چاہا لیکن اس کے منہ میں غالباً تھوک بھی باقی نہیں بچا تھا اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور کئی سیکنڈ تک حلق سے "کھیں کھیں" کی آواز نکلتی رہی "میری بات کا یقین کرو۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اب وہ کہاں ہے۔ میری ڈیوٹی بس یہی تھی کہ میں اسے کیمپس میں پہنچا دوں۔ پہنچا کر میں واپس آگیا تھا۔"

میں نے کہا "اچھا وہ انڈین لڑکی جو ہلاک ہوئی کون تھی؟"

"مجھے اس کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ صرف باس مائیکل سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ کیمپس میں ایک انڈین لڑکی ہلاک ہو گئی ہے۔"

میں نے ریوالور مرقص کی پیشانی کی طرف سیدھا کیا اور ایک آنکھ بند کرکے نشانہ لے لیا "بڑے بے خبر ہو تم۔ میرا خیال ہے کہ ایسے بے خبر ہیڈ انچارج سے چھٹکارا پا کر کنگ براؤن بہت خوش ہوگا۔" میں نے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا تو مرقص کی باقاعدہ گھگی بندھ گئی۔ اس کے منہ سے ناقابلِ فہم آوازیں نکل رہی تھیں۔۔۔ خدا کے لیے گولی مت چلانا۔ اس نے فریاد کی۔

"تو بتاؤ، کملا کو لاک اپ سے کیوں نکالا تھا اور دوسرے قیدیوں کو یہ کیوں بتایا تھا کہ کملا کو میں نے بلایا ہے؟"

"وہ۔۔۔ وہ صرف اس لیے تھا کہ کملا میرے ساتھ آنے میں پس و پیش نہ کرے۔ مجھے ہرکولیس کے نائب کپتان آرتھر سے معلوم ہوا تھا کہ کملا اور دیگر قیدی تم پر بے پناہ اعتماد رکھتے ہیں اور جہاز میں سفر کے دوران میں تم ہی ان کی دیکھ بھال کرتے رہے ہو۔"

بدبخت مرقص سخت خوف زدہ ہونے کے باوجود چکنا گھڑا ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک ایک بھی ٹھوس بات نہیں بتائی تھی۔ میرا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا۔ میں ایک دم اٹھا اور پھر سے اس کی لمبوتری گردن دبوچ لی۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلنے لگیں۔۔۔ لیکن تھا ڈھیٹ۔ آخری حد تک خوف زدہ بھی تھا اور اپنے جھوٹ پر اڑا ہوا بھی تھا۔ میں اسے گھسیٹ کر اٹیچ باتھ روم میں لے گیا۔ یہاں باتھ ٹب جھاگ دار پانی سے لبالب بھرا تھا۔ میں نے مرقص کا سر سیدھا ٹب میں گھسیڑ دیا۔ اس کی سانس بند ہونے لگی تو وہ مچھلی کی طرح تڑپا۔ اس کا پائجامہ نما پہناوا کمر سے کھسک گیا اور وہ نیم عریاں ہو گیا۔ جب سانس بالکل بند ہونے لگی تو میں نے اس کا سر ٹب سے نکال دیا "ہاں، کہاں ہے کملا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پھر وہی راگنی الاپنے کی کوشش کی۔ میں نے دوبارہ اس کا سر پانی میں ڈبو دیا۔ دو چار خوفناک غوطے کھانے کے بعد مرقص کی مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ وہ باتھ روم کے فرش پر گر گیا اور زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس حرکت کا مطلب یہ تھا کہ وہ اگلے غوطے سے بچنا چاہتا ہے اور اس کے بدلے مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کو تیار ہے۔

وہ باتھ روم سے نکلنا چاہتا تھا مگر میں اسے ٹب کے قریب ہی رکھنا چاہتا تھا تاکہ اگلے غوطے کا خوف مرقص کے سر پر سوار رہے اور وہ جھوٹ بکنے سے گریز کرے۔ اس کی حالت اتنی پتلی تھی کہ تین چار منٹ تک اسے اپنی بے ... کا بھی خیال نہیں آیا اور وہ اسی طرح دیوار سے ... بیٹھا رہا۔ اس دوران میں اس نے دو بار قے بھی کی۔ ... حالت قدرے سنبھلی تو میں نے ریوالور کی نال ہلاتے ہوئے کہا "ہاں۔۔۔ بتاؤ کہاں ہے کملا؟"

"میں سچ کہتا ہوں۔۔۔ مم۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ وہ۔۔۔ کنگ کے پاس تھی۔"

"تھی۔۔۔ کیا مطلب؟" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔

"وہ مر چکی ہے۔" مرقص کی آواز میرے کانوں میں دھماکے کی طرح گونجی۔

میں سکتے کی سی کیفیت میں مرقص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا "وہ مر چکی ہے اور اس کا بچہ اس سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ وہ دونوں کیمپس میں ہی تھے۔"

"کس نے مارا تھا انہیں ب" مجھے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

مرقص کے ہونٹ تھرائے۔ وہ تھوک نگل کر بولا "اس۔۔۔ اسقف نے اور اس کے دوستوں نے۔"

"یہ اسقف کون ہے؟"

مرقص کے ہونٹ پھر کپکپائے "وہ۔۔۔ وہ کنگ کا ...

"کہاں رہتا ہے وہ؟"

"کیمپس میں۔ کنگ کے ساتھ۔"

"کیا کیا ان لوگوں نے کملا کے ساتھ؟" میری آواز دکھ اور غصے سے کراہ اٹھی تھی۔

"بس مار دیا۔ کسی کو مار دینا ان کے لیے ایک مشغلہ ہے۔"

"مجھے تفصیل بتاؤ۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"بب۔۔۔ بس وہ ایک دن اس سے کھیلتے رہے، پھر اسے مار ڈالا۔"

"اس پر جنسی تشدد کیا گیا تھا؟"

"نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔" وہ فوراً بولا۔

"کیا بکتے ہو۔" میں نے اسے جھانپڑ مارا "درندہ اپنی درندگی سے باز کیسے رہ سکتا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ ہکلایا۔ "تت۔۔۔ تم اسقف۔۔۔ کو دیکھو گے تو خود یقین کر لو گے۔" وہ خود کو قریباً گھسیٹتا ہوا باتھ روم کے دروازے کی طرف گیا۔ بیڈ کے ساتھ ہی سائڈ ٹیبل موجود تھی۔ اس نے ٹیبل کی نیچے والی دراز کھولی اور اس میں سے ایک فوٹو البم نکال لیا۔ البم کے شروع میں ہی ایک گروپ فوٹو موجود تھا۔ وہ ایک چہرے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہ ہے اسقف۔۔۔ اسے عام طور پر ماسٹر اسقی کہا جاتا ہے۔ یہ اس کی تازہ تصویر ہے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ موٹی ناک والا ایک سفید فام لڑکا جس کی عمر بمشکل دس گیارہ سال رہی ہوگی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ بڑی شان سے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں اور کم عمری میں ہی چہرے سے خشونت اور کرختگی کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ بڑا قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا، گلے میں سونے کی جڑاؤ زنجیر تھی۔ اس کے دوست بھی حلیے اور عادات کے لحاظ سے اس سے ملتے جلتے تھے۔

"اس بچے نے مارا ہے کملا کو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں یہی کنگ کا صاحب زادہ ہے۔ باقی لڑکوں میں سے دو اس کے کزن اور دو دوست ہیں۔"

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی دونوں لائٹس آف کر دیں۔ اب اگر بستر پر موجود لڑکی جاگ بھی جاتی تو وہ کمرے میں روشنی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے دوبارہ مرقص کی لمبی گردن دبوچی اور اسے پھر سے باتھ روم کے اندر لے گیا۔ میں نے اسے ٹب کے سامنے بٹھا دیا اور خطرناک لہجے میں کہا "دیکھو مرقص! مجھے کنگ اور اس لڑکے کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتاؤ ورنہ چند منٹ کے اندر اس ٹب میں تمہاری لاش تیرتی نظر آئے گی۔"

میرے لب و لہجے نے خاطر خواہ اثر کیا۔ مرقص ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "یہ کنگ کا بڑا بیٹا ہے اور کنگ کا جانشین بھی۔ کنگ اس کی تربیت اپنے جانشین کے طور پر ہی کر رہا ہے۔ وہ اسے بے حد دلیر، بے رحم اور پتھر دل دیکھنا چاہتا ہے۔ اس چھوٹی سی عمر میں ہی ماسٹر اسقی ہر قسم کے اسلحے کے استعمال سے واقف ہے۔ وہ صرف تفریح کے طور پر کسی راہ جاتے بردے کو گولی مار کر ہلاک کر سکتا ہے۔ ابھی صرف تین چار دن پہلے اس نے ایک نئی آٹومیٹک رائفل ٹیسٹ کرنے کے لیے ایک نائیجیرین بردے کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ کنگ کی ہر توقع پر پورا اتر رہا ہے بلکہ کئی کام ان کی توقع سے بھی بڑھ کر کرتا ہے۔"

البم ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس بچے کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مرقص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سچ ہے۔ اس بچے کی آنکھوں میں واقعی ایک ایسی خباثت بھری چمک موجود تھی جو اسے دوسروں سے جدا کرتی تھی۔ اس کے اردگرد موجود بچوں کے چہرے بھی معصومیت سے یکسر محروم تھے اور وہ شکل و صورت سے ہی بدمعاش زادے دکھائی دیتے تھے مگر اسقی کا رنگ ڈھنگ سب سے جدا نظر آتا تھا۔ مرقص نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "ماسٹر اسقی اور دیگر لڑکوں کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی وجہ کے سبب ہی کسی کو قتل کریں۔ وہ عام طور پر صرف تفریح کے لیے ایسا کرتے ہیں اور انہیں اس تفریح کی عادت ڈالنے والے ان کے بڑے ہی ہیں۔ یہاں ایک بہت بڑا ہال ہے۔ اس ہال کے اندر راہداریوں کی مدد سے بھول بھلیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ چھ فٹ اونچی دیواریں ہیں جن کا سلسلہ پورے ہال میں پھیلا ہوا ہے۔ نہتے شکار کو ان بھول بھلیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ماسٹر اسقی اور اس کے ساتھی شکار کا پیچھا کرتے ہیں۔ عام طور پر شکار کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جاتے ہیں تاکہ طاقتور ہونے کی صورت میں وہ بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ بس اس شکار کو اذیتیں دے کر مار دیا جاتا ہے۔ اذیت دینے کے بے شمار طریقے ہیں۔ کبھی یہ بچے اسے "کی بوکو" سے پیٹتے ہیں، کبھی چھوٹے چھوٹے خنجروں سے چرکے لگاتے ہیں، جب وہ نڈھال ہو کر گر جاتا ہے تو اس کا گلا کاٹ دیا جاتا ہے، یا فائرنگ سے ہلاک کر دیا جاتا ہے۔۔۔ بعد میں اکثر اس کی لاش ضیامیوں کو دے دی جاتی ہے۔"

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

"یہ غیامی کون ہیں؟" میں نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

وہ ذرا سا ہچکچایا۔ مگر پانی سے بھرا ہوا ٹب اس کے سامنے تھا۔ تھوک نگل کر بولا "باس مائیکل اور اس کے قبیلے کے لوگ غیامی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔"

"آدم خوری بھی کرتے ہیں۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کردیا۔ مرقص اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"کملا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

"اس کے بچے کو۔۔۔ چیخ کر مار دیا تھا بچوں نے۔ بعد میں اسے بھول بھلیوں کے اندر لے گئے۔ دو تین گھنٹے بعد وہ بھی زخمی ہو کر مرگئی تھی۔"

میرے کانوں میں جیسے سیسا انڈیلا جارہا تھا۔ جو کچھ مرقص بتا رہا تھا اگر سچ تھا تو بڑا ہی خوفناک سچ تھا۔ کملا کی صورت پھر میری نگاہوں میں گھوم گئی۔ میرے لیے یہ تصور سوہانِ روح تھا کہ وہ مجھ سے ملنے کی آس لے کر لاک اپ سے نکلی تھی۔ پتا نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا کیا باتیں تھیں۔ وہ مجھ سے کیا کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر اسے بے رحم آفت زادوں کے حوالے کردیا گیا تھا اور اس کی آخری چیخیں شوخ و شنگ قہقہوں میں ڈوب گئی تھیں۔ میری نگاہ ایک بار پھر یہاں کے سفاک ولی عہد کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔ وہ اپنے ہم جولیوں کے درمیان بڑی شان سے اکڑ کر کھڑا تھا۔ وہ کملا اور اس کے بچے کا قاتل تھا لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ ایک بچہ تھا۔ میں چاہتا بھی تو اس سے اتنی نفرت نہیں کرسکتا تھا جتنی ایک درندہ صفت قاتل سے کرنی چاہیے تھی۔ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کے اصل ذمے دار اس کے بڑے تھے۔ اس کا شیطان باپ تھا اور وہ ماحول تھا جس میں اسے پروان چڑھایا جارہا تھا۔

"ماں بیٹے کی لاشوں کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں باس مائیکل ہی جانتا ہے۔ غالباً۔۔۔" مرقص پھر کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

میں مرقص کے ادھورے فقرے کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ یقیناً وہ لاشیں مائیکل اور اس کے ساتھیوں کے کام آئی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ اس رات کیمپس کے کسی ائر کنڈیشنڈ کمرے میں پانچ چھ غیامیوں نے ایک دل پسند کھانا کھایا ہو۔ سوزی نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ اس رات باس مائیکل نے اس کے ساتھ وقت نہیں گزارا تھا اور کیمپس چلا گیا تھا۔ اس قسم کے نجانے کتنے "وزٹ" وہ پہلے بھی کرچکا تھا اور کرتا رہتا تھا۔ ان درو دیوار کے اسرار جتنے کھل رہے تھے اتنے ہی گمبھیر ہو رہے تھے۔

اب مجھے ایک سنہری موقع ملا تھا کہ میں ہیڈ انچارج مرقص سے کچھ پوچھ لوں۔ کم از کم جتنا اسے معلوم تھا وہاں تک پہنچ ہی سکتا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ میں گفتگو کا رخ "ماریا ٹرسٹ" کی طرف موڑتا ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ یہ باریک سی نسوانی آواز اس نوخیز لڑکی کی تھی جو بیڈ روم میں سو رہی تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں دو تین بار یقیناً مرقص ہی کو پکارا تھا، پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک نلکا کھول دیا تھا اور پانی پُر شور آواز سے پلاسٹک کی ایک بالٹی میں گرنے لگا تھا۔ یہ آواز لڑکی کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ مرقص باتھ روم میں ہے۔ میں تین چار منٹ خاموشی سے انتظار کرتا رہا، دوبارہ کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکی دوبارہ سو گئی ہے۔ بہرحال اس کی نیند کچی ہو چکی تھی اور وہ کسی بھی وقت دوبارہ بیدار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے کمرے کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ یوں تو میں دروازہ اچھی طرح بند کر آیا تھا مگر پہرے دار کسی وقت بیدار ہو کر دروازہ چیک کرسکتا تھا۔ میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اب زیادہ دیر مجھے یہاں رکنا نہیں چاہیے۔

میں نے پتلون کی جیب میں سے ایک بار پھر اسکرو ڈرائیور نکال لیا۔ یہ اسکرو ڈرائیور مرقص کی گردن کو خاصی اذیت پہنچا چکا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں اسکرو ڈرائیور دیکھ کر یرقان زدہ ہوگئیں۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں والے مرقص کو باتھ روم کے فرش پر پچھاڑ کر گھٹنا اس کے سینے پر رکھ دیا "مجھے افسوس ہے مرقص! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔"

خوف سے مرقص کی آنکھیں پھیل گئیں "خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا "میں نے کملا کو قتل نہیں کیا۔ تم جس طرح چاہو، میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں۔"

"تم نے قتل نہ بھی کیا ہو، مگر تمہیں زندہ چھوڑنا میرے لیے جان لیوا ہے۔"

وہ بلک اٹھا "میں اپنی زبان بند کرلوں گا۔ اپنے ہونٹوں پر تالا لگا لوں گا۔ میں سمجھوں گا۔ میں نے آج کچھ نہیں دیکھا، کچھ نہیں سنا۔ میں کرائسٹ کی قسم کھاتا ہوں۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

جاں بخشی کی ہزار ہا اپیلیں ہیڈ انچارج کے چہرے پر درج تھیں اور اس کی حسن پرست آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔ ایک بات تو میں نے بھی محسوس کی تھی اور

کہ مرقص اتنا باہمت اور مضبوط نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا اور جتنا اسے اپنے عہدے کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ آج رات وہ ایک کمزور دل اور ناتواں شخص ثابت ہوا تھا' ایسے لوگ اکثر مہم جوئی سے گریز کرتے ہیں اور اگر ان کے ساتھ کوئی واردات ہوجائے اور خاموش رہنے میں عزت رہ جاتی ہو اور تحفظ بھی نظر آتا ہو تو وہ خاموش رہنے کو ترجیح دیتے ہیں' اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ مرقص اپنے ہمکار مائیکل کے سخت خلاف تھا۔ مرقص کی جان بخشی کرکے اسے بعد میں مائیکل کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی مگر دوسری طرف خطرات بھی تھے۔ مرقص اب تو عہد پر عہد کررہا تھا مگر محفوظ ہونے کے بعد وہ ہر عہد کو ملیامیٹ بھی کرسکتا تھا۔ میں چند لمحے تذبذب میں رہا۔ ایک بار تو دل میں آئی کہ اسے چھوڑ دوں' مگر پھر ذہن نے آخری فیصلہ مرقص کے خلاف ہی دیا۔ میں نے اس کے ہونٹ اپنی ہتھیلی کے ساتھ مضبوطی سے بند کیے۔ "مجھے افسوس ہے مرقص! تمہیں جانا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

میرا دایاں ہاتھ بلند ہوا اور آٹھ انچ لمبا اسکریو ڈرائیور دستے تک مرقص کے سینے میں گھس گیا۔ اس کے سیاہ جسم کو شدید جھٹکا لگا اور آنکھیں دہشت آمیز اذیت سے پھٹ گئیں۔ میں نے دوسرا وار چند انچ نیچے کیا۔ دل کے مقام سے خون کا فوارہ چھوٹا اور اس کی بنیان کو بھگونے کے بعد باتھ روم کے فرش کو رنگین کرنے لگا۔ ڈیڑھ دو منٹ میں مرقص ٹھنڈا ہوگیا۔ میں باتھ روم کی کنڈی ہٹا کر بہ آہستگی باہر نکلا۔ نوخیز حسینہ ایک بار پھر گہری نیند میں نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر نہایت مختصر لباس تھا اور مدہوشی کی نیند میں وہ بھی بے ترتیب نظر آرہا تھا۔ اس کے ریشمی بال پورے تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ باتھ روم کے ادھ کھلے دروازے سے آنے والی روشنی میں انیس کا بے ہوش جسم بھی فرش پر پڑا نظر آرہا تھا۔ مرقص کی موت کے بعد اب انیس کا "چل چلاؤ" بھی ضروری ہوگیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا اور اس کی گواہی میرے لیے موت کا پھندا تھی۔ میں اسے قالین پر احتیاط سے گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے آیا۔ قریباً دو منٹ بعد انیس بھی عزت مآب ہیڈ انچارج مرقص کے پاس پہنچ چکا تھا۔

لڑکی معصوم صورت تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ سوئی رہے۔ اس کی نیند ہی اس کی زندگی کی ضمانت تھی۔ وہ جاگ جاتی تو مجھے اس کے نازک جسم میں بھی ایک دو بار اسکریو ڈرائیور اتارنا پڑتا۔ انیس کے خاتمے کے بعد میں احتیاط کے ساتھ مختلف جگہوں اور چیزوں سے اپنی [illegible] کے نشانات صاف کیے۔ یہاں تک کہ جو ٹیوب لا [illegible] نے اتاری تھیں' انہیں بھی اچھی طرح صاف کر [illegible] رومال سے پکڑ کر لگایا۔ ہر طرح اطمینان کرنے کے [illegible] احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ مکان کی [illegible] پھلانگ کر میں احاطے میں پہنچا۔ نجانے کیوں میرا دل [illegible] دے رہا تھا کہ ٹرسٹ کی عمارت میں سے نکلنے کی [illegible] میرے لیے سخت خطرناک ثابت ہوگی۔ میری چھٹی [illegible] اطلاع تھی کہ کچھ نادیدہ آنکھیں یہاں ہروقت نگران [illegible] فرار کی کوشش ناکام بنانے کے لیے تیار ہیں۔ میں [illegible] کہ جس طرح ہرکولیس جہاز پر ٹی وی کیمرے نصب [illegible] یہاں بھی نازک مقامات پر اس قسم کا انتظام موجود ہو [illegible] میں مختلف چیزوں کی آڑ لیتا واپس اپنے کمرے تک [illegible] گیا۔ اب میری بچت کا دارومدار اسی پر تھا کہ پہرے دار [illegible] علم میں آئے بغیر میں واپس اپنے کمرے میں پہنچ جاؤں اور [illegible] صرف کمرے میں پہنچ جاؤں بلکہ کنڈی کو بھی دوبارہ اس [illegible] مقام پر فکس کرسکوں۔ جس طرح کوئی اچھا دن [illegible] ایک اچھی رات تھی' میں نہ صرف سلامتی [illegible] کمرے میں گھس گیا بلکہ کنڈی کو دوبارہ فکس کر [illegible] بھی مجھے مل گیا۔ پہرے دار مسلسل خوابیدہ تھا۔ بس [illegible] اس کا جسم جھٹکا کھاتا تھا اور وہ دیوار سے پشت ہٹا کر [illegible] بیٹھ جاتا تھا' لیکن یہ صورتِ حال دو چار منٹ ہی رہتی [illegible] اس کے بعد وہ پھر سے باسی مولی کی طرح لٹک کر دیوار [illegible] ٹیک لگا لیتا تھا اور گردن جھکا کر ٹھوڑی سینے پر ٹکا دیتا تھا۔ [illegible] نے سب سے پہلے کمرے کے باتھ روم میں جاکر ایک [illegible] اسکریو ڈرائیور اور اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے' اپنے لباس [illegible] لے کر میں واپس دروازے کے پاس آ بیٹھا اور [illegible] سے کسنے کی کوشش کرنے لگا۔ مزے کی بات یہ [illegible] غیر موجودگی میں صفدر اور زریں بھی گہری نیند [illegible] تھے اور انہیں مطلق معلوم نہیں تھا کہ میں کیا چاند چڑھا [illegible] آیا ہوں۔ دروازے کی سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر [illegible] کنڈی کو اس طرح کسنا کہ آواز بھی پیدا نہ ہو' بڑا جان [illegible] کام تھا۔ دانتوں پسینہ لے آنے والے اس کام میں مجھے [illegible] بیس تیس منٹ لگے۔ اس دوران میں پہرے دار کے [illegible] ہونے کی وجہ سے دو تین بار مجھے کام روکنا بھی پڑا۔ پھر [illegible] مرتبہ زریں گل بیدار ہوگیا اور باتھ روم میں جاکر دس [illegible] منٹ بیٹھا رہا۔ میں نے زریں پر بھی ظاہر نہیں ہونے [illegible]

[illegible] رہا ہوں اور پیچیدہ تکنیکی کررہا ہوں۔ اس وقت [illegible] دار ہو رہا تھا جب میں دروازے کی کنڈی کو دوبارہ [illegible] بٹھانے اور لگانے میں کامیاب ہوگیا۔ میری [illegible] اکڑ کر رہ گئی تھیں اور انگلیاں جیسے پھوڑا بن [illegible] جس زاویے سے ہاتھوں کو حرکت دے کر میں [illegible] لگائی تھی وہ میرے اپنے لیے بھی حیران کن تھا۔ [illegible] قتل کو چھپانے کا تھا' اس کے لیے میں نے پہلے [illegible] رکھا تھا۔ میں نے اسکریو ڈرائیور کو دروازے.... کی [illegible] میں پھنسا کر تھوڑا سا خم دیا' پھر باتھ روم میں جاکر [illegible] اسکریو ڈرائیور کو فلش میں یوں گھمایا کہ وہ سارا [illegible] چلا گیا۔ اب فرش اکھاڑے بغیر اس کا کھوج نہیں [illegible] تھا۔

[illegible] یوں تو سب کچھ معمول کے مطابق تھا تاہم پہرے [illegible] طور پر پریشان نظر آرہے تھے۔ دس بجے کے قریب [illegible] فارغ ہوچکے تھے' ایک پہرے دار ہی کی [illegible] اطلاع ملی۔ یہاں پاس ہی دو قتل ہوگئے ہیں' اور [illegible] ایک وہی انیس نامی پہرے دار تھا جو چند روز پہلے [illegible] پر موجود تھا۔ دوسرے مقتول کا نام پہرے دار [illegible] بتایا۔ شاید وہ ہم سے چھپا رہا تھا یا پھر اس سے بھی [illegible] تھا۔ بہرحال دوپہر تک دوسرے مقتول کا نام بھی [illegible] میں گردش کرنے لگا۔ اور یقیناً یہ ایک بڑی خبر [illegible] ویلفیئر ٹرسٹ کے ہوسٹل کا ہیڈ انچارج اپنے گارڈ [illegible] گاہ میں مردہ پایا گیا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی [illegible] پولیس کی آمد و رفت بھی نظر آئی اور یہ بھی [illegible] کنگ براؤن بھی بنفسِ نفیس ہوسٹل میں موجود [illegible] بہرحال ہم اس کے "دیدار" سے محروم رہے۔ میں [illegible] زریں سے کچھ بھی چھپانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا [illegible] خیال میں ابھی انہیں بے خبر رکھنا ہی مناسب [illegible] اگر کوئی تفتیشی چکر چلتا بھی تو اپنی کارروائی کا راز [illegible] ہی ہوتا۔

[illegible] سارا دن کمرے میں ہی گزرا۔ باہر کے حالات کا [illegible] زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ رات بھی بغیر کسی اہم واقعے [illegible] گئی۔ ہیڈ انچارج کے قتل کی تفتیش تو یقیناً ہو رہی تھی [illegible] آس پاس اس "تفتیش" کا گزر نہیں تھا۔ اور یہ [illegible] حال میرے لیے تسلی بخش تھی۔ پہرے داروں کی [illegible] سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تفتیش کا رخ [illegible] سے کسی اور طرف مڑ گیا ہے۔ بعد ازاں یہ [illegible] بھی ثابت ہوا (کچھ دنوں بعد ہمیں پتا چلا تھا کہ مرقص کی ایک لڑکی کے ہی سلسلے میں کسی مقامی سے پرانی رقابت تھی۔ اس قتل کو فوری طور پر اس رقابت کا شاخسانہ قرار دے دیا گیا تھا) قریباً ۴۸ گھنٹے تک میرے ذہن میں خدشات رہے مگر پھر میں پُرسکون ہوگیا۔ کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ایک مقفل کمرے کے اندر سے نکل کر اور پہرے دار کو غچا دے کر ہم میں سے کوئی ایسی کارروائی کرسکتا ہے۔ تیسرے روز رات کو میں نے صفدر اور زریں گل کو سب کچھ بتا دیا' وہ حیرت سے گنگ سنتے رہے۔ صفدر کو زیادہ حیرت ہوئی کیونکہ وہ زریں سے زیادہ چوکس اور باخبر شخص تھا۔ وہ حیران تھا کہ میں کمرے سے باہر گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹا باہر رہا اور پھر واپس بھی آیا۔ اس کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میں نے کملا اور اس کے بچے کی موت کی اطلاع دی تو ان دونوں کے چہرے بھی رنج و غم کی تصویر بن گئے۔ یہ بات شروع میں انہیں بھی ناقابلِ یقین محسوس ہوئی کہ کملا اور اس کے بچے کا قاتل دس گیارہ سالہ ایک بچہ ہے۔ کملا کی موت کا سن کر زریں کی آنکھوں میں تو باقاعدہ آنسو چمکنے لگے۔ کملا کی زندگی کے بارے میں اب تک وہی سب سے زیادہ پُرامید تھا۔ وہ کئی بار کہہ چکا تھا "امارا دل گواہی دیتا ہے کہ ام اس لڑکی کو پھر سے ہنستا مسکراتا دیکھے گا۔" اس کے دل کی یہ گواہی غلط ثابت ہوئی تھی۔

اس رات ہم تینوں جاگتے رہے اور واقعات کی اس نئی کروٹ کے بارے میں سوچتے رہے۔ ہم صاف دیکھ رہے تھے کہ ہم ایک بدترین مقام پر ہیں اور ہمارا واسطہ بدترین لوگوں سے ہے۔ آدم خور مائیکل کا کردار ہی کچھ کم بھیانک نہیں تھا' اب یہ کنگ براؤن اور اس کا نوعمر ولی عہد سامنے آگئے تھے۔ انہوں نے زیرِ زمین جرم کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی اور دہشت گردی اور سفاکی کے ریکارڈ قائم کر رہے تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اس "ماریا ٹرسٹ" کے دو روپ ہیں۔ دو چہروں والی ایک بھیانک تصویر' جس کا اُجلا چہرہ عام لوگوں کے لیے ہے اور تاریک و گھناؤنا چہرہ خاص الخاص لوگوں کے لیے۔ ابھی ہم نے اس تاریک چہرے کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھی تھی۔ معلوم نہیں کہ پس منظر میں کیا کچھ تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے پھر کمرے سے نکالا گیا۔ پہرے داروں نے بتایا کہ مجھے پھر کیمپس میں لے جایا جا رہا ہے۔ ایک بار پھر ہم اسی راستے سے نکل کر انہی مراحل سے گزرے۔ رنگین شیشوں والی اسٹیشن ویگن' آنکھوں پر پٹی اور کانوں میں ڈاٹ۔ پندرہ بیس منٹ کے تیز رفتار اور "چکر دار" سفر کے بعد ہم کسی عمارت کے مین گیٹ میں داخل

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ہوئے اور پھر ایک طویل راہداری سے گزر کر، جہاں قدموں کی آواز دور تک گونجتی تھی، اسی ہال میں پہنچ گئے جہاں چار نہایت جدید لفٹس نصب تھیں۔ یہاں میری بصارت اور سماعت کو آزاد کردیا گیا۔ پہلے کی طرح رجسٹر میں ہمارا اندراج ہوا۔ پھر ہمیں ٹوکن فراہم کیا گیا اور تلاشی وغیرہ کے مراحل سے گزر کر ہم لفٹ میں داخل ہوگئے۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ خود کو اسی لاک اپ کے سامنے پایا جہاں دو روز پہلے اترپردیشی قیدیوں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی، آج میرے اندر ان لوگوں کا سامنا کرنے کی طاقت نہیں تھی اور کملا کی ماں کا سامنا کرنے کی طاقت تو بالکل نہیں تھی۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ اس کی بیٹی اور شیر خوار نواسہ میرے پاس ہیں۔ میں پرسوں اسے تسلی دے کر گیا تھا کہ اس کی لاڈلی بیٹی بہت جلد اس کے پاس ہوگی۔ یقیناً وہ شدت سے کملا کی واپسی کا انتظار کررہی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس دُکھیاری کو بیٹی اور نواسے کی دردناک موت کی خبر سناؤں۔ میں نے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کی اور لاک اپ میں داخل ہوگیا۔ تمام لوگ دیوانہ وار میرے گرد جمع ہوگئے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں دیے سے جل اٹھتے تھے۔ وہ مجھ سے اپنا دکھ سکھ بیان کرنے لگے، ان میں لڑکیاں بھی تھیں، عورتیں بھی، مرد اور بچے بھی۔ وہ سب اتنی عقیدت اور ستائش سے مجھے دیکھتے تھے کہ شرمندگی ہونے لگتی تھی۔ کملا کی ماں نے پوچھا کہ کملا نہیں آئی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔

ایک دم اس کی آنکھوں میں سیکڑوں اندیشے جاگ اٹھے "ہائے رام۔ کا کہوت ہو۔"

میں نے ججھکتے ہوئے کہا "سیڑھیوں سے گر گئی تھی، سر اور سینے پر چوٹ آئی ہے، اسپتال میں ہے۔ اب پہلے سے کچھ ٹھیک لگتی ہے۔"

وہ ایک دم رونے لگی۔ اس کی آواز نوحے سے مشابہ تھی۔ "ہر کوئے مصیبت ہم غریبن کے واسطے۔ رام ہم جیسو کا ہے کو جگ میں آوت۔ ہائے میری کملا۔" پھر وہ اپنے نواسے کے بارے میں پوچھنے لگی۔

میں نے بتایا کہ حادثے کے وقت وہ بھی کملا کی گود میں تھا۔ اسے بھی چوٹیں آئی ہیں، لیکن زیادہ چوٹ کملا کو لگی ہے۔ میں اس عورت کو ذہنی طور پر اس صدمے کے لیے تیار کررہا تھا جو اسے پہنچنے والا تھا۔ وہ واویلا کرنے لگی۔ میرے پاؤں میں سر رکھنے لگی کہ میں اسے اس کی بیٹی کے پاس لے جاؤں۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں۔ اسے تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ وہ کسی صورت نہیں ہورہی تھی۔ اس کا رونا دھونا دوسرے افراد کو بھی [illegible] کررہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے دیکھ کر جو چہرے کھل [illegible] تھے وہ پژمردہ نظر آنے لگے تھے۔ میں نے سیوک کمار کو [illegible] طرف لے جاکر بتایا کہ فی الحال اس کی بیٹی کی حالت ایسی [illegible] کہ وہ اس سے مل سکے۔ اسے ذرا اپنی زبان میں [illegible] سیوک کمار میری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتے [illegible] بولا "ہمار بیٹی کو کوئے خطرہ تو ناہیں؟"

میں نے کہا "بس تم پرارتھنا کرو۔ بھگوان اچھا [illegible] گا۔"

میں اس کو کیسے بتاتا کہ وہ خطرے اور سلامتی [illegible] مرحلوں سے گزر چکی ہے۔ اسے مار دیا گیا ہے اور [illegible] قصور صرف یہ تھا کہ وہ زندہ تھی۔ وہ کچھ ایسے لوگوں [illegible] میں چلی گئی تھی جو صرف تفریح کی خاطر زندگی کو گرانا [illegible] موت میں تبدیل کردیتے ہیں۔ اس بے اماں چار دیواری [illegible] اندر وہ اس گروپ میں سے پہلی ستم گزیدہ تھی، ابھی [illegible] کس کس کو کیسے کیسے انداز میں تختۂ مشق بننا تھا۔ [illegible] رہے تھے کہ یہ ایک طویل رات کا آغاز [illegible] ایک کرب کی پہلی ٹیس اور ایک لامحدود [illegible] ہے۔

سیوک کمار نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے [illegible] آنکھوں کے ساتھ سرگوشی میں بولا کہ میں ان پر رحم [illegible] کسی طرح سے ان سب کو یہاں سے نکال کرلے جاؤں [illegible]

میں نے کہا "سیوک! یہ سب اتنی جلدی نہیں [illegible] اس کے لیے دھیرج اور حوصلے کی ضرورت ہے۔"

جواب میں اس نے عجیب اعتقاد کے ساتھ [illegible] انداز میں کہا "پربھو! تم سب کچھ کرسکت ہو۔ تمہارے نجدیک کوئے بھی مُشکل ناہیں۔"

یعنی اے ہمارے مالک! تم سب کچھ کرسکتے [illegible] تمہارے لیے کوئی مشکل بھی مشکل نہیں۔

میں نے کہا "سیوک! بے وقوفی کی باتیں [illegible] مالک تو بس اوپر والا ہے۔ میں کیا اور میری حقیقت کیا [illegible] اگر یہاں تھوڑی بہت میری حقیقت ہے بھی تو مجھ [illegible] بڑی حقیقت والے بھی یہاں موجود ہیں۔ لہٰذا مجھ [illegible] زیادہ آشائیں مت باندھو، ہاں جو کچھ مجھ سے ہوسکا وہ کروں گا۔"

کچھ دیر بعد پہرے دار مجھے لے کر لاک اپ سے [illegible] نکل آئے۔ میرا خیال تھا کہ اب ہم واپس لفٹوں کی [illegible] [illegible] گے لیکن پہرے داروں نے مجھے دوسرے رخ پر چلنے کو [illegible]

"اب کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

ایک پہرے دار گمبھیر آواز میں بولا "کنگ تمہیں شرفِ [illegible] بخش رہے ہیں۔"

میرے بدن میں پھریری سی دوڑ گئی۔ ایک عرصے سے [illegible] کنگ کے بارے میں سن رہا تھا آج اس سے ملاقات بھی [illegible] تھی۔ وہ اپنے سپوت کی جس "اعلیٰ انداز" میں تربیت [illegible] تھا اور اس تربیت کے نتیجے میں سپوت جیسے جیسے [illegible] انجام دے رہا تھا..... اس کے بارے میں جان کر [illegible] کی "قدر و منزلت" میری نگاہ میں اور بڑھ گئی تھی۔ [illegible] طویل راہداری میں قدم اٹھاتے ہوئے میں کنگ کے [illegible] میں سوچ رہا تھا اور دھڑکنیں زیر و زبر ہورہی تھیں۔ [illegible] کوریڈور سے ہم ایک برانچ کوریڈور میں مڑ گئے۔ [illegible] راہداریوں کے اس زیرِ زمین سلسلے کو دیکھ کر نجانے کیوں مجھے [illegible] احساس ہورہا تھا جیسے یہ ساری "تعمیر" کسی کان وغیرہ کا [illegible] ہو۔ بعض اوقات کچھ کانوں میں کام ختم کردیا جاتا ہے [illegible] زیرِ زمین سرنگوں کا وہ جال موجود رہتا ہے جو کان کنی کے [illegible] میں وجود میں آتا ہے۔ شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی سلسلہ تھا۔ [illegible] میں نیلی وردیوں والے مرد و زن ملے۔ ان میں سے [illegible] کے چہروں پر خشونت اور بے رحمی درج تھی۔ مردوں [illegible] ساتھ اکثر باوردی خواتین نے بھی کمر سے ریوالور [illegible] رکھے تھے۔ بردوں کے سہمے سہمے گروہ بھی مجھے یہاں [illegible] آئے پھر ایک دروازے میں لگے ہوئے شیشے میں [illegible] نے ایک کلاس روم دیکھا۔ یہاں سات آٹھ سال [illegible] و طالبات موجود تھے۔ ان میں مجھے کئی نسلوں اور [illegible] کے بچے نظر آئے۔ لڑکوں کے سر مونڈ دیے گئے تھے۔ [illegible] کے چہروں سے ہی مظلومیت اور محکومیت ٹپکتی [illegible] ان ہی راہداریوں میں سے گزرتے ہوئے مجھے کہیں [illegible] تیز چیخیں بھی سنائی دیں۔ یہ چیخیں کسی عورت یا بچے [illegible] تھیں۔ ان چیخوں کے ہمراہ کی بوکو کی شائیں شائیں بھی [illegible] سنی جاسکتی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کی بوکو یعنی مخصوص [illegible] کا استعمال یہاں بلا تردد اور بلا دریغ کیا جاتا ہے۔ یہاں [illegible] وردی مرد و زن کو میں نے دیکھا جو کی بوکو لیے آزادانہ [illegible] تھے، جیسے یہ ایذا رسانی کا آلہ نہ ہو واکنگ اسٹک یا [illegible] وغیرہ ہو۔ میں اس کیمپس کی وسعت اور جدت دیکھ [illegible] حیران ہورہا تھا۔ ماریا ٹرسٹ کی عمارت اس عمارت [illegible] مقابلے میں ایک استقبالیہ کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ جلد [illegible] ایک شان دار آفس نما کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں مکمل خاموشی تھی۔ فرش پر دبیز قالین، دیواروں پر غالیچے۔ دو دیواروں کے ساتھ ساتھ آرام دہ نشستیں اور ایک بہت بڑی شان دار میز جس کے پیچھے ایک قیمتی کرسی موجود تھی۔ میز کے عقب میں دیوار پر کسی بہت پرانے بوسیدہ انگریز کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ اس تصویر کے طلائی فریم میں نگینے دمک رہے تھے۔ مجھے اس مرعوب کن فضا میں پہنچا کر آفس کا خصوصی گارڈ دروازے سے باہر کھڑا ہوگیا۔ ایسا ہی ایک گارڈ آفس کے اندر موجود سیڑھیوں پر چوکس کھڑا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کنگ براؤن کو انہی سیڑھیوں سے اتر کر تشریف فرما ہونا تھا۔ میں ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ گیا اور دھڑکتے دل سے کنگ کا انتظار کرنے لگا۔ سیڑھیوں پر موجود پہرے دار بھی ساکت و جامد تھا۔ پہلی نظر میں یہ شک گزرتا تھا کہ شاید وہ پتھر کا مجسمہ ہے۔ اس کی کمر سے چاندی کے دستے والا ایک نہایت قیمتی پسٹل جھول رہا تھا۔ سر پر ٹوپی تھی جس پر سامنے کی طرف M.T کے الفاظ موجود تھے۔

میں قریباً آدھ گھنٹے تک اکڑوں نشست پر بیٹھا رہا پھر باہر والا گارڈ اندر آیا اور اس نے شستہ انگریزی میں مجھے بتایا کہ کنگ کچھ لیٹ ہیں، میں آرام سے تشریف رکھوں۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ مسلسل انتظار کرتے ہوئے آرام سے تشریف کیسے رکھی جاسکتی ہے، بہرحال میں بیٹھا رہا۔ اچانک میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ کوئی شے اڑتی ہوئی آئی اور پٹاخ سے میرے چہرے پر لگی۔ یہ ایک انڈا تھا جو عین میری پیشانی پر ٹوٹا تھا اور زردی و سفیدی میرے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ میں بوکھلا کر اٹھا اور جیب سے رومال نکالا۔ اسی دوران میں ایک اور انڈا میرے کان پر لگا اور گردن تک بہہ گیا۔ چاروں طرف دیکھا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ سیڑھیوں پر کھڑا گارڈ اپنی جگہ سے حرکت میں آیا۔ اس نے الماری میں سے ایک تولیا نکال کر ادب سے میری طرف بڑھا دیا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کون ہے یہ؟"

گارڈ نے جواب نہیں دیا۔ بس اس کا نچلا ہونٹ مُسکانے والے انداز میں تھوڑا سا کھنچ گیا۔ میں نے گردن اور چہرہ صاف کیا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی تھی۔ اب تک جو معلومات مجھ تک پہنچی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ کنگ کا بگڑا تگڑا بیٹا ماسٹر اسمتھ ایک مجسم آفت ہے۔ ابھی جو شرارت میرے ساتھ ہوئی تھی وہ اسی آفت زادے یا اس کے کسی سنگی ساتھی کا کام ہوسکتی تھی "یہ کون حرام زادہ ہے؟" میں نے بلند آواز میں کہا۔

سیڑھیوں پر کھڑے سفید فام گارڈ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ وہ

میرے قریب آیا اور دھیمے لیکن کرخت لہجے میں بولا "ادب ملحوظِ خاطر رہے۔ یہ ماسٹر استی کے دوست ہیں۔"

ابھی اس کا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ سیڑھیوں کے آخری سرے پر واقع ایک کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھلا' اس میں ایک ہاتھ کی حرکت دکھائی دی اور ایک اور انڈا تیرتا ہوا ہماری طرف آیا۔ اس مرتبہ شاید پھینکنے والے کا نشانہ تھوڑا سا چوک گیا' انڈا گارڈ کی کنپٹی پر لگا اور اس کا مواد گارڈ کے چہرے پر پھیل گیا۔ گارڈ جوں کا توں کھڑا رہا۔ یہ انڈا سخت بدبو دار تھا۔ پورے کمرے میں کراہت آمیز بو پھیل گئی۔ کھڑکی کے عقب سے ایک دبی دبی ہنسی سنائی دی اور پھر خاموشی چھاگئی۔ گارڈ کے چہرے پر سلوٹ تک نہیں آئی۔ اس نے بو ختم کرنے کے لیے ائر کنڈیشنر کے شٹرز کو اوپن پر سیٹ کردیا' پھر الماری سے ائر فریشنر نکال کر تھوڑا سا اسپرے کیا۔ اس کے بعد باتھ روم میں جاکر چہرہ صاف کیا اور واپس اپنی جگہ پر انین شین کھڑا ہو گیا۔

میں رومال سے چہرہ پونچھتا ہوا واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پالیا تھا اور کسی بھی نئی شرارت کے لیے تیار تھا' مگر شرارت نہیں ہوئی' اس کے بجائے ایک مجسم شیطان مجھے نظر آگیا۔ یہ مائیکل تھا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف سے ہی نمودار ہوا۔ ہمیشہ کی طرح تھری پیس سوٹ میں ملبوس' سرخ ٹائی لگائے ہوئے وہ بڑا بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ مائیکل سے میری آخری ملاقات کئی روز پیشتر ٹرسٹ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہوئی تھی۔ میں کوٹھڑی کے اندر اور مائیکل باہر تھا۔ اس وقت مبارک امین تازہ تازہ مرحوم ہوا تھا۔ اپنے دوست کے قتل پر مائیکل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ فرطِ طیش میں اس نے کی بوکو سے میری چمڑی ادھیڑنے کی کوشش کی تھی' مگر قدرت نے میری مدد کی تھی۔ مائیکل کو کنگ کی طرف سے فوری بلاوا آگیا تھا اور وہ واپس چلا گیا تھا۔ آج پھر وہ میرے رو برو تھا۔ تاہم آج وہ خاصا پُرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی سستی آمیز اطمینان تھا جو انتہائی پھرتیلے اور خوں خوار درندوں کی آنکھوں میں پایا جاتا ہے۔

وہ میز کے عقب میں جاکر زرنگار کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بالوں بھرے ہاتھ میز کی شفاف سطح پر رکھ دیے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کرلیں۔ اس کی کلائی میں ڈائمنڈ راڈو گھڑی جگمگا رہی تھی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "شاہ جہاں! مجھے افسوس ہے کہ کنگ مصروف ہیں' وہ آج تم سے مل نہیں سکیں گے۔ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے' میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس نے میرا لہجہ بڑے اطمینان سے برداشت [illegible] بولا "تمہارے لیے کنگ کے کچھ کمپلیمنٹس ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ سمجھو کہ میں کنگ کی جانب سے مخاطب ہوں۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "بحری جہاز ہرکولیس میں اور پھر یہاں [illegible] میں تم نے جس طرح انڈین بردوں کو کنٹرول کیا ہے [illegible] تعریف کام ہے۔ اس سے تمہاری فہم و فراست اور [illegible] اندر چھپی ہوئی انتظامی صلاحیتوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ [illegible] ایسے لوگوں کی قدر کرتے ہیں' اور ان سے خصوصی [illegible] معاملہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ایسے ہی انڈین بردوں [illegible] ایک اور گروپ بھی موجود ہے۔ ان لوگوں کو کنٹرول کر[illegible] کافی دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ کنگ کو توقع ہے کہ تم اس [illegible] میں تعاون کا ہاتھ بڑھاؤ گے۔"

"میں ہر اس کام میں تعاون کرنے کو تیار ہوں جس [illegible] دکھی لوگوں کے دکھ کم ہوسکتے ہوں' اس حوالے سے میرے [illegible] ساتھیوں کی خدمات بھی حاضر ہیں۔"

مائیکل نے کہا "یہاں پہنچ کر تم سے [illegible] سرزد ہوئی ہے۔ تم نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے [illegible] کی ہے' اور ایک شخص (مبارک امین) تمہارے ہاتھ[illegible] بھی ہوا ہے۔ کنگ اس معاملے کا بغور جائزہ لے رہے [illegible] ہوسکتا ہے کہ اس جرم کے لیے تمہیں تھوڑا بہت [illegible] دے دیا جائے لیکن یہ ریلیف تمہارے اچھے رویے [illegible] مشروط ہوگا۔"

چند لمحے توقف کرکے مائیکل نے اپنے قیمتی لائٹر [illegible] سگریٹ سلگایا اور بولا "تمہاری نسبت سے ایک مسئلہ جوزف [illegible] کی گمشدگی کا بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ چنداں مشکل نہیں [illegible] ہم تم پر یا تمہارے ساتھیوں میں سے کسی ایک پر سختی [illegible] جوزف کے بارے میں درست صورتِ حال معلوم کرلیں [illegible] ہم اپنے اور تمہارے درمیان اچھی فضا برقرار رکھنا چا[illegible] ہیں۔ امید ہے کہ تم بھی ایسا ہی چاہو گے۔ لہٰذا جوزف [illegible] ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے متعلق سچ بتا کر تم اپنے [illegible] آسانیاں پیدا کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ سچ مجھے کنگ کو بتانا پڑے گا یا تمہیں؟"

وہ بولا "اس وقت میں تمہارے ساتھ کنگ ہی کی طرف سے مخاطب ہوں۔"

میں نے کہا "جوزف کے بارے میں جو کچھ میں نے روزی کو بتایا تھا وہی سو فی صد سچ ہے۔ جوزف اب اس دنیا میں نہیں۔ بوڑھے داراب کی رہائش گاہ پر دو طرفہ فائرنگ میں اسے مبارک کے کارندوں کی گولی لگی تھی۔ ہم نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔"

"اس کی لاش کہاں ہے؟"

"مبارک امین کے ایک دوست پولیس انسپکٹر تابش کی رہائش گاہ میں۔ رہائش گاہ کے پچھواڑے واقع احاطے میں اسے دفن کیا گیا تھا۔ اگر تم وہ لاش پاسکو تو وہ خود ہی گواہی دے گی کہ اس کے قاتل مبارک امین کے کارندے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ گولی ابھی تک لاش ہی میں موجود ہے جو جوزف کی ہلاکت کا سبب بنی۔ وہ گولی ان رائفلوں میں سے کسی ایک سے چلائی گئی تھی جو مبارک کے ساتھیوں کے پاس موجود تھیں۔"

مائیکل نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا' اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ میری تاویل کو بری طرح رد کرنا چاہتا ہے۔ مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ کسی طرح کی تلخی کو ہوا نہیں دے گا۔ ورنہ میرے لیے جس قسم کے "دوستانہ" جذبات اس کے دل میں تھے وہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ آدمیت کا لبادہ اتار کر ابھی آدم خور درندہ بن جاتا اور مجھے اپنے دانتوں اور پنجوں سے بھنبوڑ کر رکھ دیتا۔ بہرحال میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مبارک امین کا دکھ بھولے گا نہیں۔ موقع ملتے ہی مجھ پر کوئی کاری وار کرے گا۔ بحری سفر کے دوران میں مجھے مائیکل کی غیر معمولی عیاری اور چال بازی کا اندازہ ہوچکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔" مائیکل نے رعونت سے کہا۔

"لیکن میں بھی تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔" مائیکل نے جواباً کچھ نہیں کہا بس کڑے تیوروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "میرا ایک مسئلہ ہے اور وہ تم لوگوں کا ہی پیدا کیا ہوا ہے۔ اتر پردیشی قیدیوں میں ایک نوعمر لڑکی کملا تھی۔ وہ اپنے بچے سمیت غائب ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا کسی درندے کی درندگی کا شکار ہوگئی ہے بہرحال تمہارے لوگوں نے اتر پردیشی قیدیوں کو یہ بتایا تھا کہ اس بدنصیب کو میرے حکم پر لاک اپ سے لے جایا جارہا ہے۔ اب وہ سارے یہی سمجھتے ہیں کہ لڑکی میری حفاظت میں ہے۔ یہ میرے لیے بڑی تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ یا تو اس لڑکی کو اپنے بچے سمیت واپس آنا چاہیے یا پھر ان انڈین قیدیوں کو یہ باور کرایا جانا چاہیے کہ لڑکی اور بچہ میرے پاس نہیں تھے۔"

"تم یہ مسئلہ کنگ کے سامنے بیان کرو تو بہتر ہوگا۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا تھا' مگر معلوم نہیں وہ کب شرفِ ملاقات بخشیں گے۔"

"بہرحال میں اس بارے میں رپورٹ مانگتا ہوں اور کنگ کو بھی باخبر کروں گا۔" مائیکل نے گفتگو ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے بڑی مشکل سے برداشت کررہا ہے۔

"یہ معاملہ تاخیر کرنے والا نہیں ہے۔" میں نے وارننگ کے انداز میں کہا "قیدیوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات ابھر رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ان کی نگاہوں میں' میں اعتماد کھودوں۔"

میں اٹھا اور گارڈز کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گارڈز مجھے لے کر مین کوریڈور میں آگئے' ہمارا رخ لفٹوں کی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے واپس لے جایا جارہا ہے۔ ابھی ہم لفٹوں سے قریباً نصف فرلانگ دور تھے کہ عقب سے دو باوردی سیاہ فام تیز قدموں سے آئے اور انہوں نے میرے ساتھ چلنے والے گارڈز سے کچھ کھسر پھسر کی۔ کھسر پھسر کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ ہم آگے بڑھنے کے بجائے وہیں کھڑے ہوگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہاں لانے والے دونوں گارڈز عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان نظروں میں استہزائیہ انداز تھا اور اس کے ساتھ ساتھ "رحم" کی جھلک بھی تھی۔ وہ جیسے اچانک ہی میرے انجام کے بارے میں فکر مند ہوگئے تھے۔ "کیا بات ہے؟ ہم رک کیوں گئے ہیں؟" میں نے ایک گارڈ سے پوچھا۔

"بس تمہاری قسمت ہی ایسی ہے۔ لگتا ہے کہ آج کا دن تم کیمپس میں ہی رہو گے۔" وہ بولا۔

"مگر کیوں؟"

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے بولا "کنگ کے آفس میں کیا واقعہ ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں۔ بس تمہارے باس مائیکل سے بات چیت ہوئی۔"

"اس کے علاوہ بھی کچھ ہوا تھا؟"

"کیا مطلب؟"

"تم اپنی زبان کو لگام دے کر رکھتے تو اچھا تھا۔ تم نے ماسٹر استی صاحب کے ایک دوست کو گالی دی۔ شاید تمہیں

معلوم نہیں ہنگ کے بعد ماسٹر استقی اس کیمپس کے سب سے اہم اور قابلِ احترام فرد ہیں۔ اب ماسٹر نے تمہیں بلایا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہ ابھی معلوم نہیں لیکن تھوڑی دیر میں معلوم ہوجائے گا۔"

انگریزی داں گارڈ نے دوستانہ لہجے میں کہا "دیکھو' ماسٹر کے دوست کو گالی دینے کی غلطی تم پہلے ہی کرچکے ہو' اب مزید کوئی غلطی نہ کرنا۔ ماسٹر اگر غصہ دکھائیں یا کوئی سزا دیں تو خاموشی سے قبول کرلینا۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور سلامتی ہے۔"

اسی دوران میں وہ دونوں گارڈز واپس آگئے جنہوں نے میرے ساتھ آنے والے گارڈز سے کھسر پھسر کی تھی۔ یہ چاروں گارڈز مجھے لے کر مختلف راہداریوں سے گزرے۔ ہر کوئی اپنے حال میں مگن تھا کسی نے مجھے خصوصی توجہ کے قابل نہیں سمجھا' یہاں میں نے ایک بات نوٹ کی۔ ہر قیدی یا بردے کی کلائی میں ایک آہنی رِنگ نظر آرہا تھا۔ اس رِنگ پر بردے کا نمبر اور دیگر کوائف درج تھے۔ راہداریوں میں آتے جاتے بردوں میں زبردست نظم و ضبط دکھائی دے رہا تھا۔ وہ باوردی گارڈز کے ایک ہلکے سے اشارے پر باجماعت عمل کرتے تھے۔ بالکل جیسے وہ کسی پریڈ میں حصہ لے رہے ہوں۔

ہم ایک لمبوترے کمرے میں پہنچے۔ یہاں ایک طرف کلینک کا چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ چند کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی سی میز اور دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ اس حصے کو مشورہ گاہ کی حیثیت دی گئی تھی اور دیوار پر باقاعدہ مشورہ گاہ کا اسٹکر بھی چسپاں کیا گیا تھا۔ اچانک ایک نرس کلینک کے اندرونی حصے سے نکلی۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ عجیب اوٹ پٹانگ سی چیز تھی۔ چھوٹا سا قد تھا' سر پر شاید سرخ بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دس بارہ سالہ لڑکا ہے۔ اس نے اپنے جسم کو بڑی بے حیائی سے نسوانی روپ دے رکھا تھا۔ ہاتھوں میں ادویات کی ٹرے پکڑے اور اونچی ایڑی پر کھٹ کھٹ چلتا یہ بہروپیا پھر سے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اس کے بعد میں نے سفید کوٹوں میں دو ڈاکٹر صاحبان دیکھے۔ یہ بھی چنچل لڑکے ہی تھے۔ ان کی عمریں پندرہ سال سے کم تھیں۔ انہوں نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں سر ہلاتے اندر چلے گئے۔ ان بہروپیے لڑکوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے وہ فوٹو البم یاد آگیا جو تین روز پہلے میں نے مرقص کے روم میں دیکھا تھا۔ اس البم میں ماسٹر استقی اور اس کے خرانٹ صورت دوستوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ابھی جو "جعلی ڈاکٹر" میں نے دیکھے تھے وہ ان دوستوں میں سے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شیطان زادے ماسٹر استقی سے بھی میری ملاقات ہونے والی ہے۔ ماریا ٹرسٹ میں آنے کے بعد اس شیطان زادے سے ایک دن تو ملاقات ہونا ہی تھی' اچھا تھا کہ جلدی ہو رہی تھی۔

میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ یہاں کا ماحول دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کا ولی عہد اور اس کے نو عمر دوست کوئی کھیل' کھیل رہے ہیں۔ سامنے شیشے کی ایک دیوار تھی۔ جس کی دوسری جانب پردہ کھنچا ہوا تھا۔ اندر سے "اف۔۔۔ آہ" کی آواز آرہی تھی۔ میں نے اٹھ کر احتیاط سے پردے کی جھری میں سے جھانکا۔ اندر مجھے تین کم سن ڈاکٹر اور دو نرسیں نظر آئیں۔ ایک کم سن ڈاکٹر جس نے منہ پر باقاعدہ ماسک چڑھا رکھا تھا' ایک عورت کو انجکشن لگا رہا تھا۔ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی یہ عورت نما لڑکی ڈاکٹر سے عمر میں کم و بیش تین گنا بڑی تھی۔ پتا نہیں یہ کھیل [illegible] اس بے چاری کو یہ شیطان زادے کتنے انجکشن [illegible] تھے اور ابھی ٹھونک رہے تھے۔ غالباً وہ "ڈاکٹر مریض" کھیل' کھیل رہے تھے۔

قریباً پانچ منٹ بعد اس نوجوان عورت کی جان چھوٹی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا وہ اپنے کولھے سہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ "ڈاکٹر صاحبان" اور نرسیں باہر نکلے اور میری طرف متوجہ ہوگئے۔ جو نو عمر بچہ عورت کو انجکشن ٹھونک رہا تھا وہ اب ماسک میں نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ وہ یہاں کا عزت مآب ولی عہد ماسٹر استقی تھا۔ اس گورے چٹے بچے کی آنکھیں براؤن تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو مجھے کبھی کسی بچے کی آنکھوں میں دکھائی نہیں دی۔ اس کی موٹی ناک اور ذرا ابھری ہوئی پیشانی اسے ایک کرخت اور شریر بچہ ظاہر کرتی تھیں۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق تیرہ سال کے قریب تھی۔ وہ اپنے پاس کھڑے ایک دراز قد لڑکے سے مخاطب ہو کر صاف انگریزی میں بولا "جم! کیا یہی وہ بندہ ہے جس نے تمہیں گالی دی تھی۔"

جم نامی اس دُبلے پتلے لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماسٹر استقی چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اس نے میز سے تھرما میٹر اٹھا کر اپنے ساتھی لڑکے کو دیا اور میری طرف اشارہ کیا۔ یہ لڑکا جس نے بھونڈے انداز میں نرس کا روپ دھار رکھا تھا ادائی انداز میں چلتا میری طرف آیا اور تھرما میٹر میرے منہ میں رکھنا چاہا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

نرس نما لڑکا بولا "تھرما میٹر کے بغیر ہی پتا چل رہا ہے ڈاکٹر صاحب۔ کافی تیز حرارت ہے۔"

سب لڑکوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ماسٹر استقی بڑی شان سے بولا "ٹھیک ہے' انجکشن لگا دیتے ہیں' مریض کو اندر لاؤ۔"

نرس لڑکے نے گارڈ کو اشارہ کیا۔ فوراً دو گارڈز اندر آگئے۔ انہوں نے مجھے شیشے کی دیوار سے دوسری طرف چلنے کو کہا۔ میں دیوار کی دوسری طرف آگیا۔ یہاں ایک اسٹریچر اور ایک بیڈ تھا' اس کے علاوہ کوک کی دو بوتلیں پڑی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا تھوڑی دیر پہلے نوجوان عورت کو جو انجکشن لگائے جارہے تھے' ان میں کوک ہی بھری ہوئی تھی۔ بگڑے تگڑے شہزادے مجھے بڑی زہریلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماسٹر استقی کی حیثیت ان میں پروفیسر ڈاکٹر کی سی تھی۔ اس نے کہا "مریض کو بھاری ڈوز کی ضرورت ہے اس کے لیے کم از کم ساٹھ سی سی کا انجکشن تیار کرو۔" جس لڑکے نے نرس کا روپ اختیار کر رکھا تھا اس نے الماری میں سے ساٹھ سی سی کی دیوہیکل سرنج نکالی اور اس پر ایک موٹی تگڑی سُوئی لگا دی' بلکہ اسے سُوا کہنا زیادہ مناسب تھا۔ سرنج کو کوک کی بوتل میں ڈبویا گیا تو قریباً ایک تہائی بوتل سرنج میں چلی گئی۔ نرس نے پھر گارڈز کو اشارہ کیا۔ گارڈ نے سخت لہجے میں مجھ سے کہا "اپنا ٹراؤزر اتارو اور بیڈ پر لیٹ جاؤ۔"

"تاکہ تم یہ سُوا میری پیٹھ میں گھونپ سکو؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

"جیسا کہا گیا ہے ویسا کرو۔" گارڈ کا لہجہ کرخت تھا۔

اس نے مجھے بیڈ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھکا دیا۔ یہ دھکا اس کی توقع سے زیادہ زوردار تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک میز پر جا گرا' دوسرا گارڈ آگے بڑھا تو میں نے اسے بھی دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا "ٹھہرو ٹھہرو۔" ماسٹر استقی دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا "تیز بخار کی وجہ سے مریض نیم پاگل ہو رہا ہے۔ اسے دوسرے انتظام کی ضرورت ہے۔"

پھر اس نے سرگوشی کے لہجے میں ایک گارڈ سے کچھ کہا۔ گارڈ باہر گیا اور فوراً ہی ایک دوسرے شخص کے ساتھ واپس آگیا۔ یہ پہلوان نما شخص کم و بیش سات فٹ اونچا تھا۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی' بالائی جسم کا ہر ہر مسل نمایاں تھا۔ ایک بازو پر سامنے کی طرف انگریزی میں "خاموش موت" کے الفاظ لکھے تھے۔ ایسے عظیم الجثہ پہلوان ٹی وی پر دکھائی جانے والی کشتیوں میں عام نظر آتے ہیں' مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے صفاچٹ سر والے اس پہلوان کو میں نے فری اسٹائل کشتیوں میں کہیں دیکھ بھی رکھا ہے۔ ماسٹر استقی نے پہلوان سے کہا "ڈیتھ! یہ مریض ذرا ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ اسے بیڈ پر لٹاؤ تاکہ اس کا علاج کیا جاسکے۔"

حکم کی دیر تھی کہ سفید فام پہلوان میری طرف بڑھا۔ اس نے میری گردن اپنے بازو میں دبوچنے کی کوشش کی تھی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ میرے کندھے کے اوپر سے قلابازی کھا کر فرش پر گرے گا اور اسے پتا بھی نہ چل سکے گا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ فرش پر گر کر پہلوان چند لمحے تو ساکت پڑا رہا' پھر جیسے اس کے بدن میں بجلی کوندی اور وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا چہرہ غصے اور شرم کی سرخی سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے خوفناک انداز میں دونوں ہاتھ پھیلائے اور اس مرتبہ احتیاط سے میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھ پر اپنا بایاں مُکا چلایا۔ میں نے یہ وار جھک کر بچایا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ پہلوان کھبا ہے۔ باکسنگ میں ایسے باکسر کو ساؤتھ پا کہتے ہیں۔ ساؤتھ پا باکسر کو' جھک کر زوردار پنچ لگانا آسان ہوتا ہے۔ میں نے یہی تکنیک استعمال کی' اور پہلوان کی صرف دو ضربوں کے بدلے میں نے اسے سات آٹھ "ضرباتِ کلیم" لگائیں۔ اس کی ناک اور بالائی ہونٹ سے خون جاری ہوگیا۔ جب پہلوان نے خود کو باکسنگ میں ناکام ہوتے دیکھا تو جوڈو اور ریسلنگ پر آگیا۔ اس میں کافی زور تھا اور جسم بھی ورزشی تھا لیکن نورا کشتیاں لڑ لڑ کر اس میں قوتِ برداشت رہی تھی اور نہ اسٹیمنا۔ میں نے دو چار منٹ میں اس کی ساری پھنے خانی نکال دی۔ ہمارے گرد تماشائیوں کا حلقہ سا بن گیا تھا اور شیطان زادوں سمیت بہت سے افراد دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ گارڈز کے ریوالور وغیرہ اب ان کے ہاتھوں میں نظر آنے لگے تھے لیکن شاید نو عمر ولی عہد نے انہیں اس لڑائی سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ دو تین مواقع مجھے ایسے ملے تھے کہ میں اس خوں خوار پہلوان کی گردن مسل کر اسے لمبا لٹا سکتا تھا لیکن میں خود بھی تھوڑی دیر اس تماشے کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ ہماری زبردست دھینگا مشتی کے دوران میں شیطان زادوں کا مصنوعی کلینک بری طرح تباہ ہوگیا تھا۔ شیشے کی ایک دیوار جو جنوبی سمت میں واقع تھی' ٹوٹ گئی تھی اور اب ہم ساتھ والے کمرے میں لڑ رہے تھے۔ ماسٹر استقی اور اس کے

ساتھی چیخ چیخ کر اپنے پہلوان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے مگر اب اس میں وہ دم خم باقی نہیں رہا تھا۔ وہ میرے نیچے اوندھا پڑا تھا اور میرا آرم لاک کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں وہی ساٹھ سی سی سرنج تھی۔ یہ میں نے اس کی گردن میں ٹھونک دی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا اور مجھے دور پھینکنے میں کامیاب رہا۔ اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا۔ سرنج کھینچ کر اس نے گردن میں سے نکالی۔ فرطِ غضب میں اس نے ایک آہنی کرسی اٹھائی اور پوری طاقت سے مجھ پر چلائی۔ میں جھک کر بچ گیا۔ کرسی اڑتی ہوئی ایک کھڑکی سے ٹکرائی اور شیشہ توڑ کر ساتھ والے کمرے میں جاگری۔ کمرے کے اندر سے بھی زوردار چھناکا سنائی دیا۔ یقیناً وہاں بھی کچھ ٹوٹا تھا پھر اچانک ہی ساتھ والے کمرے سے زنانہ اور مردانہ چیخیں سنائی دیں۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے دو باوردی عورتیں چیختی ہوئی برباد شدہ کلینک میں گھس آئیں۔ وہ اپنے عقب میں دیکھ رہی تھیں اور ان کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دائیں جانب کے کمروں سے بھی چیخ وپکار سنائی دے رہی تھی۔ اچانک میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے دو چھپکلے دیکھے۔ ان چھپکلوں LIZARDS کی جسامت کم و بیش ایک عام انسانی بازو کے برابر تھی۔ ان کی ابھری ہوئی آنکھیں خوفناک انداز میں چمک رہی تھیں اور جبڑے کھلے ہوئے تھے۔ وہ تڑپ کر فرش پر گرے اور دو نرس لڑکیوں کے پیچھے بھاگے۔ وہ لرزہ خیز چیخیں مارتی ہوئی ایک باتھ روم میں گھس گئیں۔ باتھ روم کے دروازے کے نیچے درز موجود تھی۔ ایک چھپکلے نے اپنا سر درز میں گھسیڑ دیا اور اندر گھسنے کے لیے زور لگانے لگا۔ اندر دونوں لڑکیاں ہذیانی انداز میں چیختی چلی جا رہی تھیں۔ میں نے سامنے دیکھا اور چونک گیا۔ ایسے ہی مزید تین چار چھپکلے کھڑکی سے کود کر اندر آگئے تھے اور اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے، اندازہ ہوتا تھا کہ ایسے ہی کچھ چھپکلے دائیں جانب کے کمروں میں بھی کرالنگ کر رہے ہیں۔ وہاں سے چیخ وپکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چھپکلے ایک بڑے "گلاس کیس" میں بند تھے۔ آہنی کرسی لگنے سے یہ گلاس کیس ٹوٹ گیا تھا اور یہ کریہہ النظر جانور آزاد ہو گئے تھے۔ "خاموش موت" (پہلوان) کا کہیں پتا نہیں تھا، نہ ہی شیطان صفت شاہ زادوں میں سے کوئی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے بھی وہ کمرا چھوڑا اور لفٹوں کی سمت دوڑتا چلا گیا۔ تھوڑا آگے میں نے ایک سرخ و سفید لڑکی کو دیکھا۔ وہ بہت مختصر لباس میں تھی۔ گرانڈیل چھپکلا اس کے پیٹ پر چڑھا بیٹھا تھا اور وہ فرش پر بری طرح تڑپ رہی تھی۔ پھر اچانک اس نے لڑکی کو چھوڑا اور لپک کر ایک دروازے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لڑکی کے پیٹ کی شفاف جلد لہولہان ہو رہی تھی۔ وہ فرش سے اٹھی اور مخالف سمت میں بھاگتی چلی گئی۔ میں اس لڑکی کی صورت دیکھ کر بے طرح چونک گیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی انڈین لڑکی تھی جو "خاصے کی شے" کے طور پر بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئی تھی۔ اس سیدھی سادی لیکن نہایت خوب صورت و یاتن نے اپنا نام "انو" بتایا تھا۔ جہاز میں وہ اکثر بڑی بے چارگی کے ساتھ یہی فقرہ دہراتی رہتی "بھگوان کے لیے مجھے میرے اندر نگر والے گھر پہنچا دو۔" انو کے ساتھ دو اور حسین و جمیل لڑکیاں بھی جہاز پر سوار ہوئی تھیں۔ ان کے بال گہرے سیاہ اور آنکھیں گہری براؤن تھیں۔ انو کو دیکھ کر یہ سارا "ڈیٹا" ایک سیکنڈ کے اندر میرے ذہن سے گزر گیا۔ میں نے پکار کر کہا "انو... میری بات سنو!"

لیکن وہ اندھا دھند بھاگتی چلی گئی۔ اس کے لانبے بال اس کی نیم عریاں کمر پر لہرا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے، اس کے باوجود وہ میری آواز پر رکی نہیں تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ ارد گرد کے کمروں میں چونکہ خوفناک چھپکلوں کی وجہ سے افراتفری پھیلی ہوئی تھی لہٰذا کسی باوردی شخص نے مجھے انو کے پیچھے دوڑتے نہیں دیکھا۔ ایک خم دار راہداری میں پہنچ کر میں نے اسے آواز دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی رفتار میں تیزی آگئی۔ بے شک اس کا حلیہ ساحلِ سمندر پر دھوپ سینکنے والی کسی یورپین لڑکی جیسا تھا لیکن وہ تھی انو ہی... پتا نہیں کہ وہ مجھ سے اتنی خوف زدہ کیوں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ اس LIZARD کا خوف بھی بھول گئی ہے جو لمحہ پہلے اس کے پیٹ پر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ بڑی پھرتی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھی اور بالائی منزل پر آگئی۔ میں بھی اس کے پیچھے آیا۔ وہ ایک ایسے کوریڈور میں بھاگتی چلی گئی جس میں قالین بچھا تھا اور دونوں طرف پلائی کے دروازے تھے۔ "انو رک جاؤ۔" میں نے پھر کہا۔ وہ غڑاپ سے ایک دروازے میں گھس گئی۔

کوریڈور میں موجود ایک ہٹا کٹا پہرے دار تیزی سے میری طرف بڑھا۔ اسی دوران میں وہ دروازہ بھی کھل گیا جس میں انو گھسی تھی۔ اندر سے کم و بیش پندرہ لڑکیاں بھرا مار کر باہر نکل آئیں۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ سب کی سب مختصر ترین لباس میں تھیں۔ ایک دو سیاہ فام تھیں باقی سب سفید فام یا گندمی رنگت کی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان

لڑکیوں کا انتخاب درجنوں خوب صورت اور متناسب الجسم لڑکیوں میں سے کیا گیا ہے۔ وہ بے داغ اور موزوں ترین جسموں کی مالک تھیں اور انو ان میں سے ایک تھی۔ وہ ڈری سہمی ان لڑکیوں کے درمیان میں ہی کھڑی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کیا۔ اتنے سارے شعلے تھے اور سارے "بھڑکے ہوئے سے" میری جانب دیکھ رہے تھے۔ آنکھوں میں طیش، جبینوں پر شکنیں، غالباً یہ لڑکیاں انو کی ابتر حالت کا ذمے دار مجھے ہی سمجھ رہی تھیں۔ جس دروازے میں سے یہ آفت زادیاں نکلی تھیں اس پر انگلش میں "رقص گاہ" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ شاید یہاں ڈانس وغیرہ کی کلاس ہو رہی تھی۔ ایک درمیانی عمر کی خوش شکل عورت آگے بڑھی۔ اس نے جین اور بوشرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ انسٹرکٹر ہے۔ جتنی کرختگی اس سارے پر نظر آرہی تھی وہ انسٹرکٹر کے چہرے پر ہی تھی۔ وہ میری طرف بڑھی تو میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی دوران میں مسلح پہرے دار بھی میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے مجھے کالر سے پکڑ لیا اور کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ یہاں موجود لوگ ابھی تک اس ہنگامے سے بے خبر تھے جو نچلی منزل پر چھپکلوں کی وجہ سے برپا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مجھے کسی متوقع وار پیٹ سے بچانے کے لیے انو ہاتھ ہلا ہلا کر ساتھی لڑکیوں سے کچھ کہہ رہی ہے۔ پری پیکر حسینائیں اس کی بات سن کر اپنے پارے کو تھوڑا سا نیچے لے آئیں۔ اسی اثنا میں تین اور مسلح پہرے دار دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک پہرے دار وہی تھا جس کے ساتھ میں تین گھنٹے پہلے اس زمین دوز کیمپس میں آیا تھا۔ ان پہرے داروں نے فوراً مجھے گھیر لیا۔ انگریزی داں پہرے دار مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "تم یہاں کیسے پہنچ گئے۔ ہم تمہیں نیچے ڈھونڈ رہے تھے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا کورس کی شکل میں سُریلی چیخیں سنائی دیں۔ یہ انہی حسیناؤں کی چیخیں تھیں جو تھوڑی دیر پہلے مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ دراصل انہیں ایک پہرے دار نے اپنی زبان میں سمجھایا تھا کہ نیچے کیا واقعہ رونما ہوا ہے۔ چھپکلی سے ڈرنے والی بنات نے گز بھر لمبے چھپکلے سے تو ڈرنا ہی تھا۔ وہ چیخ کر واپس اپنی رقص گاہ میں گھس گئی تھیں اور دروازہ مضبوطی کے ساتھ اندر سے بند کر لیا تھا۔ حالانکہ یہاں چھپکلوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اندر گھسنے سے پہلے "انو" نے آخری بار مڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ اس ایک لمحے میں ان آنکھوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی ہیں لیکن کسی نامعلوم وجہ سے خوف زدہ ہیں۔ انو کا حلیہ بھی مجھے حیران کر رہا تھا۔ جہاز میں وہ بے وقوفی کی حد تک سیدھی سادی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر زریں گل نے تبصرہ کیا تھا "اس کو دیکھ کر تو ام کو شہنائی قلم کا دیبا یاد آگیا ہے۔ اتنا خوب صورت لڑکی کو اتنا سادہ نہیں ہونا چاہیے، ورنہ ہر لوفر کے اندر ایک بھیڑیا جاگ اٹھتا ہے۔"

انو خیر سیدھی سادی تو اب بھی نظر آرہی تھی مگر اس کا ظاہری حلیہ ان چند دنوں میں ہی بہت بدل گیا تھا۔ بال، چہرہ لباس، چلنے پھرنے کا انداز، سبھی کچھ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ دو تنو مند پہرے داروں نے مجھے دونوں بازوؤں سے تھام رکھا تھا۔ ایک گارڈز نے اپنا ہاتھ ریوالور پر رکھا ہوا تھا اور بوقتِ ضرورت ریوالور کو "بے نیام" کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ ہم واپس سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ اس دوران میں نچلی منزل سے "ری پیٹر" کے تین چار فائر سنائی دیے۔ اس فائرنگ کی "وجہ" کا علم مین راہداری میں جا کر ہوا۔ میں نے دیواروں اور فرش پر خون کے چھینٹے دیکھے۔ دو جسیم چھپکلے فرش پر مردہ پڑے تھے۔

مجھے سیدھا لفٹوں پر لے جایا گیا۔ یہاں تلاشی اور چیکنگ کے مختلف مراحل سے گزار کر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور رنگ دار شیشوں والی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

○☆○

قریباً پون گھنٹے بعد میں واپس ہوسٹل میں تھا اور اپنے کمرے میں صفدر اور زریں کے روبرو بیٹھا تھا۔ میں دوپہر بارہ بجے یہاں سے گیا تھا اب قریباً چار بجنے والے تھے۔ پچھلے چار گھنٹوں میں جو کچھ ہوا تھا اس کی کچھ تفصیلات صفدر اور زریں کو بھی معلوم ہو چکی تھیں۔ یہاں تک کہ LIZARDS والے واقعے کی خبر بھی ابھی پانچ دس منٹ پہلے ان تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی باخبری نے مجھے حیران کیا۔ صفدر نے بتایا کہ یہ سب کچھ سوزی بتا کر گئی ہے۔ سوزی ابھی دس منٹ پہلے تک یہاں موجود تھی۔

صفدر بولا "وہ بڑے افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔"

"کس بات پر؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سی باتوں پر بطور خاص طور سے اس بات پر کہ آپ بار بار منع کرنے کے باوجود احتیاط سے کام نہیں لے رہے۔ وہ کہتی ہے کہ پہلے آپ کے ہاتھوں مبارک امین کا قتل ہوا پھر آپ نے اترپردیش لڑکی کی گمشدگی پر برہمی دکھائی اور اب آپ نے بھٹاپٹ ماتر اسقی سے دشمنی مول لے لی ہے۔ وہ بتا رہی تھی کہ آپ نے اسقی کے کسی دوست کو گالی

دی ہے جس کے بعد ماسٹر اسقی صاحب برہم ہو گئے ہیں۔"
میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "چلو برہم ہی ہوا ہے، قتل تو نہیں ہوا۔ میں اسے نابالغ ہونے کی رعایت دینے پر مجبور ہوں ورنہ اس بدبخت نے جس طرح کملا اور اس کے بچے کی جان لی ہے شاید میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔"
"کملا کی موت کا تو ہم سب کو دکھ ہے۔ مگر کیا کر سکتے ہیں۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اصل میں فردِ جرم کس پر عائد کی جا سکتی ہے۔"
"شاید تم درست کہتے ہو۔" میں نے بستر پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔
خبیث آنکھوں والے ماسٹر اسقی کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا، اور میں خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کچھ بھی ہے لیکن وہ ہے تو بچہ ہی۔ اس کے شیطانی کرتوتوں کی تمام تر ذمے داری اس پر کیسے ڈالی جا سکتی ہے۔ عین اسی وقت ذہن سے ایک اور آواز آئی "وہ بچہ نہیں ہے۔ تم نے اس ملعون کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ کیا ایک بچے کی آنکھیں ایسی ہوتی ہیں۔ اس کے اندر کسی سو سالہ "فتنہ پسند" بدبخت روح کا بسیرا ہے۔
زریں گل کی آواز نے مجھے اپنے خیال سے چونکا دیا۔ وہ بولا "استاد صیب! ام کو ایک بات کا بہت افسوس ہے۔ آپ ہر خطرناک کام کرنے کے لیے خود چلا جاتا ہے اور ام کو بتاتا تک نہیں۔ آخر ام کس مرض کی دوا ہے۔"
"تم خود مرض ہو۔" صفدر نے ہولے سے کہا۔
"صپدر بھائی! کیا کہا تم نے؟" زریں کے کان کھڑے ہو گئے۔
"میں کہہ رہا ہوں کہ تمہارا جذبہ تعریف کے قابل ہے۔"
"لیکن ام صرف تعریف نہیں چاہتا۔ ام آپ کے شانہ بشانہ ہر خطرناک کام میں حصہ لینا چاہتا ہے۔ اب دیکھیں استاد صیب! آپ نے مبارک امین کو اکیلے ہی جہنم واصل کیا اور اس کے بعد اکیلے ہی گارڈز کا مار پیٹ بھی برداشت کیا، اگر اس تبرک میں سے تھوڑا بہت حصہ ام کو بھی مل جاتا تو امارا دل ٹھنڈا ہو جاتا۔"
"اوئے چغد! تو اسے تبرک کہہ رہا ہے۔ تبرک تو تھوڑا سا ہوتا ہے چکھنے کے لیے۔ یہ دیکھ نیل میری ٹانگوں اور بازوؤں کے۔" میں نے اسے اپنی ٹانگیں دکھائیں "اگر یہ تبرک تھا تو پھر میں نے پوری دیگ کھائی ہے تبرک کی۔"
"ام اسی لیے تو کہہ رہا ہے جناب کہ ام بانٹ کے کھائیں۔"
"بانٹ شانٹ کوئی نہیں۔ بس اب تمہاری [illegible] ہے۔" صفدر نے کہا۔
"خو ایسے بھی ٹھیک ہے۔" زریں نے اطمینان [illegible] کہا۔
... غزالہ کو میں نے آخری مرتبہ اس وقت [illegible] جب نا مبارک امین میرے ہاتھوں پار ہوا تھا۔ میں [illegible] غزالہ سے مل کر اس کی خیر خیریت دریافت کرنا چاہتا [illegible] ابھی تک سوزی کے پاس اس کے آفس نما اپارٹمنٹ [illegible] تھی۔ سوزی سے درخواست کر کے غزالہ سے ملا [illegible] جا سکتی تھی۔ میں نے پہرے دار کے ہاتھ سوزی کو [illegible] پیغامات بھیجے لیکن وہ نہیں آئی... اور جب آئی تو [illegible] طرح آئی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کے انداز [illegible] عجلت پائی جاتی تھی۔ اس نے پہرے دار کو بہانے سے [illegible] بھیج دیا پھر سلاخ دار دروازے کے قریب چلی آئی۔ [illegible] ہوئی سی آواز میں بولی "مسٹر شا! تم نے اپنے حق میں [illegible] کیا ہے۔ تم نے یہاں آتے ساتھ ہی بھڑوں کے چھتے میں [illegible] ڈال دیا ہے۔"
"بھڑوں کے چھتے سے کہیں تمہاری مراد [illegible] اس کے ساتھی تو نہیں؟"
"تو اور کیا۔" اس نے پریشانی سے کہا "تم [illegible] عمر پر نہ جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیا بلا ہے اور [illegible] چار دیواری کے اندر کیا کچھ کر سکتی ہے۔ مجھے ابھی معلوم [illegible] ہے کہ ماسٹر تمہیں فوری طور پر سبق سکھانے کا ارادہ [illegible] ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر میں اپنے ساتھیوں [illegible] ہمراہ یہاں موجود ہو۔"
اطلاع واقعی سنسنی خیز تھی۔ سوزی نے اپنے خشک [illegible] پر زبان پھیری۔ صفدر نے کہا "مس سوزی! تم یہاں کی انچارج ہو۔ اپنی تحویل میں موجود افراد کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔ اگر ماسٹر اور اس کے ساتھی [illegible] آتے ہیں تو تم انہیں ہوسٹل میں داخل ہونے سے روک [illegible] ہو۔"
"وہ بچے نہیں ہیں۔" وہ جھلا کر بولی "میں نے کہا [illegible] ناں کہ وہ بلاؤں سے کم نہیں ہیں، اور انہیں روکنے کی [illegible] کنگ براؤن کے علاوہ یہاں کسی میں نہیں ہے۔" وہ [illegible] پریشان نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"اور کنگ براؤن کہاں ہے؟"
"یہی تو مسئلہ ہے۔ کنگ اس وقت ایک نہایت ضروری [illegible]

[illegible] میں ہیں۔ یہ میٹنگ پچھلے چھ گھنٹے سے مسلسل چل رہی [illegible] اور ابھی معلوم نہیں کہ کب تک چلے گی۔ کیمپس میں [illegible] تمہاری ملاقات بھی اسی لیے نہیں ہو سکی تھی۔" [illegible] سوچتی رہی پھر بولی "اگر ماسٹر کے روانہ ہونے سے [illegible] کی میٹنگ ختم ہو گئی اور انہوں نے ماسٹر کو روک لیا [illegible] بات ہے ورنہ تم اس وقت خود کو شدید قسم کے خطرے [illegible]"
[illegible] سوزی کے چہرے پر ہمارے لیے ترس آمیز پریشانی تھی۔ [illegible] تاثرات کیمپس میں پہرے داروں کے چہرے پر [illegible] تھے جب ماسٹر نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ سوزی [illegible] "ماسٹر... تم پر بہت برہم ہے۔ تم نے اسے چیلنج کیا ہے، [illegible] وہ اس کا جواب دے کر رہے گا۔ اس کی تربیت ہی اس [illegible] کی گئی ہے۔ ماسٹر کے اضافی غصے کا سبب وہ توڑ پھوڑ [illegible] تمہاری اور پہلوان کی دھینگا مشتی کی وجہ سے ہوئی [illegible] توڑ پھوڑ میں وہ دیوار گیر "گلاس کیس" ٹوٹ گیا [illegible] میں ماسٹر کے پالتو چھپکلے تھے۔ یہ آٹھ چھپکلے تھے، [illegible] میں سے دو کو ہلاک کر دیا ہے۔"
"ابھی یہاں بہت سے چھپکلے اور چھپکلیاں ہلاک ہونی [illegible]" صفدر نے اطمینان سے کہا۔
سوزی صفدر کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی [illegible] شا! یاد ہے کہ تم نے کہا تھا کہ تم میرے احسان مند [illegible]"
"ہاں، تم نے ایک سے زائد مرتبہ ہم پر احسان کیا ہے۔ [illegible] مز سے فرار کے بعد تو تم ہی ہماری زندگی کا وسیلہ بنی [illegible]"
"تو پھر ان احسانات کے بدلے میری ایک بات مان [illegible]" وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔
"ہاں کہو۔"
"جس زندگی کو بچانے کے لیے میں نے خود کو تین بار [illegible] میں ڈالا ہے اسے یوں بے دردی سے ضائع نہ کرو۔"
"کیا کہنا چاہتی ہو؟"
وہ اپنا چہرہ میرے قریب لاتے ہوئے بولی "ماسٹر اسقی [illegible] کا مطلب کنگ سے الجھنا ہے اور کنگ کو خفا کر کے [illegible] اور اپنے ساتھیوں کی زندگی کو دردناک خطرے سے دو [illegible] کرو گے۔ تمہاری بہادری اور سخت جانی میں کلام نہیں [illegible] اس "ماریا ٹرسٹ" کے آہنی پنجرے میں تم بری طرح [illegible] چکے ہو۔ یہ لوگ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے [illegible] جو چاہیں کر سکتے ہیں اور یہ کیا کچھ "چاہ" سکتے ہیں اس کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں۔"
"لگتا ہے کہ تم ہمیں خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"
"نہیں ایسی کوئی بات نہیں شاہ جہاں! میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے ساتھیوں کے لیے تمہیں تھوڑی سی قربانی دینا ہو گی۔ ماسٹر اسقی بہت بپھرا ہوا ہے۔ وہ اب تمہیں ذہنی اور جسمانی اذیت پہنچائے بغیر نہیں رہے گا۔ یہ اذیت تمہیں برداشت کرنی ہی پڑے گی۔ رضامندی سے نہیں کرو گے تو زبردستی کرائی جائے گی۔ دانا کہتے ہیں کہ لمبی چھلانگ لگانے کے لیے پہلے تھوڑا سا پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ اگر تم واقعی اپنی اور اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو اس وقت تمہیں اپنی مرضی اور انا کے خلاف چلنا پڑے گا۔"
صفدر نے کہا "کیا یہاں سے ہمارے فرار کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے؟"
وہ بے دلی سے مسکرائی "سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی تو شاید نکل جائے مگر ماریا ٹرسٹ سے راہِ فرار اختیار کرنا ناممکن ہے۔ بے شمار پوشیدہ آنکھیں ہیں جو یہاں ہر وقت نگران رہتی ہیں۔"
سوزی روہانسی آواز میں دس پندرہ منٹ تک ہمیں قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ اب ماسٹر اسقی کے غیظ و غضب کا سامنا کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔ وہ زبان سے تو نہیں کہہ رہی تھی مگر اس کا خیال یہی تھا کہ میرا زندہ بچ نکلنا ہی میری بہت بڑی خوش قسمتی ہو گا۔ اسی دوران میں منی اسکرٹ والی ایک سیاہ فام لڑکی گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ یہ سوزی کی قابلِ اعتماد ماتحت تھی۔ اس نے سرگوشی میں سوزی سے کچھ کہا۔ سوزی کا رنگ متغیر ہو گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "ماسٹر اسقی اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیمپس سے روانہ ہو چکا ہے، وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے ہیں۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا "دیکھو شا! میں پھر کہتی ہوں۔ ماسٹر سے کسی طرح کی تکرار نہیں کرنی۔ وہ گالی وغیرہ بھی بکے گا مگر تمہیں برداشت کرنا ہو گا۔ ماسٹر کے ساتھ اس کا ایک چچا بھی ہے۔ اس کا نام چین ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں نقص ہے۔ وہ بھی سخت بدزبان شخص ہے۔ تمہارا امتحان یہی ہے کہ تم اپنے آپ پر کنٹرول رکھو۔"
پیشانی سے پسینہ پونچھتی ہوئی سوزی واپس چلی گئی۔ صفدر... اور زریں پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ زریں گل...

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

بڑبڑایا "ایسا زندگی سے ام موت کو بہتر سمجھتا ہے۔ استاد صیب' ام آپ کا بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا تم اپنی چونچ ذرا بند رکھو۔ کچھ سوچنے کا موقع دو۔"

صفدر نے کہا "سوزی کو کسی طرح کنگ سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"وہ کوشش کر چکی ہے۔ کنگ کے ماتحت اسے کوئی کال نہیں دے رہے۔ وہ کسی بہت اہم میٹنگ میں ہے۔"

"ہم آپ کو کہیں جانے نہیں دیں گے۔" صفدر نے عزم سے کہا۔

"دیکھو صفدر! کسی بے وقوفی کی گنجائش نہیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "تم خود کو مشکل میں ڈال کر بھی میرا کوئی بھلا نہیں کر سکتے ہو۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ مشکل میں اضافہ ہو جائے۔ اسے میری درخواست سمجھ لو یا میرا حکم۔ تم دونوں اس معاملے سے بالکل الگ رہو گے۔ میں اس چکر سے خود ہی نمٹوں گا۔" پھر میں نے زریں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اور سنو زریں! اب یا آگے چل کر میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو پھر تم سب کو صفدر کے مشورے پر چلنا ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟" زریں نے کوئی جواب نہیں دیا' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی اور سخت شکوہ تھا۔

اگلے تین چار منٹ بڑی ٹینشن میں گزرے۔ سوزی کی شکل دوبارہ دکھائی نہیں دی۔ وہ اپنے آفس میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ کنگ سے رابطے کی آخری کوشش کر رہی ہو۔ پھر مشکل گھڑی سر پر پہنچ گئی۔ راہداری کی طرف سے کئی قدموں کی چاپ ابھری اور ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ ان میں بچوں کی آوازیں بھی تھیں اور ان میں وہ بچہ بھی تھا جس کے اندر کسی بوڑھی خبیث روح کا بسیرا تھا۔ ہمارے کمرے کے سامنے دو پہرے دار بالکل چوکس کھڑے تھے۔ وہ سنگی مجسموں کی طرح ساکت تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جوں جوں قدموں کی چاپ نزدیک آرہی ہے پہرے داروں کے رنگ پیلے پڑتے جا رہے ہیں۔ کسی وقت تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس ماریا ٹرسٹ کے اندر موجود ہر جان دار و بے جان شے ماسٹر استقی کے شر سے پناہ مانگتی ہے اور پھر ماسٹر ہمارے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ وہی چنڈال چوکڑی تھی جس سے ابھی تھوڑی دیر پہلے کیمپس میں ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ کل سات لڑکے تھے' ان میں ایک ذرا لمبے قد کا تھا اور تیرہ چودہ سالہ لگتا تھا' باقی ماسٹر سمیت دس اور بارہ تیرہ

سال کے درمیان تھے۔ ان کے ساتھ پانچ مسلح حبشی گارڈ تھے اور ایک آنکھ سے معذور وہ نوجوان بھی تھا جس کا نام سوزی نے چین بتایا تھا۔ یہ نوجوان رشتے میں ماسٹر کا چچا تھا۔ غنڈا صورت نوجوان قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کے لمبے بال شانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "تو تم ہو شاہ جہاں؟"

میرے بولنے سے پہلے ہی استقی نے کہا "ہاں یہی ہے۔" پھر وہ گارڈز سے مخاطب ہوا "نکالو اس ماں کے شیر کو باہر۔"

ماسٹر استقی اپنی عمر سے کہیں بڑی باتیں کرتا تھا اور اس کا انداز بھی بڑوں جیسا تھا۔ دو گارڈز نے اپنے ماؤزر مجھ پر تان لیے' پھر دروازہ کھولا گیا اور مجھے باہر آنے کا حکم دیا گیا۔ میں باہر آگیا۔ دروازہ پھر لاک کر دیا گیا۔ سوزی ہوسٹل انچارج کی حیثیت سے ایک طرف کھڑی خاموشی سے تماشا دیکھ رہی تھی۔ گارڈز نے بڑی مہارت کے ساتھ مجھے کور کر رکھا تھا۔ ایک شخص عقب سے آیا اور اس نے پھرتی سے کوئی شے میرے گلے میں ڈال دی۔ یہ ایک رسّی تھی۔ بالکل جیسے بکرے کے گلے میں رسّی ڈالی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسے دو طرف سے کھینچا جا سکتا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ میرے گلے میں دو رسّیاں ڈالی گئی تھیں اور انھیں دو افراد مختلف سمتوں میں کھینچ رہے تھے۔ میں اپنی مرضی سے کسی جانب حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ماسٹر استقی اور اس کے ساتھی مجھے کھینچتے ہوئے راہداری کی طرف بڑھے۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شیشے کا ایک گلاس اڑتا ہوا ماسٹر استقی کے سر میں لگا اور فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی زریں گل کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہ اردو اور پشتو میں ماسٹر اور اس کے ساتھی لڑکوں کو بے نقط سنا رہا تھا۔ اس کی گالیاں جیسے پورے ہوسٹل میں گونج رہی تھیں۔ ماسٹر استقی کے چہرے کا رنگ انگارا ہو گیا۔ کچھ یہی کیفیت اس کے چچا کی بھی تھی۔ ماسٹر استقی بھنایا ہوا کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچا۔ اس نے سوزی کو حکم دیا کہ زریں کو بھی کمرے سے باہر نکالا جائے۔ میں اپنے آپ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ زریں پر میری نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے پٹھانی خون نے جوش مارا تھا اور وہ مجھے تنہا جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا اس کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ اسے بھی کمرے سے نکال کر میرے برابر کھڑا کر دیا جائے اور اس کی تمنا مکمل طور پر پوری ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اسے باہر نکالا گیا بلکہ میری ہی طرح گلے میں دُہری رسّی

بھی ڈال دی گئی۔ وہ جنگلی شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا اور پوری طاقت سے دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔ جن افراد نے دونوں طرف سے اس کی رسّیاں تھام رکھی تھیں انھیں زریں کو قابو رکھنے کے لیے پورا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ میری طرح زریں بھی تین چار ریوالوروں کی زد میں تھا۔

وہ لوگ ہمیں کھینچتے اور مارتے ہوئے اسی بندی خانے میں لے آئے جہاں چند روز قبل مجھے قید رکھا گیا تھا۔ اس خستہ حال قید خانے کی بیشتر کوٹھڑیاں اب بھی خالی پڑی تھیں۔ جو دو چار بندے یہاں قید تھے' وہ حیران پریشان نظروں سے یہ منظر دیکھنے لگے تھے۔ اس سنسان قید خانے میں یہ ہنگامہ انھیں یقیناً بہت دلچسپ اور سنسنی خیز لگا ہوگا۔ یہاں ایک گوشے میں مجھے تین زنگ آلود ٹکٹکیاں نظر آئیں۔ ان چوبی ٹکٹکیوں کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ انھیں' قیدیوں کو کوڑے وغیرہ مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نجانے کتنے زمانے سے یہ ٹکٹکیاں یہاں موجود تھیں اور کیسے عذاب ناک مناظر کی شاہد تھیں۔ ان ٹکٹکیوں پر باندھے جانے والے بدنصیبوں کی کربناک چیخیں ابھی تک ان کے اردگرد ہی گونج رہی تھیں۔

دو ٹکٹکیوں کو جلدی جلدی تیار حالت میں کیا گیا۔ ایک تنومند حبشی گارڈ جو صورت سے ہی کوڑا زن نظر آتا تھا' دو بڑے سائز کے "کی بوکو" لے کر آگیا۔ سارے کام جلدی جلدی کیے جا رہے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ماسٹر استقی اور دیگر لڑکوں کو خطرہ تھا کہ کہیں کنگ براؤن کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ پڑ جائے۔ کنگ ابھی تک میٹنگ میں تھا اس کے فارغ ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنا کام کر گزرنا چاہتے تھے۔

ماسٹر کے ہمراہ آنے والے تمام افراد ایک نیم دائرے کی صورت ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے تھے۔ ہوسٹل کے پہرے دار اور سوزی بھی ان افراد میں شامل تھی۔ ایک دو بار میری نظر سوزی سے ملی۔ اس کی نگاہ میں بس یہی التجا تھی کہ جو کچھ ہونے جا رہا ہے اسے ہو جانے دو۔ بندی خانے کے باہر سے بھی کچھ لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اندر آنا چاہ رہے تھے۔ ماسٹر استقی کے حکم پر سوزی نے بندی خانے کا ایک زنگ آلود دروازہ کھلوا دیا۔ دروازہ کھلتے ہی کئی مرد و زن اندر آگئے اور تماشائیوں میں شامل ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تماشائیوں کی تعداد سو سے تجاوز کر چکی تھی اور ابھی مزید لوگ اندر آرہے تھے۔

میں نے زریں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل پُرسکون تھا اور ہر قسم کی اذیت کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

تین ممالک تین اتحاد

① ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو شمالی یمن اور جنوبی یمن کا اتحاد عرب لیگ کے تعاون سے تقریباً ۳۰۰... سال بعد عمل میں آیا۔

② ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی کا اتحاد عمل میں آیا اور ۱۹۴۵ء کے بعد دوسری جنگِ عظیم سے لے کر ۱۹۹۰ء دونوں کا دیوار برلن کی وجہ سے رابطہ نہ تھا۔ اب جرمنی یورپ میں روس کے بعد سب سے بڑا یورپی ملک ہے۔

③ جون کے درمیان ۲۰۰۰ء میں شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کے دونوں سربراہوں کا ملاپ شمالی کوریا میں ہوا۔ دونوں ممالک کا اتحاد ہو گیا ہے۔ صرف معاہدہ پر۔۔ عملی طور پر دستخط ہونا باقی ہے۔ جو اس صدی کا آخری بڑا کارنامہ ہوگا۔

محمد انیس اعوان کی تلاش' میانوالی سے۔

ماسٹر استقی کے چچا چین کے اشارے پر سوزی نے ہم دونوں کو ٹکٹکیوں پر باندھنے کا حکم دیا۔ بندی خانے کے چوکس پہرے دار آگے بڑھے۔ مگر بارہ تیرہ سالہ ماسٹر استقی نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس کی موٹی ناک ضرورت سے زیادہ پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خباثت لشکارے مار رہی تھی۔ وہ پہرے داروں سے بولا "انھیں برہنہ کر کے کوڑے مارے جائیں گے۔"

پہرے داروں نے سرِ تسلیم خم کیا اور کپڑے اتارنے کے لیے ہماری طرف بڑھے۔ ماسٹر نے انھیں ایک بار پھر روک دیا "یہ اپنے کپڑے خود اتاریں گے۔" وہ بڑی زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

ایک پہرے دار نے زریں گل کی پشت پر "کی بوکو" کی دو زوردار ضربیں لگائیں اور چیخ کر کہا "چل مانشیے! اپنے کپڑے اتار دے۔"

زریں گل پہرے دار کی بات سمجھ گیا تھا اور اس کا رنگ سرخ انگارا ہو گیا تھا۔ اس نے پہرے دار کی جانب تھوک دیا اور اسے ماں بہن کی غلیظ گالیاں دیں۔ یہ گالیاں چونکہ اردو میں تھیں لہٰذا سننے والوں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ زریں پر کی بوکو کی بارش کر دی گئی۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ یہ

بڑی جان لیوا ضربیں تھیں۔ ایسی ہی ایک ضرب میں مائیکل کے ہاتھوں چند دن پیشتر سہہ چکا تھا "رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا۔

پہرے دار کا ہاتھ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ زریں گل کے گلے کی رسّی تنومند پہرے دار دو طرف سے کھینچ رہے تھے اور اس کھچاؤ کے سبب اس کا چہرہ سرخ تر ہو گیا تھا۔

میں نے ماسٹر اسقی سے کہا "اس کو کیوں مار رہے ہو؟ یہ بے قصور ہے۔ بس وقتی طور پر غصے میں آگیا تھا۔ اپنے کیے کی سزا اسے مل گئی ہے۔"

"بہت خوب' بڑا خیال ہے اپنے ساتھی کا۔" اسقی کے جواں سال چچا نے کہا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اچانک اس نے اپنے ہولسٹر میں سے ریوالور برآمد کیا اور زریں کو ایک زوردار دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیا۔ تنومند پہرے داروں نے زریں کو قربانی کے جانور کی طرح دبوچ لیا۔ چین نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کر نال زریں کے سر سے لگا دی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بے حد سرد لہجے میں بولا "اپنے ساتھی کی جان بے حد پیاری ہے تمہیں۔ اس کی جان بچانا چاہتے ہو تو خود کو بے لباس کر دو۔"

اس کی آواز میں موجود درندگی کا تاثر اتنا گمبھیر تھا کہ میں اندر سے ہل گیا۔ ایک لمحے میں مجھے یقین ہو گیا کہ زریں کی زندگی تیز ہوا میں رکھا ہوا چراغ بن گئی ہے۔ جنونی چین کی انگلی کی ایک جنبش زریں کو ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر سکتی تھی۔ یہ سُولی پر چڑھے ہوئے لمحے تھے۔

"میں دس تک گنوں گا۔" چین نے سپاٹ آواز میں کہا۔

میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ جدوجہد کی کوئی گنجائش نظر نہیں آرہی تھی۔ قید خانے کے کھلے ہوئے گیٹ میں سے باہر ایک باغ کا منظر تھا لیکن یہ گیٹ اور یہ باغ اور یہ آزادی' مجھ سے بہت دور تھے..... برہنگی ایک تذلیل ہے' لیکن یہ کسی فردِ واحد کی نہیں' انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس شخص کو برہنہ ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اس سے زیادہ فکر مند انسانیت کو ہونا چاہیے۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا' اس کے بعد اپنے ہاتھ قمیص کے بٹنوں کی طرف بڑھا دیے۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ مجھ جیسے لوگ جو جرم و سزا کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں' اپنے اور دوسروں کے متعلق خاصے بے رحم ہو جاتے ہیں۔ بتدریج اور غیر محسوس طور پر ان کا ذہن سخت ترین فیصلوں کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ میں قمیص کے بٹن کھول چکا تھا جب اچانک ایک بجلی سی میری نگاہوں کے سامنے لپک گئی۔ قید خا... ایک "کھنڈر بالکونی" میں سے ایک سایہ نے چھلانگ... اور دھم سے پختہ فرش پر گرا۔ ماسٹر اسقی کا ایک ساتھی... اس سایے کے نیچے دب گیا۔ پھر سایہ سیدھا ہوا' وہ... خستہ حال شخص تھا۔ اس کے سر اور چہرے کے بال... ہوئے تھے' چہرے اور ہاتھوں پر بے تحاشا میل کچیل تھا... صرف پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس نے گیارہ بارہ سال... اندام لڑکے کو عقب سے یوں دبوچ لیا تھا جیسے عقاب... دبوچتا ہے' اس کے دائیں ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالور... اور اس کی خوفناک نال عین لڑکے کی کنپٹی پر رکھی تھی۔

میں نے ذرا غور سے نووارد کی شکل دیکھی اور بھو... گیا۔ وہ پروفیسر اللہ دتا تھا۔ میری نظر دھوکا نہیں کھا... وہ پروفیسر اللہ دتا ہی تھا۔ اس نے جنونی انداز میں... "خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے' ورنہ اس... کی کھوپڑی اُڑا دوں گا۔"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہر شخص اپنی... ساکت و جامد کھڑا رہ گیا تھا۔ پھر جیسے دو گارڈز کو ہوش... ریوالور سونت کر چند قدم آگے بڑھے "خبردار!" پروفیسر... پھر دہاڑ کر کہا "گولی مار دوں گا۔"

اور پھر..... ایک گارڈ کو جھپٹتے دیکھ کر اس نے... کے سر میں گولی مار دی۔ طاقت ور ریوالور نے دھما... شعلہ چھوڑا اور میں نے لڑکے کی پیشانی کی جانب... پچکاری سی نکلتے دیکھی۔ یہ منظر اتنا دہشت ناک تھا کہ... لمحے کے لیے گارڈز بھی مبہوت رہ گئے۔ جس گارڈ نے... پر جھپٹنے کی حماقت کی تھی وہ بھی ایک لمحے کے لیے... تھا۔ اسی مختصر ترین مہلت میں پروفیسر نے ایک اور... گردن دبوچ لی اور اسے گھسیٹ کر کئی قدم پیچھے لے... وہی لڑکا تھا جس کا قد' اسقی کے دو... سب... تھا۔ اب "قاتل ریوالور" کی نال اس دوسرے لڑکے کی... سے چپکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اردگرد موجود افراد... ہو گئے ہیں "کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اسے بھی مار ڈالوں... گا!" پروفیسر نے خوفناک لہجے میں وارننگ دی۔

میں ان لمحوں میں ششدر تھا اور سوچ رہا تھا کہ... یہ وہی پروفیسر ہے جو بحری سفر کے دوران میں مائیکل... سایے سے لرزتا تھا..... اور ہر جگہ بے بسی کی تصویر... تھا.....

حالات کی گردش سے برسرِ پیکار شاہ جہاں کی سرگزشت... ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

آپ کی کہانی ... آپ کی زبانی

سچی کہانیاں

کنواری سہاگن خالدہ شاکر' سکھر	دشمن دوست عمر ایاز' اسلام آباد
اللہ والا یوسف' کراچی	عقب زن سلمان ارشد' اسلام آباد
آنکھوں دیکھی عاصم بختیار' کراچی	غصہ حرام ثمینہ' حیدرآباد
نئی زندگی جبران عدیل' حیدرآباد	کارِ دشوار منظور امام' کراچی
قیامت تک مسعود اکرام' کراچی	کامیاب کیس عبدالحمید شاہ' سرگودھا

پہلے' دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

انوکھی سہاگن

تحریر: ساجد امجد

محترمی و مکرمی، آداب

آپ کا منفرد میگزین میری تنہائیوں کا ساتھی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میری اپنی کہانی بھی اس میں شائع ہو جائے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتی کہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ کسی اور کے ساتھ نہیں ہوا ہو گا۔ مگر یہ ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ضرور ہے کہ ایسی صورتِ حال میں بھی قصوروار عورت کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے اور کچھ نہیں تو اسے منحوس ہی قرار دے دیا جاتا ہے۔ بہر حال آپ کہانی پڑھ لیں اور اپنے فیصلے سے مجھے بھی آگاہ کر دیں کہ یہ قابلِ اشاعت ہو گی یا نہیں؟

فقط والسلام

خالدہ شاکر۔ سکھر

میری شادی اپنے خالہ زاد بھائی سے اس وقت ہوئی تھی جب میں نے شادیاں دیکھی تو تھیں لیکن شادی کے مفہوم سے واقف نہیں تھی۔ میری عمر ہی کیا تھی، صرف گیارہ سال۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس عمر کی لڑکیاں بھی بہت سی باتیں بخوبی جانتی ہیں لیکن میں فطری طور پر بہت سیدھی تھی۔ پورا گھر مجھ سے بات بعد میں کرتا تھا بے وقوف پہلے کہتا تھا۔ کوئی کام بھی مجھے ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا تھا۔ اماں کے ڈر سے اسکول چلی جاتی تھی مگر پڑھائی میں کوری تھی۔

ایک دن میں کھیلتے ہوئے گھر میں آئی تو کسی کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ خالہ آئی ہوئی تھیں۔ میری شادی شدہ بہن ثریا بھی آئی ہوئی تھی اور اماں بھی تھیں۔ میں بھی جا کر بیٹھ گئی۔

"اب دیکھ لو۔ اتنی چھوٹی تو ہے یہ۔" اماں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لڑکیاں اپنی شادی کی بات سن کر شرما جاتی ہیں اور یہ ہے کہ یہاں آ کر جم گئی۔"

"آپا، یہ تو کوئی بہانہ نہیں ہوا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ جب میری شادی ہوئی تھی تو میری عمر بھی بارہ سے زیادہ نہیں تھی اور میں بھی اسی طرح اپنی شادی کی باتیں سنا کرتی تھی۔" خالہ نے کہا۔

"اب زمانہ بدل گیا ہے فاخرہ۔"

"لاکھ زمانہ بدل گیا ہو۔ ہم تو وہی ہیں۔"

"یہ کم بخت باؤلی سی تو ہے۔" اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"غیروں میں تو بیاہ کر نہیں جا رہی ہے کہ باتیں بنیں گی۔ میرے گھر جا رہی ہے۔ جیسی یہاں رہ رہی ہے وہاں رہ لے گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب سلیقہ آ جائے گا۔"

"میں تو اس کی کم عمری سے ڈرتی ہوں۔"

"یہ اگر گیارہ، بارہ کی ہے تو میرا شاکر اٹھارہ کا ہے۔ کون سا زیادہ فرق ہے۔"

"اچھا، مجھے کچھ اور سوچنے دو۔" اماں نے کہا۔

"سوچ لو لیکن ہو گا وہی جو میں نے کہہ دیا ہے۔" خالہ نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

میں سوچ رہی تھی شادی کی ان باتوں میں بار بار میرا ذکر کیوں آ رہا ہے۔ ذہن پر زور دینے کی عادت ہی نہیں تھی لہٰذا یہ خیال بھی فوراً جھٹک دیا۔

بات یہ تھی کہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو خالہ نے اپنے بیٹے شاکر کے لیے میرا رشتہ مانگ لیا تھا۔ اب خالو کو کینسر ہو گیا تھا اور ان کی زندگی ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق چند ماہ سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے، شاکر کی شادی ان کی زندگی ہی میں ہو جائے۔ میری خالہ اچھی پیسے والی تھیں اس لیے اماں بھی یہی چاہتی تھیں کہ میں اس گھر میں چلی جاؤں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ انہوں نے تو اپنی زندگی غربت میں کاٹ دی لیکن بیٹیوں کے لیے اچھا سوچیں گی۔ نصیبوں کے کھیل ہوتے ہیں۔ میری بڑی بہن کے سلسلے میں تو ان کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن اب میری قسمت کے دروازے پر خوش قسمتی دستک دے رہی تھی۔ اماں اس موقع کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ بس وہ اس بات سے ڈر رہی تھیں کہ میں بہت چھوٹی ہوں۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو کہیں ان کی بہن کسی اور لڑکی کو بیاہ کر اپنے گھر نہ لے آئے۔ بالآخر یہی طے پایا کہ میری شادی کر دی جائے۔

"اماں تیری شادی شاکر سے کر رہی ہیں۔" ایک دن میری بڑی بہن نے مجھے اطلاع دی۔

"میں نہیں کرتی شادی وادی اور وہ بھی شاکر بھائی سے۔ اتنا تو ڈانٹتے ہیں وہ مجھے۔"

"پگلی، ابھی ڈانٹتے ہیں نا۔ شادی کے بعد تھوڑی ڈانٹیں گے۔"

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

"پھر بھی۔ میں نہیں کرتی شادی۔"

"پہننے کو خوب سارا زیور ملے گا۔ اچھے اچھے کپڑے ملیں گے۔ ہروقت پیسے رہیں گے تیرے پاس۔"

"تمہاری بھی تو شادی ہوگئی ہے۔ ایک بھی زیور نہیں ہے تمہارے پاس۔"

"میری بات چھوڑ۔ میں تو غریب گھر میں بیاہی گئی ہوں۔ خالہ امیر ہیں۔ خوب زیور چڑھائیں گی تجھے۔"

میں زیور اور اچھے کپڑوں کے لالچ میں آگئی اور.... شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

میری اجازت ملتے ہی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

زیور اور اچھے اچھے کپڑوں کا شوق اپنی جگہ لیکن میری باجی نے جو نصیحتیں مجھے کیں انہیں سن کر مجھے شاکر سے ڈر لگنے لگا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ زیور اور کپڑے تو میں لے لوں گی لیکن شاکر بھائی سے بات بالکل نہیں کروں گی۔

شادی سے ایک دن پہلے جو زیورات اور کپڑے میرے لیے خالہ کے گھر سے آئے، انہیں دیکھ کر میری آنکھوں میں ساتوں رنگ اتر آئے تھے۔ میں نے خواب میں بھی ایسی چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔

"اماں، یہ سب میرے لیے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"چپ رہ کم بخت! کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ تیرے ہی لیے تو ہیں۔ یہی پہن کر تو، تو دلہن بنے گی۔"

"کتنا مزہ آئے گا نا؟"

"چپ رہ۔"

میں چپ ہوگئی کہ اماں تو مجھے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ ہروقت ڈانٹتی رہتی ہیں۔

نہایت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ ہماری طرف سے تو کچھ نہیں تھا لیکن خالہ نے خوب ارمان نکالے تھے۔

میں دلہن بن کر خالہ کے گھر پہنچ گئی۔ باجی بھی میرے ساتھ آئی تھیں۔ میں سیکڑوں مرتبہ خالہ کے گھر آئی تھی لیکن اس وقت میرے احساسات ہی دوسرے تھے۔ خوشی بھی تھی کہ میں نے اتنے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور الجھن بھی ہو رہی تھی کہ یہ لوگ مجھے باہر کیوں نہیں جانے دے رہے ہیں۔ کب تک گٹھری بنی بیٹھی رہوں گی۔ عورتیں مجھے گھیرے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان کے قہقہے، ان کی باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں۔ مجھے کھیلنے کے لیے باہر جانا تھا اور باجی مجھے جانے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

جب رات ہوئی تو مجھے ایک سجے ہوئے کمرے میں پہنچا دیا۔ اتنا شان دار کمرا دیکھ کر تو میری آنکھوں میں چمک آگئی۔

"باجی، ہم اتنے شان دار کمرے میں سوئیں گے؟"

"ہم نہیں۔ صرف تم۔" باجی نے کہا "اور اب بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دلہنیں بولتی نہیں ہیں۔ چپ چاپ یہاں بیٹھ جاؤ۔"

"تم بیٹھو گی تو میں بیٹھوں گی۔" میں نے کہا۔

"چل تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتی ہوں پھر میں چلی جاؤں گی۔ صبح آؤں گی۔"

"صبح! میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی۔ صبح تک تو میرا دم نکل جائے گا۔ میری اچھی باجی، تم بھی یہیں سو جاؤ۔"

"پاگل! میں یہاں کیسے سو سکتی ہوں۔ یہ تیرا کمرا ہے۔ ابھی تیرا دولہا آئے گا۔"

"دولہا کون شاکر؟ میں تو اسے گھسنے بھی نہیں دوں گی۔"

"اس نے تجھے اتنے ڈھیر سارے زیور دیے ہیں اور تو اسے گھسنے نہیں دے گی؟"

"مجھے نہیں چاہئیں زیور۔" میں نے زیور اتارنے شروع کردیے۔

باجی نے میرا ہاتھ پکڑلیا "جب شاکر آجائے اور تجھے بنا سنورا دیکھ لے تو پھر اتار دینا۔"

"مجھے اماں یاد آرہی ہیں۔" میں نے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔

میری آواز سن کر خالہ بھی اندر آگئیں۔ انہوں نے بھی مجھے سمجھانا شروع کردیا۔

"پگلی، کیا میں تیری ماں نہیں ہوں۔"

"پھر میں آپ کے پاس سوؤں گی۔ مجھے یہاں کیوں بٹھا دیا۔"

"جب شادی ہوجاتی ہے تو اماں کے پاس نہیں، دولہا کے کمرے میں رہتے ہیں۔ ابھی شاکر آئے گا۔ اس سے لڑنا مت، اس کا کہنا ماننا، وہ تیرا شوہر ہے۔"

ان کے سمجھانے سے میں چپ ہوگئی اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں چلی گئیں۔ جاتے وقت کمرے کا دروازہ بھی بند کرگئی تھیں اس لیے میں باہر بھی نہیں نکل سکتی تھی۔

زیور کے بوجھ سے میری گردن جھک گئی تھی۔ میں نے ایک ایک کرکے سارے زیور اتار دیے۔ دوپٹا اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور آرام سے لیٹ گئی۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ اندر سے دروازہ بند نہیں کیا لہٰذا کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور شاکر اندر آگیا۔ اس نے اندر آتے ہی دروازہ بند کرلیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور میرے بستر پر بیٹھ گیا۔

"شاکر بھائی، تم یہاں کیوں بیٹھ رہے ہو۔"

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے اس لیے بیٹھ رہا ہوں۔"

"مجھے نہیں سننی تمہاری کوئی بات وات۔ تم اپنے کمرے میں جاکر سو جاؤ۔ یہ میرا کمرا ہے۔"

"اماں نے مجھ سے تمہاری شادی کرائی ہے۔ اب مجھے یہیں سونا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ پھر میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔" میں نے کہا اور بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔

شاکر دروازہ روک کر کھڑا ہوگیا "خالدہ یہاں سے جانا مت ورنہ لوگ تم پر بھی ہنسیں گے، مجھ پر بھی۔"

"تم مجھے مارو گے تو نہیں؟"

"ماروں گا کیوں۔ میں تو تمہیں پیار کروں گا۔"

"پیار بھی مت کرنا۔ مجھے تم اچھے ہی نہیں لگتے ہو۔"

"پھر تم نے شادی کیوں کی۔"

"زیور کے لیے۔ اور مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں جارہی ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑلیا "خالدہ، تم یہاں سے جاؤ مت۔ میں زمین پر لیٹ جاؤں گا۔ تم بستر پر سو جانا۔"

میں نے سوچا باہر جاؤں گی تو باجی پھر سمجھانے بیٹھ جائیں گی لہٰذا یہی بہتر ہے۔ شاکر زمین پر لیٹ گیا اور میں بستر پر آرام سے لیٹ کر سو گئی۔

صبح ہوئی تو شاکر نے ڈرتے ڈرتے مجھے جگایا۔ میں سمجھی ابھی رات ہے اور وہ میرے بستر پر آنے کے لیے مجھے اٹھا رہا ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ڈھیلے ہاتھ کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔ اس پر جو بھی گزری ہو، اس نے اس تھپڑ کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں پھر سو گئی تھی لیکن خالہ اور باجی اندر آگئیں اور انہوں نے مجھے اٹھا دیا۔

"اٹھ کر نہالے اور تیار ہوجا۔ عورتیں ابھی تجھے دیکھنے آئیں گی۔" باجی نے کہا۔

"کیوں دیکھنے آئیں گی۔ میں کوئی تماشا ہوں۔"

"پاگل تو دلہن ہے اور عورتیں دلہن دیکھنے آتی ہیں۔ چل اٹھ، جلدی کر۔"

میں اب اٹھ تو گئی تھی۔ ان سے جھگڑنے کا کیا فائدہ ہوتا۔ میں خاموشی سے غسل خانے میں چلی گئی۔

"تو نے شاکر کو تنگ تو نہیں کیا تھا؟" باجی نے مجھے تیار کراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں یہ بات چھپا گئی کہ شاکر زمین پر سویا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں باجی میری پٹائی نہ کردیں۔

تھوڑی دیر بعد عورتوں سے گھر بھر گیا۔ ایک ایک عورت میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور پیسے دے رہی تھی۔ مجھے الجھن تو بہت ہو رہی تھی لیکن خوشی بھی ہو رہی تھی کہ خوب پیسے مل رہے ہیں۔

مجھے یہ سوچ سوچ کر ہنسی آرہی تھی کہ میں نے شاکر بھائی کے کیسا شان دار تھپڑ لگایا۔ دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ وہ بدلہ ضرور لے گا۔ ہوسکتا ہے وہ آج زمین پر نہ سوئے۔

جب میں نے یہ سنا کہ میں باجی کے ساتھ اپنے گھر جاؤں گی تو میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔

خالہ نے مجھے گلے سے لگا کر رخصت کیا اور میں باجی کے ساتھ خوشی خوشی اپنے گھر آگئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں بعد اپنے گھر آئی ہوں۔ اماں کو دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اماں، اب میں تمہارے پاس سوؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی خالہ کے گھر۔"

"بے وقوف! یہ دن ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ اسے سسرال ہی میں رہنا پڑتا ہے۔ تو تو پھر بھی خوش قسمت ہے کہ خالہ کے گھر بیاہ کر گئی ہے۔ میں اگر تیری ماں ہوں تو وہ بھی تیری ماں ہے۔"

"وہ تمہاری جیسی نہیں ہیں۔" میں نے منہ پھلا کر کہا "تم تو مجھے اپنے پاس سلاتی تھیں۔ انہوں نے مجھے الگ کمرے میں ڈال دیا تھا۔"

اماں کو ہنسی آگئی "تیری شادی ہوگئی ہے۔ میں بھی ہوتی تو تجھے اپنے پاس نہ سلاتی۔"

"میرا دل گھبراتا ہے۔"

"دو چار دن میں عادت پڑ جائے گی پھر یہ گھر تجھے اچھا نہیں لگے گا۔ وہیں رہا کرے گی۔"

"اماں، میں باہر کھیلنے چلی جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تیری شادی ہوگئی ہے۔ یہ کھیل کود چھوڑ۔" اماں نے کہا "اور ہاں، اب تو ہر بات شاکر سے پوچھا کر۔ مجھ سے نہیں۔"

"ان سے کیوں پوچھوں۔ وہ کون لگتے ہیں میرے۔"

"وہ تیرا شوہر ہے۔ ہر بات شوہر سے پوچھتے ہیں۔ تو نے دیکھا نہیں ہے؟ میں ہروقت تیرے ابا سے پوچھتی ہوں یا نہیں؟"

ان کی بات میری سمجھ میں تو آرہی تھی لیکن عمر اتنی کم تھی کہ ان باتوں کا شعور ہی نہیں تھا۔ وہ جذبہ ابھی مجھ میں بیدار ہی نہیں ہوا تھا جو کسی کی طرف محبت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاکر کی طرف محبت سے کیا دیکھتی۔ مجھے تو اس سے ڈر ہی لگتا رہتا تھا۔

شام ہوئی تو خالہ اور شاکر مجھے لینے کے لیے آئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شاکر کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ غصے میں تو نہیں ہے مجھے اپنا تھپڑ ابھی تک یاد تھا لیکن جب میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے تو میری جان میں جان آئی۔

خالہ کے گھر کے آنگن میں رات اتری تو پھر وہی مسئلہ درپیش تھا کہ مجھے اور شاکر کو ایک ہی کمرے میں سونا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر مچل گئی لیکن بیکار۔ خالہ نے مجھے سمجھایا اور پھر زبردستی کمرے میں چھوڑ آئیں۔ کچھ دیر بعد وہی ہوا کہ شاکر بھی آگئے۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں آگئی ہوں تو تم اپنی من مانی کرلو گے۔ میں تمہیں اپنے قریب بھی نہیں بیٹھنے دوں گی۔" میں نے کہا۔

"تم نہیں چاہتیں تو نہیں بیٹھوں گا تمہارے قریب لیکن تم سے باتیں تو کرسکتا ہوں۔"

"دور بیٹھ کر۔" میں نے کہا اور وہ کرسی گھسیٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"دیکھو خالدہ۔ دنیا کی نظروں میں ہماری شادی ہوگئی ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں لیکن تم اتنی چھوٹی ہو کہ میاں بیوی کے رشتے سے واقف ہی نہیں ہو۔ یا پھر مجھ سے وہ تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ جو تم کہو گی وہ کروں گا لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوگیا تھا کہ شاید میں کچھ کہوں لیکن جب میں خاموش رہی تو اس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم الگ الگ سوتے ہیں۔ کسی کو کچھ مت بتانا ورنہ میں زبردستی تمہارے بستر پر سو جاؤں گا۔ دوسرے یہ کہ دن کے وقت اور خاص طور پر اماں کے سامنے تم مجھ سے بات کرلیا کرو ورنہ اماں کو دکھ ہوگا۔"

میں نے اس کی یہ دونوں باتیں مان لیں۔ وہ خوش ہوگیا۔

"تم لوڈو کھیلنا جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں۔"

"میرے ساتھ کھیلو گی؟"

"ہاں لوڈو کھیلیں۔"

اس نے شاید دن ہی کے وقت لوڈو لاکر رکھ لیا تھا۔ الماری کے اوپر سے لوڈو اتارا اور ہم دونوں کھیلنے بیٹھ گئے۔

جب کھیلتے کھیلتے تھک گئے تو اس نے زمین پر بستر بچھایا اور میں آرام سے بستر پر سو گئی۔ یہ تھی ہماری شادی کی دوسری رات۔

میں نے اس دن کے بعد سے شاکر کی دونوں باتوں پر عمل کرنا شروع کردیا تھا۔ نہ تو میں نے کسی کو یہ بتایا کہ ہم ابھی تک غیر ہیں اور نہ ہی کسی پر یہ ظاہر ہونے دیا کہ شاکر سے میری بول چال نہیں ہے۔ جب خالہ موجود ہوتیں تو میں شاکر سے خوب باتیں کرتی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ دیکھ کر خوب خوش ہوتی تھیں۔

میری شادی صرف اس لیے ہوئی تھی کہ میرے خالو کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا لیکن میرے قدم ایسے مبارک تھے کہ ان کی صحت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔

شاکر نے انٹر کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا تھا۔ اب اسے انجینئر بننے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینا تھا لہٰذا اسے کراچی جانا پڑا۔

کراچی میں ہمارا کوئی رشتے دار تو تھا نہیں لہٰذا اسے ہوسٹل میں رہنا پڑا۔

وہ کراچی چلا گیا تو میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ اب مجھے کسی اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جب زمین پر سوتا تھا تو مجھے کچھ شرمندگی سی ہوتی تھی کہ وہ بڑا ہو کر زمین پر سو رہا ہے۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اس شرمندگی سے بھی چھٹکارا مل گیا۔ میں اب ٹھاٹ سے خالہ کے پاس سونے لگی تھی۔ مہینے دو مہینے میں شاکر آجاتا تھا تو بہ مجبوری اپنے کمرے میں سونا پڑتا تھا مگر اسی طرح، غیروں کی طرح۔

شاکر نے جس طرح میرا کہنا مانا تھا، میرے دل میں اس کے لیے بڑی عزت پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ کراچی سے آتا تھا تو میں اس کی مہمانوں کی طرح عزت کرتی تھی لیکن اس کا خوف دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ اس کے قریب جانے سے ڈرتی تھی۔

شاکر کے چلے جانے کے بعد میں گھر میں اکیلی رہ گئی تھی اس لیے خالہ نے بہتر سمجھا کہ میری پڑھائی کا بندوبست کردیں۔ میرا وقت بھی کٹ جائے گا اور میں پڑھ بھی لوں گی۔

"میرا بیٹا خیر سے انجینئر بن جائے گا۔ تو بھی کچھ نہ کچھ پڑھ لے گی تو وقت اچھا گزر جائے گا۔" خالہ نے کہا۔

میرا پڑھنے میں دل تو نہیں تھا لیکن گھر میں پڑے پڑے کرتی بھی کیا۔ میں نے خالہ کا کہنا مان لیا۔ میں اب اسکول میں تو داخلہ لے نہیں سکتی تھی، پرائیویٹ رجسٹریشن کرالیا۔ ایک ماسٹر صاحب مجھے ٹیوشن پڑھانے کے لیے آنے لگے اور میں نے میٹرک پاس کرلیا۔ میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ مجھے سب خوش قسمت کہتے تھے کہ میں نے تعلیم بھی حاصل کرلی اور شاکر جیسا پڑھا لکھا شوہر بھی مجھے مل گیا۔

پانچ سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ شاکر انجینئرنگ کے آخری سال کا امتحان دینے کے بعد سکھر واپس آگیا تھا۔ اب میں بھی عمر کے اس حصے میں آگئی تھی جب بہت سے راز خود بخود کھلنے لگتے ہیں۔ میاں بیوی کا رشتہ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

اب میں پیچھے پلٹ کر دیکھتی تھی تو اپنی زیادتیاں صاف نظر آتی تھیں۔ میں سوچتی تھی، میں نے نادانستگی میں شاکر کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ میں اس کی گناہگار ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ہی شاکر مجھے نیکی کا فرشتہ نظر آنے لگا۔ اس نے محض میری خوشی کی خاطر اپنے جذبات کا گلا گھونٹ لیا تھا۔ شاکر جیسا مرد کوئی لاکھوں میں ایک ہی ہوگا جسے اپنی بیوی کی خوشی کا اس حد تک خیال ہو۔

ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے سوچ لیا تھا کہ اب شاکر آئے گا تو میں اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی اور غیریت کی ہر دیوار گرا دوں گی۔

وہ آیا تو میرے خیالوں کو زبان مل گئی۔ ہم دونوں سونے کے لیے کمرے میں آئے تو میں نے اسے زمین پر بستر لگانے سے منع کردیا۔

"بس آج سے آپ زمین پر نہیں سوئیں گے۔ یہ بیڈ آخر کس لیے ہے؟"

"اور تم؟"

"میں بھی اسی بیڈ پر آپ کے ساتھ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے قریب بیٹھوں گا بھی نہیں بلکہ تم ہی نے مجھ سے کہا تھا۔"

"وہ میرا بچپن تھا، نادانی تھی۔ میں نے نادانستگی میں آپ کو بہت سزا دے لی۔ خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔

"ارے یہ کیا کررہی ہو۔ مجھے برا تھوڑی لگا ہے۔ جو کچھ تم نے کہا میں اس پر خوشی سے عمل کررہا ہوں بلکہ مجھے تو یہ خوشی ہے کہ تم نے ابھی تک کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بس اسی طرح میری نصیحت پر عمل کرتی رہنا۔ ہم ایک ساتھ رہیں گے، باتیں کریں گے، کھیلیں گے لیکن سوئیں گے الگ۔"

"شاکر، اب میں بچی نہیں ہوں کہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر لوڈو کھیلتی رہوں۔"

"مجھے ابھی تک تمہارا تھپڑ یاد ہے۔ اب میں دوسرا تھپڑ کھانا نہیں چاہتا۔"

"میرا اندازہ درست تھا۔ تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو۔ میں تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہی ہوں۔ تم پھر بھی مجھے معاف نہیں کرتے۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ غصہ اترے گا تو میں خود ہی تمہارے قریب آجاؤں گا۔"

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ مجھ میں بھی اس سے زیادہ خوشامد کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے زمین پر بستر لگایا اور میں بیڈ پر لیٹ گئی۔

اس کے خراٹوں کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں اور میں جاگ رہی تھی۔ مجھے اپنے کیے پر ندامت ہورہی تھی۔ مجھے شدت سے احساس ہورہا تھا کہ میں نے اپنی کم عقلی کی بدولت شاکر کے دل میں اپنے لیے نفرت پیدا کردی لیکن اس میں میرا قصور بھی کیا تھا۔ وہ میرا بچپن تھا لیکن شاکر اس کی سزا مجھے اب تک دے رہا ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ میری خاطر قربانی دے رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ اپنی انا کا شکار ہے۔ میرا ایک تھپڑ اسے اب تک یاد ہے۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میں اسے سزا دے رہی ہوں۔ اب معلوم ہوا کہ وہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ وہ یہ سزا کب تک دیتا ہے۔ اب تو ایک ہی گھر میں رہنا ہے کبھی نہ کبھی تو یہ پتھر پگھل ہی جائے گا۔

اس دن کے بعد سے میرے اور شاکر کے درمیان ایک سمجھوتا ہوگیا تھا۔ وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ میں بھی اس کی خدمت میں مصروف رہتی تھی لیکن ہم دونوں کے بدن ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔

شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک دن خالہ کی باتوں نے مجھے فکرمند کردیا۔

"خالدہ، میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے تجھ جیسی بہو مل گئی۔ تو نے مجھے کسی دن ساس سمجھا ہی نہیں۔ میری کسی بات پر پلٹ کر جواب دیا ہی نہیں۔ خدا ایسی بہو سب کو

دے۔ بس اب ایک ہی آرزو ہے کہ تیری گود بھر جائے۔ میں شاکر کے بچوں سے اپنا آنگن بھرا ہوا دیکھوں۔ شادی کو کتنے سال گزر گئے لیکن اب تک ایک پھول بھی نہیں کھلا۔"

ان کی بات سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں نے آج تک اس پہلو سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اچانک میرے اندر بھی اس جذبے نے شور مچایا کہ مجھے ماں بننا چاہیے۔ اب میں خالہ کو کیا بتاتی کہ ہم نے اب تک چلنا ہی شروع نہیں کیا تو منزل کیا ملے۔

ان کی اس بات کو شاید میں بھول بھی جاتی لیکن جب انہوں نے آنے جانے والوں کے سامنے بھی یہ باتیں شروع کردیں تو مجھے کسی طوفان کے آنے کا احساس ہونا شروع ہوگیا۔ اب میرے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ شاکر سے ایک مرتبہ پھر بات کروں۔

اس رات وہ سونے کے لیے لیٹا تو میں اس کے برابر لیٹ گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ گھبرا کر اٹھ گیا۔

"میں تمہاری بیوی ہوں۔ اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے۔"

"تمہاری اپنی شرط یہی تھی۔ میں کیا کروں۔"

"میں خود ہی اپنی شرط کو ختم کررہی ہوں پھر تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"میں اسی شرط پر قائم رہنا چاہتا ہوں۔"

"شاکر، اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔ اب غصہ تھوک دو۔"

"مجھے غصہ نہیں ہے۔ تمہاری شرط پوری کررہا ہوں۔"

"شاکر، یہ بھی تو سوچو گھر میں کیا باتیں ہورہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہاری ماں پوچھ رہی تھیں، اب تک بچہ کیوں نہیں ہوا۔ اب بتاؤ میں انہیں کیا جواب دوں۔"

"کچھ بھی کہہ دو مگر میری جان چھوڑو۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی کہہ دوں گی کہ تمہارا بیٹا مجھے بیوی سمجھتا ہی نہیں تو بچہ کیا خاک ہوگا۔"

"کہہ کر دیکھو تو۔ وہ دن اس گھر میں تمہارا آخری دن ہوگا۔"

"شاکر، مجھے اتنی بڑی سزا مت دو۔ جو کچھ میں نے تمہارے ساتھ کیا وہ میری نادانی تھی، میرا بچپن تھا مگر اب میں بچی نہیں ہوں۔"

"دیکھو خالدہ! اب وہ تم سے پوچھیں تو کہہ دینا کہ خدا کی مرضی، نہیں ہوتا بچہ۔"

"ان سے تو کہہ دوں گی لیکن اپنے دل کو کیا سمجھاؤں گی۔"

"یہ تو اس وقت سوچنے کی بات تھی جب مجھے تھپڑ مار رہی تھیں۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس وقت میں بچی تھی۔"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جب میرا غصہ اتر جائے گا میں خود تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

"وہ دن کب آئے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب پانی سر سے اونچا ہونے والا ہے۔"

"جب پانی سر سے اونچا ہوجائے گا اس وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی ایسا کچھ نہیں ہے۔ آرام سے سو جاؤ۔" اس نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی رہی پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹ تو گئی تھی لیکن نیند کیسے آتی۔ خیالوں کا ہجوم تھا جس نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی، شاکر کیا پتھر کا بنا ہوا ہے؟ کیا میں اس کی ضرورت نہیں ہوں۔ ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی اسے میری ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کیسا غصہ ہے جو اترنے ہی میں نہیں آتا۔ شاید یہ غصہ نہیں نفرت ہے۔ اسے میرے جذبات کی، میری خوشی کی، میری تذلیل کی پرواہی نہیں۔ ایک خیال دل میں یہ آیا کہ میں سب کو بتادوں۔ دوسروں کو بھی تو معلوم ہو کہ شاکر کا میرے ساتھ کیا سلوک ہے۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں نے بتادیا تو شاکر مجھے طلاق دے دے گا۔ میں جب تک اس کے ساتھ ہوں کوئی اُمید تو ہے پھر یہ اُمید بھی نہیں رہے گی۔ اس سے تو بہتر ہے میں چپ سادھ لوں۔

انہی خیالوں میں صبح ہوگئی اور پھر ہر رات کی اسی طرح صبح ہوتی رہی۔ میری تقدیر سوگئی اور میں جاگتی رہی۔

خالہ کے تقاضے بڑھتے جارہے تھے۔ میں شاکر سے الجھتے الجھتے تھک چکی تھی۔ اب یہ بات میرے گھر تک بھی پہنچ چکی تھی۔ اماں نے بھی مجھ سے پوچھا اور باجی نے بھی۔ میں وہی ایک جملہ دہراتی رہی کہ خدا کی مرضی، میں کیا کروں۔

"بیٹا! خدا کی مرضی تو ہم سب کا ایمان ہے لیکن انسان کچھ اپنی تدبیر بھی تو کرتا ہے۔ تم دونوں اپنا چیک اپ تو کرواؤ۔" ایک دن خالہ نے مشورہ دیا۔

"میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی۔ آپ ہی شاکر کو سمجھائیں۔ میں تو تیار ہوں۔"

"ہاں بیٹا، کچھ دوا دارو کرو۔ شاکر آئے تو اسے میرے پاس بھیجنا۔"

شاکر نے کچھ دنوں سے یہ وتیرہ بنالیا تھا کہ گھر میں بہت کم نظر آتا تھا۔ رات کو بھی دیر سے گھر آتا تھا۔ اس روز وہ ذرا دیر کو گھر آیا تو میں نے اسے خالہ کا پیغام پہنچادیا۔ وہ تو اب بھی ٹال جاتا لیکن میں اسے زبردستی پکڑ کر خالہ کے پاس لے گئی۔ وہ کچھ دیر اپنی ماں سے بھی الجھتا رہا کہ جب اولاد ہونا ہوگی تو ہوجائے گی لیکن بالآخر اسے جھکنا پڑا اور وہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے پر تیار ہو گیا۔

وہ کس منہ سے ڈاکٹر کے پاس جاتا۔ مجھے لے کر گھر سے نکلا ضرور لیکن اِدھر اُدھر گھما کر واپس لے آیا۔

"کیا ہوا۔ دکھایا ڈاکٹر کو۔ کیا کہا اس نے؟" خالہ نے پوچھا۔

"بظاہر تو سب ٹھیک ہے۔ مکمل رپورٹ کل ملے گی۔" شاکر نے کہا۔

خالہ خوش ہوگئیں لیکن میں شاکر کے اس سفید جھوٹ پر تلملا کر رہ گئی۔

ڈاکٹروں کو دکھایا ہی نہیں تھا تو رپورٹ کیا آتی۔ شاکر نے آکر بتادیا کہ دونوں کی رپورٹیں بالکل ٹھیک ہیں۔

خالہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے "جب رپورٹیں ٹھیک ہیں تو پھر اللہ سنتا کیوں نہیں۔ کیا میں یہ آرزو لے کر قبر میں چلی جاؤں گی کہ تیرے بچے کھلاؤں۔"

میں ایک مرتبہ پھر شاکر سے الجھ پڑی لیکن اس نے تو ایسی قسم کھائی تھی کہ ٹوٹنے ہی میں نہیں آتی تھی۔ میں اپنی نادانی سے یہی سمجھ رہی تھی کہ غلطی میری ہی ہے۔ میں نے شروع کے دنوں میں اس کے دل میں نفرت کی ایسی گرہ ڈال دی ہے جو کھلنے ہی میں نہیں آرہی ہے۔

میری راتیں ویران ہو گئی تھیں۔ میں شادی شدہ ہو کر بھی سہاگن نہیں تھی۔ ایک طوفان سا میرے اندر ابھرتا اور دم توڑ دیتا تھا۔ دنیا کی نظروں میں، میں خوش قسمت تھی لیکن جو میرا حال تھا وہ میں جانتی تھی۔ ایک بھرپور مرد میرے کمرے میں رہتا تھا لیکن میں اس کے قریب نہیں جاسکتی تھی۔ دریا میں رہ کر بھی پیاسی تھی۔ اپنی حالت سے زیادہ مجھے شاکر کی حالت پر ترس آتا تھا۔ میری طرح وہ بھی تو محرومی کی زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی میں اس کی حالت پر ترس کھاتی تھی۔ کبھی اپنی حالت کا ماتم کرتی تھی۔

جب اپنے پاس برتن نہ ہو تو دوسرے کے برتن سے پیاس بجھالی جاتی ہے۔ شدتِ جذبات سے مجبور ہو کر کئی مرتبہ گناہ کا خیال آیا۔ ایک مرتبہ تو اس خیال نے عملی صورت اختیار کرہی لی تھی کہ مجھے شاکر کی عزت کا خیال آگیا اور میں راستے سے لوٹ آئی۔

میں نے شاکر کے ایک دوست کو اس خیال ... خیال بنانا چاہا تھا کہ وہ شاکر کو سمجھائے گا۔ میں ایک ... ہوں کہ میں نے کسی رشتے دار کی مدد لینے کے بجائے ... سہارا لینا چاہا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایک ... کو معلوم ہوتا تو سب تک بات پہنچتی اور پھر بات ... غلطیاں بھی سامنے آتیں۔ میں نے ان حالات میں ... سمجھا کہ اس کے دوست محسن سے مدد لوں۔ میں ... مول انداز میں پوری بات اسے بتادی۔

"بھابی، بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔ مجھے تو رحم ... آپ پر کہ آپ کس طرح زندگی گزار رہی ہیں۔ آپ ... بھی ہیں، خوب صورت بھی۔ کس طرح وقت کاٹتی ... خیر، میں اس سے بات کروں گا۔"

ہمدردی کے دو بول اس کی زبان سے سنے تو وہ ... لگنے لگا۔ اپنے آدمی سے تو یہ غیر اچھا ہے۔ اسے میری ... بسی کا احساس تو ہوا۔

محسن کے اس اظہارِ ہمدردی میں اس کا اپنا مطلب ... ہوا تھا۔ وہ میری کمزوری سے واقف ہو گیا تھا۔ اس ... ہمدردی کی باتیں کر کر کے میرا اعتماد ... لیا۔

وہ شاکر سے ملنے پہلے بھی آیا کرتا ... پردہ بھی نہیں تھا لیکن اب زیادہ آنے لگا۔ میں بھی ... رکھنے کے لیے اس کی خوب خدمت کرنے لگی ... ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی تاکہ وہ خوش ہو اور خوب ... طرح میری حمایت کرے۔ میری اس خوش اخلاقی نے ... کے دل میں چور پیدا کردیا۔

ایک دن خالہ گھر پر نہیں تھیں۔ شاکر بھی گھر پر نہیں ... کہ محسن آگیا۔ خالو گھر پر تھے لیکن ان کا ہونا نہ ہونا برابر ... اپنے کمرے میں پڑے زندگی کے دن پورے کر رہے ... انہیں تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا، گھر میں کون آیا کون گیا۔

محسن کو دیکھ کر میں خوش ہو گئی کہ اس وقت گھر میں کوئی ... نہیں ہے، خوب کھل کر باتیں کروں گی۔

"بیٹھیے محسن بھائی، کوئی بات بنی؟"

"بھابی، ایک بات بتادوں۔ وہ میرا دوست ہے تو کیا ... بڑا ہی ڈھیٹ آدمی ہے بلکہ میں تو ناشکرا کہوں گا جو ایسی خوب ... صورت بیوی کی قدر نہیں کرتا۔" اس نے کہا اور اپنی جگہ ... سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔

"میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔"

میں نے اٹھنا چاہا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "بیٹھیے ...

... آپ کو ایک خاص بات بتانے والا ہوں۔"

... زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مرد نے، ایسی ویسی نیت سے ... ہاتھ پکڑا تھا۔ میں اتنی پیاسی تھی کہ پانی کے یہ قطرے ... دریا معلوم ہوئے۔ میں سمجھی وہ کوئی خاص بات بتانے ... اور رازداری کی وجہ سے میرے قریب آکر بیٹھ گیا ... میں پھر بیٹھ گئی۔

"خالدہ، تم کیوں اس کے چکر میں اپنی زندگی خراب ... رہی ہو۔ اسے تمہاری پروا نہیں ہے تم بھی اس کی پروا ... کرو۔"

"محسن بھائی، آپ تو مجھے بھابی کہتے تھے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ نام لینے سے اپنی اپنی لگتی ہو۔" اس ... پھر میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں تو کہوں گی یہاں تک پہنچنے میں بھی قصور شاکر ہی کا ... اس نے کبھی پیار کے دو بول نہیں بولے تھے۔ محسن نے ... کیا تو میں اسے ڈانٹنے کے بجائے گردن جھکا کر بیٹھ ... گئی۔ میری خاموشی نے اس کی ہمت بڑھادی۔

"خالدہ، جو محبت تمہیں شاکر نہیں دے سکا وہ میں ... تمہیں دوں گا۔"

"پھر بھی وہ بات گناہ ہوگی۔"

"کیوں نہیں ہوگی۔ تم کہو گی تو میں تم سے شادی کرلوں گا۔ کیوں اپنی جوانی کو ضائع کررہی ہو۔ تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے اور وہ میں ہوں۔"

میری تمام اداس راتیں سمٹ کر میرے سامنے آگئیں۔ میں حسرت سے محسن کی طرف تکنے لگی۔

"میں آتے وقت دروازہ بند کر آیا تھا۔"

"دروازہ کھول کر چلے جاؤ۔ خالہ آنے والی ہوں گی۔"

"چلو پھر کبھی سہی۔ اب دوستی تو پکی ہو ہی گئی ہے۔"

"دوبارہ اس نیت سے یہاں مت آنا۔"

"کیا کہہ رہی ہو۔"

"صحیح کہہ رہی ہوں۔ جب تک میں شاکر کے ساتھ ہوں، اس کی ہوں۔ اگر اس کی نہ رہی تو پھر تم سے اچھا آدمی میرے لیے کوئی نہیں ہوگا۔ اب تم جاؤ۔"

اس نے میرے تیور دیکھے تو اسی میں عافیت سمجھی کہ خاموشی سے رخصت ہوجائے۔

اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ جس باغ کا کوئی مالی نہ ہو وہ خود بھی اجڑتا ہے، دوسرے بھی اسے اجاڑنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کمزور پر سب کا بس چلتا ہے۔ محسن نے میری کمزوری ہی سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ میری کمزوری ہی نے اسے طاقت ور بنایا تھا۔ اگر شاکر نے مجھے اپنالیا ہوتا تو آج محسن کو میرا ہاتھ پکڑنے کی جُرات نہ ہوتی۔ مجھے اس وقت شاکر پر بے انتہا غصہ آرہا تھا۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ اگر میں کسی گناہ کا شکار ہو گئی تو قصوروار وہ ہوگا۔ خاندان بھر کی رسوائی بھی ہوگی۔ اور میں؟ دنیا بڑی ظالم ہے۔ قصوروار مجھی کو ٹھہرائے گی۔ میرے کہے کا یقین کون کرے گا۔ میں نے آج اپنے آپ کو بچالیا ہے، کیا خبر کل نہ بچاسکوں۔ مجھے اس سے پہلے کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ اب میں زیادہ دیر تنہائی کی آگ میں نہیں جل سکتی۔ شاکر کو اگر میری ضرورت نہیں ہے تو مجھے چھوڑ دے۔ آج میں شاکر سے بات کرکے رہوں گی۔

اس روز میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شاکر سے دو ٹوک بات کرکے رہوں گی لیکن وہ آیا تو ایسی ویسی بات کرنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ اسے نوکری مل گئی تھی لیکن اس نوکری میں بس ایک خرابی تھی کہ اسے حیدر آباد میں رہنا تھا۔ میں نے تو بعد میں یہی سوچا تھا کہ اس نے جان بوجھ کر حیدر آباد میں رہنا پسند کیا تھا تاکہ وہ مجھ سے دور ہوجائے۔ اس وقت میں خوش ہوگئی تھی کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔

اس نے پہلے تو یہ بہانہ کیا کہ وہ پہلے اکیلا جاکر اور کچھ دن رہ کر وہاں کا جائزہ لے لے۔ مکان وغیرہ کا بندوبست کرلے، اس کے بعد وہ مجھے لے جائے گا اس کے بعد اس نے یہ جواز پیش کردیا کہ میرے جانے کے بعد خالہ اکیلی رہ جائیں گی اس لیے وہ مجھے حیدر آباد نہیں لے جاسکتا۔ سکھر سے حیدر آباد کچھ زیادہ دور نہیں تھا لیکن جو ہمارے حالات تھے ان میں یہ فاصلہ ہم دونوں کو اور بھی دور کر سکتا تھا اس لیے میں اس پر تیار نہیں تھی کہ وہ اکیلا جائے۔ میں نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"مجھے آپ ساتھ لے کر جائیں ورنہ میں اپنی ماں کے گھر رہوں گی۔ یہاں ہرگز نہیں رہوں گی۔" میں نے کہا۔

"ابا کی حالت تم دیکھ رہی ہو۔ گھر کی نگرانی کرنے والا کوئی تو ہو۔ تم یہاں رہو گی تو مجھے اطمینان رہے گا۔"

"میں گھر کی نگرانی کے لیے نہیں آئی ہوں۔ تم نے آج تک مجھے اپنی بیوی نہیں سمجھا لیکن یہ حق تو رکھتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہ سکوں۔"

"میں یہاں تیسرے چوتھے دن آتا رہوں گا۔ تم مجھے اپنے ساتھ ہی سمجھو۔"

"آؤ گے بھی تو کیا فائدہ۔ یہاں کون سا تم نے مجھے اپنالیا۔"

"یہ باتیں اس وقت مت نکالو۔"

"کیوں نہ نکالوں۔ تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ اگر میں بہک گئی۔ میں نے تنہائی کا فائدہ اٹھالیا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہ جاؤ گے۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر تم کسی سے تعلقات رکھتی ہو تو یہ تمہارا ذاتی فعل ہے۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔"

"تم کیسے آدمی ہو شاکر۔ تم مرد بھی ہو کہ نہیں۔ ایسی بات منہ سے نکالتے ہوئے بھی تمہیں غیرت آنی چاہیے۔"

"تمہیں معلوم ہے' میں تمہاری کوئی بات نہیں ٹالتا۔ تم جو کہتی ہو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر تم کسی سے تعلق رکھنا چاہو تو مجھے لاکھ برا لگے' مجھے برداشت کرنا ہوگا۔"

"جب تم میرا ہر حکم مانتے ہو تو یہ کیوں نہیں مانتے کہ مجھے اپنالو۔ یہ کیوں نہیں مانتے کہ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ اگر ابھی تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تو اماں کو دکھ ہوگا۔ میں کچھ دن اکیلے رہنے کے بعد تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا پھر ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔"

اس ایک اشارے نے مجھے باغ و بہار کردیا۔ نئی زندگی شروع کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ اس کا غصہ اتر گیا ہے اور وہ مجھے اپنانے کو تیار ہے۔ میں اس کی باتوں میں آگئی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ جب وہ اکیلا رہے گا تو اسے میری قدر ہوگی۔ میں بہل گئی اور وہ سکھر سے حیدر آباد چلا گیا۔

وہ ہر ہفتے آتا ضرور تھا لیکن زیادہ تر خالہ کے پاس بیٹھا رہتا۔ دوستوں کے ساتھ گھومنے کے لیے نکل جاتا۔ رات گئے واپس آتا اور آتے ہی سو جاتا۔ اتنا موقع ہی نہ دیتا کہ میں کوئی بات کرتی۔

خالہ کا رویہ اب میرے ساتھ تلخ سے تلخ تر ہوتا جارہا تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ میری گود اب تک خالی تھی اور جس طرح میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا' وہ بھی انتظار کرتے کرتے تھک چکی تھیں۔ جب تک شاکر یہاں تھا وہ کھل کر کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن اب میدان خالی تھا۔ کبھی میں ان کی چہیتی بہو تھی لیکن اب انہیں میرے ہر کام میں کیڑے نظر آتے تھے۔ اپنے لیے "بانجھ" کا لفظ پہلی مرتبہ میں نے ان ہی سے سنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں بانجھ نہیں ہوں اس لیے یہ لفظ سنتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"میں ماں کیوں نہیں بنتی' یہ کسی دن آپ اپنے بیٹے سے پوچھئے گا۔ میں اگر زبان نہیں کھولتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قصوروار بھی ہوں۔ قصوروار آپ کا بیٹا ہے۔"

یہ سنتے ہی خالہ نے پورا گھر سر پر اٹھالیا "غضب خدا کا۔ اپنا الزام میرے بچے پر رکھتی ہے۔ اس کا صبر دیکھ کر اب تک تجھے گھر میں رکھے ہوئے ہے۔ تیرے لیے پردیس کمانے گیا ہوا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس پر الزام رکھ رہی ہے۔ میں آج ہی تیری ماں کو بلاتی ہوں۔ میں اپنے بچے کی دوسری شادی کراؤں گی۔ مجھے اس گھر کا وارث چاہیے۔"

انہوں نے میری ماں کو تو نہیں بلایا لیکن اس دن کے بعد سے روز مجھے دھمکیاں ملنے لگیں۔ مجھے یہ یقین ہوگیا کہ جیسے ہی شاکر گھر آئے گا' خالہ مجھے طلاق دلوا دیں گی۔

شاکر ہر ہفتے گھر آتا تھا لیکن اب ایک مہینے سے نہیں آیا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کا نہ آنا اچھا لگ رہا تھا کیونکہ خالہ کہہ چکی تھیں کہ اس کے آتے ہی تجھے طلاق ہوجائے گی پھر یہ بھی سوچتی تھی کہ وہ آخر کب تک نہیں آئے گا۔ بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی۔ میں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی تھی کہ خدا شاکر کے دل میں رحم ڈال۔ تنہائی کی آگ میں وہ خود بھی جل رہا ہے' مجھے بھی جلا رہا ہے۔ آخر ایک مہینے بعد وہ آگیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ خالہ اس وقت گھر پر نہیں تھیں لہٰذا مجھے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

"شاکر' اب تو مجھ پر رحم کرو۔ کیا مجھ سے ایسا بڑا گناہ سرزد ہوگیا کہ معافی مل ہی نہیں سکتی۔"

"اب کیا ہوگیا۔" اس نے کہا۔

"ہو یہ گیا کہ تمہاری ماں مجھے طلاق دلوا کر تمہاری دوسری شادی کرانا چاہتی ہیں۔"

"میں کروں گا تو وہ کرائیں گی نا۔ تم فکر کیوں کرتی ہو۔"

"وہ اپنے اس مطالبے میں غلط نہیں ہیں۔ انہیں تمہارے بچوں کی ضرورت ہے۔ تمہیں مجھ پر نہیں تو کیا اپنی ماں پر بھی ترس نہیں آتا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم اب تک اولاد سے کیوں محروم ہیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو' مجھے اولاد کی آرزو نہیں ہے؟"

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آگیا۔

"پھر تم میرا قصور معاف کیوں نہیں کردیتے۔ مجھے اپنا کیوں نہیں لیتے۔ تم کیوں نہیں سمجھتے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں اور تم خود بھی اپنے آپ کو سزا دے رہے ہو۔"

"بس تھوڑا انتظار اور کرلو۔ تمہاری ہر شکایت دور ہوجائے گی۔"

اس روز خالہ اور شاکر میں خوب زور کا جھگڑا ہوا۔ خالہ کا اصرار تھا کہ وہ مجھے طلاق دے کر دوسری شادی کرے اور شاکر بضد تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو اس پر سوکن لاؤں گا اور نہ اسے طلاق دوں گا۔

نزلہ غریب عضو پر ہی گرتا ہے۔ شاکر تو لڑ جھگڑ کر باہر نکل گیا' خالہ مجھ پر برس پڑیں۔ اس میں بھی قصور میرا ہی تھا۔ ان کے خیال کے مطابق میں نے شاکر پر جادو کرا دیا تھا اسی لیے اولاد نہ ہونے کے باوجود وہ مجھے طلاق دینے پر تیار نہیں۔ میں تو اب خالہ کی باتوں کی عادی ہوگئی تھی اس لیے وہ کہتی رہیں اور میں سنتی رہی۔

رات گزر گئی لیکن شاکر لوٹ کر نہیں آیا۔ صبح کو تھوڑی دیر کے لیے صرف یہ کہنے کے لیے آیا کہ وہ واپس حیدر آباد جارہا ہے۔ دل کی بات پھر دل میں رہ گئی۔ میں نے سوچا جب وہ جا ہی رہا ہے تو اب کیا کوئی ذکر چھیڑنا۔

اس کے جانے کے بعد خالہ پھر مجھ سے لڑنے کا شوق پورا کرنے لگیں پھر کسی نے انہیں دوسری راہ سجھا دی۔ وہ مجھے لے کر پیروں فقیروں کے پاس جانے لگیں۔ مجھے تعویذ گھول گھول کر پلانے لگیں کہ میری کوکھ آباد ہوجائے۔ میں دل ہی دل میں ہنستی بھی تھی اور جو وہ کہتی تھیں وہ کرتی تھی کہ اگر اسی طرح ان کی تشفی ہوتی ہے تو یونہی سہی۔

ایک دن شاکر کا خط آیا۔ اس نے کبھی خط نہیں لکھا تھا اس لیے پڑھنے سے پہلے ہی میرا دل دھڑکنے لگا پھر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی گئیں۔ مختصر سا خط تھا لیکن بڑی طویل روئداد تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر جارہا ہے۔ اتنی جلدی میں ہے کہ ملاقات کیے بغیر ہی جارہا ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ بہت جلد مجھے بھی بلالے گا۔ میں جانتی تھی کہ مجھے بلانے کا تذکرہ محض دلاسا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تو بلائے گا کیا۔ وہ کہاں جارہا ہے' اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

وہ حیدر آباد گیا تھا تو میں نہیں روئی تھی۔ سوچا تھا چند قدموں کی تو دوری ہے لیکن اب وہ کہاں گم ہوگیا۔ یہ خیال آتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خالہ بھی گھبرا گئیں۔

"مجھے بھی تو سنا۔ کیا ہوگیا۔ کیا لکھا ہے خط میں۔" خالہ نے پوچھا۔

کچھ دیر تک تو میری آواز ہی نہیں نکل سکی۔ جب بولنے کے قابل ہوئی اور تفصیل انہیں بتائی تو ان کی بھی وہی حالت ہوگئی جو میری تھی لیکن اب تو ہر بات کا نشانہ مجھے ہی بننا پڑتا تھا لہٰذا یہ الزام بھی انہوں نے مجھ ہی پر دھر دیا۔

"اب تو ٹھنڈ پڑ گئی تیرے دل میں۔ بھیج دیا میرے بچے کو میری نظروں سے دور۔ اب جو دل چاہو کرو۔ کون دیکھنے والا ہے۔"

"خالہ' میں کیوں بھیجنے لگی تھی۔ مجھے تو خود معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلے گئے۔"

"ارے بھیجنے کا کوئی ایک ہی طریقہ تھوڑی ہوتا ہے۔ اس نے تیرے ساتھ رہ کر کون سی خوشی دیکھی جو یہاں رہتا۔ تو نے تو اپنا منہ کالا کیا نہیں۔ وہ ہی کہیں چلا گیا۔ ہائے میرا بچہ نہ جانے کس حال میں ہوگا۔"

وہ روتی جارہی تھیں اور جھولی پھیلا پھیلا کر میرے مرنے کی دعائیں مانگتی جارہی تھیں۔ میں ان کی مجبوری سمجھتی تھی اس لیے چپ تھی۔ میری خاموشی نے انہیں اور بھی شیر بنا دیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ جتنا مار سکتی تھیں' انہوں نے مجھے مارا۔

"نکل جا اسی وقت میرے گھر سے۔ جب وہ نہیں تو پھر تو بھی یہاں کیوں رہے گی۔"

"خالہ' میں یہاں سے ہرگز نہیں جاؤں گی چاہے تم مجھے جان سے مار ڈالو۔"

"تیرا تو باپ بھی جائے گا۔" انہوں نے کہا اور مجھے پھر مارنا شروع کردیا۔

اب بہت ہوچکی تھی۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑلیا "یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"بلاتی ہوں تیری ماں کو۔ وہی تجھے یہاں سے لے کر جائے گی۔"

میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اماں بھی کہیں گی تو بھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔

میں انتظار کرتی رہی لیکن خالہ نے اماں کو نہیں بلایا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

شاکر کچھ بھی تھا۔ نام کا سہی شوہر تو تھا۔ وہ کیا گیا' گھر مجھے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ جس بستر پر وہ کبھی نہیں سویا تھا اسے دیکھ دیکھ کر روتی تھی۔ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی لیکن دل ہی دل میں خود کو مجرم سمجھتی تھی۔ مجھے یہ وہم سا ہوتا تھا کہ میرے رویے نے اسے ایسا دل برداشتہ کیا کہ ہمیشہ کے لیے اس کا دل مجھ سے بھر گیا۔ کبھی اس کی بے وفائی پر غصہ آتا تھا کہ ایسا بھی کیا غصہ۔

خالہ کو اب کوئی ڈر نہیں تھا۔ جی بھر کے مجھے ستا رہی تھیں۔ دو روٹیاں بھی ایسے دیتی تھیں جیسے کوئی کتے کو ڈالتا ہے۔ ان کے طعنے میرے دل کو چھلنی کیے دے رہے تھے۔ اپنی ماں کو میں کچھ اس لیے نہیں بتاتی تھی کہ وہ مجھے یہاں

پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

سے لے جائیں گی۔

بھوک اور نیند ایسی اڑ گئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ خالہ کی باتیں مجھے اندر ہی اندر گھلائے دے رہی تھیں۔ انہوں نے محلے کی عورتوں کے بھی ایسے کان بھر دیے تھے کہ سب مجھ ہی کو قصوروار ٹھہرا رہی تھیں۔ جب چار عورتیں مل کر بیٹھ جاتی تھیں، یہی کہتی تھیں کہ بیوی کو بھی بتا کر نہیں گیا تو یقیناً بیوی خراب ہوگی۔

دو مہینے بعد اس نے دو ہزار روپے کا ڈرافٹ بھیجا۔ پیسوں سے زیادہ مجھے خوشی اس بات کی ہوئی کہ وہ زندہ ہے اور مجھے بھولا نہیں ہے۔ کبھی نہ کبھی لوٹ آئے گا۔

وہ ہر مہینے پیسے بھیجتا رہا لیکن کبھی خط نہیں لکھا۔ بس اس کے پیسوں سے یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ خالو کا انتقال ہوگیا۔ جس بیٹے کا سہرا دیکھنے کی انہیں آرزو تھی، اس بیٹے کو دیکھے بغیر ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ خالو کے انتقال کے بعد خالہ بہت ہی چڑچڑی ہوگئی تھیں اور پھر وہ بیمار پڑ گئیں۔ اب میں دن رات ان کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھی۔ اتنی خدمت کے باوجود مجھے اٹھتے بیٹھتے گالیاں سننے کو ملتی تھیں۔

میری حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے برسوں کی بیمار۔ میری ماں کو یہ آرزو تھی کہ میں کسی اچھے گھر میں بیاہی جاؤں۔ ان کی یہ آرزو پوری ہو بھی گئی تھی لیکن یہ میری قسمت کہ غریب، امیر تو درکنار، شوہر ہی میری قسمت میں نہیں تھا۔

اماں میری بدقسمتی کو دیکھ کر اندر ہی اندر ٹوٹتی جارہی تھیں اور بالآخر ایک دن ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئیں۔ اچھا ہی ہوا۔ زندہ رہتیں تو اور نہ جانے کس کس طرح مجھے برباد ہوتے ہوئے دیکھتیں۔

شاکر کو گئے ہوئے پانچ سال گزر گئے تھے کہ اس نے اچانک پیسے بھیجنا بند کردیے۔ یا اللہ خیر! اب مجھے بجا طور پر یہ فکر ہونے لگی کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوگیا ہو۔

جب کئی مہینے تک اس نے پیسے نہیں بھیجے تو گھر کے حالات بگڑنے لگے۔ خالہ کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ انہیں دیکھ کر رحم آتا تھا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھیں۔ کوئی اگر انہیں پاگل نہیں کہہ سکتا تو وہ ہوش مند بھی ہرگز نہیں تھیں۔ وہی گھر جو کبھی خوش و خرم تھا اب وہاں نحوست برستی رہتی تھی۔

وہ گھر جو کسی کی دستک کے لیے ترس گیا تھا، ایک دن دستکوں کے شور سے گونج اٹھا۔ کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ اسپتال کی ایمبولینس کھڑی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ شاکر کا ایک دوست، شاکر کو لے کر آیا تھا مگر اس حالت میں؟ محلے والوں کی مدد سے شاکر کو اندر لایا گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ زندہ ہے لیکن اس کی حالت دیکھ کر میں ششدر رہ گئی کہ وہ زندہ کیسے ہے۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور خون رس رہا تھا۔

"بھابی، انہوں نے کوئی ایسی دوا کھالی تھی جس سے ان کا جسم پھٹ گیا۔ چھ مہینے سے یہ کراچی کے ایک اسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ اب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ بس اب خدا سے دعا کیجئے۔"

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ میں اکیلی کیا کرتی۔ میں نے فوراً اپنی بہن اور بہنوئی کو بلالیا۔ محلے کی عورتیں بھی آگئیں۔ میں شاکر کے سرہانے بیٹھی تھی جو مکمل بے ہوش تھا۔ کئی ڈاکٹر آئے اور دیکھ کر چلے گئے۔ سب نے بڑی بے دردی سے کہہ دیا کہ وہ ایک دو دن سے زیادہ کا مہمان نہیں۔ میں اپنے خدا سے دعا کررہی تھی کہ وہ ایک مرتبہ ہوش میں آجائے۔ اس کی زبان سے میں یہ تو سن لوں کہ اس نے مجھے معاف کردیا۔ میری نادانی نے اسے کہاں کہاں ٹھوکریں کھلائی ہیں۔ میں اس سے معافی تو مانگ لوں۔

میں اس کی آنکھوں پر نظر جمائے جاگ رہی تھی۔ رات میں کسی وقت اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی مشکل سے میرا نام لیا۔ میں اس پر جھک گئی۔

"میں اب بچوں گا نہیں۔"

"نہیں شاکر نہیں۔ میں سہاگن بننے سے پہلے بیوہ ہونا نہیں چاہتی۔ تمہیں زندہ رہنا ہوگا۔ میری سیج سجانے کے لیے۔"

"خالدہ!" اس نے کہا "میں تمہارے لائق نہیں تھا۔ تمہارے کیا، کسی بھی عورت کے لائق نہیں تھا۔ میں مرد تھا ہی نہیں۔ مجھے معاف کردینا کہ میں نے تمہاری پوری جوانی اس انتظار کی بھینٹ چڑھا دی کہ شاید میں ٹھیک ہوجاؤں۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

اس کا شکریہ کہ آخری وقت میں اس نے میرا یہ بوجھ تو اتار دیا کہ میں قصوروار نہیں تھی۔

کسی کو اب بھی یہ معلوم نہیں کہ میں کبھی سہاگن بنی ہی نہیں!

111

اللہ والا

محترم المقام معراج رسول صاحب

السلام علیکم

اپنی زندگی کے کچھ نہایت اہم واقعات تحریر کرکے روانہ کررہا ہوں۔ میں انہیں کہانی نہیں سمجھتا بلکہ یہ تو حقائق ہیں جو میرے ساتھ پیش آئے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگوں کے لیے غور طلب باتیں ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ دوسرے ان باتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی لیے یہ سب لکھ دیا ہے۔ آپ مہربانی کرکے اسے شائع کردیں۔ شکریہ

نیازمند

یوسف، کراچی

میں اس کو دیکھتے ہی کترا کر ایک طرف ہوجایا کرتا۔

لیکن وہ کم بخت اس کے باوجود میرا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ کبھی موڈ ہوا تو مسکرا کر میری طرف دیکھ لیا اور کبھی موڈ ہوا تو مسکراتا ہوا میرے قریب آکر میرے کاندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا "مولوی صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟"

یہ اس کا مخصوص جملہ تھا اور اس کی یہ دونوں حرکتیں مجھے سخت ناگوار گزرتیں۔ اس کا مجھے مولوی صاحب کہنا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ دینا۔ اوّل تو میں کوئی مولوی صاحب نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادہ انسان تھا۔ اپنے رب کو راضی رکھنے کی کوششیں کرتا رہتا۔ محلے کی مسجد میں باقاعدہ نماز کے لیے جایا کرتا اس لیے اس کا مولوی صاحب بولنا مجھے ناگوار گزرتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غلیظ انسان تھا۔

غلاظت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ گندہ رہتا ہو یا اس کا لباس گندہ ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بہت صاف ستھرا، بے داغ لباس استعمال کرنے والا شخص تھا جس کے چہرے پر تلوار نما مونچھیں بہت اچھی لگتیں اور جس کے جوتے ہر

وقت پالش شدہ ہوتے۔
یہاں غلاظت سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی اچھا انسان نہیں تھا۔ محلے کا ایک بدنام آدمی تھا۔ غنڈا اور اوباش قسم کا۔ اس کی غنڈا گردی اور اوباشی بھی شاید کسی نہ کسی حد تک برداشت کر لی جاتی لیکن وہ مجھ سے جس قسم کی باتیں کیا کرتا، وہ برداشت کے قابل نہیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر وہ جنت اور دوزخ کے حوالے سے بہت الٹی سیدھی باتیں کیا کرتا۔

اس کی ابتدا کچھ اس طرح ہوئی کہ ایک دن میں نے اسے جمعہ کی نماز میں دیکھ لیا۔ یہ بہت حیرت کی بات تھی ورنہ کہاں تیمور اور کہاں جمعہ کی نماز۔ یا کوئی بھی نماز۔ یہ دو مختلف چیزیں تھیں۔ اس وقت وعظ ہو رہا تھا اور پیش امام جنت اور دوزخ کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ اس موضوع پر یہ ان کی تیسری تقریر تھی۔ اس کا سلسلہ گزشتہ دو جمعوں سے جاری تھا۔

نماز کے بعد جب نمازی باہر نکلنے لگے تو اس بھیڑ میں تیمور بھی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آ گیا "کیا حال ہے مولوی صاحب، آپ کا؟" اس نے دریافت کیا۔

اس وقت مجھے غصہ تو آیا لیکن میں نے سوال کیا "تم یہ بتاؤ، آج تم مسجد میں کیسے دکھائی دے رہے ہو؟"

"کیا بتاؤں مولوی صاحب، میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے جنت اور دوزخ کی آواز سنی۔ بس سننے کے لیے چلا آیا۔ پتا چلا کہ جنت تو مزے کی چیز ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ جس بندے کو دنیا ہی میں عورتیں مل رہی ہوں، اسے جنت کا لالچ کیسے دے سکتے ہو؟"

"دیکھو تیمور۔ اس قسم کا مذاق یا گستاخی نہیں کرتے، خدا سے معافی مانگو۔"

"ایک بات اور ہے مولوی صاحب! یہ خدا اپنی سمجھ میں تو نہیں آیا۔ جب دیکھو کسی لٹھ باز کی طرح لٹھ لے کر سر پر کھڑا ہے۔ یہ مت کرو، وہ مت کرو۔ اس طرح رہو، اس طرح نہ رہو۔ ارے بھائی، جب بندے کو آزاد پیدا کیا ہے تو اسے آزاد رہنے دو۔"

اس کی بات سن کر میں کانپ اٹھا اور استغفار پڑھنے لگا۔ وہ کفر کی باتیں کر رہا تھا۔ یہ اس کی انتہا درجے کی گستاخی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف میں ہی نہیں، بلکہ اس کی بات سن کر سب کا یہی ردِ عمل ہوتا۔

مجھے استغفار کرتا دیکھ کر وہ مسکراتا ہوا تیز قدموں آگے بڑھ گیا۔ میں ایک [illegible]
خدا ایسے لوگوں کی رسی [illegible]
میں بھی گستاخی کرنے [illegible]
اس دن کے بعد [illegible]
وحشت ہونے لگی۔ [illegible]
نے اپنے آپ کو اپنی [illegible]
کو ایک تماشا بنا رکھا تھا۔
ایک دن اس نے گلی میں [illegible]
صاحب، آپ سے ایک [illegible]
"کیا کام ہے؟" میں [illegible]
دریافت کیا۔
"وہ کام یہ ہے کہ آج کل [illegible]
"کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"ارے مولوی صاحب [illegible]
مسکرا کر بولا "بات یہ [illegible]
ہوں۔ میرا گزارا تاش کے [illegible]
جائیں تو مزہ آجاتا ہے۔ [illegible]
چھوڑ جائیں تو جیب خالی [illegible]
سے ناراض رہنے لگے [illegible]
نہیں جیتا۔"
"تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"
"آپ خدا سے میری [illegible]
"آپ تو اس کے بہت قریب [illegible]
ہوں۔ وہ میری بات نہیں مانے گا۔"
"کیا کفر بک رہے ہو۔ [illegible]
چاہیے تمہیں۔ اس قسم کی [illegible]
احساس ہونا چاہیے کہ تم [illegible]
ہو رہے ہو۔ توبہ کرو تیمور، توبہ۔"
وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور [illegible]
گیا۔ اس کی یہ باتیں مجھے خوف [illegible]
لوگ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی [illegible]
ایسے لوگوں کے سائے سے بھی [illegible]
گھر پہنچا تو اماں میرے انتظار [illegible]
بھی آئی ہوئی تھیں۔ دونوں [illegible]
اور دونوں ہی اس وقت بہت خوش [illegible]
مجھے دیکھ کر ان دونوں کے ہونٹوں [illegible]
نمودار ہو گئی۔ ان کی اس مسکراہٹ [illegible]
دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔ میں ان دونوں [illegible]

[illegible] کوئی نہ کوئی بات ضرور
[illegible] کوئی ایسی بات جس نے مجھے
[illegible] جب میں نے اپنی تعلیم
[illegible] ان نگاہوں نے مجھے سلام کیا

[illegible] صغرا پھوپو کی بیٹی۔ حسن، [illegible] کا پیکر۔
[illegible] پرواز کر جاتا ہے اور اس
[illegible] رہ جاتے ہیں۔ امبرین اور
[illegible] کا۔ میں جب بھی صغرا پھوپو
[illegible] کے ساتھ کھیلا کرتا۔ اس
[illegible] تھی۔ خوبصورت تو وہ تھی ہی۔
[illegible] اور بھی دل کش کر دیا تھا
[illegible] اور اپنے آپ کو بے دیے

[illegible] میرے دل میں ہلچل سی
[illegible] اسے پسند کرنے لگا تھا۔
[illegible] محبت تھی وہ میرا حسن خیال

[illegible] ہم دونوں جوان ہو گئے۔ ایک
[illegible] کم ہو گئی۔ اس کے باوجود
[illegible] گوشے میں موجود رہی۔ میں نے
[illegible] دھیان ہی نہیں دیا تھا۔
[illegible] ہمیشہ دوسرے نوجوانوں سے
[illegible] نوجوان تو کھیل تماشے اور شور
[illegible] میں ایک باوقار اور دیندار
[illegible] تھا۔
[illegible] زندگی میں فخر کی سب سے بڑی بات
[illegible] دامن کو حتی الامکان گناہوں سے
[illegible] اپنے دل میں یہ گمان بھی کرتا کہ
[illegible] بھی ہو۔ میرے پاس میرا کردار
[illegible] آبیاری کرنی ہے۔
[illegible] بھی حاصل ہو گئی تھی جو مذہب کے
[illegible] ان کے ساتھ نے میرے کردار کو اور
[illegible] خدا سے یہی دعا مانگی کہ اے خدا
[illegible] رکھ۔ مجھے کسی امتحان میں مبتلا نہ
[illegible] سال متقی زندگی گزار کر اس دنیا سے
[illegible] جاؤں۔

بہرحال اب اتنے دنوں کے بعد جب میں نے صغرا پھوپو اور اپنی اماں کو ایک ساتھ دیکھا اور ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پائی۔ تو دل کی کچھ عجیب کیفیت ہو گئی کیونکہ پچھلے کچھ دنوں سے گھر میں یہ خبر سننے کو آرہی تھی کہ امبرین اور میرے رشتے کی بات ہو رہی ہے اور دونوں گھرانے اس رشتے کے لیے تیار ہیں کیونکہ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

کچھ دیر بعد اماں میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ اس وقت بھی مسکرا رہی تھیں "بیٹا، جانتے ہو، آج تمہاری صغرا پھوپو کیوں آئی تھیں؟"

"وہ تو آتی ہی رہتی ہیں اماں" میں نے کہا۔

"لیکن آج ان کے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

"چلیں، آپ ہی بتا دیں کیا مقصد تھا ان کا؟"

"وہ امبرین سے تمہارے رشتے کی بات کرنے آئی تھیں" اماں نے مسکراتے ہوئے بتایا "اور ہم نے بھی اس کو مان لیا ہے۔"

میں اپنی خوشی اماں سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔ سب بہت اچھا تھا۔ یہ بات تو بہت پہلے سے معلوم تھی کہ میری زندگی میں بہار آئی تو امبرین کے دم سے آئے گی اور امبرین بھی اس بات سے اچھی طرح واقف تھی۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مجھے یاد آیا کہ بہت دنوں پہلے امبرین میرے پاس ایک عجیب شکایت لے کر آئی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے لیکن بہت محتاط ہو کر۔ جھکی ہوئی نگاہوں کے ساتھ۔ اس سے ملاقات کے وقت میں دل ہی دل میں اپنی ثابت قدمی کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ میں خدا سے کہا کرتا "اے میرے مولا! میں ایک عاجز اور کمزور بندہ ہوں۔ تو نے ہی اس لڑکی کی محبت میرے دل میں ڈال دی ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن مجھے حوصلہ دینا کہ میں اس محبت کا کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کروں اور اگر تیری رضا ہو تو تیرے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اسے حاصل کر سکوں۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔"

اس لیے جب وہ میرے سامنے آتی تو میں اس کی طرف ایک بار دیکھ کر اپنی نگاہیں جھکا لیا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی اور اس نے کہا "سنیں، میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔"

"ہاں کہو، کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ یہ آپ روز بہ روز مولوی صاحب کیوں بنتے جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی تھی "کیوں، اس میں ایسی کون سی برائی ہو گئی؟" میں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"دیکھیں نا، وقت بہت بدل گیا ہے" اس نے کہا "آپ ایک پڑھے لکھے انسان ہیں۔ جدید دور کے ہیں پھر آپ کے لیے یہ سب..."

"نہیں امبرین! آگے کچھ مت کہنا" میں نے اسے ٹوک دیا "میں جو بھی ہوں، بہت ٹھیک ہوں اور اپنے لیے جو بہتر سمجھ رہا ہوں، اسی راہ پر سفر بھی کر رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جدید دور میں سانس لینے اور زندہ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اپنی روایات ترک کر دوں۔ مجھے میرے مذہب کی طرف سے جو احکامات ملے ہیں وہ میرے لیے ضروری ہیں یا تمہاری خوشنودی میرے لیے ضروری ہے؟ دیکھو، بہت ٹھنڈے دل سے اس کا جواب دینا۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا "ظاہر ہے۔ آپ کو جو احکامات ملے ہیں، وہ آپ کے لیے ضروری ہیں۔"

"شاباش! اور تمہیں تو اس بات پر میری تعریف کرنی چاہیے کہ میں نے اس دور میں بھی اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہے" میں نے کہا۔

اس دن کے بعد سے امبرین نے پھر مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اور اب وہ میری شریکِ حیات بننے جا رہی تھی۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

سب کچھ طے ہو گیا۔ اگلے چھ ماہ بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔ اب میری دعاؤں کا پھل مجھے ملنے والا تھا۔ اسی دوران میں صغرا پھوپو امبرین کو لے کر دو مہینوں کے لیے لاہور چلی گئیں۔ میں تو خیر اس سے ویسے بھی نہیں ملتا تھا اور شادی کی بات طے ہو جانے کے بعد تو امبرین سے ملاقات کرنا میرے لیے بہت نامناسب سی بات تھی۔ اس لیے اس طرح مجھ پر کوئی ردعمل نہیں ہوا تھا۔

میرے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ وقت مجھے پر لگا کر اڑتا ہوا محسوس ہوتا اور کہاں یہ ہوا کہ وقت میرے لیے جیسے جم کر رہ گیا ہو۔ وہ چھ مہینے سال کی طرح طویل ہوتے جا رہے تھے۔

پھر دو مہینے بھی گزر گئے۔ وہ لوگ واپس نہیں آئے۔ ان کی واپسی ڈھائی ماہ بعد ہوئی تھی۔ یہ خبر مجھے اماں ہی نے دی تھی اور اسی شام امبرین کا میرے لیے فون آگیا۔ یہ میرے لیے ایک نئی بات تھی۔ میں کس طرح اس سے بات کر سکتا تھا لیکن اماں کے اصرار پر میں نے امبرین سے بات کی۔ "سنیں۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے" امبرین کہہ رہی تھی "میرا آپ سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"امبرین، یہ کیسے ہو سکتا ہے" میں حیران رہ گیا تھا۔ "اب ہم دونوں شادی سے پہلے تو نہیں مل سکتے نا۔"

"لیکن یہ ملاقات بہت اہم ہے" اس نے کہا "اور ملاقات گھر پر نہیں ہوگی۔ کہیں اور ہوگی بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ میرے گھر آجائیں۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس سے ملنا کیوں ضروری ہے۔ اسے کیا کام پڑ گیا تھا۔ بہرحال میں اس کی بات مان کر صغرا پھوپو کے گھر پہنچ گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس ملاقات کا اہتمام خود صغرا پھوپو ہی نے کیا تھا۔ اس لیے وہ گھر پر نہیں تھیں۔

امبرین کچھ پریشان اور اُلجھی اُلجھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ بہت دیر تک میرے سامنے گردن جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

"خیریت تو ہے امبرین؟" میں نے پوچھا "کیوں بلایا ہے مجھے؟"

"میں اس وقت ایک دوراہے پر آکر کھڑی ہو گئی ہوں" اس نے کہا "اور چونکہ آپ پر، آپ کے کردار اور آپ کی سوچ پر پورا پورا بھروسا ہے۔ اس لیے آپ ہی سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دیں گے۔"

"ہاں ہاں، کہو۔ میں تو ہر حال میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔"

"میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ فوری طور پر مجھ سے شادی کر لیں۔"

"کیا!"

"ہاں فوری طور پر۔ کسی طرح بھی ہو، آج یا کل۔ یا زیادہ سے زیادہ دو چار دنوں کے اندر اندر۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ اتنی جلدی کیسے شادی ہو سکتی ہے" میں حیران ہو کر بولا "دنیا بھر کے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔"

"انتظامات کو رہنے دیں۔ میری عزت بچانے کی بات کریں۔"

"آخر بات کیا ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں؟"

میرے اصرار پر اس نے صاف صاف جو کچھ بتایا وہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا تھا۔ وہ لاہور پہنچ کر کچھ غنڈوں کے ہاتھوں اغوا ہو گئی تھی۔ جنہوں نے اسے داغ دار کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی لیے لاہور سے واپسی میں ان لوگوں کو دیر ہو گئی تھی۔ صغرا پھوپو اور امبرین پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور اب اس کے وجود میں کوئی جنم لے رہا تھا، وہ حاملہ ہو چکی تھی۔

امبرین یہ سب سنا کر بہت بری طرح رو رہی تھی اور میں اپنا سر تھام لیا تھا۔ میں سوچنا اور بولنا بھول گیا تھا۔ ایک پاگل کی سی کیفیت تھی۔

کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ امبرین اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی تھی "میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے اس حال میں قبول کر لیں گے کیونکہ آپ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں اور جو کچھ ہوا ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، میں بے گناہ ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی کو سہارا دینا بہت بڑی عبادت ہے۔ میں آپ سے سہارے کی بھیک مانگ رہی ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ مجھے اس کے پورے جسم پر کیڑے سے رینگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزاری تھی اور اب اس پاکیزگی کی جھیل میں ایک گندہ سا پتھر آگرا تھا۔

بے شمار سوالات تھے میرے ذہن میں۔ آخر ہونا کیا ہے۔ کیا میرے گھر والے یہ سب برداشت کر لیں گے۔ کیا میں برداشت کر لوں گا پھر میرے ذہن میں ایک خیال آگیا۔ امبرین سے یہ کہتے ہوئے مجھے شرم سی ہو رہی تھی لیکن اس موضوع پر بات کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "امبرین۔ ایک کام یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس سے نجات حاصل کر لو۔"

میری یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ بھڑک کر بول پڑی "نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس وجود کو قتل کر دوں۔ جس کا کوئی قصور نہیں ہے، جس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ جو خود میرے وجود کا حصہ ہے۔"

"تو کیا تم بغیر شادی کے ماں بننے کا تصور کر سکتی ہو؟"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ آپ فوری طور پر مجھ سے شادی کر لیں" اس نے کہا "یہ حادثہ اس طرح چھپ جائے گا۔ کسی کو احساس بھی نہیں ہوگا۔"

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ مجھ سے کیسی باتیں کر رہی تھی "امبرین۔ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے" میں پریشان ہو کر بولا "تم خود اندازہ کر سکتی ہو کہ میں نے اب تک کس انداز کی زندگی گزاری ہے۔ میں کتنا صاف ستھرا انسان ہوں۔ کیا وہ اولاد میرے دامن پر بدنما داغ نہیں ثابت ہوگی؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں" اس نے حیران ہو کر پوچھا "یہ تو آپ کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ بھی ہے اور آپ کی محبت کا تقاضا بھی ہے۔"

"نہیں امبرین۔ میں نے تم سے محبت ضرور کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن میں اپنے اصولوں اور اپنے مذہبی تصورات اور اس کی پاکیزگی کو اس محبت کے لیے ختم نہیں کر سکتا۔"

یہ سچ ہے کہ یہ سب کہتے ہوئے میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ امبرین سے جدا ہونے کا تصور ہی میرے لیے روح فرسا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں صرف محبت کی خاطر اپنی ریاضت کا خاتمہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اگر میں نے اس سے شادی بھی کر لی تو بھی زندگی بھر کسک میں مبتلا رہوں گا پھر اس کی اولاد ہونے کے بعد میری یہ کمزوری کھل کر میرے سامنے آجائے گی کیونکہ میں اسے برداشت نہیں کر سکوں گا۔ خواہ مخواہ اس کی پرورش کے سلسلے میں مجھ سے ناانصافیاں ہوتی رہیں گی اور یہ ناانصافیاں مجھے گناہگار بنائے رکھیں گی۔ میں حق تلفی کا مجرم بن جاؤں گا۔

امبرین چلی گئی۔ اس سے میری بات ختم ہو گئی تھی۔ تعلق ختم ہو گیا تھا۔ اب اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ قدرت نے مجھے ایک بہت بڑے گناہ اور امتحان سے بچالیا تھا۔

میں نے اس کی ایک بات ضرور مان لی کہ اس نے جو بھی کہا تھا' اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کیا بلکہ اپنی امی سے کسی اور انداز سے انکار کر دیا تھا۔ امی میرے فیصلے سے بہت حیران ہوئی تھیں۔ "کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیا تم امبرین سے شادی نہیں کرو گے؟"

"نہیں امی۔ میں فی الحال شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔"

"آخر کیوں؟"

"بس یوں ہی۔" میں نے جواب دیا "ابھی کچھ دنوں تک میں اپنے آپ کو تبلیغ کے کاموں میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ میری روحانی تربیت شروع ہونے والی ہے اور میں نے اگر شادی کر لی تو میرے پیروں میں زنجیر پڑ جائے گی اور میں نے جو کچھ سوچ رکھا ہے' وہ میں نہیں کر پاؤں گا۔"

میں نہیں جانتا کہ میرے گھر والے میری ان باتوں سے مطمئن بھی ہوئے یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ میری شادی کے سلسلے میں خاموش ہو گئے پھر ٹھیک ایک ہفتے کے بعد امی نے مجھے ایک عجیب وحشت ناک خبر سنادی "یوسف۔ کچھ سنا تم نے' امبرین گھر سے بھاگ گئی ہے۔"

"کیا!" یہ خبر سن کر مجھے ایک ذہنی جھٹکا لگا تھا "کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ امبرین گھر سے بھاگ گئی؟"

"ہاں' دو دن ہو گئے ہیں" اماں نے بتایا "بے چاری صغرا پر تو سکتے کی کیفیت طاری ہے۔ وہ نہ تو زندہ ہے اور نہ ہی مردہ ہے۔ اس بے چاری کے بس میں جہاں تک تھا' اس نے تلاش کر کے دیکھ لیا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ اب تم بتاؤ' یہ سب کیا ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اماں!"

"نہیں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم کو کوئی نہ کوئی بات ضرور معلوم ہے۔ اس لیے تم نے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر سے بھاگ گئی۔ آخر کوئی وجہ تو ہو گی ورنہ وہ ایسی لڑکی تو نہیں ہے۔"

میں بہت مشکلوں سے اماں کو بتا سکا تھا کہ امبرین کے ساتھ کیا ہوا ہے اور میں نے اس شادی سے کیوں انکار کیا تھا۔ میری بات سن کر اماں نے اپنا سر پیٹ لیا تھا "ہائے' بے چاری صغرا کا نصیب۔ اب وہ نہ جانے کہاں ہو گی۔ کس کے پاس ہو گی۔"

میرے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے دل میں بے پناہ خلش سی ہو رہی تھی۔ دکھ سا ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ میری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر میں اس کی بات مان لیتا تو.... نہیں' یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کو اپنانے کے بعد میرا اجلا وجود خود بھی داغ دار ہو جاتا۔

ایک خیال یہ تھا کہ امبرین کچھ دنوں کے بعد یا تو واپس آجائے گی۔ یا اس کی کوئی خبر سننے کو ملے گی لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ تو بالکل ہی غائب ہو گئی تھی۔

کچھ دنوں تک اس کے آنے کا انتظار رہا تھا۔ اس کے بعد دوسری مصروفیات نے دامن تھام لیے۔ زندگی مصروف ہوتی چلی گئی۔ اسی دوران میں ایک دین دار شخص سے میری ملاقات ہوئی۔ جس کی صحبت سے میں فیض حاصل کرنے لگا تھا۔ ان کا نام بھی فیض ہی تھا۔ میرے اور ان کے درمیان تعلق کی یہ کیفیت تھی کہ میں نے اپنی کوئی بات ان سے پوشیدہ نہیں رکھی۔ امبرین کے بارے میں بھی سب کچھ بتاتے ہوئے ان سے مشورہ طلب کیا "فیض صاحب۔ طبیعت آج کل کچھ گراں گراں سی رہتی ہے۔ یہ بات نہیں کہ مجھے اس کی یاد وغیرہ آتی ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کچھ بے کیفی سی محسوس ہونے لگی ہے۔"

"اس بے کیفی سے نجات کا ایک ہی طریقہ ہے یوسف میاں کہ فوری طور پر شادی کر لو" فیض صاحب نے مشورہ دیا "میرا خیال ہے کہ تمہارے والدین بھی یہی چاہتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ یہ بات تو ہے" میں نے ان کی تائید کی "والدین کی یہی خواہش ہے۔"

"تو بس اللہ کا نام لے کر یہ نیک کام کر ہی ڈالو۔"

میں نے فیض صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے گھر والوں کو اپنی شادی کا عندیہ دے دیا۔ بس اس کے بعد میرے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی۔ اماں بہت جلدی کر رہی تھیں تاکہ کہیں میرا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے۔

بہرحال کئی دنوں کی کوشش کے بعد انہیں میرے لیے ایک لڑکی پسند آہی گئی۔ میں نے اپنی شادی کے لیے پہلی شرط یہی رکھی تھی کہ لڑکی کا تعلق دیندار گھرانے سے ہو اور اماں کو ایسی ہی لڑکی مل بھی گئی تھی۔

میری شادی کی تیاریاں جاری تھیں کہ ایک دن راستے میں تیمور مل گیا۔ اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر بہت عجیب سی مسکراہٹ تھی "مولوی صاحب! میں تو تمہیں کئی دنوں سے تلاش کر رہا تھا" اس نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "کیوں تلاش کر رہے تھے؟"

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے" وہ مسکرا کر بولا۔

"میرا شکریہ، کس بات کا شکریہ؟"

"یار مولوی صاحب۔ تمہاری دعاؤں سے خدا نے مجھے دولت دے دی۔ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ میرے لیے تم دعا کرو، مجھے یقین ہے کہ تم نے میرے لیے ضرور دعا کی ہوگی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" مجھے اس کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "یار۔ اب ایسی بھی کیا بے مروتی۔ ٹھیک ہے، تم مجھے اپنی شادی میں نہ بلاؤ لیکن مبارک باد تو قبول کرلو۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ میری شادی ہو رہی ہے؟"

"اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے" وہ ہنس پڑا "یہ تو پورے محلے کو معلوم ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اماں نے پورے محلے کو میری شادی کے بارے میں بتادیا ہوگا۔ سب سے زیادہ خوشی تو ان ہی کو تھی۔ بہرحال میری شادی ہو گئی۔ لڑکی کا نام زہرہ تھا۔ جسے قبول صورت کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کا تعلق دیندار گھرانے سے تھا اور خود بھی صوم وصلوٰۃ کی پابند تھی ورنہ اس دور میں ایسی لڑکیاں کہاں ہوا کرتی ہیں۔

شادی کے تقریباً ایک سال بعد تیمور محلہ چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ محلے والوں نے بھی اطمینان کی سانس لی ہوگی۔ وہ آدمی ہی ایسا تھا جس کو شاید کسی نے بھی پسند نہ کیا ہو۔

میں نے یوں ہی تجسس کی خاطر محلے کے ایک نوجوان سے جب تیمور کے بارے میں بات کی تو وہ کہنے لگا "ہاں یوسف بھائی۔ تیمور بھائی کے جانے سے محلہ اُداس ہو کر رہ گیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا "ایسے آدمی کے جانے کی تو خوشی ہونی چاہیے۔"

"کس بات کی خوشی۔ یوسف بھائی، تم کو نہیں معلوم، تیمور بھائی دل کا بہت اچھا آدمی ہے۔ بہت نرم، محبت کرنے والا۔ اوپر سے چاہے جیسا بھی ہو، اندر سے موم کی طرح ہے۔"

"میں یہ تو نہیں جانتا لیکن اس کی... غنڈا گردی سے پریشانی ہوتی تھی" میں نے کہا۔

"کس بات کی پریشانی۔ اس نے پورے [illegible] کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کیا۔ کبھی کسی لڑکی کو [illegible] کبھی کسی سے زیادتی نہیں کی۔ وہ تو ایک سال پہلے چلا جاتا لیکن مکان اب ملا ہے اس کو۔"

"کیا وہ پہلے سے یہاں سے جانے کا منصوبہ بنا [illegible]"

"ہاں یوسف بھائی۔ اس نے ایک سال پہلے [illegible] تھی" اس نے بتایا "بیوی کو دوسرے محلے میں رکھا تھا [illegible] ماں کو بھی اسی گھر میں لے گیا۔"

حالانکہ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن حیرت ہوئی تھی کہ اس نے شادی کرلی تھی۔ جبکہ میں سوچتا رہتا تھا کہ پتا نہیں اس قسم کے لوگ شادی بھی [illegible] ہوں گے یا نہیں۔

بہرحال وہ چلا گیا تھا اور میں خود کو "مولوی مولوی" کہہ کر بلانے والے کے شر سے محفوظ ہو گیا تھا۔ میرا فیض صاحب کے یہاں آنا جانا لگا ہوا تھا۔ میں ان کے پاس جا کر ان کی باتیں سن کر اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا کرتا۔ مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے ان کے پاس جا کر میری [illegible] تکمیل ہو رہی ہو۔

پھر فیض صاحب کی محبت ایسا رنگ لائی [illegible] مغرب کی نماز کے بعد ہی ان کے پاس پہنچ جاتا اور [illegible] واپس آتا۔ اس دوران میں ان کی باتوں سے میری تطہیر [illegible] رہتی تھی۔

ایک رات گھر واپس آیا تو میری بیوی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ برس پڑی "یہ آپ نے آخر کیا لگا رکھا ہے" اس نے غصے سے پوچھا۔

"کیوں، کیا بات ہو گئی؟"

"یہ آپ روزانہ رات کو دیر سے کیوں آنے لگے ہیں؟"

"تم تو جانتی ہو کہ میں فیض صاحب کے پاس جاتا ہوں" میں نے کہا "وہاں اللہ رسولؐ کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

"کیا اللہ رسولؐ کی باتوں کا یہ مطلب ہے کہ اپنے گھر کی طرف بھی دھیان نہ دیا جائے، اپنی بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔"

"میں تو ایسا نہیں کرتا، تم دیکھتی ہو کہ میں فیض صاحب سے اجازت لے کر گھر ہی کی طرف آتا ہوں، کہیں اور نہیں جاتا۔"

"اور گھر میں آپ کتنے گھنٹے گزارتے ہیں؟" وہ بحث کیے جا رہی تھی اور مجھے اس پر غصہ آنے لگا

تھا۔ ظاہر ہے کہ میں فیض صاحب کے مقابلے پر اس کو ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ بیوی کی ایسی باتوں کے باوجود میرا وہی معمول رہا تھا۔

ایک رات تقریباً دو بجے فیض صاحب کا ایک پڑوسی مجھے بلانے کے لیے آگیا۔ اس نے بتایا کہ فیض صاحب کی حالت اچانک نازک ہو گئی ہے اور انہوں نے فوری طور پر مجھے یاد کیا ہے۔

میرے لیے یہ خبر قیامت کے سانحے کی طرح تھی۔ میں نے فیض صاحب کے گھر کی طرف دوڑ لگادی لیکن افسوس وہاں تک پہنچنے میں دیر ہو چکی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی فیض صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔

میرے پیروں تلے زمین نکل کر رہ گئی۔ یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ میں ایک ایسے سائے سے محروم ہو گیا تھا جس کی بدولت روحانی منازل طے کر رہا تھا۔ فیض صاحب کے خاندان کے کچھ لوگ جمع تھے۔ کچھ محلے والے تھے اور وہ سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ اس دنیا سے ایک نیک انسان گزر گیا ہے۔

فیض صاحب کے بعد زندگی بہت پھیکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب پند و نصائح کے لیے کوئی میرے پاس نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا۔ جس سے معرفت کی باتیں سنا کرتا۔ ایک خلا سا ہو گیا تھا لیکن قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔

ایک دن اچانک تیمور سے ملاقات ہو گئی۔ وہی غنڈا جس کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ جو اس محلے کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ جو مجھے "مولوی صاحب مولوی صاحب" کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ تیمور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ سال، ڈیڑھ سال کا ایک خوبصورت سا بچہ بھی تھا۔ جس کو اس نے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ میں اس وقت ایک مارکیٹ کی دکان میں تھا اور وہیں تیمور آٹکرایا تھا۔ میں نے اس سے بچ کر نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا "ارے، کیا حال ہیں... مولوی صاحب آپ کے؟ آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"ہاں ٹھیک ہوں۔" میں نے بے دلی سے جواب دیا پھر رسمی طور پر اس بچے کے گال کو تھپ تھپا کر بولا "یہ کون ہے؟"

"یہ میرا بیٹا ہے مولوی صاحب!" اس نے لہک کر بتایا "آپ کو یاد ہوگا، میں نے شادی کرلی تھی۔"

"ہاں، ہاں اچھی طرح یاد ہے۔"

"مولوی صاحب۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے" اس نے کہا "میں کئی دنوں سے خود آپ کے پاس آنا چاہ رہا تھا لیکن فرصت نہیں مل رہی تھی۔ آج آپ مل گئے ہیں تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔"

"ہاں بتاؤ، کیا کام ہے؟"

"میری بیوی نے آپ کو بلایا ہے" اس نے بتایا۔

"تمہاری بیوی نے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں۔"

"لیکن تمہاری بیوی مجھے کیا جانے؟"

"وہ جانتی ہے آپ کو۔ میں نے آپ کے بارے میں اسے سب کچھ بتا رکھا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ آپ ایک نیک انسان ہیں۔ اللہ والے ہیں۔ میں پہلے آپ ہی کے محلے میں رہا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اسے معلوم ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"مولوی صاحب۔ یہ جو عورتیں ہوتی ہیں، ان کے دل کا حال خدا ہی جانتا ہے۔ بہت گہری ہوتی ہیں۔ اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔ بس ضد کرنے لگی کہ میں کسی طرح آپ کو بلا کر لے آؤں اور میرا یہ حال ہے مولوی صاحب کہ میں اس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتا۔ بہت محبت کرتا ہوں اس سے۔ اس نے اتنا پیارا پیارا بیٹا دیا ہے۔ وہ بھی میرا اتنا خیال کرتی ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔"

اس نے مجھے کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ نہ جانے اس کی بیوی مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ میں اس کے کس کام آسکتا تھا۔ بہرحال تیمور اتنا اصرار کر رہا تھا کہ میں نے اس کے گھر جانے کا وعدہ کرلیا۔ اس نے اپنا پتا اچھی طرح سمجھاتے ہوئے کہا "مولوی صاحب! ہو سکتا ہے کہ آپ جس وقت میرے گھر پہنچیں، میں گھر پر نہ ہوں۔ کام سے گیا ہوں لیکن آپ یہ سن کر واپس مت آجائیے گا۔ اپنا نام بتا دیجیے گا، بیوی آپ سے ملاقات کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا کسی دن۔"

میں تیمور سے رخصت ہو کر گھر آگیا۔ اس کی ملاقات مجھے الجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔ میرا دل تو اس کے یہاں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں اس سے وعدہ کر چکا تھا اور مذہب میں وعدے کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ بس یہ سوچ کر دو دنوں کے بعد شام کے وقت میں تیمور کے گھر پہنچ گیا۔ تیمور کا مکان تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ سب ہی لوگ اسے جانتے تھے' وہ ایک غنڈا تھا اور غنڈوں کو کون نہیں جانتا۔

میری دستک کے جواب میں ایک ملازمہ نما عورت نے دروازہ کھول دیا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے تیمور کے بارے میں بتایا کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ تیمور نے کہا تھا کہ وہ اگر گھر پر نہ بھی ہو تو بھی اس کی بیوی کو میں اپنا نام بتادوں' وہ مجھے اندر بلا کر مجھ سے بات کرلے گی۔

میں نے اس عورت کو اپنا نام بتادیا۔ وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آکر میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ بہت معمولی سا فرنیچر لیکن صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا۔

میں گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے گردن اٹھائی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر' اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا' وہ امبرین تھی۔

صغرا پھوپو کی بیٹی۔ کسی زمانے میں میری محبت۔ جو میرے پاس شادی کی درخواست لے کر آئی تھی اور جو کہیں غائب ہو گئی تھی۔ جس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا اور اس وقت وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

"یوسف! پہچان لیا آپ نے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"امبرین! یہ..... یہ تم..." مجھ سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں' یہ میں ہوں" اس نے کہا "تیمور کی بیوی۔"

"خدا کی پناہ۔ یہ سب..... یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب ایک فرشتے کی قربانی اور اس کی محبت کی داستان ہے یوسف صاحب!" وہ تلخ ہو کر بولی "میں بتاؤں' کیا ہوا..... آپ نے تو مجھے اپنانے سے انکار کردیا تھا۔ کیونکہ میں ایک ایسے بچے کی ماں بننے والی تھی جس کو جبر اور ظلم کے ذریعے میرے وجود کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ آپ نے اس لیے انکار کیا کہ آپ پر انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ آپ کی نیک نامی پر حرف آجاتا۔ آپ نے اپنے طور پر تو بالکل درست کیا لیکن میں کیا کرتی' میرے سامنے سوائے موت کے اور کون سا راستہ رہ گیا تھا۔ موت جو ہر قسم کی بدنامی سے بچالیا کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس کے بعد اس کے گھر والوں پر عذاب نازل ہوتا رہتا ہے لیکن وہ خود تو اس قسم کی باتوں سے چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے۔

"تو میں موت کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں خود کو سمندر کی لہروں کے حوالے کردوں گی کہ ساحل پر یہ آدمی مل گیا جس کو آپ لوگ اور پورا معاشرہ غنڈا اور بدمعاش کہا کرتا ہے۔ اس آدمی نے جان پر کھیل کر مجھے بچالیا یوسف صاحب۔ مجھ سے کہنے لگا "بابا' تم کیوں مرتا ہے۔ آخر اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ تمہارے بچے کا کیا قصور ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ۔ یہ جو زندگی ہے نا' یہ اوپر والے کا امانت ہے۔ وہ جب امانت واپس مانگے اسی وقت واپس کرنے کا ہے۔ پہلے واپس نہیں کرنا چاہیے۔"

"بہت اکھڑی ہوئی جاہلانہ باتیں تھیں یوسف صاحب لیکن میرے دل میں اترتی چلی جارہی تھیں پھر جب میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے گھر واپس نہیں جاؤں گی۔ تو خدا کا یہ بندہ مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اس نے اس طرح میری حفاظت کی جیسے چراغ کی لو کی حفاظت کرتے ہیں۔ یا شیشے کے برتن کو رکھا جاتا ہے۔ دنیا چاہے اسے کچھ بھی کہتی رہے لیکن میرے لیے وہ فرشتہ تھا اور میں نے اسی فرشتے سے شادی کرلی۔ آپ نے اس کی گود میں ایک بچہ دیکھا ہوگا' یہ وہی بچہ تھا جس کی خاطر آپ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا۔

"میں نے تیمور کے ذریعے آپ کو جس ضروری کام سے بلوایا ہے' وہ یہ ہے کہ آپ میری اماں تک صرف یہ پیغام پہنچادیں کہ میں نہ صرف زندہ ہوں بلکہ بہت خوش ہوں اور بہت خوبصورت زندگی گزار رہی ہوں۔ انہیں اس کے سوا اور کچھ نہ بتائیں۔ اس طرح انہیں چین مل جائے گا۔ بس یہ کام ہے آپ سے۔"

میرا دماغ اس وقت سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ امبرین تیمور کی بیوی تھی۔ وہ تیمور جو ایک غنڈا' بدمعاش تھا اور اس نے امبرین کو سہارا دے کر اسے اپنی بیوی بنالیا تھا۔ اس کی دل جوئی کرتا رہتا تھا۔ اس سے بے پناہ محبت کیا کرتا۔

"بتائیں۔ اماں کو میری طرف سے اطمینان دلا دیں گے؟" امبرین نے پوچھا۔

میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکا۔ اس گھر سے چلا آیا۔ سینے پر ایک بوجھ سا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی یا نہیں یا ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یا جو کچھ بھی ہوا ہے' اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا' تقدیر یہی چاہتی تھی۔

میں نے کسی کو بھی امبرین سے اپنی ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا۔ صغرا پھوپو سے بھی آدھا سچ بیان کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا "پھوپو۔ میں آپ کے لیے ایک زبردست خوش خبری لے کر آیا ہوں۔"

"نہیں بیٹا۔ اب میرے لیے خوش خبری کی کوئی چیز نہیں رہی" صغرا پھوپو نے ایک گہری سانس لی۔

"ہے پھوپو! اور وہ یہ ہے کہ میں نے امبرین سے ملاقات کی ہے۔"

"کیا؟" صغرا پھوپو تڑپ اٹھی تھیں "بیٹا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" میں نے کہا "اور وہ اتنی خوش ہے کہ آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ اس کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔"

"شوہر!" صغرا پھوپو کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔

"ہاں پھوپو! اس نے ایک انتہائی محبت کرنے والے شخص سے شادی کرلی ہے۔ دونوں کا ایک بچہ بھی ہے۔ بہت خوبصورت' ارسلان نام ہے اس کا۔ اپنا مکان ہے' اپنی گاڑی ہے۔ سب کچھ ہے اس کے پاس۔"

پھوپو بری طرح رونے لگی تھیں۔ ان کے زخم ہرے ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ میں کسی دن فون پر امبرین سے ان کی بات کرادوں گا۔ صغرا پھوپو کو جیسے ایک نئی زندگی مل گئی تھی۔ وہ پھر سے جی اٹھی تھیں۔

پھر یہ ہوا کہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان لوگوں کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا پھر بہت دنوں کے بعد صغرا پھوپو مجھ سے ملنے آگئیں۔ وہ اداس اور پریشان بھی ہو رہی تھیں اور دوسری طرف خوشیوں کا ہلکا سا رنگ بھی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"بیٹے۔ تم نے مجھے آدھی بات کیوں بتائی تھی؟" پھوپو نے پوچھا۔

"میں نہیں سمجھا پھوپو!"

"بیٹے۔ امبرین سے اتفاقاً میری ملاقات ہو گئی ہے" انہوں نے بتایا "تم نے یہ بالکل سچ بتایا تھا کہ وہ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا شوہر تیمور جیسا آدمی ہے۔"

ماھنامہ پاکیزہ کا نیا منفرد اور مفید ترین سلسلہ

مسیحا

سید انور فراز کے قلم سے

آپ کسی بھی مسئلے سے دوچار ہوں' ہمیں لکھیے۔

شادی' محبت' ازدواجی زندگی کے مسائل' جسمانی' نفسیاتی اور روحانی تکالیف و الجھنیں۔ کاروباری' مالی یا تعلیمی معاملات میں ناکامیاں۔ وقت کی گردش کے تحت مصائب اور پریشانیاں۔ الغرض کوئی بھی مسئلہ ہو' ہم علمی طور پر نہ صرف آپ کی ہر ممکن رہنمائی کریں گے بلکہ آپ کے مسئلے کے ممکنہ مادی و روحانی حل کے لئے تدابیر بھی تجویز کریں گے۔ آپ کے سوالوں کے جواب اور مسائل کا حل علم نجوم واعداد و جفر' نفسیات و روحانیات اور طب کی روشنی میں پیش کیے جائیں گے۔ ان علوم کے بارے میں اگر آپ چاہیں تو کوئی معلوماتی سوال بھی کرسکتے ہیں۔

مکمل تفصیل کے ساتھ اپنے حالات لکھیے۔ ساتھ ہی درج ذیل کوائف سے بھی آگاہ کیجیے۔

مکمل نام مع والدہ ____________

مکمل تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش ____________

پیدائش کا شہر یا گاؤں ____________

سوال کرنے کا وقت' مکمل تاریخ اور شہر کا نام ____________

کسی جسمانی یا روحانی بیماری کی صورت میں اب تک کیے گئے علاج کی تفصیل۔

کھانے میں میٹھی چیزیں زیادہ پسند ہیں یا نمکین؟ آنکھوں کا رنگ؟ جسمانی طور پر نارمل یا مائل بہ فربہی؟

پتہ:

"مسیحا" معرفت ماہنامہ پاکیزہ پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی

"پھوپو! میں نے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ آپ یہ سن کر پریشان ہو جاتیں" میں نے کہا۔

"بیٹا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ میں پریشان ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں" پھوپو الجھتے ہوئے بولیں "امبرین اس کے ساتھ بہت خوش ہے اور دوسری طرف میں نے تیمور کے بارے میں بھی سن رکھا ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے لیکن پھر یہ سوچتی ہوں کہ جب میری بیٹی اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہے تو پھر مجھے کس بات کی پریشانی۔ دنیا کے لیے وہ چاہے جیسا بھی ہو، لیکن امبرین کے لیے تو ٹھیک ہے نا۔"

"جی ہاں' یہ بات تو ہے" میں نے آہستہ سے کہا "امبرین اس کو فرشتہ سمجھتی ہے۔"

"پتا نہیں بیٹے' ویسے میرے لیے یہ اطمینان کی بات ہے کہ وہ زندہ ہے اور خوش ہے۔"

اس کے بعد بہت دنوں تک پھر کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ ایک آدھ بار پھوپو سے ملاقات ہوئی تو امبرین کی خیریت معلوم ہوتی رہی۔ امبرین بالکل خیریت سے تھی اور بہت اچھی زندگی گزار رہی تھی۔ صغرا پھوپو کو اس کی طرف سے مکمل اطمینان ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک رات بہت خاموشی کے ساتھ ان کا انتقال ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ وہ بہت پُرسکون ہو کر مری تھیں۔

ان کے جنازے میں دوسروں کے ساتھ تیمور بھی شریک تھا۔ اب سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تیمور اور امبرین میاں بیوی ہیں۔ پہلی اولاد کے بعد امبرین اور تیمور کے یہاں اب ایک بچی بھی تھی۔

ہو سکتا تھا کہ صغرا پھوپو کی موت اس وقت ہوتی جب امبرین خودکشی کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی اور تیمور نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس وقت اگر تیمور اور امبرین صغرا پھوپو کے جنازے میں شریک ہوتے تو شاید طرح طرح کی باتیں ہوا کرتیں۔ محلے والے دونوں کو حیرت اور حقارت سے دیکھتے لیکن اب اس واقعے کو کئی سال گزر چکے تھے۔ اس لیے کسی کو پروا بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس مصروف دور میں کون کس پر دھیان رکھا کرتا ہے۔

جنازے کے بعد میں کچھ دیر وہاں رہ کر واپس آگیا تھا۔ امبرین سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اور دو تین سال بیت گئے۔ ان دونوں کی خیریت ادھر ادھر سے معلوم ہو جایا کرتی پھر ایک دن ایک ہولناک خبر سننے کو مل گئی۔ تیمور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اس خبر کا پس منظر کچھ یوں تھا کہ تیمور کے محلے میں کچھ مسلح نوجوان ایک لڑکی کو اٹھا کر بھاگنے والے تھے۔ اتفاق سے تیمور وہاں موجود تھا۔ وہ تو شروع ہی سے بے جگرا آدمی تھا۔ اس نے اغوا کرنے والوں اور ان کے ہتھیاروں کی پروا کیے بغیر ان پر حملہ کر دیا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی تو بچ گئی لیکن اس چکر میں تیمور مارا گیا تھا۔ یہ ایک بھیانک خبر تھی۔ میں نے تیمور کے محلے کی طرف دوڑ لگا دی۔ اطلاع درست ثابت ہوئی تھی۔ تیمور واقعی اسی طرح ہلاک ہوا تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر میری کیفیت کچھ عجیب ہونے لگی تھی۔ ایک ساتھ بہت سی باتیں میرے ذہن پر حملہ آور ہو گئی تھیں۔ تیمور کے جنازے میں بے شمار لوگ تھے۔ پورا محلہ اس جنازے میں شریک تھا کیونکہ اس کی موت ہی اس انداز میں ہوئی تھی۔

یہ اس کی دین تھی' جسے پروردگار دے۔ وہ شہید ہوا تھا اور شہید کی شان تو کچھ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ اس نے کسی غیر لڑکی کی عزت محفوظ رکھنے کے لیے اپنی جان جیسی قیمتی چیز دے دی تھی۔

اس وقت میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہوں کہ ذرا اٹھ کر دیکھو تو سہی۔ تمہارا مولوی صاحب تمہارے جنازے میں شریک ہونے کے لیے آیا ہے۔ اگر امبرین کا حوالہ نہ بھی ہوتا تب بھی میں اسی طرح آتا کیونکہ تم اپنی ذات میں ایک بڑے آدمی تھے۔ تم مجھ سے یہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے خدا سے تمہاری سفارش کر دوں تو تیمور' خدا تو اب تمہارا ہے۔ تم اس کے ہو چکے ہو اور اس نے تمہیں قبول کر لیا ہے۔

پھر مجھے فیض صاحب کا جنازہ یاد آگیا۔ جس میں گنتی کے چند لوگ شریک تھے اور ایک تیمور کا جنازہ تھا کہ کندھا دینے والوں کی لائن لگی ہوئی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اللہ والا کون تھا؟ فیض صاحب یا تیمور؟ یا خود میری موت کے بعد میرا کیا حال ہو گا؟ کیا میرے جنازے کو اتنے لوگ میسر ہوں گے یا نہیں ہوں گے؟

اس دن کے بعد سے لوگوں کو دیکھنے کا میرا نقطۂ نظر ہی بدل چکا ہے۔ اب مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ کسی کے ظاہر پر مت جاؤ' ذرا اس کے باطن میں تو جھانک کر دیکھو۔ کون جانے کہ تم آج جس سے حقارت سے پیش آرہے ہو' خدا کو وہ تم سے زیادہ عزیز ہو۔

پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

السلام علیکم

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ سرگزشت سے میری واقفیت پرانی ہے۔ آپ سے پہلی بار مخاطب ہو رہا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ اپنی ایک بپتا بیان کرنے کا خیال آگیا ہے۔ میری یہ آپ بیتی اگر لائق توجہ ہو تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔

ایک قاری
عاصم بختیار، کراچی

آنکھوں دیکھی

ڈیڈی آفس کی طرف سے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ جب واپس آئے تو ایک پیاری سی بچی ان کے ساتھ تھی۔ میں نے "پیاری" اس لیے کہا کہ سب نے اسے دیکھتے ہی یہ الفاظ دہرائے تھے ورنہ مجھے وہ کہیں سے بھی پیاری نہیں لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اس وقت تک اکلوتا تھا اور اپنی محبت میں کسی کو بھی شریک کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں اس وقت بارہ سال کا تھا اور وہ بچی بمشکل سات سال کی ہوگی۔ میرا' اس کا کوئی جوڑ بھی نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ کر خوش ہوتا کہ چلو' ساتھ کھیلنے والی آگئی۔ میرے ننھے سے ذہن نے اس وقت یہی سوچا تھا کہ یہ لڑکی ڈیڈی کو کہیں سے پڑی ہوئی ملی ہوگی' اٹھا کر گھر لے آئے ہیں۔ وہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ میری تایا زاد بہن ہے اور اس کا نام رانی ہے۔

میرے ایک تایا حیدرآباد میں رہتے تھے۔ کراچی سے حیدرآباد کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن دلوں کے درمیان بہت فاصلے تھے۔ کچھ خاندانی رنجشیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان لوگوں سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا۔ میں نے کبھی اپنے تایا' یا ان کے بچوں کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب کچھ دنوں سے میں

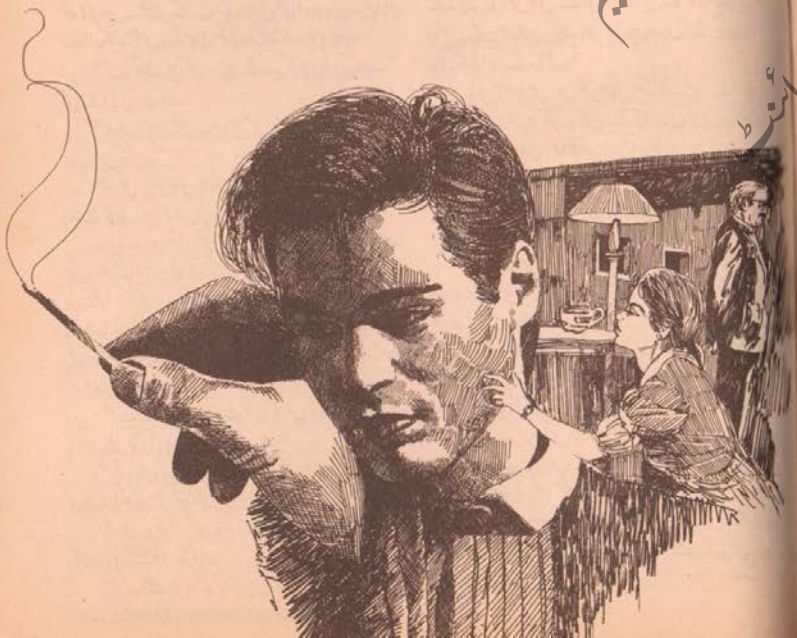

سن رہا تھا کہ رنجشیں کچھ دور ہوئی ہیں۔ اس کا نتیجہ میرے سامنے تھا کہ ڈیڈی، رانی کو لے کر آگئے تھے۔

"یہ اتنی سی بچی آپ کے ساتھ آکیسے گئی اور یہ یہاں اکیلی رہ لے گی؟" ممی نے پوچھا۔

"اسے اتنی سی مت کہو۔" ڈیڈی نے کہا "ذرا کھل جائے تو دیکھنا۔ ایسی عقل مندی کی باتیں کرتی ہے کہ دیکھتے رہ جاؤ۔"

"پھر بھی۔ ہے تو بچی ہی نا۔"

"میں نے بھی اس کی ماں سے یہی کہا تھا لیکن یہ خود ہی ضد کر کے میرے ساتھ آگئی۔"

اس کے بعد ممی نے رانی سے پوچھا "کیوں بیٹی! تم یہاں اکیلی رہ لوگی؟ گھبراؤ گی تو نہیں؟"

"اکیلی کہاں ہوں۔ آپ ہیں، چچا جان ہیں اور یہ لڑکا ہے جس کا نام آپ لوگوں نے مجھے ابھی تک بتایا ہی نہیں۔ میں اکیلی کہاں ہوں۔"

"ہمارا مطلب تھا، تم اپنے ابو، امی کے بغیر یہاں گھبراؤ گی تو نہیں۔"

"آپ لوگ بھی تو میرے ابو، امی کی طرح ہیں۔ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔ کھیلنے کے لیے ایک بھائی بھی موجود ہے۔ کیا نام ہے ان کا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ یہ تو بڑی ذہین ہے۔" ممی نے ڈیڈی سے کہا۔

"صرف ذہین نہیں۔ میری مس کہتی ہیں ضرورت سے زیادہ ذہین ہوں۔"

"واقعی یہ تو بڑی پٹاخا ہے۔" ممی نے کہا اور میرے سامنے کئی بار اس کا منہ چوم ڈالا۔

جب سے وہ آئی تھی، سب اسی میں لگے ہوئے تھے۔ میری طرف کوئی دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا گلاس تھا، میں نے جان بوجھ کر اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا تاکہ سب کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ جائے۔ یہی ہوا بھی۔ جیسے ہی گلاس کی آواز آئی۔ ممی نے اسے چھوڑ کر میری طرف دیکھا۔

"اے ہے، میرے سیٹ کا نیا گلاس توڑ ڈالا۔ تیرے ہاتھوں میں تو کوئی چیز ٹکتی ہی نہیں ہے۔"

"چچی جان، یہ گلاس انہوں نے جان بوجھ کر توڑا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں تھا، خود بخود گرا دیا۔" رانی نے کہا۔

"جان بوجھ کر کیوں گرائے گا۔" ممی نے کانچ کے ٹکڑوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"لوگ غصے میں آکر کیا چیزیں توڑتے نہیں ہیں؟ انہیں یہ غصہ ہے کہ میں کیوں آئی ہوں۔ ان کے چہرے سے لگ رہا ہے۔"

"واقعی، یہ لڑکی تو آفت ہے، پوری آفت۔" ممی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آفت نہیں چچی جان، آفت کی پڑیا۔ میری امی تو مجھے یہی کہتی ہیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔"

"میں ان کے ساتھ کھیل لوں؟ کیا نام ہے ان کا؟" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

"اس کا نام ہے عاصم، جاؤ کھیل لو لیکن دیکھ بھال کے کھیلنا۔ یہ بھی کوئی کم شریر نہیں ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرا ہاتھ تھام لیا "آیئے عاصم بھائی کھیلیں۔"

"چھوڑو میرا ہاتھ۔ مجھے نہیں کھیلنا تمہارے ساتھ۔" میں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"دیکھا چچی جان! یہ کتنے غصے میں ہیں۔" رانی نے کہا۔

"عاصم! تم تو واقعی اس سے جل رہے ہو۔" ڈیڈی نے کہا "بھئی، یہ کوئی ہمیشہ کے لیے تو آنہیں گئی ہے۔ مہمان آئی ہے۔ چند روز میں اس کے امی، ابو آئیں گے اور اسے لے جائیں گے۔ مہمانوں کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔ چلو، جاؤ۔ کھیلو اس کے ساتھ۔"

ڈیڈی کا کہنا میں کس طرح ٹال سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لے آیا جہاں کیرم بورڈ اور دوسرا کھیل کا سامان رکھا تھا۔

"کیا کھیلو گی؟"

"ذرا نرمی سے کہیے عاصم بھائی۔ آخر کو میں آپ کی کزن ہوں۔"

اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ غصے میں ہونے کے باوجود مجھے ہنسی آگئی تھی لیکن ہنسی ظاہر کر کے خود کو کمزور ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"دیکھو میری کزن! مجھے تمہارے ساتھ کھیلنے کا شوق نہیں ہے۔ میں تو ڈیڈی کے کہنے سے آگیا ہوں۔"

"شکریہ! آؤ کیرم کھیلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے کیرم اس کے سامنے رکھ دیا اور بے دلی سے کھیلنے لگا کہ بچی ہے اس کے ساتھ کیا کھیلنا لیکن جب اس کی مہارت دیکھی تو مجھے سنبھلنا پڑا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کے سامنے مجھے شرمندگی نہ ہو لیکن اس نے چوتھے ہی بورڈ میں مجھے شکست دے دی۔ اس کے قہقہے مجھے پاگل کیے دے رہے تھے۔

دماغ

انسانی دماغ کھوپڑی کے اندر ایک مخصوص پانی میں محفوظ رہتا ہے۔ دماغ زندگی بھر کبھی بھی آرام نہیں کرپاتا بلکہ یہ کام میں مشغول رہ کر لطف پاتا ہے۔ ایک عام دماغ کے اندر بارہ بلین اعصابی خلیے یا نیوران موجود ہوتے ہیں۔ دماغ کا وزن عموماً تین پاؤنڈ ہوتا ہے۔

امریکا کے دارالحکومت واشنگٹن میں دماغوں کا ایک میوزیم ہے جس کا نام "آرمڈ فورسز انسٹیٹیوٹ آف پاتھولوجی"

ARMED FORCES INSTITUTE OF PATHOLOGY

ہے۔ اس عجائب گھر میں پندرہ سو سے زائد دماغ محفوظ کیے گئے ہیں۔ کچھ دماغ نوجوان لوگوں کے ہیں اور بعض بوڑھوں کے۔ ان دماغوں میں ایڈز کی بیماری سے مرنے والوں کے بھی چند دماغ نمونے کے طور پر محفوظ کیے گئے ہیں۔ اس طرح رشیا کے "ماسکو برین انسٹی ٹیوٹ" میں روسی رہنما لینن (LENAN) کے دماغ کے علاوہ دوسرے مشاہیر کے دماغ بھی موجود ہیں۔

(محمد یونس بلوچ، جرمنی)

"عاصم بھائی، آپ ہارے تھوڑی ہیں۔ آپ تو مجھے بچی سمجھ کر بے دلی سے کھیل رہے تھے اس لیے میں جیت گئی۔"

میں پریشان ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی نجومی ہے کیا ہے۔ دلوں کا حال معلوم کر لیتی ہے۔

"اب آپ کہیں گے، میں آپ کے ساتھ کوئی اور کھیل کھیلوں۔"

"ارے واہ! تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہ سوچ رہا ہوں۔"

"سیدھی سی بات ہے۔ آپ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کو اپنا ہارنا اچھا نہیں لگا ہے لہٰذا کسی دوسرے کھیل میں مجھے ہرانے کی کوشش کریں گے مثلاً آپ کہیں گے، آؤ رانی! شطرنج کھیلیں۔"

"آتی بھی ہے شطرنج؟"

"کھیل کر دیکھ لو۔"

شطرنج مجھے ڈیڈی نے سکھائی تھی۔ وہ اکثر میرے ساتھ کھیلتے بھی تھے۔ میں اچھا خاصا کھیلنے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں شطرنج میں رانی کو ہرا دوں گا۔

میرا یہ خواب بھی جلد ہی ٹوٹ گیا۔ وہ نہایت احتیاط سے نہایت نپی تلی چالیں چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شطرنج جیسا مشکل کھیل بھی کھیلنا جانتی ہے۔ میں نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن اس کے سامنے بے بس ہونا پڑا۔ اس نے ایک ایسی چال پھنسائی کہ شکست کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ میری شکست پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔

"تم بہت بڑی بے ایمان ہو ورنہ تم مجھے شکست نہیں دے سکتی تھیں۔"

"عاصم بھائی، آپ زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے۔"

"کھیل کا زندگی سے کیا تعلق۔ بنتی ہے بڑی ذہین۔"

"میری مس کہتی ہیں، جو کھیل میں اپنی شکست برداشت نہیں کر سکتا، وہ زندگی میں ایک شکست کے بعد حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔"

"بکواس کرتی ہیں تمہاری مس۔"

"اے! خبردار، جو میری مس کو کچھ کہا۔"

"کہوں گا۔ ہزار بار کہوں گا۔" میں نے کہا اور اپنی شکست کا بدلہ اس طرح لیا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ بے چاری تڑپ کر رہ گئی۔

"یہی عزت ہوتی ہے تمہارے گھر مہمانوں کی۔"

"ہاں۔ یہی عزت ہوتی ہے۔ دو چار دن اور رہو گی تو مار مار کے کھال ادھیڑ دوں گا۔"

وہ اتنی ڈر گئی کہ میرے کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی، میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ممی سے میری شکایت کرے گی لیکن شاید وہ اتنی ڈر گئی تھی کہ میری شکایت بھی کسی سے نہیں کی۔

یہ تھا رانی سے میرا پہلا تعارف۔ اس پہلی ملاقات میں اس نے شکست کے سوا مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تاثر دیا تھا کہ اس کے جسم میں کسی بڑی عورت کی روح ہے اسی لیے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرتی ہے۔

وہ ڈیڈی کے ساتھ آتو گئی تھی لیکن اس کے والدین کو یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اکیلی یہاں رہ لے گی اسی لیے وہ دوسرے ہی دن کراچی پہنچ گئے تھے۔ میں نے اپنے ہوش میں پہلی مرتبہ اپنے تایا اور تائی کو دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دوسرے بچے بھی آئے تھے۔ رانی سب سے چھوٹی تھی۔

ان کے آنے کے بعد بھی رانی ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے والدین کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ خطرناک حد تک ذہین ہے۔ رانی کی موجودگی میں کسی اور کا ذکر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہی بات مجھے ناگوار تھی اسی لیے میں رانی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

دو دن بعد وہ ہمارے گھر سے چلی گئی اور میں نے شکر ادا کیا لیکن یہ شکر کئی دن تک اس لیے ادھورا رہا کہ رانی کے جانے کے بعد بھی ممی کئی دن تک اسی کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

دونوں خاندانوں کے درمیان جو رنجش تھی وہ ختم ہو گئی تھی لیکن دلوں میں گنجائشیں ختم ہو چکی تھیں اس لیے زیادہ ملنا جلنا نہیں رہا تھا پھر یہ بھی تھا کہ ایک شہر کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ وہ حیدر آباد میں تھے، ہم کراچی میں۔ کبھی کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ تقدیر اسے ایک مرتبہ پھر میرے گھر لے آئی۔ وہ انٹر کر چکی تھی اور اس کا داخلہ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج میں ہو گیا تھا۔ تایا نے مناسب سمجھا کہ وہ ہوسٹل میں رہنے کے بجائے ہمارے گھر رہے۔ میں اس وقت بی ' ایس ' سی کے آخری سال میں تھا۔ ڈاکٹر بننے کا خواب میں نے بھی دیکھا تھا لیکن میرے نمبر کم تھے اس لیے مجبوراً بی ' ایس ' سی کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے پھر مجھے شکست دے دی تھی۔

جب میں اور اب میں کتنا فرق ہو گیا تھا۔ رانی میرے سامنے آئی تو اس پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ وہ جتنی ذہین تھی اس سے زیادہ حسین تھی۔ میری یادوں کے خزانے میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی لیکن اب محبت کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب میں نے اسے دیکھتے ہی سوچا تھا' یہ یہاں سے کب جائے گی۔ ایک زمانہ یہ تھا کہ سوچ رہا تھا' یہ یہاں سے کبھی نہ جائے۔ میں بھی اب بھرپور جوان ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر یادوں کی راکھ وہ بھی کریدنے لگی تھی پھر جیسے بہت سی باتیں اسے ایک ساتھ یاد آ گئیں۔

"عاصم بھائی! یاد ہے' میں نے کیرم بورڈ میں آپ کو کیسا ہرایا تھا۔" اس نے یادوں کی راکھ سے ایک چنگاری نکالی۔

"وہ تو میں جان بوجھ کر ہار گیا تھا۔ اب کھیل کر دیکھو۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اب کوئی رعایت نہیں ہو گی۔"

"بچپن کی فرصتیں اب کہاں۔ اب کھیلنے کا وقت کیسے مل سکتا ہے۔"

"اگر تم میرے ساتھ کھیلو گی نہیں تو مجھے شکست برداشت کرنے کی عادت کیسے پڑے گی۔"

"کیا مطلب!"

"یاد ہے' تم نے کہا تھا جو شخص شکست برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا' وہ زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

"میں نے کہا تھا!" وہ ہنسنے لگی "میں اتنی چھوٹی عمر میں اتنی بڑی بات کیسے کر سکتی تھی۔"

"تم اس سے بھی بڑی باتیں کرتی تھیں۔"

"اچھا! مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ مجھے دیکھ کر تم جل گئے تھے۔"

"یہ عادت تو میری اب بھی ہے لیکن اب میں ان جلووں گا جو تمہیں دیکھیں گے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ اس بات کو وہ سمجھی تھی یا نہیں لیکن وہ حیران ضرور ہوئی تھی۔

"آپ سائنس کیوں پڑھ رہے ہیں۔ آپ کو تو فلسفہ پڑھنا چاہیے تھا۔"

"آج سے تم پڑھو گی اور میں تمہیں پڑھتے ہوئے دیکھوں گا۔"

"بڑے ہوتے اسی لیے ہیں کہ نگرانی کرتے رہیں۔"

اس نگرانی کا اس نے کوئی بھی مطلب لیا ہو۔ اس کے آتے ہی مجھ میں یہ تبدیلی آئی کہ میں نے کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔

"عاصم بھائی' آخر آپ پڑھتے کس وقت ہیں۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ اب تم پڑھو گی اور میں تمہیں پڑھتے ہوئے دیکھوں گا۔"

"واہ! کیا بات ہوئی۔ تم چچا جان کی ایک ہی اولاد ہو۔ انہوں نے تم سے کیا کیا امیدیں وابستہ کر رکھی ہوں گی اور تم۔"

"تم مجھے نصیحت کرنے والی کون ہوتی ہو۔" میں اچانک تلخ ہو گیا۔

"عاصم بھائی۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی اور پھر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

میں نے بچپن سے اب تک اسے کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ وہ میرے حافظے کے پردے پر کبھی نمودار نہیں ہوئی تھی لیکن اسے دیکھتے ہی میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ مرعوب اتنا تھا کہ اس سے دل کی بات کہتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ میری کیفیت کو وہ خود ہی سمجھ لے۔ یہ انتظار طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے اس کے ادنیٰ ملازم کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اسے صبح کے وقت کالج چھوڑنے جاتا تھا۔ واپس آ کر اس کا کمرا صاف کرتا تھا۔ اس کی بکھری ہوئی کتابوں کو سلیقے سے رکھتا تھا۔ رات کو جب تک اس کے کمرے میں روشنی رہتی تھی، کمرے کے سامنے ٹہلتا رہتا تھا کہ کہیں اسے کسی چیز کی ضرورت نہ پڑ جائے۔

کمرے میں اس خیال سے نہیں جاتا تھا کہ اس کی پڑھائی میں حرج ہو گا۔

وہ جو دلوں کا حال جان لیتی تھی' اب ایسی بے خبر تھی کہ اسے میرا احساس تک نہیں تھا۔

اب میرا ماضی' میرا حال' میرا مستقبل سب کچھ وہی تھی۔ اس کی کامیابی میری کامیابی تھی۔ مجھے اپنی پروا نہیں تھی۔ جب سے وہ آئی تھی' میں نے کتاب اٹھا کر بھی نہیں دیکھی تھی۔

اپنی پڑھائی کی طرف سے بے نیازی کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ میں فیل ہو گیا۔ خواب یہ دیکھا تھا کہ انٹر میں تو نمبر اچھے نہیں آ سکے تھے لیکن بی ' ایس ' سی کرنے کے بعد میڈیکل میں داخلہ لے لوں گا لیکن اب تو سب کچھ ہی الٹا ہو گیا۔ مجھے ذرا بھی ملال نہیں ہوا کیونکہ رانی' میڈیکل کے پہلے سال میں نہایت شان دار نمبروں سے پاس ہو گئی تھی۔

"تم اتنے غیر ذمے دار کیوں ہو۔" رانی مجھے سمجھا رہی تھی "چچا جان کو تم سے کتنی امیدیں ہیں اور تم ہو کہ نہ جانے کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ میں نے تو تمہیں کبھی کتاب ہاتھ میں اٹھائے ہوئے دیکھا نہیں۔ میرے ہی پاس آ کر بیٹھ جاتے تو ہم دونوں مل کر پڑھ لیتے۔"

"میں تو اس ڈر سے آپ کے پاس آ کر نہیں بیٹھا کہ آپ کی پڑھائی کا حرج ہو گا۔"

"اخاہ! میرا اتنا خیال۔ نہ پڑھنے کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا تو خود ہی پڑھ لیتے۔ کسی لڑکی وڑکی کا تو چکر نہیں ہے۔ اگر ہے تو بتا دیجئے۔ میں چچی جان سے بات کر لوں گی۔"

میں نے سوچا اقرار کر لوں۔ لڑکی کا نام بھی بتا دوں۔ چیخ چیخ کر کہوں' بے خبری کی بھی حد ہوتی ہے۔ تمہارے عشق میں میرا یہ حال ہو گیا اور تمہیں خبر ہی نہیں۔

میں نے یہ موقع بھی گنوا دیا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ پتھروں سے پھوڑتی رہی۔

"عاصم بھائی' آپ کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ آپ تو کچھ بولتے ہی نہیں۔"

"تم بولتی رہو۔ تمہارا بولنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اتنی باتیں تو کبھی تم نے مجھ سے کہیں ہی نہیں۔ اس بہانے خوب باتیں کر لیجئے۔"

"اب میں تمہاری طرح فالتو تو ہوں نہیں کہ باتیں ہی کرتی رہوں۔"

"میں بھی فالتو نہیں ہوں۔ کچھ نہ کچھ کام تو کر ہی رہا ہوں۔"

"کیا کام کر رہے ہیں۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔"

ایک موقع پھر آیا تھا کہ میں اظہارِ محبت کرتا لیکن زبان پر پھر تالا سا پڑ گیا۔

"آپ جو کام بھی کر رہے ہیں' شوق سے کریں لیکن اس سال امتحان میں ضرور بیٹھیں اور پاس بھی ہو کر دکھائیں۔"

"جی بہت اچھا۔"

میں اس کے پاس پیاسا بیٹھا تھا' پیاسا ہی اٹھ گیا۔ اس کی سنتا رہا' اپنی کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

زندگی پھر اسی رفتار سے چلنے لگی تھی۔ میں اس سال پھر امتحان میں بیٹھ رہا تھا۔ رانی نے مجھے بہت سمجھایا تھا اس لیے کچھ نہ کچھ پڑھ بھی رہا تھا۔

رانی اگر دور ہوتی تو میرا دھیان بٹتا رہتا۔ مجبوریوں کے نام پر تسلی ملتی رہتی لیکن ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے وہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے تھی اس لیے میری وحشت بڑھتی ہی چلی گئی۔

ایک رات میں حسبِ معمول اس کے کمرے کے سامنے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس نے دروازہ کھولا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔

"عاصم بھائی آپ! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

میں اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا لیکن گھبراہٹ میں سچی بات میرے منہ سے نکل ہی گئی۔

"تم جاگ رہی تھیں۔ تمہیں کسی بھی چیز کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس لیے میرا یہاں ہونا ضروری تھا۔"

"اف میرے خدا! اس سردی میں آپ اس طرح ٹہل رہے ہیں۔"

"تم بھی تو اس سردی میں ابھی تک جاگ رہی ہو۔ پھر میں کیسے سو سکتا تھا۔"

"یہ کیا دیوانگی ہے۔ جلدی سے اندر آئیے ورنہ سردی لگ جائے گی۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں کھینچ لیا۔

"اب بتایئے' یہ سب کیا ہے۔" اس نے کمبل میرے پیروں پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم اسے دیوانگی کہتی ہو مگر یہ تو میری مجبوری ہے۔ تم جاگ رہی ہو تو میں کیسے سو سکتا ہوں۔"

"تو اندر آ جاتے۔"

"مجھ سے باتوں میں لگ جاتیں تو تمہاری پڑھائی کا جو نقصان ہوتا۔"

وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر اس نے گردن اوپر اٹھائی۔

"مجھے پہلے بھی کئی دفعہ شک ہوا تھا کہ کوئی باہر ہے۔ اُف خدا! تو یہ تم تھے۔" اس نے بے اختیار میرے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر کہا۔

"تم نہ بتاؤ مگر میں تمہارے دل کی زبان سمجھتی ہوں۔"

"مجھے معلوم تھا۔ تم اتنی ذہین ہو کہ میری خاموشی کے باوجود میری پکار سن لو گی۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، رانی۔"

"میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں لیکن تم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ تمہیں تباہ کردے گا۔ جانتے ہو، اگر کوئی اس وقت تمہیں یہاں دیکھ لے تو کیا سوچے۔ وعدہ کرو کہ اس طرح راتوں کو میرے کمرے کے سامنے نہیں ٹہلا کرو گے۔"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو؟"

"میں اپنی ضرورت خود پوری کرلوں گی۔ یہ میرا اپنا گھر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ اب تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو گے۔"

"سچی بات یہ ہے کہ میں خود کو تمہارے لائق نہیں سمجھ رہا تھا۔ اب تم نے میری محبت قبول کرلی ہے تو میں ضرور پڑھوں گا۔"

اس ایک رات نے مجھے کئی صبحوں کا اجالا بخش دیا۔ یہ غرور عطا کردیا کہ رانی میری ہے۔

ہم ایک ہی گھر میں تھے۔ ہزار مواقع ملتے تھے۔ جب ایک مرتبہ ہم نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تو بات بڑھتی ہی گئی۔ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ رات کے وقت میں اس کے کمرے میں نہ آیا کروں لیکن اب میری ہر رات اس کے کمرے میں گزرتی تھی۔ وہ جو مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی، اب اسے میرے بغیر چین نہ آتا تھا۔

"رانی، کیا تم مجھے ہمیشہ کے لیے مل سکتی ہو۔" ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

وہ ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ اس کی آنکھیں یوں ساکت ہوگئیں جیسے کسی گہری جھیل کا پانی اچانک خشک ہوگیا ہو۔

"کیا ہوا رانی؟ کیا میں نے کوئی بے ہودہ سوال کردیا؟"

"اگر میری شادی کی بات چلی تو میرا پہلا انتخاب تم ہوگے لیکن..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا ہے؟"

"لیکن یہ کہ میں اپنے والدین کا انتخاب کسی قیمت پر نہیں ٹال سکوں گی۔ اگر انہوں نے تمہیں ٹھکرا دیا اور میرا رشتہ کسی اور جگہ طے کردیا تو میں ان کی بات ٹال نہیں سکوں گی۔ تم اس وقت کے لیے بھی تیار رہنا۔"

"اور ہماری محبت؟"

"اسے میں ہمیشہ اپنے دل میں محسوس کروں گی۔ محبت صرف پالینے کا نام نہیں ہوتا۔"

"مگر میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔"

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گی۔"

"یہ کیسی محبت ہے؟"

"کیا والدین ہم سے محبت نہیں کرتے؟ کیا ان کا ہم پر کوئی حق نہیں؟"

"لیکن یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔"

"والدین کی خوشی کا بھی تو سوال ہے۔ میں انہیں ناخوش کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"اور میری خوشی؟"

"ضروری تو نہیں کہ وہ تمہیں ٹھکرا ہی دیں۔ یہ تو ایک بات کہی ہے جو غلط بھی ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ میرے انتخاب پر اعتراض نہ کریں۔ تمہیں قبول کرلیں۔"

"مجھے ڈر ہی لگتا ہے۔ میں ہمیشہ تم سے ہارتا ہی رہا ہوں۔"

"تم مجھ سے کھیل میں ہارتے تھے۔ محبت میں تو تمہاری جیت ہوئی ہے۔ میں ہار گئی ہوں اعظم۔ تم فتح یاب ہوئے ہو۔"

اس نے ایسی باتیں کی تھیں کہ میں فکر مند ہوگیا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرا ساتھ نہیں دے گی اگر تایا نے انکار کردیا تو میری طرف سے لڑنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ برابر اسی بات پر اڑی رہی تھی کہ اپنے والدین کی رضا کو نہیں ٹھکرا سکے گی۔

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں، اُدھر تقدیر اپنا فیصلہ لکھ رہی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح تایا ابو آگئے۔ وہ رانی کو لینے آئے تھے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر آتے تھے اور اسے لے جاتے تھے۔ انوکھی بات یہ تھی کہ رانی کا رشتہ آیا تھا۔ کچھ لوگ اسے دیکھنے آرہے تھے۔ یہ اطلاع مجھ پر بجلی بن کر گری۔ ابھی تو میں نے اپنے گھر والوں سے بھی بات نہیں کی تھی، تایا ابو کے کانوں میں کیا پڑتی۔ انہوں نے اگر اس رشتے کو قبول کرلیا تو وہ بے قصور ہوں گے۔ انہیں میری خواہش کا علم ہی نہیں تو ٹھکرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے جلدی جلدی رانی سے بات کی۔ وہ خود پریشان ہوگئی تھی۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ مسئلہ اتنی جلدی سامنے آجائے گا۔

"تم اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر فی الحال اس رشتے کو ٹال دینا۔" میں نے رانی سے کہا۔

"اس سے کیا ہوگا۔ گھر والے میری شادی نہیں تو منگنی تو کرسکتے ہیں۔"

"پھر تم صاف انکار کردینا۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ میں نہیں کرسکتی۔"

"پھر میں کیا کروں۔"

"میں اتنا کرسکتی ہوں کہ سوچنے کے بہانے دو تین دن کا وقت لے لوں۔ تم کل پرسوں، پرسوں چچی جان کو ہمارے گھر بھیج دینا کیونکہ کل وہ لوگ آرہے ہیں گے۔"

تایا ابو، رانی کو لے کر چلے گئے۔ اب مجھے ہمت کرنی تھی کہ ممی کو ان کے گھر بھیجنے پر آمادہ کرسکوں۔

میں نے ممی سے تذکرہ کیا۔ وہ میری بات سن کر حیران رہ گئیں۔

"تم اب کہہ رہے ہو جب اس کی بات کہیں سے آچکی ہے۔ اگر انہوں نے بات پکی کرلی تو میں کیا منہ لے کر ان کے گھر جاؤں گی۔"

"رانی نے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ دینے میں دو تین دن لے لے گی۔ آپ پرسوں وہاں پہنچ جائیں۔ رانی نے مجھ سے یہی کہا ہے۔"

"میں چلی جاتی ہوں لیکن امید بہت کم ہے۔ تم نے بہت دیر کردی۔"

"آپ جائیں تو۔ آگے میری قسمت۔"

"دیکھو، میں تمہارے ڈیڈی سے بات کرتی ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"وہ کچھ بھی کہیں۔ بس آپ کو جانا ہے۔"

ممی کے خیال کے مطابق اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ ہرگز وہاں جانے کو تیار نہیں تھیں لیکن میری ضد کے آگے پسپا ہوگئیں۔

میں ڈیڈی اور ممی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ تایا ابو ضرور مان جائیں گے کیونکہ میں ان کے بھائی کا بیٹا ہوں۔ رانی پر پہلا حق میرا ہے اور پھر رانی کا ووٹ بھی میرے حق میں ہوگا۔

آخر وہ وقت آگیا کہ ممی واپس آگئیں لیکن ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بات میرے حق میں نہیں ہوئی ہے۔

"وہ نہیں مان رہے ہیں۔" ممی نے بجھے دل سے کہا "حالانکہ ابھی بات پکی نہیں ہوئی ہے۔ دو دن بعد رانی سے پوچھ کر جواب دیں گے۔ انہیں اپنوں کا کچھ خیال ہی نہیں۔ ہم نے ان کی بیٹی کو اپنے گھر میں رکھا۔ انہوں نے اس احسان کا بھی منہ نہیں کیا۔"

ممی تو بہت دیر تک بولتی رہی تھیں لیکن مجھ میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ میں گھر سے نکل گیا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا ابھی بس میں بیٹھوں اور حیدر آباد پہنچ جاؤں لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ ممکن ہے رانی انکار کردے اور فیصلہ میرے حق میں ہوجائے۔

تین دن بعد تایا کا ٹیلی فون آیا کہ رانی کی بات پکی ہوگئی ہے اور فلاں تاریخ کو منگنی ہے۔ یہ آخری امید بھی ختم ہوگئی کہ رانی کچھ کرے گی۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے فیصلے کی پاس داری کرے گی۔ آخر اس نے یہی کیا۔

تایا کے گھرانے سے ایک مرتبہ پھر ہمارے تعلقات کشیدہ ہوگئے۔

رانی کی منگنی میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ڈیڈی اس ایک بات پر ان سے بگاڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے ممی کو بھی سمجھایا۔ ڈیڈی اور ممی چلے گئے لیکن میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں اب بھی مطمئن تھا کہ منگنی سے نمٹنے کے بعد رانی یہاں رہنے کے لیے آئے گی تو اس سے بات کروں گا۔

منگنی کے بعد بھی ایک ہفتہ گزر گیا لیکن رانی لوٹ کر نہیں آئی جبکہ اس کا کالج کھلا ہوا تھا پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ میری دلچسپی دیکھتے ہوئے تایا ابو نے یہ مناسب نہیں سمجھا ہوگا کہ وہ ہمارے گھر رہے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے میں حق بجانب تھے لیکن مجھے بھی اور ڈیڈی کو بھی یہ دکھ ہوا کہ انہوں نے ہمیں اعتماد میں بھی نہیں لیا اور نہ ہی اپنے فیصلے کی اطلاع دی۔ مجھے رانی پر بھی غصہ تھا کہ وہ ملنے بھی نہیں آئی۔ ہاسٹل ہی میں رہتی لیکن ملنے تو آسکتی تھی۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ اسی شہر میں ہے، میں اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ایک دن اس کے کالج پہنچ

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

گیا۔ میری آنکھوں کا دھوکا تھا یا وہ واقعی اتنی بدل گئی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی ماند پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں اپنی پریشانی بھول کر اس کی طرف سے فکر مند ہو گیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے رانی!"

"مجھے کیا ہونا ہے۔"

"کیا تم آئینہ نہیں دیکھتی ہو؟"

"اوہ' تو یہ بات ہے۔ پچھلے دنوں پڑھائی کا بہت نقصان ہو گیا۔ اب دن رات جاگ کر اس نقصان کو پورا کر رہی ہوں۔ بس اس وجہ سے۔"

"صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بات کچھ اور ہے۔"

"جب تمہیں معلوم ہے تو پوچھتے کیوں ہو۔"

"یہ کہاں کی فرماں برداری ہے کہ تم اپنی زندگی خراب کر کے ماں باپ کا کہنا مانو۔ تمہیں یہ منگنی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"میں نے تم سے پہلے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے والدین کا کہنا نہیں ٹال سکتی۔"

"تم اس فیصلے سے خوش نہیں ہو۔"

"میرے ماں' باپ تو خوش ہیں۔"

"تم مجھ سے ملنے تک نہیں آئیں۔"

"میں ڈر رہی تھی کہ نہ جانے تمہارا کیا ردِ عمل ہو۔ اب تم آ گئے ہو تو میں ضرور آؤں گی۔"

وہ اسی دن گھر آ گئی۔ میں نے ممی سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ کسی ناراضگی کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ ممی اس سے اچھی طرح ملیں البتہ میں نے موقع دیکھ کر اس سے شکایت کی۔ اس کا وہی جواب تھا جو وہ پہلے دے چکی تھی۔

"کیا ہماری محبت عارضی نہیں۔" میں نے کہا۔

"محبت تو میں اب بھی تم سے کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔"

"میں صرف محبت سے نہیں بہل سکتا۔"

"یہ تمہاری خود غرضی ہو گی۔ تم ہی بتاؤ میں ابو' امی کا کہنا کیسے ٹال سکتی ہوں۔"

"خدا کے لیے رانی' میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔"

"تمہیں میری خاطر زندہ بھی رہنا ہو گا' خوش بھی رہنا ہو گا۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہو گا۔"

"عاصم' مجھے تو دیکھو۔ کیا مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں زہر پی کر بھی زندہ ہوں۔ ہم دونوں رشتے دار ہیں۔ شادی کے بعد بھی میں تمہاری نظروں سے دور نہیں چلی جاؤں گی۔ ہم ملتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے رہیں گے۔ کیا یہ کم نہیں ہے؟"

میں ایک ... مرتبہ پھر اس کی باتوں سے بہل گیا۔ وہ روز گھر آنے لگی۔ اس کے چہرے پر سرخی نے پھر جگہ بنالی۔ اس کا حسن پھر جگمگانے لگا۔

کچھ دنوں کے لیے یہ خیال ہی ذہن سے نکل گیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ وہ روز گھر آجاتی تھی اور ہم گھنٹوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے رہتے تھے یا پھر کہیں گھومنے نکل جاتے تھے۔

ممی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا۔ ایک دن دبے لفظوں میں انہوں نے کہہ ہی دیا۔

"عاصم' تمہیں معلوم ہے وہ اب پرائی ہو چکی ہے۔ اب تمہارا اس سے اس قدر ملنا جلنا ٹھیک نہیں۔"

"ممی' وہ میری کزن بھی تو ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ تمہارا یوں ملنا مجھے قطعی پسند نہیں۔"

"ٹھیک ہے ممی' میں اسے منع کر دوں گا۔"

میں نے ظاہر ہے یہ بات ممی کو مطمئن کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ میں بھلا اسے کیسے منع کر سکتا تھا۔ میں نے رانی کو پوری بات بتائی' اور ہم لوگ باہر ملنے لگے۔

کراچی کا کوئی ہوٹل ایسا نہیں بچا جہاں جا کر ہم بیٹھے نہ ہوں۔ اس نے مجھے اپنا اتنا عادی بنالیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے اس کے بغیر قرار نہیں آتا تھا۔

قربت کے یہ لمحات میں نے جان بوجھ کر اسے دیے تھے کہ وہ مجھ سے اس درجہ مانوس ہو جائے کہ منگنی سے انکار کر دے۔

جب میں نے دیکھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی تو میں نے اپنا مطالبہ دہرایا لیکن اس کا اب بھی یہی جواب تھا کہ وہ شادی اپنے والدین کی مرضی سے کرے گی۔ اس کا یہ انکار میری برداشت سے باہر تھا۔ اس روز پہلی مرتبہ میں نے اس سے تلخی سے بات کی اور اس سے کہہ آیا کہ اب وہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ "جب تم اپنے والدین کی اتنی وفادار ہو تو میری ماں بھی تم سے ملنے کے لیے منع کرتی ہے۔ مجھ پر بھی فرض ہے کہ میں ان کا کہنا مانوں۔"

ممی تمام حالات سے بے خبر تھیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں نے اسے منع کر دیا ہے لہٰذا وہ نہیں آ رہی ہے۔ انہیں میرے احساسات کا بھی علم تھا اور طرح طرح سے مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں اپنے عہد پر جما ہوا تھا۔ پورے پندرہ دن ہو گئے تھے کہ میں اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا کہ اگر میں نے غصے میں کچھ کہہ بھی دیا تھا تو اسے ملنے تو آنا چاہیے تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا' میں اس سے ملنے نہیں گیا۔ میرا غصہ اب دم توڑنے لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا غیروں کی طرح سہی اس سے ملنے چلا تو جاؤں۔

اس روز اس کے کالج جانے کے لیے میں تیار ہو ہی رہا تھا کہ تایا ابو آ گئے۔ وہ رانی کی شادی کا کارڈ لے کر آئے تھے۔

"بھائی جان' وہ تو ابھی پڑھ رہی ہے۔" ممی نے پوچھا۔

"کیا کروں' اس کے سسرال والے جلدی کر رہے تھے۔ رشتہ مجھے اتنا پسند ہے کہ میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔ وہ لوگ وعدہ تو کر رہے ہیں کہ شادی کے بعد اسے تعلیم مکمل کرنے دیں گے۔"

"ارے بھائی جان' شادی ہو جانے کے بعد کہاں فرصت ملتی ہے لڑکیوں کو۔"

"آگے اس کی قسمت۔"

میں یہ باتیں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ اتنی جلدی یہ سب کیسے ہو گیا۔ جس خطرے سے میں بچتا پھر رہا تھا' وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میری خوشیوں کا قاتل میرے سامنے تھا لیکن اب میں کیا کر سکتا تھا۔

میں دیکھتا رہ گیا اور رانی کی شادی ہو گئی۔ مجھے اس سے سروکار نہیں تھا کہ اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے' وہ شخص کون ہے۔

وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ رانی کی شادی بھی ہو گئی اور میں نے دل پر پتھر بھی رکھ لیا۔

کہنے کو علاج ہو جاتا ہے لیکن انسان اندر سے جتنا ٹوٹ جاتا ہے' اس کا اندازہ کوئی اور نہیں وہ خود ہی کر سکتا ہے۔ میں نے پھر صبر کر لیا تھا لیکن صبر آتا نہیں تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

یونیورسٹی میں میری ملاقات بینا سے ہوئی۔ یوں تو وہاں جتنی لڑکیاں تھیں ان میں سے اکثر کسی نہ کسی رشتے کی تلاش میں نظر آتی تھیں لیکن بینا کا عالم ہی دوسرا تھا۔ وہ خوب صورت بھی تھی اور چنچل بھی۔ اس کی ادائیں ایسی تھیں کہ ہر لڑکا اس کا دیوانہ تھا۔ وہ کلاس میں بہت کم نظر آتی تھی۔ کبھی کینٹین میں دکھائی دیتی تھی کبھی لائبریری میں کسی لڑکے کے ساتھ بیٹھی نظر آتی تھی۔

جب سے میں یونیورسٹی پہنچا تھا' اس کی سرگرمیاں مجھ تک آ کر رک گئی تھیں۔ اس نے خود ہی میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن رانی کے بعد میں کسی دوسری لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور پھر بینا کی کہانیاں تو میں سن ہی چکا تھا۔ ایسی لڑکیوں میں ضد کا مادّہ بہت ہوتا ہے۔ اس نے بھی میری بے رخی کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنے کی متمنی نظر آتی تھی۔

"اگر تم میرے ساتھ شادی نہیں کر سکتے تو میرے ساتھ گھومو پھرو' عیش کرو۔" ایک دن اس نے صاف کہہ دیا۔

"کیوں اپنا وقت برباد کرتی ہو۔ میں کسی بھی انداز میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔"

"شاید کوئی بہت گہری چوٹ کھائی ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہی سمجھ لو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

"اب تو میں تمہارا پیچھا بالکل نہیں چھوڑ سکتی۔ تمہیں حاصل کرنا تو ثواب کا کام ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصفہ شاکر ہومیو کلینک

ڈاکٹر آصفہ شاکر ◆ ڈاکٹر نرگس مغل

تعطیل بروز ______ جمعۃ المبارک

C-2/960 کمرشل ایریا' طارق روڈ بالمقابل مسٹر برگر ۔ کراچی

اوقاتِ ملاقات: دوپہر ۱۲ تا ۳ بجے

گلشنِ اقبال برانچ

6/1 سفاری ویو بلاک 7 نزد مین گیٹ سفاری پارک

گلشن اقبال' کراچی

اوقاتِ ملاقات: شام 6 تا 9 بجے رات

شاکر ہیئر آئل بھی دستیاب ہے

مزید معلومات کے لئے فون: 4966698

"کوشش کرتی رہو۔ میں تمہارے کام نہیں آنے کا۔"

اس کشمکش میں پورا سال گزر گیا۔ رانی کی خیریت ملتی رہتی تھی۔ وہ اب ایک بچی کی ماں بن گئی تھی۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے گھر پہنچا تو رانی اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد میں پہلی مرتبہ رانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے شوہر سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اسے دیکھ کر بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اسے میں نے پہلے بھی دیکھا ہے لیکن کہاں دیکھا ہے یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہم سمجھ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

"عاصم بھائی، آپ نے تو حیدر آباد آنا ہی چھوڑ دیا۔" رانی نے کہا۔

اس کا شوہر اس کے سامنے بیٹھا تھا اس لیے میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

رانی کو دیکھ کر میرے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ میرا دل رو رہا تھا لیکن میری آنکھیں خاموش تھیں۔

"عاصم، یونیورسٹی میں تو بہت سی لڑکیاں ہوں گی۔" اس نے موقع دیکھ کر اکیلے میں مجھ سے کہا۔

"ہاں ہیں۔ پھر؟"

"کوئی تم میں دلچسپی بھی لیتی ہو گی؟"

"ایک لڑکی ہے تو۔"

"میری ایک بات مانو گے؟"

"میں نے تمہاری ہر بات مانی ہے۔"

"اس لڑکی سے شادی کر لو۔"

"اچھا۔" میں نے اس طرح اقرار کر لیا جیسے ابھی جاؤں گا اور شادی کر لوں گا۔ میں نے کوئی بحث ہی نہیں کی جو بات آگے بڑھتی۔

رانی مجھے خوش نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت میں نے یہی سوچا تھا کہ اس نے زبردستی شادی کی ہے اس لیے خوش نہیں ہے۔ میری محبت ابھی تک اس کے دل میں ہے۔

کچھ دنوں بعد میں نے ایسی خبر سنی کہ میرے ہوش اڑ گئے۔

"رانی کا اپنے شوہر سے جھگڑا ہو گیا ہے اور وہ گھر آ کر بیٹھ گئی ہے۔"

"مگر کیوں۔ ایسا کیا جھگڑا ہو گیا۔"

"سنا ہے اس کا شوہر کسی طوائف کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ بات طلاق تک پہنچ گئی ہے۔"

یہ خبر سنتے ہی مجھے اچانک یاد آ گیا کہ اس کے شوہر کو میں نے کہاں دیکھا ہے۔ وہ ایک مرتبہ بینا کے ساتھ یونیورسٹی آیا تھا۔ کہیں یہ اسی کا تو کوئی چکر نہیں۔ لیکن بینا طوائف ہے؟

یہ معلوم کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ یونیورسٹی میں ایک دو لڑکوں کو ٹٹولا تو مجھے اس کی اصلیت معلوم ہو گئی۔ اب یہ یقین کرنا باقی تھا کہ رانی کا شوہر جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے، وہ واقعی بینا ہے یا کوئی اور ہے۔ ہونے والی بات تھی کہ قدرت نے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اسے بینا کے ساتھ دیکھ لیا۔ اب میں اپنی آنکھوں کو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ اب میں وہ کرنا چاہتا تھا جو میں نے سوچا تھا۔

"بینا! مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کیا!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں "مجھے تم پر رحم آنے لگا ہے۔ تم شریف آدمی ہو۔ شادی کے چکر میں کہاں پڑو گے۔ ویسے ہی عیش کر لو۔ شادی تو میں کہیں نہ کہیں کر ہی لوں گی۔"

"میں بہت سوچ سمجھ کر تم سے یہ مطالبہ کر رہا ہوں۔"

"میری اصلیت جانتے ہو؟"

"مجھے یہی بتاؤ گی نا کہ تم طوائف ماں کی بیٹی ہو۔"

"ہاں۔ لیکن اب ہم طوائف نہیں ہیں۔"

"ہو تیں بھی تو تم سے شادی کر لیتا۔"

"تمہاری مرضی۔ میں تو تم پر کب سے مرتی ہوں۔"

"لیکن میرے گھر والوں کو معلوم نہ ہو کہ تمہارا ماضی کیا تھا۔"

"کوشش کروں گی۔" اس نے کندھے اچکائے۔

اسے میں نے تیار کر لیا۔ ممی، ڈیڈی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے تو شکر بھیجا کہ میں شادی پر تیار رہوا۔

وہ ماں اور بیٹیاں اب ایسے علاقے میں رہتی تھیں کہ ان پر طوائف ہونے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے آنکھوں دیکھے مکھی نگل لی۔

وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ رانی کا شوہر بینا کی طرف سے مایوس ہوا تو بیوی کی قدر ہوئی اور وہ رانی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ رانی کا گھر بچ گیا لیکن میرا گھر اجڑ گیا۔ بینا میرے ساتھ وفادار ہے لیکن میں یہ بات دل سے نہیں نکال سکا کہ وہ طوائف ماں کی بیٹی ہے۔ یونیورسٹی میں اس کی آوارگی کے قصے عام تھے۔

رانی اور اس کا شوہر میری شادی کا سن کر صرف ایک مرتبہ ہمارے گھر آئے۔ اب نہ وہ خود آتا ہے نہ رانی کو چھوڑتا ہے۔ اب تو رانی کو دیکھے ہوئے بھی برسوں ہو گئے لیکن خوش ہوں کہ میں نے اس کا گھر تو بچا لیا۔

نئی زندگی

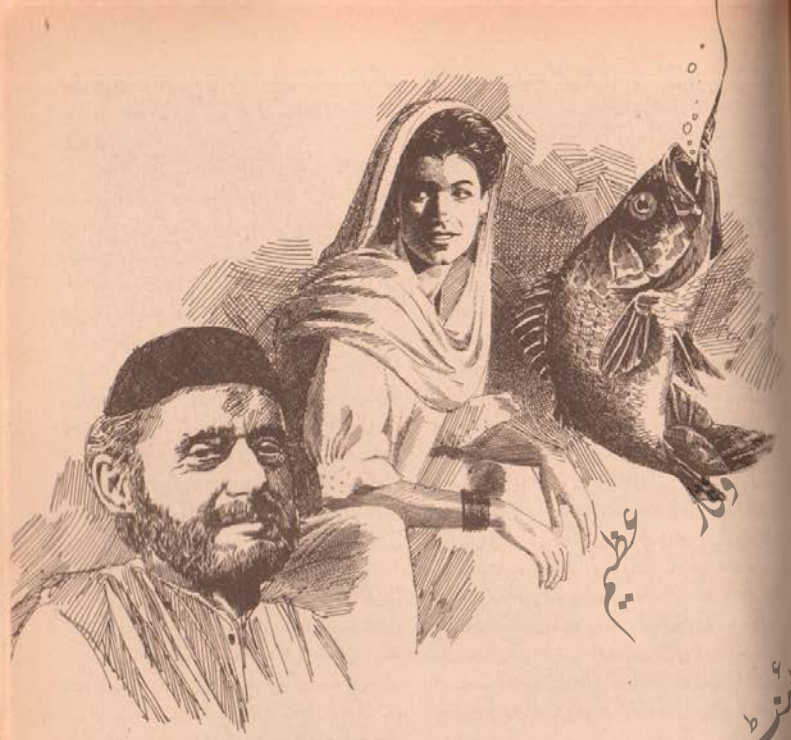

محترم معراج صاحب! السلام علیکم

امید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ میں بھی خدا کے فضل سے خیریت سے ہی ہوں۔ ایک کہانی روانہ کر رہا ہوں۔ جس کے تمام کردار بقیدِ حیات ہیں اور ان میں سے ہی ایک نے یہ کہانی مجھے سنائی ہے۔ کہانی کے تمام کرداروں کے نام و اصل مقام میں نے تبدیل کر دیئے ہیں۔

دعاگو

جبران عدیل۔ حیدر آباد

میں نے یہ تیسری بار کہا تھا "ماں، میں اب بکریوں کو جنگل کی طرف نہیں لے جاؤں گی۔"

ماں نے وہی سوال کیا تھا "کیوں؟"

ماں کے اس سوال کا جواب میں دینا نہیں چاہتی تھی ورنہ میں کہہ سکتی تھی، ماں اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور لڑکے مجھے چھیڑتے ہیں۔

اس روز ماں نے تھوڑی دیر چپ رہ کر کہا تھا "فاطمہ، بس جلدی سے تیری شادی ہو جائے تو پھر نہ بکریاں ہوں گی اور نہ تو، چند ماہ کی بات اور ہے۔"

میں جانتی تھی کہ ماں نے بکریاں صرف میری شادی کے لیے رکھی ہیں، انہیں بیچ کر وہ میری شادی کرنا چاہتی تھی۔ کئی سال سے یہ بکریاں ہمارے گھر تھیں۔ بابا کے مرنے کے بعد ہی ماں نے چار بکریاں خریدی تھیں اور اب یہ سترہ ہو گئی تھیں۔ جبکہ ماں نے تین چار بکریاں بیچ بھی دی تھیں "کیا

میری شادی ان بکریوں کو بیچ کر ہو جائے گی؟" میں نے دھیمی آواز سے کہا۔ شاید ماں نہیں سن سکی تھی ورنہ جواب ضرور دیتی۔

میرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ماں کہتی ہے، میرے دو بھائی تھے لیکن بیمار ہو کر مر گئے۔ بابا بھی بیمار ہو کر مرا تھا۔ اب گھر میں ماں اور میں تھی۔ ماں مُلاجی کے گھر کام کرنے جاتی تھی۔ ویسے تو وہ گوٹھ کے کئی گھروں میں کام کرتی تھی لیکن مُلاجی کے گھر اسے روز ہی جانا پڑتا تھا۔ ماں کا کہنا تھا کہ ان کی پہلی بیوی بیمار رہتی ہے اور اس سے گھر کا کام نہیں ہوتا۔ مُلاجی نے دو شادیاں اور کی تھیں لیکن انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اب صرف ان کے گھر میں پہلی بیوی تھی۔ ماں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ بیوی مُلاجی کے ماموں کی لڑکی بھی ہے اس لیے مُلاجی اسے چھوڑتے نہیں ورنہ جب انہوں نے دوسری شادی کی تھی تب ہی اسے چھوڑ دیتے۔ ان کی تیسری بیوی کے گھر والوں نے تو یہ شرط رکھی تھی کہ گھر میں جو بیوی ہے پہلے اسے چھوڑو تو پھر شادی ہوگی لیکن مُلاجی نے کہا تھا کہ شادی کے ایک سال بعد میں اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دوں گا لیکن انہوں نے تیسری بیوی کو ہی ایک سال بعد طلاق دے دی تھی۔

اس روز میں صبح کچھ دیر سے بکریاں لے کر جنگل کی طرف آئی تھی۔ بہت مشکل سے میں نے ماں کو یہ بات بتائی تھی کہ اکثر جنگل میں گوٹھ کے لڑکے نکل آتے ہیں اور مجھ سے گندے گندے مذاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں نے ان کے نام پوچھے تھے لیکن میں نے جان بوجھ کر نہیں بتائے تھے کیونکہ میں جانتی تھی، ماں ان لوگوں کے گھر جا کر بات کرے گی، انہیں منع کرے گی اور پھر بات سارے گوٹھ میں پھیل جائے گی کہ رحمت، قدوس اور بخشل فاطمہ کو چھیڑتے ہیں۔ بخشل کا تو خیر ماں کچھ کر نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ وڈیرے کے پالے ہوئے غنڈوں میں شامل تھا۔ رحمت بھی منشی کا لڑکا تھا، قدوس گوٹھ میں جو ہوٹل تھا اس کے مالک کا لڑکا تھا لیکن تھا وہ بھی بہت بدمعاش!

سورج کی تیزی میں کمی آگئی تھی کیونکہ اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ میں نے بکریوں کو گھیرنا شروع کیا۔ میں انہیں گھیر کر پہلے ایک ببول کے درخت کے نیچے جمع کرتی اور پھر گھر کی طرف انہیں ہانک دیتی۔ ابھی میں بکریوں کو گھیر رہی تھی کہ میں خود درندوں میں گھر گئی۔ معلوم نہیں کس طرف سے اچانک ہی بخشل میرے سامنے آگیا اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس درندے سے بچنے کے لیے کسی طرف بھاگتی، رحمت اور قدوس بھی نمودار ہو گئے۔ پھر تینوں نے مجھے چھاپ لیا۔ میں بہت چیخی چلائی، بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن خود کو ان درندوں سے نہیں بچا سکی۔

سورج کے زوال سے پہلے ہی میرا زوال ہو گیا۔ بکریاں میری بے بسی کا تماشا دیکھتی رہ گئیں۔ جاتے ان حرام زادوں نے دھمکی بھی دی "اگر تو نے زبان کھولی اور ہمارے خلاف کسی سے کچھ کہا تو ہم تجھے جنگل میں اور ماں کو گھر میں قتل کرا دیں گے اور تو جانتی ہے کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں بہت دیر تک اپنے نصیب کو روتی رہی اور پھر سورج کے غروب ہونے کے بعد ہی گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ میں انیس سال کی ہو گئی تھی، میری شادی تو نہیں ہوئی لیکن میں ہر معاملے کا شعور رکھتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ میں کسی اور کے قابل نہیں ہوں۔ گوٹھ کی لڑکیاں زیادہ سے زیادہ سولہ سترہ سال کی عمر میں اپنے گھروں کی ہو جاتی ہیں۔ ایک تو جب میں سولہ سال کی ہوئی تو میرا بابا مر گیا۔ میرا کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے میں ماں کو تنہا چھوڑ کر اپنے گھر کی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میری ماں کی خواہش تھی کہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں، وہ دنوں تک میرے بیاہ کی کوشش کرتی رہیں پھر مایوس ہو کر انہوں نے پڑوس کے گوٹھ میں کرنے کی کوشش کی۔ پڑوس کے گوٹھ ماں کا وہاں سے بھی کوئی مناسب جواب نہیں ملا اس طرح مرنے کے بعد کے تین سال گزر گئے اور میری پوری ہوتی رہی کہ میں ماں کو تنہا چھوڑ کر اپنے گھر کی ہو جاؤں۔

اب تو صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔ میں بکریوں کی کیے بغیر آنسو بہاتی گھر کی طرف جا رہی تھی۔ میں جب گھر تو اندھیرا پھیل گیا تھا۔ بکریاں مجھ سے پہلے ہی تھیں۔ جیسے ہی ماں کی نظر مجھ پر پڑی وہ تیز آواز "کہاں مر گئی تھی اتنی دیر؟"

میں کیا جواب دیتی۔ میں ان سے چمٹ گئی اور آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"ارے ہوا کیا... مجھے تو بتا، ہوا کیا؟" میں روتی رہی اور ماں پوچھتی رہی۔

گھر میں برائے نام روشنی تھی۔ اگر گھر روشن ہوتا میری بربادی کا اعلان، میرے بال، میرے کپڑے اور حالت کر دیتی۔ ماں وہ سب کچھ سمجھ جاتی جو میں اپنے کہنا نہیں چاہتی تھی۔ جب آنسوؤں، ہچکیوں کا طوفان میں نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے کہا "ماں،

پ... پانی!"

اب میں غٹاغٹ گلاس بھر کر پانی پی چکی تو ماں نے کہا "کیا ہوا؟"

ماں کے سوال کے جواب میں، انہیں ہاتھ پکڑ کر میں اندر کمرے میں لے گئی اور پھر رک رک کر ہچکیوں کے درمیان کہا "ماں... میں بر... باد ہو گئی... بخشل۔"

وہ رات ہمارے سوگ کی رات تھی، غم واندوہ کی رات۔ ماں بھی میرے ساتھ روتی اور سر پٹختی رہی۔ نہ ہمیں کا ہوش تھا اور نہ سونے کا۔

"ماں میں تجھ سے کہتی تھی اب جنگل نہیں جاؤں گی۔"

"اری میں تو سمجھتی تھی تو اب بچی نہیں ہے، کسی ایک کو کر مار دیتی۔"

"میں نہیں مار سکتی تھی ماں، انہوں نے مجھے ہاتھ پاؤں کا موقع ہی نہیں دیا۔ پھر تم جانتی ہو وہ تینوں دیو کی اولاد

"پھر بھی!" ماں نے کہا اور مجھے گلے سے لگا کر رونے

ہمارے رونے اور سوگ منانے سے رات رکنے والی نہیں تھی۔ اسے گزرنا تھا اور وہ گزر گئی۔ ماں صبح کام پر نہیں گئی۔ ملاجی کے گھر بھی نہیں گئی۔ ہم نے رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور دن بھی کچھ کھائے بغیر گزر گیا۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کھانا تھا، پیٹ کی آگ کو بھی بجھانا تھا۔ سو جب آدھی گزر گئی تو ماں نے بکری کا دودھ اور روٹی لا کے رکھی اور کہا "کچھ کھا لے، میں بھی کھاتی

اس سانحے کے بعد کے دو ماہ میرے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔ میں ہر پل جان دینے کا فیصلہ کرتی اور اسے توڑ دیتی، ماں کی دلی کیفیت کا علم مجھے نہیں لیکن ان کی حالت بھی گرتی گئی۔ وہ کام پر جاتے ہوئے دروازے کو تالا لگا جاتی تھیں۔ حالانکہ تالا اب بیکار تھا، جو تھا وہ تو لٹ گیا تھا۔ بکریاں مراد قسائی کو اونے پونے بیچ دی تھیں۔ ان دو ماہ میں لوگ ان کا گوشت کھا گئے ہوں گے لیکن میری جان جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کاش کوئی قسائی مجھے ذبح کر دیتا۔ میری بوٹی چیل کوؤں کو کھلا دیتا۔

ماں بھی میری طرح خاموش رہنے لگی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان بات ہوتی تو بس مختصر سی لیکن ایک رات ماں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہا "میں نے تیرا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

"رشتہ... میرا... لیکن...؟"

"آدمی بہت شریف ہے۔"

"اسے معلوم ہے کہ..."

"نہیں، اسے معلوم نہیں" ماں نے کہا "اسے بیوی کی ضرورت ہے اور تم اچھی بیوی بن کر رہنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"لیکن ماں میں تو..." میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکی۔ میرے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ میں ماں کو بتاتی بھی کیسے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ لیکن پھر ماں نے بہت اصرار کیا تو میں نے پوچھا "رشتے کی بات کہاں ہوئی ہے؟"

"میں تمہارا رشتہ مُلاجی سے طے کر کے آئی ہوں۔"

"لیکن ماں، وہ تو بابا سے بھی عمر میں بڑے ہیں" میں نے ماں کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہی ٹھیک ہیں تمہارے لیے" ماں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "میں جانتی ہوں کہ تم ان کی چوتھی بیوی ہوگی لیکن اب اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ پھر اب میری زندگی کتنے دن کی رہ گئی ہے۔ میرے بعد تو تم..."

"نہیں ماں، ایسا مت کہو" میں نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں نے تم سے ایک بات چھپائی ہے۔"

"میں جانتی ہوں" ماں نے کہا "تم ماں بننے والی ہو، اسی لیے اب مجھے جلدی ہے۔ کل ہی میں تمہارے نکاح کی بات کر آئی ہوں۔"

اردو کے تفریحی ادب کا ایک نیا رخ
گھر کی مرغی
حلیمی ٹیکسی
آپ کے سر پر
شرارت
بے وقوف
بی وی کی تلاش
الو کی دم
مسٹر مداری
اور سی...
بور ہونا چھوڑیں، مسکرانا سیکھیں
کتابیات پبلی کیشنز 74200

"لیکن ماں....!"

"بعض عورتوں کے بچہ سات ماہ میں بھی ہوجاتا ہے۔ تم بھی سات ماہ میں مُلاجی کو اولاد سے نواز دوگی۔ انہیں اولاد کی بہت خواہش ہے، انہوں نے تین شادیاں اولاد کی خاطر ہی کیں لیکن انہیں اولاد نہیں ہوئی۔ تم ان کے بچے کی ماں بنوگی تو وہ سب بھول کر تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔"

یہ رات بھی ہم دونوں نے جاگ کر ہی گزاری، میں رات بھر انہیں سمجھاتی رہی کہ نکاح بیکار ہے۔ یہ مقام تو میرے نکاح کا نہیں، مرنے کا ہے۔ لیکن ماں نے میری ایک نہیں سنی، انہوں نے کہہ دیا کہ اگر میں مروں گی تو ان کا جنازہ بھی میرے ساتھ ہی اس گھر سے اٹھے گا۔ بہرحال دوسرے روز گوٹھ کے چار چھ افراد کے سامنے میرا نکاح عصر اور مغرب کے درمیان ملاجی کے ساتھ ہوگیا۔ اس روز ہی مُلاجی کے نام کا علم ہوا۔ ان کا نام وقار علی ہے۔ میرا خیال ہے، گوٹھ میں ایسے چند ہی لوگ ہوں گے جو انہیں وقار علی کے نام سے جانتے ہوں گے ورنہ تو سب انہیں مُلاجی ہی کہتے تھے۔

وقار صاحب کی پہلی بیوی عمر میں ماں سے بھی بڑی تھیں۔ اس لیے میں نے انہیں شروع ہی دن سے ماں سمجھا اور ماں کہا۔ حالانکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں انہیں "ماں جی" کہوں۔ وقار صاحب نے بھی مجھے کئی بار منع کیا۔ لیکن میں نے انہیں جب بھی مخاطب کیا "ماں جی" کہہ کر کیا۔ وقار صاحب نے میری ماں کو بھی اپنے گھر میں رہنے کے لیے کہا لیکن ماں نہیں آئی۔ ویسے وہ روز صبح کام کے لیے آتی تھیں جبکہ نکاح کے چند روز بعد ہی سے میں نے گھر کا کام سنبھال لیا تھا لیکن وقار صاحب نے ماں کو آنے اور کام کرنے سے منع نہیں کیا۔

نکاح کے ایک ماہ بعد ہی ماں نے مجھ سے چپکے سے کہا "اپنے میاں سے کہہ دے کہ تو ماں بننے والی ہے۔"

"میں!" میں نے ماں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو اور کون کہے گا؟"

"لیکن ماں...!"

"میں جیسا کہہ رہی ہوں بالکل ایسا ہی کرو ورنہ..."

میں سہم گئی۔ پھر میں نے اسی رات وقار صاحب سے کہا "میرا خیال ہے شاید میں ماں بننے والی ہوں۔"

وقار صاحب نے میری طرف پہلے تو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے "اللہ کا شکر ہے جو دوا ہم نے نکاح سے پہلے کھائی تھی اس نے اپنا اثر دکھا دیا۔"

میں اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔ وقار صاحب [illegible] کہہ رہے تھے وہ مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا اور پھر [illegible] دوسری طرف منہ کرلیا۔

وقار صاحب نے مجھے بلا کر کہا "اس میں [illegible] بات ہے، ہر عورت شادی کے بعد ماں بنتی ہے۔ ہم [illegible] خوش ہیں یہ تمہیں بتا نہیں سکتے۔ اللہ ہمیں [illegible] صاحبِ اولاد کر رہا ہے" اس کے بعد انہوں [illegible] انہوں نے دوسری اور تیسری شادی اپنی پہلی بیوی [illegible] اور مرضی سے کی لیکن اُن سے بھی اولاد نہیں ہوئی [illegible] نے طلاق دے دی اور حق مہر ادا کیا۔ آخری طلاق [illegible] نے فیصلہ کیا تھا کہ اب چوتھی شادی نہیں کریں [illegible] جب میری ماں نے میرا ذکر کرکے کہا کہ وہ اپنی لڑکی کی [illegible] فرشتہ صفت اور جہاندیدہ آدمی سے کرنا چاہتی ہیں [illegible] نے پوچھا کہ تمہاری نظر میں کوئی ہے تو ماں نے کہا [illegible] نظر میں آپ ہیں۔ اگر آپ شادی کے قائل ہیں تو میں [illegible] ہوں۔ انہوں نے آمادگی ظاہر کی اور پھر میرا نکاح ان [illegible] ساتھ ہوگیا۔

"جب میں بچی تھی تو آپ کے پاس قرآن پڑھنے آتی [illegible] تھی" میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"مجھے یاد ہے" وقار صاحب نے کہا [illegible] کان پکڑتا تھا اور گالوں پر چٹکی بھرتا تھا۔"

"اس لیے تو میں نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں [illegible] تم پڑھنے کیوں نہیں جاتی ہو تو میں نے کہا پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا حالانکہ میں پانچواں پارہ پڑھ رہی تھی۔"

"تم نے غلط کیا تھا، کم از کم مجھ سے تو کہتیں کہ [illegible] گال پر چٹکی بھرنے کی وجہ سے [illegible] نہیں آرہی تو میں [illegible] بھرتا" وقار صاحب نے کہا "اب پڑھنا شروع کرو۔ [illegible] چالیس سال کی عمر میں بھی علم حاصل کرسکتی [illegible]"

"ٹھیک ہے آپ مجھے اردو بھی پڑھائیں" میں [illegible]

"سندھی تو شاید آپ کو آتی نہیں۔"

"اس وقت ہم سندھی ہی میں بات چیت کر رہے ہیں۔"

"بات کرنا الگ بات ہے اور پڑھنا پڑھانا الگ [illegible]" [illegible] نے بڑی دانشمندی کی بات کی تھی "ماں نے ایک بار [illegible] کہ آپ سندھی نہیں، اردو جانتے ہیں۔"

"ٹھیک کہا تھا تمہاری ماں نے، میں جب اس گوٹھ میں آیا تھا تو سندھی بولنا.... ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا [illegible] اب میں بہت روانی سے بولتا ہوں اور سندھی پڑھ بھی [illegible]

[illegible] صرف لکھنا نہیں آتا۔ اگر تم چاہو تو میں لکھنا بھی سیکھ لوں گا۔"

"میں سندھی کی صرف تین کلاس پڑھی ہوں" میں نے کہا "خیر میں کوشش کروں گی کہ آپ کو سندھی لکھنا سکھا دوں۔"

وقار صاحب کو میں سندھی لکھنا تو نہیں سکھا سکی لیکن وہ پابندی سے مجھے اردو پڑھانے لگے۔ عشاء کی نماز کے بعد جب وہ مسجد سے آتے تو میں کتاب کھولے تیار رہتی۔ ان کے آنے سے قبل میں کل کا سبق مزید یاد کرتی اور اسے دوبارہ لکھنے بیٹھ جاتی۔ ان کے آنے پر پہلے میں اپنی کاپی دکھاتی اور پھر سبق سنا کر نیا سبق لیتی۔

ایک روز میں سبق لکھ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ جب وقار صاحب عشاء کی نماز کے لیے گھر سے نکلتے تو میں دروازے کی کنڈی اندر سے لگا لیتی تھی۔ اس لیے میں [illegible] چونکی کیونکہ ابھی ابھی جماعت کھڑی ہوئی تھی اور وقار صاحب کے آنے میں آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ وقت تھا۔

"کون ہے؟" میں نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

"دروازہ کھولو" یہ آواز بخشل کی تھی۔ میں نے صاف پہچان لی تھی۔ پھر بھی میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

"یاد رکھنا، ہم ابھی مرے نہیں ہیں اور کسی وقت بھی تمہارے بارے میں مُلا کو بتا سکتے ہیں۔ وہ ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن تیری زندگی برباد کر دے گا" بخشل سرگوشیانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ میں چونکہ دروازے کے قریب تھی اس لیے میں نے سب کچھ سنا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو میں جا رہا ہوں پھر موقع دیکھ کر آؤں گا۔"

میں بخشل کے جانے کے بعد بھی دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنے دن بعد بخشل کیوں آیا تھا؟ اب وہ کیا چاہتا ہے۔ جن دنوں بخشل میرے گھر آیا تھا ان دنوں ماں میرے گھر رہنے لگی تھی کیونکہ گھر والوں کے حساب سے میرا پانچواں مہینہ تھا اور میرے اور ماں کے حساب سے ساتواں مہینہ تھا۔ ماں یوں تو آنے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میں نے وقار صاحب پر زور دیا تھا اور ماں سے بھی کہا تھا کہ وہ میرے پاس ہی آجائے۔ معلوم نہیں کیوں، میرا دل گھبراتا تھا۔

ماں کے رہنے کا بندوبست وقار صاحب نے اپنی بڑی بیوی کے کمرے میں کیا تھا۔ اس کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک پر وقار صاحب کی بڑی بیوی سوتی تھیں اور ایک پر ماں۔

وقار صاحب کی بڑی بیوی ماں سے زیادہ عمر کی تھیں لیکن ملنسار اور ہمدرد عورت تھیں۔ ماں کا اور ان کا مزاج بہت جلد مل گیا اور انہوں نے ان کے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بخشل کی آمد کے بارے میں نہ میں نے ماں کو... بتایا اور نہ وقار صاحب سے کہا۔ جس وقت بخشل مجھ سے بات کر رہا تھا، اس وقت ماں بھی گھر میں تھی لیکن ان کا کمرا دروازے سے فاصلے پر تھا اس لیے انہوں نے دستک کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

جس رات بخشل آکر گیا تھا اس رات کے بعد مختلف اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے گھیر لیا تھا کسی کام میں میرا دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور میں اداس اداس رہنے لگی تھی۔ گھر میں کلر ٹی وی تھا مگر میں اسے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی وقار صاحب کی بڑی بیوی کے کمرے میں تھا چونکہ میں ٹی وی نہیں دیکھ رہی تھی اس لیے شام کے وقت ان کے کمرے میں بھی نہیں جا رہی تھی۔ ماں نے کئی بار مجھے بلایا بھی، لیکن میں نے سردرد کا بہانہ کر دیا۔

ایک روز وقار صاحب نے پوچھا "کیا بات ہے، تمہاری طبیعت گڑبڑ تو نہیں ہے؟"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔"

"تو پھر..." اتنا کہہ کر وقار رک گئے پھر بولے "یہاں سے شہر دور نہیں، آدھے گھنٹے کا سفر ہے۔ چلو، ڈاکٹر کو دکھا دیتے ہیں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میں دیکھ رہا ہوں کئی روز سے، تمہارا پڑھنے میں بھی دل نہیں لگ رہا ہے" وقار صاحب نے کہا "تم جانتی ہو، میرے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہے گا تو میں تمہیں شہر میں بھی رکھ سکتا ہوں۔ تم ماں کے ساتھ رہ کر علاج کرانا۔"

"جب ایسی کوئی بات ہوگی، میں آپ کو بتا دوں گی" میں نے کہا "اب آپ مسجد جانے کی تیاری کریں، وقت ہوگیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وقار چلے گئے۔ وقار تھے تو گوٹھ کی واحد مسجد کے مُلا اور پیش امام۔ لیکن ان کے گھر میں خوش حالی تھی۔ سال بھر کا راشن وڈیرے کی طرف سے ملتا تھا۔ پھر گوٹھ والے ان کی تنخواہ کا بندوبست کرتے تھے۔ یہی نہیں، گوٹھ میں کوئی مرتا تو وقار مردے کو نہلاتے، نماز جنازہ پڑھاتے اور پھر دفن کرنے کے بعد دعا پڑھنے کے بھی پیسے لیتے تھے۔ کسی کے گھر نیاز فاتحہ دینے کے بھی وقار کو پیسے ملتے

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
وقار عظیم

تھے۔ عید بقرعید پر بھی گوٹھ والے انہیں نذرانہ پیش کرتے تھے۔ وڈیرے کی طرف سے سال میں دو جوڑے کا کپڑا اور سلائی کے پیسے بھی ملتے تھے۔ اس طرح وقار کی آمدنی بہت تھی اور وہ خوش حال تھے۔

وقار جب گوٹھ میں اپنی بڑی بیوی کے ساتھ آئے تھے تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ مگر اب بہت کچھ تھا۔ یہ سب انہوں نے گوٹھ میں رہ کر ہی پیدا کیا تھا۔ بس انہیں دکھ اس بات کا تھا کہ اللہ نے انہیں ہر شے سے نوازا ہے لیکن اولاد نہیں دی۔ وہ اب یہ کہہ کر خوش ہوتے تھے کہ اب اللہ انہیں اولاد سے بھی نواز رہا ہے اور میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس مرحلے پر انہیں کوئی صدمہ ہو۔ اگر انہیں کسی طرح علم ہوگیا کہ جس بچے کو میں جنم دینے والی ہوں۔ وہ ان کا نہیں ہے تو پتا نہیں کیا طوفان آجائے اور اگر بخشل میرے گھر آتا رہا تو پھر شاید میرا راز، راز نہ رہے۔

بخشل نے دھمکی تو دی تھی کہ وہ مُلا کو سب کچھ بتادے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو پھر... پھر کیا ہوگا؟ میں اس وقت تک یہی سوچتی رہی جب تک وقار عشاء کی نماز کے لیے نہیں گئے، وقار نے مجھے بتایا تھا کہ عشاء کی نماز میں کبھی کبھی تو کوئی بھی نہیں ہوتا سوائے وقار کے لیکن انہیں جاکر اذان دینی ہوتی تھی اور اگر کوئی نہیں آئے تو اکیلے ہی نماز پڑھنی پڑتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تو ان کی ڈیوٹی ہے، کوئی آئے نہ آئے۔ وہ پانچوں وقت پابندی سے اذان دیتے اور نماز پڑھاتے یا خود ہی نماز پڑھ کر واپس آتے تھے۔ ابھی میں ان باتوں پر ہی غور کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" میں نے دروازے کے قریب جاکر کہا۔

"ہم اس گوٹھ میں رہتے ہیں فاطمہ اور سب معلومات رکھتے ہیں۔ سنا ہے تم ماں بننے والی ہو۔"

"تو پھر... جلدی بولو، وقار صاحب آجائیں گے۔"

"وہ مُلا کیا کرے گا۔ ہے تو وہ بڑا لیکن اس کے پاس دل نہیں ہے۔" بخشل نے کہا "تیرے مُلا کے پاس مال بہت ہے اور مجھے دو ہزار کی ضرورت ہے اور وہ دو ہزار مجھے تو دے گی ورنہ میں مُلا سے کہہ دوں گا تیرے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ مُلا کا نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو..." میں نے سرگوشی کی "ایسا مت کرنا۔"

"دو ہزار کا بندوبست کردے، ایسا نہیں ہوگا" بخشل نے کہا "میں تین دن بعد اسی وقت آؤں گا۔" اتنا کہہ کر بخشل چلا گیا۔

میں دروازے کے قریب سے ہٹ رہی تھی کہ ماں میرے سامنے ہی آگئی "کون تھا؟" ماں نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

"بخشل!" میں نے کہا "میرے کمرے میں چلو۔"

میرے کمرے میں آنے کے بعد ماں نے پوچھا "کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہہ رہا تھا، بچہ مُلا کا نہیں ہے اس لیے میں اسے دو ہزار روپے دوں ورنہ وہ مُلا کو بتادے گا۔ معلوم نہیں اسے کس نے بتایا ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔"

ماں تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر بولی "یہ تو اسے میں نے ہی بتایا تھا۔ وہ مجھے وڈیرے کے گھر کے قریب ہی ملا تھا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ یہاں تم سے بات کرنے آیا تھا میں نے اس سے کہا کہ خبردار، اب فاطمہ کے قریب بھی مت جانا وہ مُلا کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

"یہ تو نے کیوں بتایا ماں؟"

"یہ میں نے اس لیے بتایا کہ وہ کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرے، وحشی سے وحشی آدمی بھی بچے والی کے قریب نہیں آتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ماں، اب میں دو ہزار روپے کہاں سے لاؤں گی۔"

"کہہ دینا اتنی بڑی رقم تیرے پاس نہیں ہے۔"

"وہ بہت کمینہ ہے ماں، نہیں مانے گا۔ کہہ رہا تھا تیرے پاس بہت رقم ہے" میں نے روتے ہوئے کہا "میں نے آج تک وقار سے کچھ نہیں مانگا۔ نہ کبھی ان کی رقم کو ہاتھ لگایا وہ مجھ پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔ ماں میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں؟"

"ٹھیک ہے، کچھ کرتے ہیں، تو فکر مت کر" ماں نے کہا "میری بکریوں کی کچھ رقم مراد کے پاس ہے۔"

"لیکن ماں...!"

"اب خاموش ہوجا" ماں نے کہا اور میرے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ماں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کے انداز سے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ یہ وقار کی دستک ہے۔ میں نے دروازہ کھولا اور وقار کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں آگئی "آج پھر نماز کے لیے کوئی نہیں آیا۔ پتا نہیں لوگوں کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ پہلے عشاء کی نماز میں بھی چار پانچ بندے آجاتے تھے، آج کل تو اس طرف کوئی آتا ہی

نہیں۔"

"سردی بھی تو بڑھ گئی ہے، لوگ گھروں سے ہی نہیں نکلتے۔"

"پانچ بجے صبح کھیتوں پر بھی تو جاتے ہیں" وقار نے کہا۔ وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بات چیت کر رہے تھے "تم نے چائے کا پانی تو چڑھا دیا ہوگا۔"

"نہیں، بس ابھی بنا کر لاتی ہوں" میں نے کہا اور کمرے سے باہر آگئی۔ آج مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وقار سونے سے پہلے چائے ضرور پیتے ہیں اور میں ان کی آمد سے پہلے چائے کا پانی رکھ دیتی ہوں۔ پھر جیسے ہی وہ آکر کپڑے تبدیل کرتے، چائے ان کے آگے ہوتی۔

وقار چائے پی کر لیٹ گئے تو میں ان کے پیر دبانے لگی۔ یہ میری روز کی ڈیوٹی تھی۔ جب تک وہ سوتے نہیں، میں پیر دباتی رہتی۔ جب وہ سو جاتے تو میں بھی لیٹ جاتی تھی اور تھوڑی دیر بعد میری آنکھ بھی لگ جاتی تھی لیکن گزشتہ کئی روز سے مجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آرہی تھی۔ اس روز بھی میں لیٹ تو گئی لیکن مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ فجر کی اذان سے پہلے وقار بیدار ہوئے۔ حسب معمول میں بھی اٹھ گئی۔ چونکہ سردی تھی اس لیے میں نے پانی گرم کیا اور پھر تیار ہوکر وقار مسجد چلے گئے تو میں ناشتا بنانے لگی۔

دن تو گھر کے کام کاج میں کٹ گیا۔ لیکن مغرب کی نماز کے بعد سے میری طبیعت بخشل کے بارے میں سوچ سوچ کر خراب ہونے لگی حالانکہ اس کے آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ ماں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مراد سے بات کرکے آگئی ہیں۔ اس نے رقم دینے کا وعدہ بھی کرلیا ہے۔ پھر بھی مجھے جانے کیوں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ تیسرے دن وقار نے میرے آگے نوٹ رکھتے ہوئے کہا "یہ ماں کو دے دو۔"

"کیوں، کس بات کے؟"

"مراد قسائی نے انہیں رقم نہیں دی۔ جمعہ کا وعدہ کیا ہے۔ پتا نہیں انہیں کیا ضرورت ہے" وقار نے کہا "یہ پورے دو ہزار ہیں، ان سے کہنا جب مراد انہیں جمعہ کو رقم دے تو مجھے واپس کردینا۔ گھر کی بات ہے، وہ آج بہت پریشان لگ رہی تھیں۔"

"لیکن آپ کو کس نے...؟"

"مراد قسائی مجھے راستے میں ملا تھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھے بتایا کہ اس کی رقم رک گئی ہے۔ جمعہ کو مل جائے گی۔ ماں سے کہنا پریشان نہ ہوں، میں ان کی رقم پھولوں میں رکھ کردوں گا۔ بہرحال، تم یہ روپے انہیں دے دو۔"

کھانا کھانے سے پہلے وہ رقم میں نے نہیں اٹھائی۔ کھانے کے بعد جب وقار لیٹ گئے تو میں نے رقم اٹھائی اور کمرے سے باہر آکر ماں کو آواز دی۔

کمرے سے نکل کر جب ماں میرے قریب آئی تو میں نے نوٹ ماں کے آگے کردیے "یہ کس نے..."

"وقار نے دیے ہیں، کہہ رہے تھے جب جمعہ کے روز مراد آپ کو دے تو لوٹا دینا۔"

ماں نے ایک گہری سانس بھری اور پھر رقم لے کر بولیں "میں اسے ابھی دے کر آتی ہوں تاکہ وہ اپنی منحوس شکل لے کر رات کو نہ آئے۔"

"لیکن وہ اس وقت تمہیں کہاں ملے گا؟"

"مجھے پتا ہے، وہ اس وقت کہاں ہوگا" ماں نے کہا اور پھر بولیں "تم میرے کمرے میں جاؤ اور ان سے کہنا میں ایک ضروری کام سے گئی ہوں۔ ابھی آجاؤں گی" ماں کا اشارہ وقار کی بڑی بیوی کی طرف تھا۔

میں ماں کے جانے کے بعد ان کے کمرے میں گئی تو وقار کی بڑی بیوی بے خبر سو رہی تھیں۔ میں چند لمحے انہیں سوتا ہوا دیکھتی رہی اور پھر ماں کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ پھر شاید لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔ یوں بھی میں کئی راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ ماں عصر کی نماز سے کچھ دیر پہلے آئی اور مجھے جگایا پھر اشارے سے کہا باہر چلو۔

میں کمرے سے باہر آئی تو انہوں نے سرگوشی کی "میں نے رقم اسے دے دی ہے، اب وہ نہیں آئے گا" یہ فقرہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

میرا خیال تھا اب بخشل کا منہ بند رہے گا مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ رقم دینے کے تین دن بعد ہی مجھے وقار کی باتوں سے یوں لگا جیسے بخشل ان سے ملا ہو۔ انہوں نے باتوں باتوں میں کہا "بخشل، بدمعاش ہے۔ وہ کسی کی بھی عزت اچھال سکتا ہے۔ اسے نہ غیرت ہے نہ شرم پھر وہ وڈیرے کا منہ لگا ہے۔ کیونکہ اس کے غلط کام کرتا ہے۔"

"یہ آپ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ماں نے مجھ سے لی ہوئی رقم اس کو دی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا کیوں دی ہے۔ لیکن بخشل کہہ رہا تھا کہ وہ بہت جلد مجھے یہ راز بھی بتادے گا کہ ماں نے اسے رقم کیوں دی ہے؟ ماں سے کہو کہ مجھے اندھیرے میں نہ رکھیں۔"

میں وقار کی بات کا مطلب سمجھ رہی تھی، لیکن جو بات

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

وقار معلوم کرنا چاہتے تھے وہ ایسی نہیں تھی کہ انہیں بتائی جائے۔ اس بات پر پردہ ڈالنے ہی کے لیے تو ماں نے اتنی موٹی رقم ادا کی تھی۔ میں چند لمحے سوچتی رہی اور پھر بولی "آپ پریشان نہ ہوں' لیٹ جائیں۔ میں ماں سے پوچھ لوں گی۔"

"تم نہیں پوچھو' ان سے کہو کہ مجھ سے بات کریں۔"

"ٹھیک ہے' میں صبح کہہ دوں گی۔"

صبح جب فجر کی نماز کے لیے وقار مسجد گئے تو میں ماں کو اپنے کمرے میں لے آئی اور پھر انہیں ساری بات بتانے کے بعد کہا کہ اب کیا کیا جائے؟ ماں میری بات سن کے گم صم سی ہو گئی تھیں پھر انہوں نے کہا "میری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ وقار سے کیا کہا جائے' ویسے میں بخشل کے پاس جاتی ہوں۔"

"نہیں' اب بخشل کے پاس مت جانا" میں نے کہا۔

"جانا تو پڑے گا' آخر اس نے وقار سے بات کیوں کی۔ جب معاملہ اس کے اور ہمارے درمیان ہے۔"

"وہ بدنیت اور لالچی آدمی ہے ماں' ممکن ہے وہ کسی طرح وقار سے بھی کچھ۔۔۔"

"نہیں' اگر وہ ایسا کرے گا تو تیرا گھر برباد ہو جائے گا۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے ماں کہ میرا گھر برباد ہو کر رہے گا" میں نے کہا "ایک بات میں وقار سے نکاح کے بعد ہی سے سوچ رہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہی ہے؟"

"میری کوکھ میں حرام کی اولاد پل رہی ہے" میں نے سرگوشی کی "میں اپنا گناہ وقار کے سر کیوں تھوپ دوں؟"

"یہ تیرا گناہ نہیں فاطمہ' اگر تیرا گناہ ہوتا تو اللہ اس کی پردہ پوشی کا موقع ہی نہیں دیتا" ماں نے کہا "ان باتوں کو چھوڑ' کوئی اور ترکیب سوچ کہ کسی طرح بخشل کا منہ بند ہو جائے۔"

"ایک بخشل ہی نہیں ماں' رحمت اور قدوس بھی ہیں۔ بخشل کسی روز انہیں بھی سامنے لائے گا۔"

"پھر۔۔۔ پھر کیا کریں؟"

"میں ان تینوں کو قتل نہیں کر سکتی ورنہ سب سے بہتر حل یہی ہے" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے وقار سے میں ابھی نہیں ملوں۔ پہلے بخشل سے بات کرلوں پھر اس سے ملوں گی۔"

وقار نماز سے آنے کے بعد حسب معمول سو گئے۔ میرا خیال تھا وہ اٹھنے کے بعد پوچھیں گے کہ ماں نے کیا کہا۔ لیکن انہوں نے نہیں پوچھا۔ میں بھی خاموش ہی رہی۔ ماں بخشل سے ملنے گئی تو وہ شام سے پہلے گھر نہیں آئی۔ آنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی' سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اس کمرے میں ان سے بخشل والی بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وقار کی بڑی بیوی کمرے ہی میں ہوتی تھی۔ رات کا کھانا میں نے کمرے میں پہنچایا' وہ وقار کی بیوی کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ میں اور وقار ساتھ کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد ہی وقار عشاء کی نماز کو جاتے تھے۔

اس روز بھی وہ نماز کے لیے گھر سے نکلے۔ میں نے دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈی لگائی اور پلٹی تو میں نے ماں کو کمرے سے نکل کر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں ان کی طرف بڑھی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کے لیے کہا۔ میں رک گئی۔ میں بیرونی دروازے سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی تھی۔

"وقار نکل گیا مگر وہ نہیں آیا" ماں نے میرے قریب پہنچ کر کہا "جبکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد آجائے گا۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟"

"بخشل کی" ماں نے کہا "آج وڈیرا بھی گوٹھ آیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ آکر وقار کے سامنے کہہ دے کہ میں نے وڈیرے کا پرانا قرض چکایا ہے۔ پہلے وہ میری بات مان نہیں رہا تھا۔ لیکن بعد میں مان گیا۔ اگر وہ کہہ دیتا تو وقار کا دل صاف ہو جاتا۔"

"لیکن ماں' اس کام کے لیے اسے گھر بلانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تو پھر وہ وقار سے کہاں ملتا؟"

"مسجد میں مل سکتا تھا" میں نے کہا "اب تم کل عصر کی نماز میں اسے لے کر مسجد ہی پہنچو تو ٹھیک ہے۔"

"مگر وقار نے مجھ سے صبح پوچھ لیا تو۔۔۔"

"تو تم یہی بات کہہ دینا کہ تم نے وڈیرے۔۔۔۔" اس سے آگے میں کچھ نہیں کہہ سکی۔ کیونکہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔

"شاید وہی ہے" ماں نے کہا اور دروازے کی طرف لپکی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی' وہ نہ صرف دروازہ کھول چکی تھی بلکہ بخشل دروازے کے اندر تھا۔ "ارے تو تم بھی کھڑی ہو" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا "میں سوچ رہا تھا دروازہ تم کھولوگی لیکن خیر' ابھی تو تم میرے کام کی نہیں ہو' لیکن میں تیرے شوہر کو سب نہیں بتاؤں گا مگر تمہیں بھی میرا خیال کرنا پڑے گا۔"

"ارے' ابھی ملا نہیں ہے' بکواس زیادہ مت کر' کل تو اس سے مل کر بتادینا کہ میں نے تجھے رقم۔۔۔"

"بتادوں گا لیکن پہلے اس سے تو وعدہ لے لوں" اتنا کہہ کر وہ بالکل میرے سامنے آگیا۔

مجھے اس کی شکل سے ہی نفرت تھی پھر پتا نہیں مجھے اچانک کیا ہوا کہ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ ہو گیا جس کی نہ مجھے توقع تھی نہ گمان۔

بخشل نے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور دھکا دے دیا۔ جب میں گری تو میری چیخ نکل گئی۔ اس نے میرے گرتے ہی میرے لات ماری۔ وہ میرے ابھرے ہوئے پیٹ پر لگی اور میں تڑپ گئی۔ بس پھر میں نے اتنا دیکھا کہ بخشل پیچھے کی طرف گرا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ماں نے اسے کالر پکڑ کر پیچھے کی طرف جھٹکے سے کھینچ لیا تھا۔

مجھے اگلے دن ہوش آیا تھا۔ اس وقت میں میرپور خاص کے بڑے اسپتال میں تھی۔ میرا آپریشن ہو چکا تھا۔ مرے ہوئے بچے کو تو شاید دفنایا بھی جا چکا تھا۔ جس وقت مجھے ہوش آیا' اس وقت میرے پاس وقار کی بڑی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں تھانے میں ہے اور بخشل اسپتال پہنچ کر پولیس کو بیان دینے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔

وقار کی بیوی نے کہا کہ جب میں درد سے تڑپ رہی تھی' اس وقت ماں نے جھٹکے سے بخشل کو پیچھے کی طرف کھینچا۔ وہ گر گیا تو ماں نے دروازے کے پاس رکھا ہوا پتھر اٹھا کر بخشل کی طرف اچھال دیا۔ وہ پتھر گرے ہوئے بخشل کے سر پر پڑا اور پھر بخشل اٹھ نہیں سکا۔ اتنی دیر میں پاس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پھر وڈیرے کی جیپ میں مجھے اور بخشل کو اسپتال پہنچایا گیا۔ بے ہوشی ہی کے عالم میں میرا آپریشن کیا گیا۔

ماں کو پولیس تھانے لے گئی۔ وہ اس وقت تھانے ہی میں تھی اور وقار بھی تھانے گئے تھے۔ وقار کے تھانے سے آنے تک دن نکل آیا تھا۔ انہوں نے ہی آکر بتایا کہ ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ صدمے سے بار بار بے ہوش ہو رہی ہیں۔ جبکہ وقار نے انہیں بتادیا کہ میں اب خطرے سے باہر ہوں اور بچہ ضائع ہو گیا' اسے بچایا نہیں جا سکا۔

میں نے نحیف آواز میں کہا "ماں کا کیا ہو گا؟"

"ماں کو کچھ نہیں ہو گا" وقار نے کہا۔ "میں اچھا وکیل کروں گا اور کیس لڑوں گا۔ بخشل میرے گھر میں گھس آیا تھا۔ اس نے تمہاری عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کے ہاتھوں میرا بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا۔"

میں وقار کو دیکھ رہی تھی' میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا حالانکہ میں کہنا چاہتی تھی کہ ماں کو کسی بھی طرح بچالیا جائے' میری ماں بہت مظلوم تھی۔ اگر میری وجہ سے اسے سزا ہو گئی تو میں اپنے آپ کو نہیں بخش سکوں گی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی مر جاؤں گی۔ مجھے معلوم تھا کہ کسی کا خون کرنے کی کیا سزا ہوتی ہے۔

"تم آرام سے رہو' صالحہ تمہارے پاس رہے گی" وقار نے اپنی بڑی بیوی کی طرف اشارہ کرکے کہا "میں اب وکیل کے پاس جاؤں گا پھر وڈیرے سے بھی ملوں گا۔ ساری بات اسے بھی بتاؤں گا۔ سب جانتے ہیں کہ اس وقت میں مسجد میں تھا۔ ایسے وقت بخشل میرے گھر کیوں آیا پھر جو کچھ ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ ہر عورت کو اپنی عزت اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ تم اسے دیکھ کر چیخ پڑیں اور ماں کمرے سے نکل کر آئیں اور وہ ہو گیا جو سب نے دیکھا۔"

کوکا کولا

ایک فارمسٹ جو امریکن تھا۔ وہ اکثر اپنی لیبارٹری میں مشروبات بنانے کے لیے فارمولے بناتا رہتا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں اس کی لاٹری نکل گئی جب اس نے ایسے ہی تجربات کے دوران میں دنیا کا سب سے زیادہ پیے جانے والے مشروب کا فارمولا دریافت کرلیا۔

اس فارمسٹ کا نام۔۔۔ جان ایس پامبرٹن" JOHN S PAMBERTON تھا۔ بعد ازاں اس نے یہ فارمولا اس زمانے کے مشہور فارمسٹ "جیکب فارمیسی اٹلانٹا" کے آگے پیش کیا اور اس فارمولے کی بنیاد پر جیکب فارمیسی کے کیمیادانوں نے اس میں تھوڑا بہت ردوبدل کرکے اسے امریکن یہودی تاجروں کے ساتھ مل کر PATENT کروالیا۔ بعد ازاں یہودی تاجروں نے اس مشروب کو پوری دنیا میں پھیلادیا جسے آج ہم "کوکا کولا" کے نام سے جانتے ہیں۔

(محمد یونس بلوچ' جرمنی)

میں وقار کی شکل تک رہی تھی۔ میری آنکھوں میں حیرت کے رنگ بھی تھے اور افسوس کے بھی۔

تھانے میں' میں نے ماں کو سمجھادیا ہے کہ وہ یہی کچھ کہے۔ پھراس کا بیان بھی وکیل کے سامنے دلاؤں گا۔ میں نے ایس ایچ او سے کہہ دیا ہے کہ وکیل کے آنے سے پہلے ماں کا بیان نہ لیا جائے۔ میرے خیال میں تھانے دار وہی کرے گا جو میں نے کہا ہے" چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دھیمی آواز میں وقار نے کہا" بخشل کی لاش ابھی ابھی گوٹھ گئی ہے' مجھے گوٹھ بھی جانا ہے تاکہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا سکوں' اس کے لیے قبرستان میں مجھے دعا بھی کرنی ہے۔ اب یہ وقت آگیا ہے کہ مجھے اپنے دشمن کے لیے بھی یہ سب کرنا پڑے گا۔ بخشل کے لیے آخری دعا پڑھ کر ہی میں وڈیرے سے ملاقات کروں گا۔ اگر وڈیرا بخشل کے سلسلے میں کچھ نہ کرے تو ماں سزا سے بچ جائے گی ورنہ ماں کو سزا ہو جائے گی۔"

"پھانسی کی سزا؟" میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں' میں اتنی بڑی سزا نہیں ہونے دوں گا" وقار نے کہا "چند سالوں کی سزا تو ہو جائے گی۔"

اس کے بعد وقار اسپتال سے چلے گئے۔ اس کے بعد میرے ساتھ ان کی بڑی بیوی صالحہ تھی۔ یہ بے چاری میرا بہت خیال رکھ رہی تھی۔

○☆○

پورے دس ماہ بعد ماں جیل سے گھر آئی تھی۔ سزا تو انہیں صرف تین ماہ کی ہوئی تھی لیکن ان کی ضمانت نہیں ہوسکی تھی اس لیے مقدمے کے دوران میں بھی وہ جیل ہی میں رہیں۔ وقار نے ان کے لیے بہت بڑا وکیل کیا تھا اور انہوں نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ بخشل کی طرف سے وڈیرا کوئی اچھا وکیل نہ کھڑا کرے اور جھوٹے گواہ کھڑے نہ کرے اس کے باوجود بھی ماں دس ماہ بعد گھر آئی تھیں۔

ماں جس روز گھر آئی' اس دن جیسے میری عید ہوگئی تھی اور میں یہ سوچ سوچ کر بھی دکھی ہو رہی تھی کہ ماں نے میری خاطر کتنی بڑی قربانی دی۔ انہیں دس ماہ جیل میں گزارنے پڑے اور وہ یہ اذیت بھی جھیلتی رہیں کہ پتا نہیں اسے عمر قید ہوتی ہے یا اتنی سزا کہ ان کی موت جیل ہی میں ہو جائے۔ میری طرح وقار اور ان کی پہلی بیوی بھی خوش تھیں۔ گوٹھ کی بہت سی عورتیں ماں سے ملنے آئی تھیں۔ رات تک عورتیں آتی جاتی رہیں۔ ہر عورت بخشل کو برا کہہ رہی تھی۔ کئی ایک نے تو کہا "اچھا ہوا کمینہ مرگیا ورنہ معلوم نہیں کتنی عورتیں اور لڑکیاں اس کے ہاتھوں تباہ ہو جاتیں۔"

رات عشاء کی نماز کے بعد وقار گھر آئے' کپڑے تبدیل کر کے وہ لیٹے تو میں حسبِ معمول ان کے پیروں کے پاس [illegible] گئی اور پیر دبانے لگی۔

"بعض وقت آدمی سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے" وقار نے خود کلامیہ انداز میں کہا تھا "تم سے نکاح کے چار دن بعد ہی مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جنگل میں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے لیکن میں نے یہ سوچ کر اس کا ذکر تم سے نہیں کیا کہ تمہیں شرمندہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ بخشل ماں کو اور تمہیں بلیک میل کر رہا ہے تو میں نے سوچا اسے گرفتار کرادیا جائے۔ جس روز ماں نے اسے پتھر مارا اس روز وہ میرے کہنے سے ہی میرے مسجد جانے کے بعد آیا تھا۔ ماں نے اسے پہلے بلایا تھا تاکہ میرا اور اس کا سامنا کرادیا جائے۔"

میں وقار کی بات سن رہی تھی اور میرے ہاتھ کیا پورا جسم پتھر کا ہوگیا تھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ وہ گھر میں کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کرے گا کہ ہنگامہ ہو جائے گا پھر میں اسے عزت پر حملے کے الزام میں گرفتار کرادوں گا جب مقدمہ چلے گا تو جرح کے دوران میں بخشل اپنے پہلے کارنامے کا ذکر اس طرح کرے گا کہ فاطمہ کون سی عزت دار ہے۔ میری تو یہ [illegible] اور اس کے بلانے پر ہی میں اس کے گھر گیا تھا۔ اس کے بعد میرا وکیل' اس سے میرے کہنے پر ایسے سوالات کرتا کہ وہ [illegible] حوالہ دیتا اور کہتا کہ مُلّا اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کا ڈاکٹری معائنہ کرالیا جائے۔ فاطمہ کی کوکھ میں جو بچہ ہے وہ اس کا نہیں' ناجائز ہے۔"

"لیکن۔۔۔" میں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکی۔

"پھر میرا وکیل اس ناجائز بچے کے باپ کے سلسلے میں ایسے سوالات کرتا کہ بخشل پھنس جاتا اور عدالت اسے پھر ایک معصوم لڑکی سے زیادتی کرنے کے جرم میں کم از کم [illegible] سال کی سزا سنادیتی۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ تم نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے تم پر حملہ کیا اور ماں کا مارا ہوا پتھر اسے موت کے منہ میں لے گیا" وقار نے کہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھے اور مسکراتے ہوئے بولے "میرا دل بہت بڑا ہے۔ اگر ماں کو سزا نہیں ہوتی تو یہ باتیں میں تمہیں نہیں بتاتا لیکن اب تم ماں سے مت کہنا۔"

میں وقار کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ کاش' میں اس مُلّا کے بچے کی ماں بن سکتی جس نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

معراج صاحب' آداب

زیرِ نظر کہانی کا میں عینی شاہد تو نہیں ہوں مگر جس شخص نے مجھے یہ کہانی سنائی ہے اس کے گاؤں والوں میں اب بھی بہت سے لوگ ایسے زندہ ہیں جو اس کہانی کے عینی گواہ ہیں۔ کہانی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ محبت کے عجیب و غریب جذبے کی عکاس ہے۔ اور اس کی مظہر کہ

یہ ایک محبت ہے جو ہر وقت جواں رہتی ہے

آپ کا

سرور اکرام۔ کراچی

قیامت تک

یہ کہانی مجھے میرے ایک جاننے والے نے سنائی تھی۔ اس کہانی کو سن کر مجھے محبت کی عظمت پر یقین آگیا۔ آج کے اس افراتفری اور خود غرضی کے عہد میں بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہیں جو محبت کی خاطر اپنے آپ کو قربان کردیتے ہیں۔ نہ جانے یہ کیسا جذبہ ہے۔ جو قربانیاں دینے کا حوصلہ پیدا کردیتا ہے۔

اس کہانی کے بہت سے کردار آج بھی زندہ ہیں لیکن میں ان کے نام تبدیل کر رہا ہوں لیکن جو لوگ محبت کی اس داستان سے واقف ہیں۔ انہیں فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کہانی کن کرداروں کی ہے اور کس علاقے سے تعلق رکھتی ہے۔

دلدار نام تھا اس کا۔

ایک طرح دار اور دلدار ہی قسم کا خوب صورت نوجوان' دو بھائی اس سے بڑے تھے۔ جنہوں نے اپنا اپنا کاروبار شروع کر رکھا تھا اور شادیاں کرلی تھیں جبکہ دلدار ابھی تعلیم ہی حاصل کر رہا تھا۔ وہ ایک ذہین نوجوان تھا۔ اس

نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کے والدین حیات تھے اور انہیں امید تھی کہ دلدار آگے چل کر ان کے خاندان کا نام ضرور روشن کرے گا۔

والدین کی خواہش پوری تو ہوئی لیکن کسی اور انداز سے۔ دلدار نے نام تو روشن کیا لیکن یہ روشنی کچھ اور ہی تھی۔

وہ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں ہر طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ ان کھیتوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہوئے تھے۔ پس منظر میں خوب صورت پہاڑیاں تھیں۔ جن پر سرمئی بادل سایہ کیے رہتے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک خوب صورت رومان پرور گاؤں تھا۔ آپ اس گاؤں کا نام رانجھا نگر فرض کر سکتے ہیں۔

اس گاؤں میں یوں تو بے شمار لڑکیاں تھیں لیکن زیبو کی بات کچھ اور ہی تھی حالانکہ اس کا رنگ کندن کی طرح نہیں تھا اور نہ ہی اس کا قد سرو کی طرح تھا۔ اس کے باوجود اس میں بے پناہ کشش تھی۔ ایسی دلکشی اور دلنوازی بہت کم میں پائی جاتی ہے۔

ایک دن دلدار اور زیبو گاؤں کی ایک گلی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ مختصر سا گاؤں تھا۔ زیبو جانتی تھی کہ یہ دلدار ہے اور دلدار کو زیبو کے بارے میں معلوم تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھا بھی کرتے تھے لیکن اس وقت تک ان دونوں کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس دن شاید عشق کا دیوتا وہیں کہیں چھپا ہوا تھا جس نے ان دونوں کی آہٹ پاتے ہی اپنے ترکش سے ایک خوب صورت سا تیر چلا دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی نگاہوں میں سما کر رہ گئے۔

وہ گلی اتنی تنگ تھی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا رہنا پڑتا۔ تب جا کر دوسرا گزر سکتا تھا۔ عام طور پر اس گاؤں میں خواتین کا احترام ہی کیا جاتا تھا لیکن اس وقت دلدار زیبو کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا "ہٹ جا دلدار۔ راستہ چھوڑ میرا" زیبو نے کہا۔

"اب تو یہ راستہ ایک ہو گیا ہے زیبو" دلدار بول پڑا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"مطلب یہ ہے کہ اب تیرا وہی راستہ ہے جو میرا ہو گا اور میرا وہی راستہ ہے جو تیرا ہو گا' جا نکل جا" دلدار دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن زیبو فوری طور پر آگے نہیں جا سکی تھی۔ کیونکہ تیر نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ اس کے پاؤں جم کر رہ گئے تھے اور نگاہیں دلدار کا طواف کر رہی تھیں جبکہ دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ وہی حال دلدار کا ہو رہا تھا۔ وہ بھی دیوار سے چپک کر رہ گیا تھا پھر ان دونوں کو جیسے ہوش سا آ گیا۔ دونوں اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔

اس دن کے بعد سے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوش اور بے چین ہونے لگے تھے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ قدرت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ چوری چھپے دونوں کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی کھیتوں کے درمیان' کبھی کسی چھوٹی موٹی تقریب میں لیکن ان تمام ملاقاتوں کے باوجود دونوں کے دلوں میں خوف بھی تھا۔ یہ خوف دیکھ لیے جانے کا تھا۔ راز افشا ہونے کا خوف تھا۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ گاؤں کی روایات بہت مختلف تھیں۔ یہاں اس قسم کی باتیں خوں ریزی کا سبب بن جایا کرتی تھیں۔ غیرت کے نام پر لاشوں کے ڈھیر لگا دیے جاتے تھے۔ ایسی صورت میں' ایسے ماحول میں عشق کرنا آسان نہیں تھا۔

ایک بار اس گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے گاؤں میں ایک میلہ لگا۔ گاؤں والوں کے لیے یہ تفریح کا ایک اچھا موقع تھا۔ تقریباً گاؤں کا ہر آدمی اس میلے میں شریک ہونے گیا تھا۔ دلدار بھی اپنے دوستوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔

وہاں اس نے زیبو کو بھی دیکھا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ دلدار نے زیبو کو اشارہ کیا۔ زیبو موقع پا کر ان سہیلیوں سے کٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ کچھ دیر میں دلدار بھی اس سے آملا تھا۔

"زیبو" دلدار نے اس سے کہا "میلے میں ایک بہت بڑا نجومی بھی آیا ہوا ہے۔ چل اس سے قسمت کا حال معلوم کرتے ہیں۔"

"اور اگر اس نے کوئی الٹی سیدھی بات بتا دی تو۔"

"تو کیا ہوا۔ پیار کرنے والے ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے" دلدار نے کہا "اگر اس نے کوئی الٹی سیدھی بات بتا بھی دی۔ تب بھی ہماری محبت میں کیا کمی آئے گی' ہم ایک دوسرے کے ہیں اور ایک دوسرے کے ہی رہیں گے۔"

زیبو اور دلدار اس نجومی کے پاس پہنچ گئے۔ جو ایک چھوٹے سے خیمے کے اندر اپنے نجوم کی دنیا سجائے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں محبت کرنے والے بھی اس کے سامنے جا کر کھڑے

ہو گئے۔ نجومی ایک بوڑھا انسان تھا۔ جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور جس کی آنکھوں میں بہت چمک تھی۔ وہ بہت غور سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بابا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ رہنے کا ارادہ کیا ہے" دلدار نے بتایا "اب تم ہمارے ہاتھ دیکھ کر بتا دو کہ یہ ہو سکے گا یا نہیں۔"

"بچو۔ اس کے لیے تمہارا ہاتھ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے" نجومی نے کہا "محبت کی خوشبو تم دونوں کے ارد گرد منڈلا رہی ہے اور یہ خوشبو یہ بتا رہی ہے کہ تم دونوں قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہو گے۔"

"بس بابا۔ ہمیں اب کچھ نہیں معلوم کرنا' بتاؤ کتنے پیسے دے دوں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ ہم محبت کرنے والوں سے پیسے نہیں لیا کرتے البتہ ان کے حق میں دعائیں ضرور کرتے ہیں۔ جاؤ' میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

دونوں بہت خوش خوش اس کے خیمے سے باہر نکل آئے تھے "زیبو۔ میرا دل کہتا ہے کہ نجومی کی بات غلط نہیں ہو گی" دلدار نے باہر آنے کے بعد کہا۔

"ہاں" زیبو نے اس کی تائید کی "بہت پہنچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے سب کچھ بتا دیا۔"

اس میلے میں جسم پر نقش و نگار کھودنے والا بھی موجود تھا۔ دلدار زیبو کو ضد کر کے اس کے پاس لے گیا تھا۔ زیبو نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی تھی "نہیں دلدار۔ یہ مت کرو' سنا ہے سوئی سے نقشے بناتے ہیں اور بہت تکلیف ہوا کرتی ہے۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ تو رہو گی نا۔ تو پھر مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

نقش بنانے والا ایک کریہہ الصورت انسان تھا۔ دلدار نے اس سے کہا "مجھے ایک نام کھدوانا ہے اور کم از کم دس جگہ۔"

"ٹھیک ہے" نقش بنانے والے نے کہا "چلو آستینیں اوپر کرو۔"

"چار بار دونوں بازوؤں پر اور چھ بار میرے سینے پر" دلدار نے بتایا۔

"دلدار یہ کیا پاگل پن ہے؟" زیبو نے اسے منع کرنے کی کوشش کی۔

لیکن دلدار اس وقت محبت کے نشے میں سرشار ہو رہا تھا۔ اس نے زیبو کا ہاتھ تھام لیا۔ اس تکلیف دہ عمل کے دوران میں وہ زیبو کی طرف دیکھتا رہا تھا اور ایک گھنٹے کے اندر اس کے دونوں بازوؤں اور سینے پر زیبو ہی زیبو تھی۔

اس طرح ان دونوں کی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ آندھی اور طوفان کی طرح۔ انہیں ایک دوسرے کے علاوہ اور کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ دونوں نے اپنا آرام اور سکون ایک دوسرے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اگر ایک کو تکلیف ہوتی تو دوسرا اس کے درد کو محسوس کر لیا کرتا تھا۔

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ بہت پرانی بات ہے لیکن ہر دور میں سچ ثابت رہی ہے۔ ان کی محبت بھی چھپ نہیں سکی تھی۔ پہلے دو چار کو پھر پورے علاقے کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ زیبو اور دلدار ایک دوسرے سے طوفانی محبت کرنے لگے ہیں۔

زیبو کے گھر والے بہت چالاک اور کاروباری قسم کے انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس سیلاب کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ اس لیے انہوں نے اس صورتِ حال کو بہت ہوشیاری سے ہینڈل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

زیبو کے باپ نے ایک دن دلدار کو اپنے پاس بلا لیا۔ دلدار ایک لمحے کے لیے خوف زدہ تو ہوا تھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ محبت کی قوت اس کے ساتھ ہے۔ محبت اس کی کسی محافظ کی طرح حفاظت کرتی رہے گی اس لیے وہ بڑی جرأت مندی سے اس کے پاس پہنچ گیا "جی چاچا۔ تم نے بلایا ہے مجھے؟"

کتابیات پبلی کیشنز
کشمیر کی کلی
عجائب خانۂ عشق
اندر کا آدمی
آگ کا بدن
شہزادی کا نیلام
بالاخانے کی دلہن
رزم بزم
74200

"ہاں بیٹا" زیبو کے باپ نے ایک مکارانہ مسکراہٹ سے کہا "دیکھ بیٹا۔ میں جانتا ہوں کہ تو اور زیبو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں۔ کوئی بات نہیں، ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو خواہ مخواہ راستے میں دیوار بن جائیں۔ ہمارے لیے اولاد کی خوشی کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔"

"تمہاری بہت مہربانی ہے چاچا" دلدار فرطِ عقیدت سے دہرا ہو گیا تھا۔

"لیکن بیٹا۔ ہمیں بھی پوری برادری والوں کو جواب دینا ..... ہے۔ سب یہی سوال کریں گے کہ آخر کیوں؟ ہم نے تم میں ایسی کون سی خوبی دیکھی کہ اتنی بدنامی کے بعد بھی لڑکی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیا۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہاں چاچا۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو پھر بتاؤ، میں کیا کروں؟"

"بیٹا۔ تمہارے پاس بہت وقت ہے۔ پورے چھ مہینے ہیں تمہارے پاس" زیبو کے باپ نے کہا "تم ایک لاکھ روپے کا بندوبست کردو۔ اس کے بعد زیبو تمہاری ہے۔"

"ایک لاکھ روپے؟"

"ہاں بیٹا۔ یہ کوئی خاص بڑی رقم بھی نہیں ہے۔ تم مرد آدمی ہو۔ تمہارے لیے کیا مشکل ہے پھر میں بھی سر اٹھا کر کہہ سکوں گا کہ میرے ہونے والے داماد نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا پھر کسی کو اعتراض کی بھی گنجائش نہیں ہوگی۔"

"لیکن چاچا۔ ایک لاکھ۔ اور وہ بھی چھ مہینے میں۔"

"بیٹا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ برادری والے تو مشورہ دے رہے تھے کہ پورے پانچ لاکھ کی شرط لگادو لیکن میرا دل نہیں مانا اور اب تمہاری مرضی ہے، میں نے تمہارے لیے معاملہ کتنا آسان کردیا ہے۔ اب اگر تم اس سے محبت کرتے ہو تو اس کو حاصل کرنے کی کوشش بھی کرو گے۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔ میں لادوں گا ایک لاکھ لیکن تم بھی اپنی بات پر قائم رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ زیبو کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دو۔"

"نہیں بیٹا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا اور اب جاؤ اور ابھی سے کوشش شروع کردو۔"

دلدار بہت الجھا ہوا گھر آیا تھا۔ وہ ناامید بھی تھا اور پُرامید بھی۔ خوش بھی تھا اور اندیشے بھی ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف زیبو کے والدین نے ان دونوں کی محبت کا برا نہیں مانا تھا۔ تو دوسری طرف انہوں نے ایک لاکھ کی شرط بھی عائد کردی تھی۔ اس کے لیے امکانات بھی تھے اور ناامیدی بھی تھی۔ بہرحال اسے زیبو کو تو حاصل کرنا تھا، چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔ اس نجومی کی بات بھی اسے یاد تھی جس نے کہا تھا کہ وہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی الگ نہیں کرسکتا۔ اس نجومی کی یہ بات اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بہت تھی۔

گھر آکر وہ سیدھے اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا حالانکہ اس نے کبھی باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی اور آج زبان کھول رہا تھا تو ایسے موضوع پر جو اس کے لیے کسی طور مناسب نہیں تھا لیکن معاملہ زیبو اور محبت کا تھا۔ اس لیے اسے باپ ہی سے مدد مانگنی تھی "ابا۔ مجھے ایک لاکھ کی ضرورت ہے" اس نے کہا۔

"ایک لاکھ روپے!" اس کا باپ یہ سن کر اچھل پڑا "کیا پاگل ہو گیا ہے دلدار۔ کس لیے چاہیے ایک لاکھ؟"

"ابا۔ زیبو کے باپ نے میرے سامنے یہ شرط رکھ دی ہے۔"

"اوہ۔ اب سمجھا، تو یہ معاملہ تیرے عشق کا ہے۔ شرم نہیں آتی تجھے کہ اپنے باپ سے ایسی بات کرنے چلا آیا۔"

"میں کوئی گناہ نہیں کررہا ابا!" اس نے کہا "زیبو سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بس اتنی سی خواہش ہے میری اگر ایک لاکھ روپے میرے پاس ہوئے تو میری خوشی بن جائے گی، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہونے دے کچھ بھی" اس کا باپ بھڑک اٹھا "تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ صاحب زادے عشق خود کررہے ہیں اور باپ سے ایک لاکھ روپے مانگ رہے ہیں جبکہ یہاں ایک ہزار بھی نہیں ہے۔ گھر میں ہے کیا جو اٹھا کر تجھے دے دوں اور آئندہ میرے سامنے اس قسم کی بات مت کرنا۔"

باپ سے مایوس ہو کر اس نے باری باری دونوں بھائیوں سے رجوع کیا لیکن انہوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا تھا بلکہ سب نے مل کر اس کا مذاق اڑانا شروع کردیا تھا۔ بہت ہی بددل ہو کر دلدار نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جس کی اطلاع اس نے کسی کو بھی نہیں دی تھی سوائے زیبو کے۔ وہ کسی طرح زیبو سے ملنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ حالانکہ زیبو کی سخت نگرانی ہونے لگی تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح دلدار کے پاس چلی آئی تھی۔

"زیبو، میں تیرے باپ کی شرط پوری کرنے کے لیے شہر جارہا ہوں" اس نے بتایا "اس گاؤں میں رہ کر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کون دے گا پیسے۔ باپ سے بول کر دیکھ لیا۔ بھائیوں کے آگے ہاتھ پھیلا لیا لیکن کوئی فائدہ نہیں۔"

"دلدار۔ شہر جا کر بھی کیا ہو جائے گا؟" زیبو نے آنسوؤں کے درمیان پوچھا۔

"ہو جائے گا زیبو۔ تو محبت پر یقین رکھ" دلدار نے کہا "وہاں میں اپنی جان لڑادوں گا۔ شہر میں کمانے کے بہت سے راستے ہیں۔"

"میرا تو دل دھڑک رہا ہے دلدار۔ تو شہر جائے اور یہاں کچھ اور ہو جائے تو۔"

"کچھ بھی نہیں ہوگا تو بس حوصلہ رکھ اور میری واپسی کی دعائیں کر پھر واپس آکر میں تجھے اپنی دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔"

زیبو کو دلاسا دے کر وہ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے زیبو سے کہا تھا کہ وہ اس کے گھر والوں کو بتادے کہ دلدار پیسے کمانے شہر چلا گیا ہے اور چھ مہینے سے پہلے اس کی واپسی ہو جائے گی۔

شہر اس کے لیے بالکل اجنبی تھا لیکن وہ عام دیہاتیوں کی طرح بھی نہیں تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ اچھی خاصی ذہانت بھی تھی۔ اسی لیے اسے وہ دشواریاں پیش نہیں آئیں جو عام طور پر ایسے دیہاتیوں کو پیش آیا کرتی ہیں۔ اس نے شہر آکر بہت ہوشیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا تھا۔

وہ گاؤں سے چلتے وقت اپنے ساتھ کچھ روپے لے آیا تھا۔ جن کی مدد سے دو چار دن شہر میں گزارے جاسکتے تھے۔ وہ رات کا کھانا کھانے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچ گیا اور آنے جانے والوں اور کام کرنے والے ویٹرز کے چہروں کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید ان میں سے کوئی اس کے کام کا نکل آئے۔

جس بیرے نے اس کے لیے کھانا لگایا تھا۔ وہ ایک معقول صورت ادھیڑ عمر انسان تھا۔ دلدار نے موقع پا کر اس سے کہا "بھائی۔ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔ کیا کام ہے؟"

"اس طرح نہیں بھائی۔ تم یہ بتاؤ تمہاری چھٹی کس وقت ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"دو گھنٹوں کے بعد" بیرے نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ دو گھنٹوں کے بعد مجھ سے ہوٹل کے باہر مل لینا" اس نے کہا "یقین کرو، بہت ضروری کام ہے تم سے۔ تم نے میری بات سن لی تو بہت مہربانی ہوگی تمہاری۔"

اس بیرے کو بھی اس پر ترس آگیا تھا "ٹھیک ہے، دو گھنٹے بعد آجانا۔"

دلدار نے دو گھنٹے وہیں ہوٹل کے آس پاس گزارے۔ وہ اس کے لیے نیا شہر تھا۔ اس لیے ہوٹل سے کہیں دور بھی نہیں جاسکتا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ بیرا اس کے پاس آگیا تھا۔ ہاں بھائی، اب بتا کیا کام ہے تجھے۔"

"میرا نام دلدار ہے بھائی!" اس نے بتایا "بہت امیدیں اور خواب لے کر شہر کی طرف آیا ہوں۔ میں نے میٹرک تک تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ یہ شہر میرے لیے بالکل نیا ہے۔ کسی کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ تم مجھے اچھے آدمی لگے اس لیے تم کو اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔ مجھے اس وقت صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو کہیں سر چھپانے کی جگہ۔ اور کہیں کوئی کام۔ اگر تم نے میرے یہ کام کردیئے تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

بیرے فضل کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ دلدار کو اپنے ساتھ اپنی کوٹھری میں لے آیا۔ وہ اکیلا ہی رہا کرتا تھا۔ اس نے کہہ سن کر دلدار کو ایک دوسرے ہوٹل میں نوکری بھی دلوادی تھی۔ جہاں پندرہ سو روپے تنخواہ تھی۔ دو چار دنوں کے بعد اس نے فضل سے کہا "بھائی۔ تمہاری بہت مہربانی، تم نے میرا اتنا ساتھ دیا ہے لیکن میرے ساتھ معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ میں اگر زندگی بھر بھی کام کرتا رہوں تو اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتا۔"

"آخر مقصد کیا ہے بابا تیرا؟" فضل نے پوچھا۔

دلدار نے بڑی سچائی کے ساتھ اسے اپنے مقصد سے آگاہ کردیا۔ "بس بھائی۔ میرے پاس چھ مہینے ہیں اور اتنے دنوں میں مجھے ایک لاکھ روپے چاہئیں۔"

فضل نے یہ سن کر اپنا سر تھام لیا تھا "خدا کے بندے۔ کہاں سے مل جائیں گے ایک لاکھ، کون دے گا تمہیں۔"

"اسی لیے فضل بھائی مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ میں نے تو سنا تھا کہ فرہاد نے شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکال دی تھی۔ تو کیا میں اس کو پانے کے لیے ایک لاکھ روپے بھی نہیں حاصل کرسکتا۔ نہیں فضل بھائی، چاہے کچھ ہو جائے، مجھے کہیں نہ کہیں سے ان کا انتظام ضرور کرنا ہوگا۔"

فضل خاموش ہو کر رہ گیا۔ وہ بے چارہ خود ایک معمولی ہوٹل کا معمولی سا بیرا تھا۔ وہ دلدار کو کیا بتا سکتا تھا۔ ایک دن دلدار نے ہوٹل سے چھٹی لی اور کسی اور کام کی تلاش میں چل پڑا۔ ایک جگہ اسے ایک آدمی مل گیا جو دلدار کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دلدار اس وقت ایک درخت کے پاس کھڑا تھا۔ وہ آدمی بھی اس کے پاس آگیا "جوان!"

اس نے دلدار کو مخاطب کیا "ماشاء اللہ تگڑے نوجوان ہو۔ اگر چاہو تو کسی کے کام بھی آسکتے ہو۔ ثواب کا ثواب ہے، اور پیسے الگ ملیں گے۔"

دلدار کو عذاب اور ثواب سے تو زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن پیسوں کے ذکر نے اسے چونکا دیا تھا "ہاں بتاؤ، کیا کام ہے۔ کس بات کے پیسے ملیں گے؟"

"ایک مریض کے لیے ایک بوتل خون کی ضرورت ہے" اس نے بتایا "تین سو روپے بھی مل جائیں گے۔"

دلدار فوراً تیار ہوگیا۔ ایک بوتل خون لے کر اس شخص نے سو سو کے تین نوٹ دلدار کی طرف بڑھادیے تھے۔ "نوجوان۔ یہاں روزانہ خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پیسوں کی ضرورت ہو آجانا۔ میرا نام جبار ہے، جبار ٹھیکے دار۔"

دلدار کو کمائی کا ایک راستہ مل گیا تھا۔ پہلے دن خون دینے کے بعد اسے اپنے جسم میں کوئی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ دوسرے دن بھی پہنچ گیا۔ تیسرے دن کے بعد ہوٹل میں کام کرتے کرتے اسے چکر سا آگیا تھا۔ رات کو جب اس نے فضل کو اپنے کام کے بارے میں بتایا تو وہ اس پر برس پڑا "تمہارا کیا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ایک مہینے کے بعد تم بستر سے بھی اٹھنے کے قابل نہیں رہو گے۔ تمہارا خون پانی ہوجائے گا۔ تم کسی کام کے نہیں رہو گے۔ یہ ٹھیکے دار تمہیں نچوڑ کر رکھ دے گا۔"

"لیکن وہ مجھے روزانہ کے تین سو روپے بھی تو دے رہا ہے۔"

"بے وقوف اس سے کیا ہوگا۔ کیا تین سو روپے روز پیدا کرکے تم چھ مہینوں میں ایک لاکھ روپے جمع کرلو گے؟ کبھی نہیں، ذرا حساب تو لگاؤ۔"

دلدار نے حساب لگایا تو واقعی یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ وہ کبھی اتنے پیسے حاصل نہیں کرسکتا تھا اور اس کے بدن کا سارا خون بھی چوس لیا جاتا۔ تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے تابی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ زیبو ہر رات اس کے خوابوں میں آیا کرتی تھی۔ ایک رات اس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ زیبو اپنی چھت پر چت لیٹی ہوئی ہے کہ اچانک ایک پرندہ کہیں سے نمودار ہوتا ہے اور وہ زیبو کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر پرواز کرجاتا ہے۔ وہ پرندہ زیبو کو ایک اونچی عمارت کی چھت پر لے جاکر پھینک دیتا ہے۔

اس خواب نے دلدار کو دو چار دنوں تک بہت پریشان رکھا تھا۔

○☆○

اور زیبو کو واقعی... ایک پرندہ اٹھا کرلے گیا تھا۔

اس پرندے کا نام گل داد تھا۔ دوسرے بڑے گاؤں کا ایک دولت مند آدمی۔ جو چالیس پینتالیس برس کا بھی تھا اور جس کو مرگی کے دورے بھی پڑا کرتے تھے لیکن اس کی فطرت میں ایسی ہوس تھی کہ دو بیویوں کی موت کے بعد اب تیسری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اور تیسری بیوی کے لیے اسے زیبو پسند آگئی تھی۔ وہ کسی تکلف اور جھجک کے بغیر زیبو کے والدین کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے زیبو کے باپ سے براہ راست بات کی تھی "بات یہ ہے میں آپ کی بیٹی کو اپنے گھر میں بسانا چاہتا ہوں۔۔۔" اس نے کہا۔

"تم میری بیٹی کو کیا جانو؟" زیبو کے باپ نے غصے میں پوچھا۔

"میں نہیں جانتا لیکن میں نے اس کو گاؤں کے بازار میں دیکھا ہے" گل داد نے بتایا "تم کو تو معلوم ہے کہ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اتنا بڑا مکان ہے میرا۔ زمینیں ہیں، دکانیں ہیں۔ تمہاری بیٹی میرے پاس آکر راج کرے گی۔ ساری زندگی اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"لیکن تم اپنی عمر بھی تو دیکھو۔"

"کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ مرد کی عمر کہاں دیکھی جاتی ہے" گل داد نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا "اس کی حیثیت دیکھی جاتی ہے اور مولا کی مہربانی سے بہت اچھی حیثیت ہے میری۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔"

"دیکھو گل داد۔ میں نے ایک لاکھ روپے کے لیے کسی کو زبان دے رکھی ہے" زیبو کے باپ نے بتایا۔

"میں یہ کہانی سن چکا ہوں اور میں یہ بتادوں کہ وہ چھوکرا زندگی بھر ایک لاکھ نہیں لاسکتا اور تم ایک لاکھ کی بات کرتے ہو، میں زیبو کے لیے تین لاکھ دینے کو تیار ہوں۔"

تین لاکھ کا سن کر زیبو کے باپ کی آنکھیں لالچ سے وا ہوگئی تھیں۔ اس کے خیال میں یہ کوئی ایسی بری بات بھی نہیں تھی۔ اس کے پاس ایک سودا تھا اور جب اس سودے کی اچھی قیمت مل رہی تھی تو وہ اچھی قیمت دینے والے خریدار کو کیوں نہ سودا دیتا اور دلدار کا تو کوئی بھروسا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک لاکھ روپے بھی نہیں لاسکتا تھا۔

زیبو کے باپ نے یہ بھاری پیشکش قبول کرلی۔

زیبو چیختی چلاتی رہ گئی۔ اس نے رو رو کر اپنا حال برا کرلیا۔ وہ دلدار سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی

لیکن باپ کی مرضی کے آگے اس کی ایک بھی نہیں چلی۔ گل داد سے اس کی شادی کردی گئی تھی۔

شادی کے بعد وہ رخصت ہوکر گل داد کے گاؤں، اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ ایک دو منزلہ اونچا مکان تھا۔ نچلی منزل پر گل داد نے مردان خانہ بنا رکھا تھا جبکہ اوپری منزل زنان خانے کے طور پر کام آتی تھی۔

دلدار کا یہ خواب سچ ہوگیا تھا کہ زیبو کو ایک پرندہ اپنے پنجوں میں اٹھا کرلے جاتا ہے اور ایک چھت پر پٹخ دیتا ہے۔

زیبو کے لیے ہر لمحہ کرب اور سوگ کا تھا۔ گل داد نے اس کے جسم سے شادی کی تھی جبکہ اس کی روح اور اس کی محبت دلدار ہی کے لیے تھی۔ اس نے اپنے دل میں جو جگہ بنا رکھی تھی وہاں سوائے دلدار کے کسی اور کا گزر نہیں ہوسکتا تھا۔

گل داد میں اور بھی کئی برائیاں تھیں۔ اس نے شادی کی پہلی ہی رات زیبو سے کہا تھا "دیکھو زیبو، میں بڑا حسن پرست آدمی ہوں۔ میں نے تجھے بھی اسی لیے پسند کیا تھا کہ تو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میری پہلی دونوں بیویاں بھی بہت خوب صورت تھیں۔ اس لئے میں تجھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تو میرے پاس کسی اور لڑکی کو دیکھ لے تو اس پر ہنگامہ کرنے یا رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میری فطرت ہی ایسی ہے۔ میری بات سمجھ گئی ہے نا؟"

بے بس زیبو نے آہستہ سے اپنی گردن ہلادی تھی۔

"ایک بات اور سن لے" اس نے کہا "میں اب کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ بس تجھ سے شادی ہوگئی سو ہوگئی اور ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ تو اپنے گاؤں میں کسی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود میں نے تجھ سے شادی کی ہے۔ صرف تیری بھولی صورت کے لیے۔ اب اگر تو نے مجھ سے بے وفائی کی کوشش کی تو تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔ جان سے ماردوں گا تجھے۔"

زیبو کے لیے سوائے خاموش رہنے اور چپکے چپکے آنسو بہانے کے..... اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک دن وہ اپنے اللہ میاں کو مخاطب کرکے بہت دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی تھی "آخر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ والدین نے مجھے پیدا کیا ہے۔ میں ان کی تخلیق ہوں، لیکن کیا اپنی اولاد سے ایسی بے رحمی جائز ہے۔ کیا یہ کوئی اچھی بات ہے؟ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آپ پیار کا درد تو کسی اور کے لیے دیتے ہیں اور حوالے کسی اور کے کردیتے ہیں۔ تقدیر کا مالک اس کو بنادیتے ہیں جو اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ اس سے بات بھی کی جائے۔ اس کی طرف دیکھا بھی جائے۔ کیا اس دنیا میں دولت ہی سب کچھ ہے۔ محبت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کاش، آپ مجھے ان سوالوں کے جواب دے سکتے۔"

گل داد مرگی کا مریض تھا۔ راستہ چلتے ہوئے کبھی کبھی اس پر دورہ پڑجاتا تو لوگ ہی اسے اٹھا کر لایا کرتے تھے اور اس وقت نہ چاہتے ہوئے بھی زیبو اس کی خدمت کیا کرتی کیونکہ اب وہ اس کا شوہر تھا۔ جیسا بھی سہی، شوہر تو تھا۔

گل داد کا رویہ عام طور پر اس کے ساتھ سخت ہی رہا کرتا تھا۔ زیبو اس کے خوف سے سہمی سہمی رہا کرتی لیکن ایک دن وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ اس نے زیبو سے کہا "چل زیبو، برابر والے گاؤں میں ایک میلہ لگا ہے، تجھے میلہ دکھا لاؤں۔"

میلہ؟ زیبو کو بہت کچھ یاد آگیا۔ وہ میلہ جہاں وہ گھومنے کے لیے گئی تھی۔ جس میں اسے دلدار مل گیا تھا پھر وہ نجومی جس نے کہا تھا کہ وہ دونوں قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ کاش اس نجومی سے دوبارہ ملاقات ہو تو اس سے یہ پوچھا تو جائے کہ تمہاری وہ قیامت والی پیش گوئی کیا ہوئی۔ وہ گل داد سے انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس نجومی کے پاس جاکر اپنے دل کی بھڑاس بھی نکالنا چاہتی تھی، اسی لیے وہ تیار ہوگئی۔

میلہ اسی طرح لگا ہوا تھا۔ وہی گہما گہمی، وہی چہل پہل۔ یہ میلے تو اسی طرح جاری رہتے ہیں۔ یہ خیال کیے بغیر کہ اس دوران میں کتنے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے ہیں۔ کتنوں کو موت آگئی ہے اور کتنوں کو وقت اور حالات کا پرندہ جھپٹ کرلے گیا ہے۔

گل داد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی نگاہیں اس نجومی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ بالآخر اسے نجومی کا خیمہ دکھائی دے ہی گیا۔ یہ وہی نجومی تھا جس کے پاس وہ دلدار کے ساتھ آچکی تھی۔ گل داد کسی دکان میں رکھی ہوئی چیزیں دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ گل داد کی نظر بچا کر ایک طرف کھسک گئی۔ وہ بہت تیزی سے نجومی کے خیمے کی طرف جارہی تھی۔ یہ وہی نجومی تھا۔ وہی بابا جس نے قیامت تک ساتھ رہنے کی بات کی تھی۔ زیبو اس کے سامنے جاتے ہی اس پر برس پڑی "مبارک ہو۔ تم نے کیا زبردست پیش گوئی کی تھی۔ یہی کہا تھا نا کہ ہم دونوں ساتھ رہیں گے لیکن کہاں ہیں ہم دونوں ساتھ۔ تم نے تو کہا تھا کہ محبت ہم دونوں کے حال پر بہت مہربان ہے لیکن یہ کیسی مہربانی ہے کہ میری شادی زبردستی کسی

اور سے کردی گئی ہے۔ اب تو تم یہ بھی کہو گے کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"نہیں بیٹا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے" نجومی نے کہا "اور مجھے اپنی کہی ہوئی بات بھی یاد ہے اور میں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں نے غلط نہیں کہا ہے۔ تم دونوں کا ساتھ قیامت تک کے لیے لکھا جاچکا ہے۔ تم دونوں قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہو گے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ علم جھوٹا ہے تمہارا۔ کیا اسی کو ساتھ کہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے۔"

زیبو اسی طرح بولتی ہوئی اس خیمے سے باہر آگئی۔ بوڑھا نجومی اس کی طرف افسوس بھری نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔

○☆○

دلدار نے اب ایک دوسرا کام شروع کردیا تھا۔

یہ بہت عجیب کام تھا لیکن اس میں خوب پیسے مل رہے تھے۔ اس کام کو حاصل کرنے کے سلسلے میں فضل نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اس نے دلدار سے کہا تھا "یار دلدار تیرے لیے پیسے کمانے کا ایک چانس نکل آیا ہے۔ بہت زوردار کام ہے۔ تو چھ مہینوں میں ایک لاکھ روپے جمع کرلے گا۔"

"جلدی بتاؤ فضل بھائی، میں تو سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"تجھے کھیپیا بننا ہوگا" فضل نے بتایا۔

"یہ کیا ہوتا ہے؟" دلدار نے پوچھا۔

"تجھے کچھ سامان لے کر ہانگ کانگ جانا ہوگا پھر وہاں سے کچھ مال لے کر پاکستان آنا ہوگا۔ فی پھیرا دس ہزار روپے مل جائیں گے، آنے جانے کا کرایہ الگ۔"

"فضل بھائی، یہ تو اسمگلنگ جیسی چیز ہوگئی۔"

"ہاں لیکن اسمگلنگ نہیں ہے" فضل نے بتایا "اس میں بہت کم سامان لایا جاتا ہے اور باقاعدہ لاتے ہیں۔ کسی ہیرا پھیری کے بغیر۔ وہ تو مجھے کہہ رہے تھے لیکن میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں یار پھر تیری صورت شکل بھی اچھی ہے۔ بالکل بابو معلوم ہوتا ہے۔ تو بہت آسانی سے یہ کام کرسکتا ہے۔ خود سوچ فی پھیرا دس ہزار روپے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ دس پھیروں میں ایک لاکھ روپے مل جائیں گے۔"

"ہاں اور کیا۔"

"بس تو بھائی۔ جہاں تم نے اتنی مہربانیاں کی ہیں، وہاں ایک اور سہی۔ ان لوگوں سے میری بات کروادو، میں تیار ہوں۔"

فضل نے دلدار کی ملاقات ان لوگوں سے کروادی تھی جو لوگوں کو ہانگ کانگ اور سنگاپور وغیرہ بھیجا کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں نے دلدار کے لیے پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست بھی کردیا تھا اور ایک ہفتے کے اندر ہی دلدار کو ہانگ کانگ کی فلائٹ دلوادی گئی تھی۔

شروع شروع میں تو اسے بہت وحشت ہوتی رہی تھی۔ بہت ہی خوف آتا رہا۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ اگر اسے پکڑلیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔ وہ تو کہیں کا نہیں رہے گا۔ زیبو کو حاصل کرنے کی خواہش تو اس کے دل ہی میں رہ جائے گی لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ملنے والی محبت کے تصور نے اس کے اوسان بحال رکھے تھے۔ اس کا حوصلہ قائم رکھا تھا۔ وہ ہانگ کانگ سے کامیابی کے ساتھ واپس آگیا تھا اور آتے ہی اس کو دس ہزار روپے بھی دے دیے گئے تھے۔ اس نے زیبو کے حصول کی طرف پہلا قدم بڑھادیا تھا۔

دوسری ٹرپ میں اسے سنگاپور بھیج دیا گیا تھا۔ دس ہزار اس کے بھی مل گئے۔ بیس ہزار۔ جو وہ کبھی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ پندرہ دنوں کے بعد پھر دس ہزار۔ اس کی منزل بہت تیزی سے اس کے قریب آتی جارہی تھی۔ قسمت بھی پوری طاقت سے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ پوری توانائی کے ساتھ۔

اس نے دل کش خواب دیکھنے شروع کردیے۔ جب وہ اپنے گاؤں پہنچے گا اور اس کے پاس ڈھیرے روپے ہوں گے۔ تو اس وقت زیبو کے باپ کا کیا حال ہوگا اور خود زیبو کتنا خوش ہوگی۔ زیبو کو تو ایک نئی زندگی مل جائے گی۔ وہ بے چاری اس کے لیے سوچ سوچ کر پریشان ہوتی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی ہو کہ کہیں اس کا محبوب شہر جاکر اسے بھول ہی نہ گیا ہو لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا محبوب تو رات دن اس کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔

○☆○

دلدار سب سے پہلے اپنے گھر پہنچا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا جس میں ایک لاکھ روپے بھرے ہوئے تھے۔ گھر کے دروازے پر اس نے اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا جس کی آنکھیں دلدار کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ "یہ تو ہے دلدار!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں ابا۔ یہ میں ہوں" اس نے کہا "میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے گیا تھا اور مقصد حاصل کرکے واپس آیا ہوں۔ آپ نے یہ کوئی اچھی بات نہیں کی تھی۔ اس طرح آپ کو چھوڑ کر مجھے نہیں جانا چاہیے تھا لیکن میں کیا کرتا، زیبو کے باپ نے شرط ہی ایسی لگادی تھی اور اب دیکھیں کہ میں پانچ مہینوں میں واپس آگیا ہوں۔ ابھی ایک مہینہ باقی ہے۔"

"نہیں بیٹے" اس کے والد نے دکھ سے کہا "تیرے آنے میں دیر ہوگئی۔"

"کس بات کی دیر بابا؟" اس نے کہا "ابھی تو ایک مہینہ باقی ہے۔"

"نہیں بیٹا۔ زیبو کے باپ نے زیبو کی شادی کردی ہے۔"

دلدار چکرا کر رہ گیا۔ ایک آن ایک پل میں اس کی دنیا تاریک ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ کچھ بھی نہیں رہا تھا اس کے پاس۔ اس کی ساری محبت، ساری کمائی بے کار گئی تھی۔

اچانک اس کے پورے وجود میں ایک آگ سی دہک اٹھی تھی۔ اس نے اپنا گریبان پھاڑ لیا۔ وہ آگ بھڑکتی ہوئی ساری کی ساری، اس کے وجود سے نکل کر اس بریف کیس میں سرایت کرگئی تھی جس میں ایک لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ان نوٹوں کو آگ کی گرفت سے بچانے کے لیے بریف کیس کھول کر نوٹوں کو ہوا میں بکھیرنا شروع کردیا۔ وہ اس نجومی کو برا بھلا کہہ رہا تھا جس نے قیامت تک اس کے اور زیبو کے ساتھ رہنے کی پیش گوئی کی تھی۔ سب جھوٹ تھا۔ سب بکواس تھا۔ کوئی بھی اس کی زیبو کو کسی اور کا ہونے سے نہیں روک سکا تھا۔ سب اس کے دشمن ہوگئے تھے۔ سب نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ بے وفائی کی تھی۔ سب نے مل کر اسے دھوکا دیا تھا۔ اس نے نوٹ بکھیرنے کے بعد پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے شروع کردیے۔ اپنے باپ کو، محلے والوں کو۔ سب لوگ اسے پاگل کہہ رہے تھے اور محبت کرنے والا دلدار واقعی پاگل ہوچکا تھا۔

○☆○

پھٹے ہوئے کپڑے، الجھے ہوئے بال۔ داڑھی، جاگتی ہوئی سرخ آنکھیں، جسم پر چوٹوں کے نشانات۔ آتے جاتے بچے اسے پتھر مارتے اور وہ انہیں برا بھلا کہتا۔ ان کے پیچھے دوڑتا تا پھر خود تھک ہار کر رونے لگتا تھا۔ وہ کسی کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی۔ وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ جس کو تلاش کررہا ہے۔ اس کا نام کیا ہے، وہ صرف محبت کہا کرتا تھا۔

"میں محبت کو تلاش کررہا ہوں۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ پہلے تو میرے پاس تھی۔ میرے، بہت قریب۔ میں اس کو دیکھا کرتا تھا۔ اس سے باتیں کرتا پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ ہاں، ایک پرندہ، بہت بڑا۔ اپنے پر پھیلائے ہوئے، وہ اسے اڑا کر لے گیا۔"

لوگ اس سے دریافت کرتے "کون لے گیا تیری محبت کو۔"

"ایک پرندہ تھا۔ اس سے ڈرو، وہ تم سب کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا" پھر وہ کسی خیالی پرندے کو پتھر مارنا شروع کردیتا تھا۔

اس کے گھر والوں نے اسے بس یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ اب اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہوسکتی۔ وہ اس طرح ادھر سے ادھر مارا مارا پھرے گا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت برا اور بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔

ایک دن وہ محبت کا مارا اپنے گاؤں سے چلتا ہوا ایک دوسرے بڑے گاؤں میں پہنچ گیا۔ اس گاؤں کی ایک سڑک پر بہت سے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک مرگی زدہ آدمی کو ایک گاڑی کچلتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔ وہ آدمی گل داد تھا۔ زیبو کا شوہر۔ اس کی موت میں گاڑی والے کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر کی طرف جارہا تھا کہ اچانک اسے مرگی کا دورہ پڑا اور وہ لہرا کر سڑک پر گر پڑا۔

اس کی بدقسمتی کہ ٹھیک اسی وقت ایک تیز رفتار گاڑی اس کے پیچھے آرہی تھی۔ گاڑی والے نے بریک لگانے کی بہت کوشش کی لیکن گاڑی کو کنٹرول نہیں کرسکا۔ گاڑی اسے کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

لاش کو دیکھ کر دلدار کو نہ جانے کیا ہوا۔ جیسے اسے ہوش آگیا تھا۔ اردگرد پھیلے ہوئے خون نے اس کے ذہن پر نہ جانے کیسا اثر کیا کہ اس نے لوگوں کی طرف دیکھ کر چیخنا شروع کردیا "کیا ہوگیا ہے تم لوگوں کو! تم لوگ مجھے پاگل کہتے ہو لیکن تم لوگ خود سب سے بڑے پاگل ہو۔ تمہارے سامنے ایک انسان کی کچلی ہوئی لاش پڑی ہے اور تم لوگ صرف تماشا دیکھ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، کہاں ہے اس کا گھر۔"

اس نے آگے بڑھ کر گل داد کی لاش بازوؤں پر اٹھالی۔ لوگ بہت حیرت سے اس ہوش مند دیوانے کو دیکھ رہے تھے "بتاؤ، کہاں ہے اس کا گھر" اس نے کسی باہوش انسان کی طرح دریافت کیا۔

کسی نے گل داد کے گھر کی نشاندہی کردی تھی۔ اس نے

لاش دو منزلہ مکان کے پاس رکھ دی اور اچانک اسے ایک چہرہ دکھائی دے گیا۔ وہ چہرہ زیبو کا تھا جو اس کی محبت تھی۔ زیبو اوپر کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ دلدار کے لیے اس کی ایک جھلک ہی کافی تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا تھا۔ اس کا ذہن اس عظیم اتفاق کو برداشت نہیں کرپایا۔ اس پر پھر دیوانگی مسلط ہوگئی تھی۔ اس نے "زیبو زیبو" پکارنا شروع کردیا۔

لوگوں اور بچوں نے اسے پتھر مارنے شروع کردیے لیکن اس دیوانے کو اتنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ اپنے بچاؤ کی فکر کرسکتا۔ اس کے ساتھ تو اس کی زیبو تھی۔ اس کی دنیا تھی، اس کی زندگی تھی۔

گل داد کی لاش کو دفن کردیا گیا۔ زیبو اسی مکان میں عدت کے لیے بیٹھ گئی تھی اور وہ دیوانہ اسی گھر کے اردگرد چکر لگاتا رہتا۔ بچے اسے پتھر مارتے، لیکن نہ جانے کیوں وہ ان بچوں کو جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ بچے اس کی زیبو کی گلی کے تھے اور اس گلی سے ملنے والا ہر زخم اسے جان سے بھی زیادہ پیارا تھا۔

وہ کبھی کبھی اس مقام سے غائب بھی ہوجاتا۔ نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہتا تھا۔

اس گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے گاؤں میں ایک بار پھر وہی میلہ لگا۔ وہی میلہ جو وہاں ہر سال لگا کرتا تھا اور دور دور کے گاؤں کے لوگ اس میلے میں شرکت کے لیے آیا کرتے تھے اور اس میلے میں ایک نجومی اپنا خیمہ لگایا کرتا تھا۔ وہ لوگوں کو آئندہ آنے والے دنوں کے بارے میں بتایا کرتا۔

اس سال بھی وہ میلہ اپنی روایتی دھوم دھام سے لگا تھا۔ اس میلے میں وہ نجومی بھی موجود تھا جو اس میلے میں ادھر سے ادھر گھومتے ہوئے ایک پاگل کو دیکھ کر اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا پھر اس نے اس پاگل کو پہچان ہی لیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے لیے وہ اپنی محبت کے ساتھ قیامت تک رہنے کی پیش گوئی کرچکا تھا۔ اتفاق سے اس وقت اس نجومی کے پاس اس کے قبیلے کا ایک اور فرد بھی کھڑا ہوا تھا۔

"اس پاگل کو دیکھ رہا ہے بالے" نجومی نے دلدار کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ دیکھ رہا ہوں، کیا خاص بات ہے اس میں؟"

"خاص بات یہ ہے کہ یہ اب سے چند سال پہلے میرے پاس آیا تھا" نجومی نے بتایا "اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں اپنی ریکھائیں معلوم کرنے آئے تھے لیکن ان کے ہاتھ بتارہے تھے کہ دونوں کا ساتھ لکھا ہوا ہے۔ دونوں قیامت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تم اس کی حالت دیکھ رہے ہو، یہ پاگل ہوگیا ہے۔ وہ لڑکی ایک بار میرے پاس آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے اس سے جھوٹ کیوں بولا۔ کیونکہ اس کی تو کسی دولت مند آدمی سے شادی ہوگئی ہے۔ اس کا محبوب اسے نہیں مل سکا ہے۔ خود میں بھی حیران ہوں کہ میرے حساب کتاب میں گڑبڑ کیوں ہوگئی۔ مجھے ایک بار پھر حساب کتاب لگانا ہوگا۔ میرا علم مجھے دھوکا کیوں دے گیا؟"

دلدار اس میلے کے بعد پھر زیبو کے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ ہوش تھا کہ وہ جہاں کے چکر لگاتا پھر رہا ہے۔ وہ گاؤں اس کی زیبو کا ہے۔ اسے کسی اور بات کا ہوش ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ہوش ضرور تھا۔

وہ دیوانہ ایک نعرۂ مستانہ کے بعد زیبو کے مکان کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ گیا تھا اور اسی وقت نہ جانے کس طرف سے پھینکے ہوئے ایک پتھر نے اس کی کہانی ختم کردی تھی۔ وہ پتھر اس کے سر میں اس انداز سے لگا کہ جانبر نہیں ہوسکا۔ اس نے موقع پر ہی دم توڑ دیا تھا۔

زیبو نے شوہر کے بعد اپنے مکان کے نیچے اپنے محبوب کی بھی لاش دیکھ لی۔ یہ موت اس سے برداشت نہیں ہوسکی۔ اس نے دلدار کہتے ہوئے اوپر سے چھلانگ لگادی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہاں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ دلدار کی اور زیبو کی۔

ان دونوں کی تدفین بہت دھوم دھام سے کی گئی تھی۔ ان کی قبریں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو تھیں اور اس نجومی کی بات درست ہوگئی تھی۔ دونوں قیامت تک کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ہوگئے تھے۔

آج بھی ان دونوں کی قبریں محبت کرنے والوں کے لیے زیارت گاہ بنی ہوئی ہیں۔ نہ جانے کتنے لوگ آکر پھول چڑھاتے ہیں۔ کتنے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ گل داد اور زیبو کے باپ کی قبر پر کوئی نہ جاتا ہو لیکن ان دونوں کی قبریں آباد رہتی ہیں۔ محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

دشمن دوست

محترم معراج صاحب! السلام علیکم

اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ تحریر کررہا ہوں۔ ممکن ہے آپ اسے کہانی نہ سمجھیں لیکن یہ ایک سچ بیانی ضرور ہے اور اس میں ایک بڑا سبق آموز پہلو بھی موجود ہے جس کو سمجھ لیا جائے تو معاشرے میں موجود فتنہ و فساد ختم کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اب یہ جو بھی ہے آپ کی خدمت میں مرسل ہے۔ باقی جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

خیر اندیش

عمر ایاز۔ اسلام آباد

موجودہ دور کی تیز رفتاری اور بے تحاشا دباؤ نے تفریح کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ خاص طور سے مجھ جیسے شخص کے لیے۔ جس کی طاہرہ جیسی بیوی، عثمان، فاروق اور میرا جیسے بچے اور آئی جی فاروقی جیسا باس ہو۔ میرا نام عمر ایاز ہے اور عمر عزیز کے پچاسویں سال میں، میں اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر پہنچنے میں کامیاب ہوا جہاں میں گزشتہ پچیس سال سے ملازمت کررہا تھا۔ کمرشل آرٹ میں آنرز کرنے کے بعد مجھے یہیں ڈھنگ کی نوکری ملی تھی۔ تنخواہ اور مراعات اچھی ہونے کی بنا پر میں فاروقی صاحب کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس عمر میں ایسی ملازمت دوبارہ ملنا دشوار تھی۔

میرا اسلام آباد میں اپنا مکان تھا۔ جو اس دور میں بہت بڑی نعمت ہے۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ ایک تین سالہ پرانی ڈاج کار تھی اور خوش قسمتی سے ابھی تک اچھی حالت میں تھی۔ بس اس کا پیٹرول کا خرچ روز بہ روز ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے بیچ کر کوئی سوزوکی لے لوں مگر بچے اس کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک یہ اسٹیٹس کی علامت تھی کہ ہم امریکی کار استعمال کررہے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

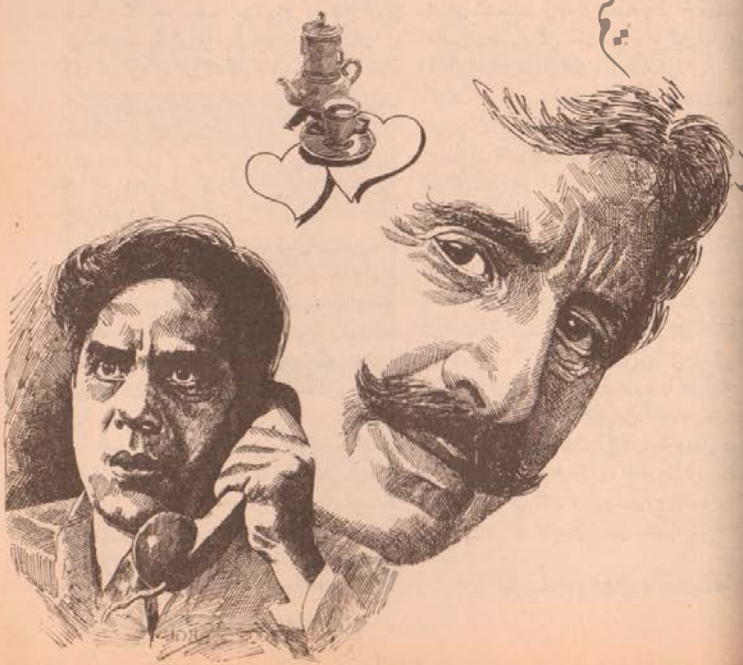

ہیں۔ بیوی کا ووٹ بھی ان کے حق میں تھا اور میں کیوں کہ جمہوریت کا قائل ہوں اس لیے گھر کے سربراہ کے صوابدیدی اختیارات سے ذرا گریز ہی کرتا ہوں۔ ایک دفعہ میں نے خاصی تگ و دو کے بعد عثمان کو اپنے حق میں کرلیا تھا کہ کار بیچنے اور دوسری کار لینے کے بعد جو رقم بچے گی۔ اس سے میں اسے موٹر سائیکل دلا دوں گا مگر بدقسمتی سے ان ہی دنوں اس کا ماموں یعنی طاہرہ کا بھائی دبئی سے اس کے لیے ایک ری کنڈیشنڈ بائیک لے آیا۔ میں دل ہی دل میں اسے صلواتیں سنائے بغیر نہ رہ سکا۔

طاہرہ بہت اچھی بیوی تھی۔ میرا بے حد خیال رکھتی۔ مجھے چپلوں سے لے کر کھانا تک بالکل درست وقت پر اور درست مقام پر ملتا تھا۔ وہ خوب صورت بھی تھی۔ پینتالیس سال کی عمر میں اور تین جوان بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی وہ جوان اور تازہ دم نظر آتی تھی اور جب وہ ذرا ڈھنگ کا میک اپ کرلیتی تو مجھے جوانی کے دن یاد آجاتے تھے۔ بس اس میں ایک ہی خرابی تھی۔ وہ بولتی بہت تھی۔ اس کی زبان اور قوتِ گفتار کو موضوع کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ دو منٹ کی بات کو دو گھنٹے تک کرنے کے فن میں ماہر تھی۔ جوانی اور نئی شادی کے نشے میں تو اس کی نان اسٹاپ چلتی زبان اتنی بُری نہیں لگتی تھی لیکن جیسے جیسے جوانی کے جذبات ٹھنڈے پڑگئے اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر وقت کی بک بک مجھے بُری لگنے لگی۔ میں نے ہر کوشش کرلی کہ اس کی زبان بند رکھوں یا کم سے کم اس کی رفتار ہی کم کرلوں لیکن مجھے قطعی ناکامی ہوئی۔ تنگ آکر میں نے اس سے کہہ دیا "جان، تم ذرا کم نہیں بول سکتیں۔"

وہ شروع ہوگئی "لو۔ میں زیادہ بولتی ہی کہاں ہوں۔ اتنا کم بولتی ہوں۔ کالج کے زمانے میں سہیلیاں مجھے گونگی کہا کرتی تھیں اور گھر والے تو میرے کم بولنے سے پریشان رہتے تھے۔ نہ جانے تمہیں کیوں لگتا ہے کہ میں اتنا بولتی ہوں۔ حالانکہ کل ہی مسز رضوی کہہ رہی تھیں کہ مجھ سے زیادہ سوچ سمجھ کر بولنے والی عورت پورے علاقے میں نہیں ملے گی اور....."

تنگ آکر میں خود واک آؤٹ کرگیا۔ اب تو بچے بھی مذاق اڑانے لگے تھے کہ اگر ایک طرف ممی بول رہی ہوں اور دوسری طرف خوں خوار شیر ہو تو ڈیڈی شیر کی طرف جانا پسند کریں گے۔ ویسے طاہرہ کبھی کبھار خاموش بھی ہوجایا کرتی تھی۔ خاص طور سے جب ٹی وی پر اس کا کوئی پسندیدہ پروگرام آرہا ہو اور بدقسمتی سے ان میں کوئی پروگرام میرا پسندیدہ نہیں تھا۔ یوں سکون کے یہ چند لمحے ضائع ہی جاتے تھے۔ بچے یوں تو خاصے اچھے اور فرماں بردار قسم کے تھے لیکن خاصے مہنگے پڑتے تھے۔ مثال کے طور پر ابھی ہمیں نئے مکان میں شفٹ ہوئے تیسرا ہی دن تھا کہ عثمان نے کار مین گیٹ سے ٹکرا دی۔ کار کا انجن تو تباہ ہوا ہی تھا۔ ساتھ ہی گیٹ بھی ٹوٹ کر نیچے آگرا تھا۔ دونوں کی مرمت پر میری دو مہینے کی تنخواہ خرچ ہوگئی تھی۔ فاروق صاحب کو کیمسٹری کے تجربات کا شوق تھا۔ ایک روز انہوں نے ڈرائنگ روم میں نہ جانے کس قسم کا تجربہ کیا کہ نیا صوفہ سیٹ جل کر راکھ ہوگیا۔ قالین اور پردوں کا الگ ستیاناس ہوا۔

میرا خیال ہے کہ میری بدقسمتی کا آغاز اسی دن ہوا جب میرا بنایا ہوا ایک اشتہار ٹی وی پر ہٹ ہوگیا اور گاہکوں نے چاروں طرف سے ایجنسی پر یلغار کردی۔ ظاہر ہے شامت میری ہی آئی تھی۔ اگلے چھ مہینے تک میں پاگلوں کی طرح مصروف رہا۔ نہ مجھے کھانے کا ہوش تھا اور نہ سونے کا۔ میں منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا تو رات گئے تک میری واپسی ہوتی۔ اس پر طاہرہ بانو کا منہ سوج گیا اور بچے الگ ناراض ناراض لگنے لگے۔ کئی بار میں نے سوچا کہ آئی جی فاروقی کو صاف کہہ دوں کہ میں انسان ہوں گھوڑا نہیں لہٰذا مجھ سے کام بھی انسانوں ہی کی طرح لیا جائے مگر میں ایسا نہ کرسکا۔ جن لوگوں نے آئی جی فاروقی کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں اس کی ہمت کیوں نہ کرسکا۔ صرف ایک فائدہ تھا کہ میرے بینک بیلنس میں خاصے عرصے بعد ترقی کے آثار نظر آئے ورنہ اس کی حالت بھی ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار سے زیادہ مختلف نہیں تھی اور اس بات کے امکانات روشن نظر آنے لگے کہ میں اپنی ذاتی [illegible] چھٹکارا حاصل کرسکوں گا۔

اس روز آئی جی فاروقی نے مجھے اپنے سجے سجائے دفتر میں طلب کیا۔ ویسے تو دفتر میرا بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن اس کی بات ہی اور تھی۔ اس نے آبنوس کی وسیع میز رکھی تھی، دیوار میں اٹلی کا ائرکنڈیشنر لگا تھا اور جا بجا آرائشی کام ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے پھر کوئی اشتہار میرے سر [illegible] کے لیے مجھے بلایا ہے۔ خلافِ توقع اس نے ہمدردی سے مجھے دیکھا۔ ویسے بھی میرا حلیہ قابلِ رحم تھا۔ مسلسل جاگنے سے آنکھیں سوج گئی تھیں اور نزلے کی وجہ سے ناک سرخ ہورہی تھی۔ مزید خلافِ توقع اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے تم پر کام کا بوجھ کچھ زیادہ ہی ہوگیا ہے۔"

"خبیث، صرف بوجھ زیادہ ہوگیا ہے۔" میں نے دل میں کہا اور میں منہ سے بولا "ایسا تو ہوتا ہے سر۔"

"نہیں یہ واقعی زیادتی ہے۔ تم نے گزشتہ چھ مہینے سے ایک بھی چھٹی نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک مہینے کی چھٹی اور اسپیشل تفریحی بونس کے حق دار ہو۔ میرا خیال ہے۔ تم ایک مہینے کے لیے شمالی علاقے میں ہو آؤ۔"

چند لمحات کو مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوا پھر یہ شبہ ہوا کہ میں جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا باس معجزانہ طور پر مجھ پر مہربان ہوگیا تھا۔ میں نے تھوک نگل کر کہا "میں آپ کا شکر گزار ہوں سر، لیکن ان دنوں چھٹی کرنا کچھ....."

میرے اعتراض پر وہ دوبارہ اپنی جون میں آگیا اور دہاڑ کر بولا "باس میں ہوں لہٰذا فیصلہ بھی میں کروں گا۔ کل سے تم ایک مہینے کی چھٹی پر جارہے ہو۔ کام کی تم فکر نہ کرو۔ وہ جمال سنبھال لے گا اور ہاں تم دفتر میں کسی کو اس بارے میں نہیں بتاؤ گے۔ یہ چھٹیاں اور بونس تمہیں خفیہ طور پر دیا جارہا ہے۔" اس نے دراز سے ایک لفافہ نکالا جس میں بیس ہزار کے کڑکڑاتے نوٹ تھے۔ میں حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ آئی جی فاروقی کسی کو ایک روپیہ بھی بغیر پلٹنی کے دینے کا روادار نہیں تھا اور مجھے خفیہ طور پر ایک مہینے کی چھٹی مع ایک ماہ کی تنخواہ کے ساتھ دے رہا تھا لیکن مجھے آم کھانے سے مطلب تھا۔ پیڑ گننے سے نہیں لہٰذا میں لفافہ سنبھال کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

پیڑ گننے سے مطلب نہ رکھنے کے باوجود یہ بات میرے ذہن میں خاصی دیر چبھتی رہی کہ فاروقی کی مہربانی خالی از علت نہیں تھی۔ اس کے پسِ پشت یقیناً اس کا کوئی مفاد تھا۔ حسبِ معمول رات گئے دفتر سے گھر جاتے ہوئے میں طے کرچکا تھا کہ میں یہ مہینہ شمالی علاقے کے کسی ہوٹل میں اکیلے ہی گزاروں گا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خوب سوؤں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں طاہرہ یا بچوں کو لے جانے سے گریز کروں۔ بہ صورتِ دیگر میرا تمام سکون غارت ہونے میں کوئی کسر نہ رہ جاتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بانو اور بچوں سے کیا بہانہ بناؤں مگر فوری طور پر مجھے کوئی بہانہ نہ سوجھ سکا۔ لہٰذا اسے میں نے کل تک کے لیے ملتوی کردیا۔ گھر جاتے ہی میں نے الٹا سیدھا کھانا کھایا۔ بانو کی "گفتگو" سنتا رہا اور بستر پر جاکر گرگیا۔

اگلے روز گیارہ بجے بانو نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا "کیا بات ہے جی۔ آج دفتر نہیں جانا۔"

"ہاں.... آں۔" میں نے جھونک میں کہا "مجھے ایک مہینے کی چھٹی مل گئی ہے۔"

"چھٹی!" بانو کے منہ سے چیخ نکل گئی "اللہ میں کب سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو چھٹی ملے تو ہم کہیں تفریح کے لیے جائیں۔"

میری حماقت ملاحظہ فرمائیں۔ میرے منہ سے نکل گیا "شمالی علاقے" اور پھر فوراً پچھتانے لگا۔ وہ راز جسے میں کل سے چھپانے کی منصوبہ بندی کرتا آرہا تھا۔ دو منٹ میں اُگل دیا تھا۔

بانو نے دوسری چیخ ماری "اللہ ہم شمالی علاقے جائیں گے۔ مری، بھوربن، نتھیا گلی، کاغان....."

"جہنم!" میں نے جھنجلا کر کہا "ہم کہیں نہیں جارہے۔"

"مذاق مت کیجئے۔" بانو نے اٹھلا کر کہا "میں جانتی تھی کہ آپ ہمیں کوئی نہ کوئی سرپرائز ضرور دیں گے۔ میں....."

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "خدا کے لیے بانو مجھے سکون کی ضرورت ہے۔"

وہ ہاتھ ہٹا کر شروع ہوگئی "ارے تو میں کب آپ کے سکون میں رکاوٹ بنی ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو

روحانی سائنس اور ہومیوپیتھک علاج کا مرکز
الفراز آسٹرو ہومیو سروسز
زیر نگرانی: سید انور فراز
ہر قسم کے جسمانی، نفسیاتی اور روحانی علاج کے لئے مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ فون نمبر 5897126
اوقات ملاقات شام 5 بجے تا رات 10 بجے
(گولڈ میڈلسٹ)
ڈاکٹر امبر امروز
پتا: C-73 الیون اسٹریٹ فیز تو D.H.A EXT
مین کورنگی روڈ نزد بس اسٹاپ کشمیر کالونی۔ کراچی

کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں نے۔۔۔"

اب بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ میں اُٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا تھا۔ خاصے عرصے بعد جی بھر کر سویا تھا پھر غسل نے ساری کسل مندی دور کردی۔ میں ناشتے کی میز پر آیا تو وہ لوگ پروگرام بھی تیار کر چکے تھے۔ سمیرا نے میرے بازو سے چپک کر کہا۔

"پاپا۔ ہم جھیل سیف الملوک دیکھنے بھی جائیں گے۔"

میں نے بانو کو گھورا تو وہ جلدی جلدی ناشتا لگانے میں لگ گئی۔ عثمان اور فاروق چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت طاری کیے بیٹھے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے باعث یونیورسٹیاں اور کالج بند تھے۔ اسی بنا پر وہ تینوں گھر پر نظر آرہے تھے۔ عثمان ٹیکسلا انجینئرنگ یونیورسٹی میں فائبر گلاس میں انجینئرنگ کررہا تھا۔ فاروق قائدِ اعظم یونیورسٹی میں ایم بی اے کے پہلے سمسٹر میں تھا اور سمیرا اسی یونیورسٹی میں فائن آرٹس پڑھ رہی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے بچو...! ہم ناردرن ایریا جارہے ہیں لیکن یاد رکھو میں کوئی حماقت برداشت نہیں کروں گا۔"

"کوئی حماقت نہیں ہوگی پاپا۔" وہ تینوں بیک وقت بولے تو میں مسکرانے لگا۔ بھلا حماقت انسان سوچ سمجھ کر کہاں کرتا ہے یہ تو ہوجاتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اب تفریح وہی کریں گے لہٰذا پروگرام بھی ان کو ہی طے کرنا تھا۔ میں گھر میں اپنی واحد پناہ گاہ اسٹڈی روم میں آبیٹھا۔ میں نے پہلے کمپیوٹر پر ای میل چیک کی۔ لاتعداد ای میلز تھیں۔ ان میں سے کچھ ہی قابلِ ذکر تھیں۔ ایک نے میری توجہ مبذول کرالی۔ اس کا عنوان تھا "مجھ سے رابطہ کریں" اور ساتھ ہی ایک فون نمبر اور ای میل کا پتا موجود تھا۔ پہلے میں نے اسے چیک کرنے کا سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں ایک مہینے کی چھٹی پر تھا۔ لہٰذا میں نے سی ڈی پر ایک فلم لگالی۔ جیسے ہی فلم ختم ہوئی فاروق نے اندر جھانکا "پاپا ہم اندر آسکتے ہیں۔"

"بالکل آسکتے ہو۔"

اس کے پیچھے باقی سب بھی تھے۔ میں ان کا پروگرام سنتا رہا اور آخر میں بولا "مگر اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟"

"پاپا آپ چھپا رہے ہیں۔" سمیرا شرارت سے بولی "ہم نے آپ کے ایم ڈی سے فون پر سب معلوم کرلیا ہے۔"

میرا منہ لٹک گیا اور میرا دل چاہا کہ میں بھی آئی جی فاروقی کو ایک فون کروں اور اسے کھری کھری سناؤں مگر میں ایسا نہیں کرسکتا تھا اس لیے دل جلا کر رہ گیا۔ پروگرام یہ یوں تھا کہ پہلے ہم مری جائیں گے۔ وہاں ایک ہفتہ گزار کر کاغان جائیں گے پھر سوات اور دیر، آخر میں ہم ایبٹ آباد کے راستے گھر لوٹ آئیں گے۔ تمام پروگرام ایک کاغذ پر لکھ کر میں نے فون اپنی طرف کھسکایا اور راشد سے رابطہ کیا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ میرا سب سے مخلص دوست ہے وہ ایک ٹریول اینڈ ٹورنگ کمپنی میں کام کرتا تھا۔ میں نے اسے سارا پروگرام سنایا اور کہا۔

"اب ہوٹلوں میں کمروں کی بکنگ تمہارے ذمے ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کروں گا۔"

"ایک گھنٹے بعد۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولا "دراصل آج کام۔۔۔"

"اگر ایک گھنٹے بعد مجھے بکنگ نہ ملی تو ایجنسی کا کنٹریکٹ ختم سمجھنا۔" میں نے اس کی بات کاٹی اور فون بند کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ ہر صورت میں میرا کام کرے گا۔ میری ایجنسی کی تمام ٹریولنگ اور بکنگ اس کی کمپنی کے ذمے تھی۔ ایک گھنٹے بعد راشد جلے بھنے انداز میں بتا رہا تھا کہ اس نے کن مشکلوں سے ہمارے لیے ہوٹلوں میں بکنگ حاصل کی تھی۔ سیزن عروج پر تھا اور ان دنوں ہوٹلوں میں کمرے حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ میں ہوٹلوں کے نام لکھتا رہا اور جیسے ہی اس نے بات ختم کی شکریہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

"بیگم اینڈ بچہ پارٹی۔" میں نے کاغذ لہرا کر کہا "ہمارا پروگرام ڈن ہے۔"

ہمیں اگلے روز روانہ ہونا تھا لہٰذا ایمرجنسی میں تیاری شروع کردی گئی۔ بکسوں میں رکھے گرم کپڑے اور سوئٹر نکالے گئے۔ انہیں دھوپ لگائی گئی۔ بانو اور سمیرا مزید کپڑوں کی خریداری کے لیے نکل کھڑی ہوئیں۔ عثمان اور فاروق نے اپنی آڈیو کیسٹس جمع کرنا شروع کردیں۔ شام تک مجھے کئی ہزار کا خسارہ ہوچکا تھا۔ میرے لیے صرف ایک مفلر آیا تھا جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میرے پاس کئی مفلر تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے پاس پہلے ہی سے سب کچھ موجود تھا۔

طے یہ ہوا تھا کہ ہم بائی کار جائیں گے۔ ڈاج کافی طاقت ور تھا اور اس میں خاصی گنجائش تھی۔ اگر کوئی چھوٹی کار ہوتی تو سکڑ سمٹ کر اتنا لمبا سفر کرنا خاصا دشوار ہوجاتا۔ اس کی ڈکی میں اتنی جگہ تھی کہ دو سوٹ کیس اور تین بیگ آ گئے کیونکہ ایک ہفتے پہلے ہی سروس کرائی تھی۔ لہٰذا کسی خرابی کا اندیشہ نہیں تھا۔ طے کیا کہ روانگی کے وقت راستے میں کسی پیٹرول پمپ سے تیل پانی بھی چیک کرالیں گے۔ اگرچہ سفر چار گھنٹے کا بھی نہیں تھا لیکن بچوں کا پروگرام تھا کہ راستے میں رک کر پکنک بھی منائی جائے گی اور اس مقصد کے لیے لنچ پیک لے جائیں گے۔ لہٰذا ہم صبح سویرے روانہ ہوگئے۔ جب تک پہاڑی علاقے نہیں شروع ہوجاتے ڈرائیونگ عثمان کے ذمے تھی۔ راستے میں پہلے ایک جگہ پیٹرول بھروایا۔ ٹنکی فل کرانے کے علاوہ ایک گیلن کا ڈبا بھی بھروالیا۔ تیل پانی چیک کیا۔ وہیں ایک قریبی ریستوران سے لنچ پیک کروایا اور آگے روانہ ہوگئے۔ خلافِ معمول عثمان بڑے آرام سے کار چلا رہا تھا ورنہ وہ گاڑی کو بحرِ ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑاتا تھا اور سب کی جان سُولی پر ٹنگی رہتی تھی مگر اس روز اس نے سستی کا ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ ہم بمشکل دوپہر تک پہاڑی علاقے تک پہنچ سکے۔ صبح سب نے معمولی سا ناشتا کیا تھا اس لیے بھوک سے سب کا بُرا حال تھا۔ اب ایک عدد مناسب جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم پکنک کے انداز میں لنچ کرسکتے لیکن اس سے پہلے کہ ہم کسی جگہ رکتے کار خود رک گئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ پچھلا پہیا پنکچر ہوچکا ہو۔ میں نے اتر کر دیکھا۔ ایک لمبی سی کیل پہیے میں گھسی ہوئی تھی۔ میرا موڈ خراب ہونے لگا۔ پنکچر شدہ پہیا بدلنا مجھے دنیا کا واہیات ترین کام لگتا ہے۔

"ایسا کرتے ہیں پہلے لنچ کرلیتے ہیں۔" میرا موڈ دیکھ کر بانو نے جلدی سے تجویز پیش کی۔

"لنچ اس جگہ، سڑک پر بیٹھ کر۔" میں نے چاروں طرف دیکھا۔

"وہ جگہ کیسی رہے گی۔" سمیرا نے دس بارہ گز اوپر ایک مسطح چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھی رہے گی ہمارا کباب بنانے کے لیے۔" فاروق جل کر بولا "پتا بھی ہے کہ دھوپ سے وہ جگہ تپ رہی ہوگی۔"

"ایک منٹ پاپا میں دیکھ کر آتا ہوں۔" عثمان بولا اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ کچھ اوپر جاکر وہ ہاتھ ہلانے لگا "پاپا، مما یہاں ایک جگہ ہے۔ آپ اوپر آجائیں۔"

ہم نے گاڑی لاک کی اور لنچ پیک نکال کر اوپر چڑھنے لگے۔ بچوں کے لیے تو یہ آسان کام تھا۔ میرے اور بانو کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ مشقت کی عادت تو جوانی میں بھی نہیں رہی تھی۔ اس عمر میں اس مشکل جگہ چڑھنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ جب ہم دونوں ہانپتے کانپتے اوپر پہنچے تو بچے دستر خوان پر لنچ لگا چکے تھے۔ یہ جگہ واقعی شان دار تھی۔ کچھ گھنے درختوں تلے نرم نرم گھاس پر کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ابھی لنچ خاتمے کے قریب تھا کہ نیچے کی طرف سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ میں اچھل کر کھڑا ہوگیا اور یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ ایک نیلی فاکسی میری ڈاج کے پچھلے حصے سے جڑ کر کھڑی تھی۔ یہ دھماکا دونوں کاروں کے تصادم کا تھا۔ میں تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر ہر ممکن تیزی سے نیچے پہنچا جہاں ایک پروفیسر قسم کا شخص سنہری عینک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دہاڑا۔

"یہ گاڑی یہاں کس احمق نے کھڑی کی تھی؟"

"اور یہ منحوس فاکسی کس اندھے بیل نے میری کار سے ٹکرائی ہے؟" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

فاکسی میں سے ایک خاتون اور پچھلی نشست سے دو لڑکیاں جھانک رہی تھیں۔ پروفیسر اچھل پڑا "مجھے اندھا بیل کہا۔" اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "میری فاکسی کو منحوس بولا۔"

"تو اور کیا کہوں۔ تمہارے اس ہاتھی نے ٹکر مار کر میری نازک سی کار کا بیڑا غرق کردیا ہے۔" میں نے ڈاج کا معائنہ کیا۔ اس کا پچھلا فینڈر پچک گیا تھا اور ڈکی کھل گئی تھی۔ ایک گھنٹے میں یہ تیسرا نقصان تھا۔

"یہ سڑک ہے۔ تمہارا گیراج نہیں جہاں آرام سے کار کھڑی کرکے چلے جاؤ۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ موڑ کے بعد گاڑی کھڑی ہے۔"

"ظاہر ہے گاڑی جہاں پنکچر ہوگی وہیں کھڑی ہوگی۔" اس روز نہ جانے کیوں میرا لڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔

پروفیسر نے تنتناتے ہوئے فاکسی میں بیٹھ کر اسے ریورس کیا تو ڈاج کا فینڈر نکل کر سڑک پر جا گرا۔ میرا غصے سے بُرا حال ہوگیا "اے جاتے کہاں ہو۔ یہ نقصان تمہارا کوئی رشتے دار پورا کرے گا۔"

"پہلے میرے نقصان کو دیکھ لو۔ شاید تمہاری طرف کچھ نکل آئے۔" اس نے فوکسی کے سنہری فینڈر کی طرف اشارہ کیا۔ جو اب باڈی کا حصہ بن گیا تھا۔ یہ کہتے ہی اس نے فوکسی آگے بڑھا دی اور میں دانت پیستا رہ گیا۔ اسی دوران میں بانو اور بچے میرے برابر میں آکھڑے ہوئے تھے اور میری اور پروفیسر کی نوک جھونک سن کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو پہیا بدلو۔" میں نے دہاڑ کر کہا تو انہوں نے جلدی جلدی کھلی ڈکی سے سامان نکالا اور اسٹپنی نکالنے کے بعد اطلاع دی "پاپا، جیک تو اس میں ہے ہی نہیں۔"

"جیک کہاں گیا؟" میں دنگ رہ گیا "ابھی دو دن پہلے ہی تو میں نے جیک صحیح کرا کے رکھا تھا۔"

بانو کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ ہکلائی "مم۔۔۔ میرا خیال ہے۔ جیک ہم گھر پر ہی بھول آئے۔ میں نے یہ سوچ کر نکال دیا تھا کہ وہ سوٹ کیس نہ خراب کردے۔"

میرا دل چاہا کہ اسے بے نقط سناؤں لیکن خطرہ تھا کہ وہ رونا نہ شروع کردے۔ بولنے کی طرح وہ رونے کے لیے بھی موقع محل نہیں دیکھتی تھی۔ میں نے ضبط کر کے کہا "اب یہ بھی بتا دو کہ پہیا کیسے تبدیل ہوگا۔"

"پاپا۔ ایک آئیڈیا۔" سمیرا بولی "ہم کسی گزرنے والے سے جیک ادھار مانگ لیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ میں ذرا آرام کرنے جارہا ہوں۔ تم لوگ کسی سے جیک لینے کی کوشش کرو۔ جب پہیا بدل جائے تو مجھے بلالینا۔"

میں جاکر وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ جہاں ہم نے لنچ کیا تھا۔ درختوں کی چھاؤں میں بڑی پیاری خنکی تھی۔ غصے کے باوجود مجھے نیند آنے لگی تھی۔ میں سچ مچ سو گیا۔ مرغن کھانے کی وجہ سے غنودگی بُری طرح سوار تھی۔ دو گھنٹے بعد بانو نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا "اب اٹھ بھی جائیے۔ پہیا تبدیل کرلیا ہے۔ اللہ کے ایک بندے کو ہم پر ترس آہی گیا تھا۔ ہم نیچے اترے۔ بچے سامان دوبارہ ڈکی میں ٹھونس چکے تھے۔ اس دفعہ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ غنودگی کے باعث میرا سر بوجھل تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ مجھے شدت سے کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہم مری اور اسلام آباد کے درمیان میں تھے۔ جہاں ریستوران یا ہوٹل نایاب تھے۔ جیسے تیسے مغرب تک ہم ایک ریستوران میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاں چائے اور کافی کے ساتھ ہلکا پھلکا ریفریشمنٹ لیا۔ اب بانو اور بچے بھی بری طرح تھکے ہوئے تھے اور ابھی ہوٹل کئی گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔

سیزن کی وجہ سے مری شہر کے ہوٹلوں میں جگہ ملنا ناممکن تھی۔ اسی وجہ سے ارشد نے ایک مضافاتی ہوٹل میں بکنگ کرا دی تھی۔ مجھے راستوں کا بھی علم نہیں تھا۔ لہٰذا ایک مقامی شخص سے رہنمائی حاصل کی گئی اور اس کی بتائی سڑک پر ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد بھی کوئی ہوٹل نہیں آیا تو میں پریشان ہوگیا کیونکہ باقی سب تو سو رہے تھے ویسے میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر سو جاؤں۔ بالآخر مجھے جو پہلا شخص نظر آیا۔ میں نے اس سے مذکورہ ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔ وہ ہنسا۔

"صاحب، آپ کہاں آگئے۔ ہوٹل تو دوسرے روڈ پر ہے۔ اب آپ واپس جائیں اور جہاں یہ سڑک دو شاخہ ہوئی ہے اس کی دوسری شاخ کی طرف گھوم جائیں۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہوٹل آجائے گا۔"

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ گویا ایک گھنٹا واپس جانے میں اور ایک گھنٹا مزید ہوٹل تک پہنچنے میں۔ رات کے نو تو بج ہی چکے تھے۔ بالآخر میں نے ہوٹل تک رسائی حاصل کی تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے بانو اور بچوں کو بیدار کر کے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ وہ سامان اٹھائے نیند میں جھومتے میرے پیچھے چلے آئے۔ اندر ہال سنسان پڑا تھا اور ایک کلرک استقبالیہ کی میز پر سر رکھے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے کاؤنٹر بجایا۔ وہ بدستور سوتا رہا تو میں نے اس کے سرہانے رکھی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا پھر اس نے کسی مشین کی طرح بولنا شروع کردیا۔

"معاف کیجئے گا سر، ہمارے ہوٹل میں کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔ آپ ایک ہفتے بعد آئیے۔"

"ہماری ہوٹل میں بکنگ ہے۔ دو کمرے مسٹر اینڈ مسز عمر بٹ کے نام سے۔"

"سوری سر، میں نے کہا نا کہ کمرے خالی نہیں ہیں۔"

اس دفعہ میرا صبر و ضبط جواب دے گیا۔ میں نے ٹائی سے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا "یہ طوطے کی طرح بکواس بند کرو اور مسٹر اینڈ مسز عمر بٹ کے نام سے بک کمروں کی چابیاں نکالو۔"

ٹائی کا پھندا لگنے سے اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے بغور ہمیں دیکھا "سر، ہمارے پاس کوئی بکنگ نہیں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں۔ بورڈ پر آپ کو کوئی چابی نظر نہیں آئے گی۔ تمام کمرے فل ہیں۔"

میرا دماغ گھوم گیا "تمہارا مطلب ہے کہ ناردرن ٹریولرز کی جانب سے کوئی بکنگ نہیں کرائی گئی ہے؟"

اس نے جلدی جلدی اپنے سامنے رکھا رجسٹر الٹا "نہیں سر، اس کمپنی کی جانب سے ہمیں کوئی بکنگ نہیں ملی۔ ویسے بھی ہم ناردرن والوں سے بزنس نہیں لیتے۔"

"بہت اچھا کرتے ہو۔ آئی ول کِل یُو۔" قتل کا ارادہ میں نے ارشد کے بارے میں ظاہر کیا تھا لیکن کلرک ڈر گیا۔ بولا "آپ ٹھہریں۔ میں ابھی منیجر کو بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ پھرتی سے کاؤنٹر کے پیچھے ایک دروازے میں غائب ہوگیا۔ بانو اور بچے وہاں رکھے صوفوں پر اونگھ رہے تھے۔

عثمان، فاروق کے کندھے پر سر رکھے خراٹے لے رہا تھا اور بانو کی گود میں سمیرا سر رکھے لیٹی تھی۔ میں سرد آہ بھر کر سوچنے لگا کہ کاش آئی جی مجھے چھٹی کے بجائے کوئی اسائنمنٹ دے دیتا تو اس وقت میں چین سے اپنے بیڈ روم میں سو رہا ہوتا۔ چند لمحے بعد کلرک کے پیچھے ایک عظیم الجثہ فٹ بال نما چیز آئی۔ جو اس ہوٹل کا منیجر ثابت ہوا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ ساری بات سن کر وہ بولا "معاف کیجئے گا۔ اس میں ہمارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر بکنگ کرائی ہوتی تو آپ کو کمرے مل جاتے۔"

"مگر رات کے اس پہر میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر کہاں جاؤں۔"

"اگر آپ انتظار کرسکیں تو کل ایک کمرا۔۔۔"

"کل میں کمرے کو لے کر کیا کروں گا۔ مجھے تو ابھی کمرے چاہئیں ہیں۔" میں نے جھلا کر کہا۔

اس پر کلرک اور منیجر کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ میں پُر امید نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔ ان مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ منیجر ہمیں ایک کمرا دینے پر رضامند ہوگیا۔ یہ کمرا ہوٹل کے مالک کے لیے مخصوص تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا۔ اسی کمرے میں رہتا تھا۔ منیجر نے اس شرط پر کمرا ہمیں دے دیا کہ ہم صبح سویرے اسے خالی کردیں گے۔ ہم اتنے تھکے ہوئے تھے کہ جاتے ہی پڑ کر سو گئے۔ منیجر نے اضافی تکیے اور کمبل فراہم کردیے تھے۔ بانو اور سمیرا شاندار ڈبل بیڈ پر سو گئیں۔ میں نے صوفے پر ڈیرا جمایا اور عثمان اور فاروق قالین پر لڑھک گئے۔

صبح مجھے بانو نے بیدار کیا "اب اٹھ بھی جائیں۔" اس نے میرے اوپر سے کمبل کھینچ لیا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں صرف میں اور بانو تھے "بچے کہاں ہیں؟"

"باہر نکلے ہوئے ہیں۔ بے چارہ کلرک دو مرتبہ آکر ناشتے کو پوچھ چکا ہے۔"

"وہ ناشتے کو پوچھنے کے بہانے ہمیں یاد دلا رہا ہے کہ اب ہمیں رخصت ہوجانا چاہیے۔" میں نے کہا اور اُٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ اس دوران میں بانو ناشتے کے لیے کہہ چکی تھی۔ ہم ناشتا کر رہے تھے کہ سمیرا ہنستے ہوئے اندر آئی۔

"پاپا آپ کو پتا ہے۔ وہ انکل جنہوں نے ہماری گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

میرا دورانِ خون ذرا تیز ہونے لگا "اچھا تو وہ خبیث یہیں ہے۔ اس سے حساب کتاب میں ذرا آسانی رہے گی۔"

سمیرا نے منہ بنایا "پلیز پاپا۔ میں نے ان کی بیٹیوں سے دوستی کرلی ہے۔ اب آپ ان سے جھگڑتے اچھے نہیں لگیں گے۔"

"عثمان اور فاروق کہاں ہیں؟"

"وہ دونوں اور نورین اور مہرین باہر گئے ہیں۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ اس لیے میں نہیں گئی۔"

ناشتا کر کے ہم نے سامان سمیٹا اور نیچے لاؤنج میں آگئے۔ استقبالیہ کلرک نے ہمیں آتے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میں فوراً اس جگہ سے روانہ ہوجانا چاہتا تھا لیکن صاحب زادے غائب تھے۔ ہم وہیں صوفوں پر بیٹھ گئے اور جب بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میں دروازے تک گیا تھا کہ ریوالونگ ڈور گھوما اور وہی شخص عین سامنے نظر آیا۔ جس سے گزشتہ چوبیس گھنٹے میں مجھے سب سے زیادہ چڑ محسوس ہو رہی تھی۔ میری ناک سے پھنکار سی خارج ہوئی۔

"آخر میں نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔"

"میں بھی تم سے بچ کر نہیں بھاگ رہا ہوں۔" اس نے بھنا کر کہا "راستہ چھوڑ دو۔"

"میں آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا اور وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھتا اندر چلا گیا۔ میں باہر آگیا۔ پہاڑی علاقے کی نرم دھوپ ہر طرف پھیلی تھی۔ فضا میں عجیب سی مہک تھی۔ جو جسم و جان کو تازگی دے رہی تھی مگر فی الوقت میں رہائش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ارشد خبیث نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ نہ جانے اس نے باقی ہوٹلوں میں ہماری بکنگ کرائی تھی یا نہیں اور اگر کرائی نہیں تھی تو یہ ہفتہ ہم کہاں گزارتے۔ بظاہر تو بیک وقت دو کمرے ملنا ناممکن لگ رہا تھا۔ میں ٹہلتے ہوئے خاصا دور نکل گیا تھا۔ جب واپس آیا تو بانو ایک خاتون کے ساتھ مصروفِ گفتگو نظر آئی۔ خاتون بھی اس کی فکر کی تھی کیونکہ دونوں بیک وقت اور رکے بغیر بول رہی تھیں۔

"بچے آئے؟" میں نے بانو سے پوچھا۔

"آگئے ہیں۔ ان سے ملئے مسز چوہدری۔"

"السلام علیکم بھائی جان۔" مسز چوہدری بولی۔

"وعلیکم السلام۔" میں بولا "بیگم چلنے کی تیاری کرو۔"

"اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ آپ دوپہر کا کھانا ہمارے

ساتھ کھائیے۔"

"بہن ہمیں ابھی ہوٹلوں میں جگہ تلاش کرنی ہے۔" میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

"جگہ تو مل گئی۔" بانو چہکی "ایک گھنٹے پہلے دو کمرے خالی ہوئے تھے۔ جو ہم نے لے لیے۔"

"کمرے لے لیے۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اس خبیث پروفیسر کے ساتھ ایک ہوٹل میں رہنے کا تصور کرکے میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میں کل سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات کا حساب کتاب کرتا رہا۔ میں تفریح اور سکون کے لیے گھر سے نکلا تھا اور میرے حساب سے مجھے صرف پریشانیوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مسز چوہدری کے زور دینے پر ہم ان کے ساتھ ان کے کمرے میں پہنچے۔ جہاں میں اس چشمے والے پروفیسر کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے مسز چوہدری کی طرف دیکھا۔

"چوہدرانی' یہ شخص ہمارے کمرے میں ہے؟"

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ وہ شخص پروفیسر نہیں بلکہ چوہدری تھا۔ بے شک اس کی ظاہری شخصیت پنجابی فلموں کے چوہدری سے بہت مختلف تھی لیکن بباطن وہ ان کی طرح ہی کا تھا۔ میں فوراً وہاں سے نکل آیا۔ برابر والے کمرے سے عثمان' فاروق' سمیرا اور کچھ لڑکیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں جو یقیناً چوہدری کی بیٹیاں تھیں۔ بانو میرے پیچھے تھی۔

"کیا ہوگیا ہے آپ کو۔ یوں اچانک چلے آئے۔" اس نے مجھے روکا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم دشمن کی بیوی سے پینگیں بڑھا کر بیٹھ جاؤ گی۔" میں خفگی سے بولا۔

بانو ہنس دی "تو ایک ذرا سے حادثے کو آپ نے دشمنی کی بنیاد بنا لیا۔"

"ذرا سا حادثہ۔" میں مزید خفا ہوگیا "ابھی کار کی مرمت پر چار پانچ ہزار کا خرچا آجائے گا اور تم نے اس خبیث چوہدری کا رویہ دیکھا۔"

"ٹھیک ہوجائے گا۔ اس بے چارے کی گاڑی کا بھی تو اتنا نقصان ہوگیا ہے۔" بانو بولی اور ایک کمرے کا دروازہ کھولنے لگی۔

"خاک نقصان ہوا ہے۔" میں جل کر بولا "نہ جانے کون سے ماڈل کی فوکسی ہے۔ اس کا صرف فینڈر ہی تو ٹیڑھا ہوا ہے۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔" بانو چونکی "ہوٹل والا بتا رہا تھا کہ کچھ دور گیرج ہے آپ وہاں گاڑی دے آئیں تو دو تین دن میں ٹھیک ہوجائے گی۔"

"اور اتنے دن ہم پیدل سفر کریں گے۔"

"کیا حرج ہے۔ جب تک گاڑی ٹھیک نہیں ہوجاتی۔ ہم قریب گھوم لیں گے اور پھر چوہدری صاحب کی گاڑی تو ہے۔"

"چوہدری۔" میں اچھلا "میں کبھی مر کر بھی اس کی گاڑی میں نہ بیٹھوں۔"

بانو کے جانے کے بعد میں دوبارہ نیچے پہنچا۔ استقبالیہ کلرک سے گیرج کا پتا پوچھا۔ اس وقت لاؤنج میں بہت چہل پہل تھی۔ لوگ سیر و تفریح کے لیے جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ باہر پھیلی دھوپ مزید تابناک ہوگئی۔ بے حد نیلے آسمان تلے سبز و سفید پیرہن پہنے پہاڑ پریوں کے افسانوی قلعے لگ رہے تھے لیکن یہ سب میرا موڈ خوشگوار کرنے سے قاصر تھے۔ گیرج تلاش کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی لیکن جب مکینک نے ڈینٹنگ پینٹنگ کا خرچا بتایا تو میرا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔ یہ معمول کے خرچے سے کم سے کم تین گنا زیادہ تھا۔

"تم مجھے لوٹنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ کام اس سے تہائی میں ہوجاتا ہے۔"

"تو پھر جہاں سے ہوجاتا ہے۔ وہاں لے جاکر کرا لیجیے۔" مکینک نے اطمینان سے کہا۔

خاصے بحث و مباحثے کے بعد وہ ایک معقول رقم پر تیار ہوگیا "گاڑی آپ کو ایک ہفتے بعد ملے گی۔"

"مجھے گاڑی ہر حالت میں پرسوں تک چاہیے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ورنہ میں ابھی گاڑی لے جارہا ہوں۔"

گاہک کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ فوراً راضی ہوگیا۔ معاً میری نگاہ وہیں پڑے سنہری فینڈر پر پڑی۔ جو یقیناً چوہدری کی فاکسی سے ٹوٹا تھا۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا

"سنو یہ فینڈر یہاں کیوں پڑا ہے؟"

"کسی بے چارے کی فوکسی کا ہے۔ ٹوٹ گیا۔ وہ کہاں اٹھائے پھرتا۔ یہاں چھوڑ گیا۔ میں نے کہا بھی کہ ایک ہفتے کا کام ہے میں کردوں گا لیکن وہ نہیں مانا۔"

میں مسکرایا "میں یہ فینڈر تم سے خریدنا چاہوں تو؟"

"خرید لیجیے۔ میں نے چار سو میں لیا ہے۔ آپ پانچ سو دے دیجیے گا۔"

وہ واضح طور پر مجھے ٹھگنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں

اپنے خیال سے اتنا خوش تھا کہ میں بخوشی تیار ہو گیا "میں تمہیں ہزار روپے دوں گا۔ بشرطیکہ تم یہ فینڈر میری گاڑی میں لگا کر دے دو۔"

وہ بھونچکا رہ گیا "لیکن یہ تو فاکسی کا ہے صاحب اور آپ کی ڈاج ہے۔"

"ارے یار، تم لوگ کس مرض کی دوا ہو۔ بس اسے لگا دو کسی طرح۔"

"کوشش کروں گا صاحب۔ پہلے تو اس کی ڈینٹنگ کرنا ہے۔"

میں وہاں سے نکلا تو میرا موڈ خود بخود خوش گوار ہو گیا تھا۔ نہ جانے مجھے چوہدری سے کیا دشمنی ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ معمولی سا حادثہ تھا جو آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ خود میں کتنی بار دوسروں کی گاڑیوں کو ٹکر مار چکا تھا پھر غلطی میری بھی تھی۔ میں نے گاڑی کو پنکچر ہونے کے بعد موڑ کے فوراً بعد چھوڑ دیا تھا۔ ظاہر ہے اب کسی کو کیا معلوم کہ موڑ کے بعد گاڑی کھڑی ہے۔ چوہدری نے آکر پوری بے فکری سے اپنی فاکسی ٹکرا دی تھی۔ اصل غصہ مجھے اس کے انداز پر تھا۔ اس نے مجھے احمق قرار دیا اور پھر کسی قسم کی ذمے داری سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں بھی اس کا رویہ معاندانہ تھا اگر وہ معذرت کر لیتا تو میں شاید اب تک سب کچھ بھول چکا ہوتا۔

اس وقت دھوپ میں خاصی تمازت آچکی تھی اور سوئٹر مجھے بوجھ لگنے لگا تھا۔ جیسے تیسے میں پیدل واپس ہوٹل پہنچا تو یہ معلوم ہوا کہ بانو اور بچے مسز چوہدری اور ان کے بچوں کے ساتھ تفریح کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ میں جلتا کڑھتا واپس کمرے میں آکر پڑ گیا پھر مجھے شام کو بانو نے اٹھایا۔ وہ بے حد خوش اور پُرجوش نظر آرہی تھی۔ میرا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

"اللہ اتنا مزہ آیا۔" بانو میری کیفیت سے بے خبر بولتی رہی "ہم اوپر تک گئے تھے۔ وہاں اتنے خوب صورت کاٹیج بنے ہوئے ہیں اور کرایہ اتنا کم۔ کاش ہم نے یہاں ایڈوانس نہ دیا ہوتا۔ ارے آپ کو کیا ہوا۔ یہ منہ کیوں سوجا ہوا ہے۔"

"اتنا بتاؤ کہ تم لوگ میرے ساتھ آئے ہو یا اس چوہدری خاندان کے ساتھ؟"

بانو شرمندہ ہو گئی "اصل میں بچوں کا پروگرام بن گیا تھا پھر مسز چوہدری نے مجھے بھی کھینچ لیا۔ واپسی میں دیر ہو گئی تو ہم نے ایک ریستوران میں لنچ کر لیا۔ اب جب تک ہم یہاں ہیں کھانا وہیں جا کر کھائیں گے۔ اس ہوٹل کا کھانا تو بالکل بکواس ہوتا ہے۔ اللہ میں کیا بتاؤں۔ وہاں [illegible] زبردست تھا اور بریانی کا تو جواب ہی نہیں تھا۔"

یہ سب سن کر میرے پیٹ میں زبردست اچھل [illegible] تھی۔ میں نے مارے غصے کے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا [illegible] بانو کی ایکسپریس زبان سے بچنے کے لیے میں جلدی [illegible] روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کر واپس آیا تو عثمان، فاروق اور سمیرا شرمندہ بیٹھے تھے۔ پہل فاروق نے کی۔

"سوری ابو، دراصل ہمیں خیال نہیں رہا تھا۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے بیٹے۔" میں تھکے ہوئے انداز میں [illegible] پر بیٹھ گیا "جب باپ بوڑھا ہو جائے تو اکثر بچوں کے ذہن سے نکل جایا کرتا ہے۔"

سمیرا مجھ سے لپٹ گئی "سوری ابو۔ آپ کہاں بوڑھے ہوئے۔ بالکل ینگ تو ہیں۔ پتا ہے۔ نورین نے کیا کہا۔ [illegible] لگی کہ یہ آپ کے سب سے بڑے بھائی ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ آپ میرے ابو ہیں تو وہ بہت حیران ہوئی۔"

"مسکا پالش نہیں۔" میں نے اسے گھورا۔ [illegible] تھی کہ میں کسی سے اور خاص طور پر بچوں سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ [illegible] انہوں نے نعرہ لگایا "یا ہو۔ آج چکن بروسٹ ڈنر ابو کی طرف سے۔"

"ہرگز نہیں میں تم لوگوں سے ناراض ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

لیکن وہ شیطان کے خالو کہاں ماننے والے تھے۔ پہلے میں نے چائے کے ساتھ کچھ ریفریشمنٹ لی۔ اسی اثنا میں بچے تیار ہو گئے۔ بانو نے میرا ایک سوٹ نکال کر پریس کروایا اور جب میں تیار ہوا تو وہ بولی۔

"سنیں ایک بات ہے آپ خفا تو نہیں ہوں گے۔"

"کوشش کروں گا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"وہ دراصل میں نے مسز چوہدری اور بچیوں کو بھی دعوت دے دی ہے۔ لنچ انہوں نے کرایا تھا۔ میں نے سوچا کہ ڈنر میں کرا دوں۔ کسی کا قرض نہیں رکھنا چاہیے۔"

"خوب۔" میں تلخی سے مسکرایا "تو اس لیے مجھے [illegible] جا رہا تھا۔"

"اب ایسا تو نہیں ہے۔" بانو خفا ہو گئی "کیا کسی کی دعوت کرنا جرم ہے۔"

"خدا کے لیے۔" میں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے "میں راضی، میرا خدا راضی۔ اب جلدی چلو۔ مجھے ویسے ہی بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے بانو کو باہر دھکیلا۔ مسز [illegible]

[چوہ]دری اور ان کی دونوں بیٹیاں نیچے لاؤنج میں موجود تھیں۔ انہوں نے مجھے شرماتے ہوئے سلام کیا تو بے اختیار میں نے شفقت سے ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ ویسے بھی بیٹیاں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ فاروق اور عثمان ان کے گرد کچھ زیادہ ہی منڈلا رہے تھے اور اس کی وجہ بھی تھی۔ دونوں ہی بہت پیاری لڑکیاں تھیں۔

ریستوران زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل چہل قدمی کرتے وہاں تک پہنچ گئے۔ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ بلندی پر تھی اور سامنے ڈھلان پر بے شمار سرخ کھپریلوں والے کاٹیج بکھرے ہوئے تھے۔ گرمیوں کے باوجود پہاڑی علاقوں میں سورج جلدی غروب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب ہم ریستوران تک پہنچے تو تاریکی چھا چکی تھی۔ ریستوران اوپن ائر بھی تھا اور اندر بیٹھنے کا انتظام بھی تھا۔ ہلکی سی خنکی کے باوجود ہم نے باہر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ بہت خوب صورت سبزہ زار پر سلیقے سے میزیں لگائی ہوئی تھیں کیونکہ ہم سب کا ایک میز پر بیٹھنا ممکن نہیں تھا اس لیے بچہ پارٹی ایک میز پر چلی گئی اور ہم تینوں دوسری میز پر آگئے۔ معاً مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ کچھ دیر پہلے تک میں ہوٹل میں اکیلا تھا اور جل کڑھ رہا تھا کہ میرے بیوی بچے مجھے نظر انداز کر کے سیر و تفریح کرتے پھر رہے تھے۔ اب ہوٹل میں وہ شخص بالکل اکیلا تھا۔ یعنی چوہدری اور اس کے بیوی بچے ہمارے ساتھ تھے۔ اس کی کیا حالت ہو گی۔ میں مسز چوہدری سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"آپ کے شوہر کیوں نہیں آئے؟"

"میں نے کہا تو تھا۔" مسز چوہدری ہنسنے لگی "لیکن وہ بھی ذرا سر پھرے ہیں۔"

"بالکل ان کی طرح۔" بانو نے لقمہ دیا۔

اس کے بعد دونوں خواتین اپنی باتوں میں لگ گئیں اور میں خاموشی سے سامنے رکھے چپس کے ٹکڑوں سے شغل کرنے لگا۔ ایک بار پھر مجھے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ بچے خود میں مگن تھے اور یہ دونوں خواتین بھی جیسے مجھے فراموش کر چکی تھیں۔ میں پھر چوہدری کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یہاں ہوتا تو مجھے بھی کمپنی مل جاتی۔ معاً میں چوہدری کا لفظ سن کر چونکا۔ مسز چوہدری اپنے شوہر کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی۔ مثلاً یہ کہ اُسے فلموں کا شوق تھا۔ (یہ شوق مجھے بھی تھا) وہ کرکٹ کا دیوانہ تھا (تھوڑا بہت دیوانہ میں بھی تھا) اور یہ کہ چوہدری نے حال ہی میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کی تھی۔ (میں بھی ایک ایسی ہی ایجنسی کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا)

ویسے یہ سب کچھ بانو بھی مسز چوہدری کو بتاتی جا رہی تھی اور وہ اپنے شوہر اور میرے درمیان اس مماثلت سے خوش تھی۔

"حیرت ہے آپ دونوں کو دوست بن جانا چاہیے تھا۔" مسز چوہدری بولیں "اور آپ دشمنی پال کر بیٹھ گئے۔"

"میں ایسے تنک چڑھے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا۔" میں نے منہ بنا کر کہا پھر مجھے اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوا مگر مسز چوہدری برا مانے بغیر ہنس کر بولیں کہ بالکل یہی الفاظ ان کے بھی تھے۔

اسی اثنا میں کھانا آگیا۔ سب نے اپنی پسند کی ڈشیں منگوائی تھیں۔ بچے ہنستے بولتے کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد سمیرا نے آئس کریم کا شور مچایا۔ اسے آئس کریم بے حد پسند تھی۔ ہم ایک قریبی آئس کریم پارلر تک گئے اور آئس کریم لے کر کھاتے ہوئے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ رات ہو چکی تھی مگر چاندنی کے باعث اردگرد کے پہاڑ اور ان پر جمی برف صاف نظر آرہی تھی۔ ہوا کی خنکی بڑھ گئی تھی لیکن بری نہیں لگ رہی تھی۔ میرے کان بچوں کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ جو کل کسی خوب صورت جگہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ مجھے جھلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میں یہاں اپنے خاندان کے ساتھ تفریح کرنے آیا تھا اور وہ۔۔۔ حلق میں پھیلتے کڑواہٹ کے احساس نے آئس کریم کو بھی بدمزہ کر دیا تھا۔ میں نے اپنا کپ سڑک سے نیچے کھائی میں پھینک دیا۔

نہ جانے یہ رات کی خنکی کا اثر تھا یا آئس کریم کھانے کا نتیجہ۔ صبح اٹھا تو گلا جکڑا ہوا تھا اور جسم بخار میں مبتلا تھا۔ بانو اور بچے میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے ہوٹل والوں سے کہہ کر ڈاکٹر بلوایا۔ اس نے میرا معائنہ کیا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھنڈ کا اثر ہو گیا ہے۔ دو تین دن پرہیز اور آرام کریں گے تو بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس نے نسخہ لکھ کر دیا۔ مجھے ایک انجکشن ٹھونکا اور رخصت ہو گیا۔ بانو اور بچے میرے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔

"بچو۔۔۔! چلو اپنے کمرے میں انہیں آرام کرنے دو۔"

"نہیں ہم یہیں رہیں گے۔" سمیرا نے ضد کی۔

"پرامس امی ذرا بھی شور نہیں مچائیں گے۔" فاروق بولا۔

"تم لوگوں کا کہیں جانے کا پروگرام تھا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"وہ تو پاپا دوپہر کے بعد کا تھا لیکن اب ہم نہیں جائیں گے۔" عثمان بولا۔

"اور کیا چشمہ تو کل بھی دیکھ سکتے ہیں۔" سمیرا نے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھا۔

"کیسا چشمہ، کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پاپا۔ یہاں سے کچھ دور اوپر پہاڑ پر ہے۔ لوگ اسے محبت والا چشمہ کہتے ہیں اور یہ بھی کہ وہاں جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہو جاتی ہے۔" سمیرا نے جلدی سے بتایا۔

میں نے محسوس کیا کہ عثمان اور فاروق یہ سن کر کچھ جھینپ گئے تھے "تم لوگ میری وجہ سے اپنا پروگرام مت چھوڑو۔ ویسے بھی اب میں آرام کروں گا۔"

"نہیں ہم آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔" بانو بولی۔

"بلاوجہ کی ضد مت کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اب تم لوگ جاؤ۔"

مجبوراً وہ چلے گئے۔ ڈاکٹر نے جو انجکشن دیا تھا۔ وہ مسکّن تھا۔ بانو نے قریبی میڈیکل اسٹور سے دوائیں منگوائیں مجھے کھلائیں اور کمبل اوڑھا کر چلی گئی۔ میری آنکھ کھلی تو تین بج رہے تھے۔ میں نے بانو کو آواز دی کہ مجھے پانی پلائے مگر بانو کے بجائے چوہدری میرے سامنے آگیا۔ وہ کرسی پر دوسری طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے جگ سے پانی انڈیل کر مجھے پلایا۔ اس لمحے دواؤں کے زیر اثر میرا ذہن سن ہو رہا تھا پھر چوہدری نے ایک گلاس دودھ مجھے دیا۔

"یہ سب کہاں ہیں؟" خاصی دیر بعد میرے ذہن میں کرنے کو یہی بات آئی۔

"وہ پہاڑی چشمے کی طرف گئے ہیں۔ وہ تمہاری وجہ سے نہیں جارہے تھے مگر میں نے بھیج دیا۔ بچے ہم بڈھوں کی وجہ سے اپنی تفریح کیوں خراب کریں۔" وہ ہنسا۔

"بوڑھے تم ہو گے۔ میں ابھی صرف ادھیڑ عمر ہوں۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"اچھا۔۔ اچھا لڑنے اور بحث کرنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ پہلے صحت یاب ہو جاؤ۔" وہ ہنسا۔ اس نے مجھے دوائیں کھانے کو دیں۔ میں نے دوا کھائی اور دوبارہ لیٹ گیا۔ ذہن پہلے ہی غنودہ ہو رہا تھا۔ دواؤں کی وجہ سے میں پھر سو گیا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو بانو اور بچے آچکے تھے۔ میں طبیعت میں خاصی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ بچے برابر والے کمرے میں تھے اور ان کے چہکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دواؤں کی وجہ سے بھوک تو مرگئی تھی لیکن مجھے شدت سے چائے یا کافی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے فون پر روم سروس کو کافی لانے کو کہا۔ کچھ لمحے بعد بانو مسکراتی ہوئی آئی۔

"ارے آپ جاگ گئے۔ کچھ کھانے کو دوں؟"

"نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا۔ کافی منگوائی ہے۔" میں نے کہا لیکن بانو مجھے کچھ کھلانے پر مُصر رہی پھر اس نے دودھ میں اوولٹین ڈال کر زبردستی مجھے پلا دیا اور اس کے بعد چشمے تک جانے اور آنے کی روداد سنانے لگی۔ جو یقیناً اصل سفر سے زیادہ طویل ہوتی لیکن خوش قسمتی سے مسز چوہدری آگئیں۔ انہوں نے میری مزاج پُرسی کی پھر ایک میگزین مجھے دیا۔

"انہوں نے بھجوایا ہے۔ کہہ رہے تھے۔ وقت اچھا کٹے گا۔"

"چوہدری سے شکریہ کہہ دیجیے گا۔" میں نے میگزین لے لیا۔ مجھے شدت سے کسی ایسی چیز کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔ اخبار کا مجھے قطعی شوق نہیں تھا۔ فارغ اوقات میں کتابیں اور رسالے پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ مسز چوہدری نے بانو کو بتایا کہ ہوٹل کے سٹنگ روم میں خواتین کی محفل جمی ہوئی ہے۔ انہیں بھی مدعو کیا گیا ہے۔ ان کے جانے سے میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ شام کو خاصی بارش ہو گئی تھی۔ جس سے سردی کی شدت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے شیشے کی کھڑکی کے سامنے سے پردے ہٹائے۔ دور تک نکھری چاندنی رات پھیلی ہوئی تھی۔ سردی کے احساس کو کم کرنے کے لیے میں نے ہیٹر تیز کیا اور اپنے گرد اچھی طرح کمبل لپیٹ کر میگزین کے مطالعے میں کھو گیا۔ پڑھتے پڑھتے اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے چوہدری کا شکریہ ادا کر دینا چاہیے۔ میں نے ٹیلی فون آپریٹر سے اس کے کمرے میں ملانے کو کہا۔

"ہیلو، چوہدری۔ میں بٹ بول رہا ہوں۔ ہاں میگزین کے لیے شکریہ۔" میں نے کہا۔

"شکریے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں بیمار ہوتا تو تم بھی میرے لیے اتنا تو کرتے ہی۔"

ایک ثانیے کو مجھے شرمندگی سی ہوئی "میرا خیال ہے تم اکیلے ہو۔ اگر زحمت نہ ہو تو میرے کمرے تک آجاؤ۔"

"میرا خیال ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"صبح سے آرام ہی تو کر رہا ہوں اور نیند بھی نہیں آرہی۔ اگر تم آرہے ہو تو میں کافی کا آرڈر دے دیتا ہوں۔"

"لالچ دے رہے ہو۔ خیر میں آتا ہوں۔" اس نے ہنس کر فون بند کر دیا۔

میں نے فوراً روم سروس کو کافی مع کریم کا آرڈر دیا۔ اگر بانو ہوتی تو وہ مجھے ہرگز کافی نہیں پینے دیتی۔ بقول اس کے

کافی جگر جلاتی ہے۔ کچھ دیر بعد چوہدری جاوید میرے سامنے تھا۔ اس نے کرسی میرے بستر کے نزدیک گھسیٹ لی۔

"چوہدری میں شرمندہ ہوں۔۔" میں نے کہنا چاہا۔ تو اس نے بات کاٹ دی۔

"شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ غلطی میری بھی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری گاڑی کا خاصا نقصان ہوا ہے۔ میں یہ نقصان بھرنے کو تیار ہوں۔"

"اب اتنا بھی ذلیل مت کرو۔ تمہاری گاڑی کا بھی کم نقصان نہیں ہوا۔ اس کا بمپر خاصا قیمتی تھا۔"

"میں نے خاص طور سے منگوایا تھا۔" وہ بولا "لیکن اب تو بیکار ہے۔ میں نے ایک گیراج والے کو بیچ دیا۔"

اسی لمحے مجھے پھر ندامت ہوئی۔ اسے جلانے کے لیے میں وہی بمپر خرید کر اپنی ڈاج میں لگانے کے لیے دے آیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ کل ہی جا کر گیرج والے کو بمپر لگانے سے منع کر دوں گا پھر باتوں باتوں میں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لیا اور ہم میں بہت کچھ مشترک تھا۔ پیشے کے علاوہ دلچسپیاں بھی۔ چوہدری جاوید راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ اس نے آئی آر میں ایم اے کرنے کے بعد لندن سے ایڈورٹائزنگ میں ڈگری لی تھی۔ کئی برس مختلف اشتہاری کمپنیوں میں کام کرنے کے بعد اس نے اپنی ذاتی ایجنسی قائم کی۔ جو ابھی ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ دراصل اس شعبے میں کاروبار بڑھا تھا۔ ساتھ ہی مقابلہ بھی بڑھ گیا تھا۔ صارفین اور ناظرین اب انٹرنیشنل ایڈورٹائزنگ دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا معیار خود بخود بلند ہو گیا تھا۔

بانو اور مسز چوہدری واپس آئیں تو ہم لوگوں کو قہقہوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو دیکھ کر دنگ رہ گئیں تھیں۔ بانو کو تشویش لاحق ہو گئی "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں فی الوقت میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔"

انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری اور جاوید کی دوستی ہو گئی تھی۔ رات گئے گپ شپ کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ صبح اٹھ کر میں نے ناشتا کیا اور بانو کے منع کرنے کے باوجود گیرج جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ مجھے روکنے سے ناکام ہو کر بانو نے مجھے سر سے پیر تک کپڑوں میں لاد دیا۔ میں جاوید کے کمرے میں گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ اور مسز چوہدری خوش ہو گئے۔

"یار، ذرا گیرج تک جانا ہے۔ فوکسی مل جائے گی۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے بلا تامل چابی میری طرف اچھال دی "لیکن ذرا احتیاط سے بے چاری ویسے ہی زخمی ہے۔"

میں فوکسی لے کر گیرج پہنچا، خوش قسمتی سے مکینک نے بمپر ابھی ڈاج میں نہیں لگایا تھا۔ میں نے اس سے کہا "یہ بمپر اسی فوکسی میں لگا دو۔"

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا "ابھی کل تو آپ کچھ اور کہہ رہے تھے صاحب۔"

"یہ بھی میں ہی کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا "براہِ کرم جو کہا جا رہا ہے وہی کرو۔"

"مجھ کو کیا صاحب۔" اس نے کندھے اچکائے "پر معاوضہ اتنا ہی ہو گا۔"

"ٹھیک ہے اور ہاں ڈاج کا بمپر اس میں لگا دو۔"

"یہ آسانی سے ہو جائے گا۔ پرسوں تک آپ کو دونوں گاڑیاں تیار ملیں گی۔"

میں اسے کچھ رقم ایڈوانس دے کر چلا آیا۔ واپسی کے لیے میں نے ٹیکسی کر لی تھی۔ میں نے خود پر ندامت طاری کی اور چوہدری جاوید کے پاس پہنچا۔ میں نے کہا "یار، مجھے افسوس ہے۔ یہاں سے جاتے ہوئے گاڑی کا ایک ٹائر بلنے لگا تھا۔ میں نے مکینک کو دکھایا تو اس نے کہا کہ دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ گاڑی پرسوں مل جائے گی۔"

یہ سن کر پہلے تو چوہدری تھوڑا خاموش ہو گیا "کوئی بات نہیں، خرابی تو کہیں بھی ہو سکتی ہے۔"

"پھر بھی مجھے افسوس ہے۔ اس کی مرمت میں ہی کراؤں گا۔"

اس نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ خیر چھوڑو۔ میں نے ابھی ایک فلم منگوائی ہے۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے سامنے رکھا ٹی وی کھول کر وی سی آر چلا دیا۔ ساتھ ہی اس نے کافی کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم فلم اور کافی میں کھوئے ہوئے تھے۔ میرا یہ خدشہ کہ گاڑی خراب ہونے کا سن کر چوہدری بگڑ جائے گا غلط ثابت ہوا۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اسی لیے یہ بہانہ گھڑا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں حسبِ معمول تفریح کے لیے کہیں نکلے ہوئے تھے۔ فلم کے بعد میں اس سے معذرت کر کے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ کچھ دیر کے لیے سو جاؤں۔ میں نے دوپہر کا کھانا کمرے میں ہی کھایا اور سو گیا۔ شام کو اٹھا تو معلوم ہوا کہ چوہدری سب کو تفریح کرانے کہیں لے گیا ہے۔

اگلے روز میری طبیعت خاصی حد تک ٹھیک ہو گئی تھی۔

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس روز بچوں کا نتھیا گلی جانے کا پروگرام تھا۔ ظاہر ہے گاڑیاں تو گیراج میں پڑی ہوئی تھیں لہٰذا انہوں نے ایک وین کرلی۔ خلافِ توقع چوہدری نے جانے سے انکار کردیا۔

"یہ بچوں کی گیدرنگ ہے اور خواتین سے میں کیا بات کروں گا۔ بہتر ہے تمہارے پاس ہی ٹھہروں۔"

میرے زور دینے کے باوجود وہ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ بچوں اور خواتین کے جانے کے بعد ہم دونوں نے ڈراف کھیلا۔ فلم دیکھی۔ آپس میں ڈھیروں باتیں کیں۔ چند دن میں ہم ایک دوسرے کے بے حد نزدیک آگئے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم ٹہلنے کے لیے باہر نکل آئے۔ دو دن کی سردی کے بعد دھوپ کی تمازت اچھی لگ رہی تھی۔ ہم ٹہلتے ہوئے سڑک سے ذرا نیچے ایک سرسبز قطع تک چلے گئے۔ وہاں بھیڑیں چر رہی تھیں۔ ہم وہیں گھاس پر بیٹھ گئے۔

"بٹ تم نے محسوس کیا کہ ہمارے بچے ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر خوش ہیں۔" چوہدری نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں بھی اس سے کہنا چاہ رہا تھا مگر جھجک آڑے آتی۔ اب اس نے کہا تو میری ہمت بھی کھل گئی "سچی بات یہ ہے چوہدری کہ مجھے تمہاری بیٹیاں بہت اچھی لگی ہیں۔"

"تمہارے لڑکے بھی بہت اچھے ہیں ورنہ میں اپنی بیٹیوں کے معاملے میں یوں ہر کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔"

"تم نے بیٹیوں کے رشتے کی بات تو نہیں چلائی ہے؟"

"رشتے تو کئی آئے لیکن ہم فی الوقت اپنی بچیوں کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتے۔ نورین بی اے کے پہلے سال میں ہے اور مہرین فرسٹ ائیر میں ہے۔ دونوں زیادہ عمر کی نہیں ہیں۔"

"میرے بیٹے بھی ابھی پڑھ رہے ہیں۔ عثمان انجینئرنگ کررہا ہے اور فاروق ایم' بی' اے۔ انہیں تعلیم مکمل کرنے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں چار پانچ سال تو لگیں گے۔"

ہم نے کھل کر نہیں کہا تھا لیکن اپنی بات بھی کہہ گئے تھے۔ اچانک چوہدری نے سرد آہ بھر کر کہا "کاش میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا تو۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میرے بیٹوں کو بھی تم اپنے ہی بیٹے سمجھو۔"

"تو پھر بات پکی!" اس نے ہاتھ آگے کیا۔

"بالکل پکی۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جو اس نے گرم جوشی سے بھینچ لیا۔

ایک ہفتہ مری میں ٹھہر کر ہم کاغان کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے چوہدری اور اس کے گھر والوں کا پروگرام صرف مری تک محدود تھا لیکن ہمارے اصرار پر وہ ساتھ چلنے کو ہوگئے تھے۔ روانگی سے دو دن پہلے میں نے اسے تو کسی [illegible] دی اور جب چوہدری نے سنہری بمپر کو اپنی جگہ لگے دیکھا تو پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور جب آیا تو وہ مارے خوشی کے مجھ سے لپٹ گیا۔

"دل خوش کردتا ای یارا!" اس نے کہا۔

بس میں یہی دیکھنا چاہتا تھا اور اسی لیے گاڑی خراب ہونے کا جھوٹ بولا تھا۔

کاغان' پھر سوات اور دیر' ہر جگہ ہم ساتھ ساتھ رہے۔ پیشگی بکنگ کرانے کی وجہ سے ہمیں ہوٹلوں میں جگہ ملتی رہی تھی ورنہ سیزن کے دنوں میں ان جگہوں پر سنگل کمرے کا حصول بھی دشوار ہوجاتا ہے۔ ایک مہینے بعد جب ہم واپس آئے تو مضبوط بندھن میں جڑ چکے تھے کیونکہ دونوں خاندانوں میں منگنی کا رواج نہیں تھا۔ لہٰذا رسمی بات چیت کرکے ہم نے عثمان کے لیے نورین کو اور فاروق کے لیے مہرین کو مانگ لیا۔ طے پایا کہ پہلے وہ تعلیم مکمل کرکے ملازمت کریں گے اس کے بعد ان کی شادیاں کی جائیں گی۔ تب تک دونوں بچیاں تعلیم حاصل کرتی رہیں گی۔

ممکن ہے آپ کو اس سچ بیانی میں کوئی کہانی نہ ملے۔ میں نے یہ ان دنوں کی روداد بیان کی ہے۔ جب قدرت نے دو خاندانوں کا ملاپ انوکھے طریقے سے کرایا۔ اس میں کئی سبق بھی پوشیدہ ہیں کہ اگر ہم اپنی اَنا مار کر دوسروں کا خیال رکھیں تو نہ صرف اختلافات کم ہوسکتے ہیں بلکہ آپ کو اچھے دوست بھی مل سکتے ہیں۔ اب دیکھنے والے مجھے اور چوہدری کو بچپن کا یار سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہمارے تعلقات ایک حادثے سے شروع ہوئے تھے۔

ہاں آئی جی فاروقی کا مجھے چھٹی دینے کا مقصد تھا کہ اسے بھنک مل گئی تھی کہ ایک اور ایڈورٹائزنگ کمپنی مجھے بہتر تنخواہ اور سہولیات پر اپنے ہاں ملازم رکھنا چاہتی تھی۔ ان کی دست برد سے بچانے کے لیے اس نے مجھے "چھٹی" دے کر تفریح کے لیے بھیج دیا۔ اس بات نے مجھے اتنا دل برداشتہ کیا کہ میں نے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ چوہدری نے مجھے اپنی فرم میں شراکت کی پیشکش کی جو میں نے قبول کرلی۔ اب میں خود اپنے کاروبار کا مالک ہوں۔ بہت بڑی نہ سہی لیکن ہم نے اپنی پوزیشن مستحکم بنالی ہے۔ انشاء اللہ کچھ عرصے بعد ہم اپنے بچوں کی شادیاں کردیں گے اور اس کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ دونوں ایک لمبے تفریحی سفر پر روانہ ہوجائیں گے۔

*****

عقب زن

محترمی و مکرمی، السلام علیکم

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ میں ایک سچ بیانی روانہ کر رہا ہوں لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں کوئی لکھاری ہرگز نہیں ہوں۔ اپنے انداز میں تمام صورتحال لکھ دی ہے جو میرے ساتھ ہوئی تھی۔ آگے اس کی اصلاح و درستی کا کام آپ پر چھوڑتا ہوں۔

خدا حافظ

سلمان ارشد، اسلام آباد

اسلام آباد کا معاشرتی طرزِ عمل کچھ ایسا ہے کہ قربتوں میں بھی فاصلوں کا گمان رہتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے ضرور ہیں لیکن تکلف کے ساتھ۔ دفتروں کی افسری' ماتحتی عام زندگی میں بھی سرایت کرگئی ہے۔ یہاں لوگوں کو عہدوں اور منصب سے پہچانا جاتا ہے۔

اسلام آباد کی اس فضا کا اثر مجھ پر کچھ زیادہ ہی ہوا تھا۔ میں تو گھر کے اندر بھی کسی سے بے تکلف ہونے کا قائل نہیں تھا۔ کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑا رہتا تھا۔ گھر میں دو چھوٹے بھائی تھے۔ تین بہنیں تھیں۔ ہر وقت قہقہے گونجتے رہتے تھے لیکن میں اپنا کمرا بند کیے بیٹھا رہتا تھا۔

میں نے انٹر تک پڑھنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ شاید اس میں بھی میری تنہائی پسندی ہی کا دخل ہو۔ میوزک کا مجھے البتہ شوق تھا۔ اس عمر میں سبھی کو ہوتا ہے لیکن مجھے کچھ زیادہ ہی تھا۔ کمرا بند کرکے میوزک سننا ہی میرا مشغلہ تھا۔

ڈیڈی میری جانب سے سخت فکر مند رہتے تھے۔ میرے پاس نہ تو ایسی تعلیم تھی کہ کوئی اچھی نوکری مل سکتی اور نہ ہی میں اتنا سوشل تھا کہ کوئی کاروبار کرسکتا لیکن اتنا مجھے بھی

معلوم تھا کہ کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ کیا کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آدمی دوستوں میں بیٹھتا ہے۔ مشورے کرتا ہے تو کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے لیکن میرا تو کوئی دوست ہی نہیں تھا۔ ایک آدھ تھا بھی تو اس سے کوئی مشورہ کرنا میری شان کے خلاف تھا۔

ڈیڈی کی فکر اب تشویش میں بدلنے لگی تھی۔ وہ چاہتے تھے، میں کوئی کاروبار کرلوں۔ انہوں نے کئی کاروبار تجویز کیے۔ کئی پروگرام میرے سامنے رکھے لیکن کوئی میرے مطلب کا نہیں تھا پھر جو انہوں نے سوچا، وہ انہی کا ذہن سوچ سکتا تھا۔

"کاروبار وہ کرو جو تمہارا شوق بھی ہو۔ تمہیں میوزک کا شوق ہے لہٰذا میوزک شاپ کھول لو۔ کیسٹوں کا کاروبار اچھا خاصا منافع بخش ہے۔"

ان کا یہ آئیڈیا مجھے بھی پسند آیا بلکہ افسوس ہوا کہ اب تک یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔ صاف ستھرا کاروبار ہے۔ ٹھاٹ سے بیٹھا نئے نئے گانے سنتا رہوں گا۔

جب اس کاروبار کا ارادہ کر ہی لیا تو چاہا کہ کچھ معلومات بھی حاصل کرلوں۔ میں نے مختلف دکانوں پر جاکر معلومات جمع کرنی شروع کردیں۔ تمام باتوں کے علاوہ ایک بات میرے لیے بہت زیادہ دل خوش کن تھی اور وہ یہ کہ خریداروں کی تعداد زیادہ تر لڑکیوں پر مشتمل تھی۔

میں ایک دکان پر بیٹھا تھا کہ چند لڑکیاں آئیں۔ انہوں نے جس انداز سے انڈین گانوں کے بول ادا کرکے اپنی من پسند کیسٹ مانگی، وہ دیکھنے کی چیز تھی۔ ایک گانے کو دکان دار سمجھ نہیں رہا تھا تو ان میں سے ایک نے باقاعدہ گنگنا کر سمجھایا۔ میں نے اسی وقت طے کرلیا کہ بس یہی کاروبار کرنا ہے۔ کسی اور کام میں یہ تفریح کہاں۔

میں نے ڈیڈی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ دکان کا انتظام انہوں نے پہلے ہی کرلیا تھا۔ صرف یہ دیکھنا تھا کہ اس دکان میں کس قسم کا مال بھروائیں۔ جب طے ہوگیا تو انہوں نے کیسٹوں سے دکان بھردی۔

دکان اتنی شان دار ڈیکوریٹ ہوئی تھی کہ افتتاح ہوتے ہی خریداروں کا ہجوم لگ گیا۔ ان خریداروں میں ظاہر ہے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ موسیقی سے میرا شغف اب کام آرہا تھا۔ میں ان لڑکیوں کو ہر گانے کے بارے میں اتنی معلومات فراہم کرتا کہ وہ حیران رہ جاتیں۔ ایک کیسٹ لینے آتیں تو چار چار لے کر جاتیں۔ میری کارکردگی سے ڈیڈی بھی بہت خوش تھے۔ ابتدا ہی میں اتنی سیل ہونے لگی تھی کہ میرا مستقبل روشن نظر آنے لگا تھا۔

لڑکیوں کے جو جھرمٹ میری دکان پر آتے تھے ان سے باتیں کرکے دل تو بہل جاتا تھا لیکن دُور کے ڈھول سہانے والی مثال صادق آرہی تھی۔ میں نے جب دکان نہیں کی تھی تو دوسروں کی دکان پر بیٹھ کر یہ سوچا کرتا تھا کہ ان لڑکیوں میں سے ہر لڑکی سے دوستی کی جاسکتی ہے۔ اب میرا یہ خیال غلط ثابت ہوتا جارہا تھا۔ یہ لڑکیاں دکان کی حد تک تو بہت ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھیں لیکن اس سے آگے کے لیے تیار نہیں تھیں بلکہ میں نے تو یہ محسوس کیا کہ بعض لڑکیوں نے میری دکان پر آنا ہی بند کردیا۔ میں محتاط ہوگیا کہ اگر یہی حال رہا تو دکان داری ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ ہمارے گھر کے سامنے والے بلاک میں ایک نئی فیملی آئی۔ سرکاری مکانوں میں یہ اکثر ہوتا ہے۔ مکان خالی ہوتے اور بھرتے رہتے ہیں۔ کسی کا تبادلہ ہوا، وہ چلا گیا۔ دوسرا آگیا۔ ان لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ سوڈان میں تھے اور اب پاکستان آگئے ہیں۔

میں ایک روز دکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق سے اس وقت دکان خالی تھی کہ میری ہی عمر کا ایک لڑکا دکان میں داخل ہوا۔

"جی فرمائیے۔ کیا چاہیے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" اس نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"جی نہیں۔" میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے! میں تمہارے سامنے ہی بلاک میں رہتا ہوں لیکن تم نے مجھے کبھی دیکھا تک نہیں۔ میں تو تمہیں کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ آج ادھر سے گزر رہا تھا کہ تمہیں دیکھ کر رُک گیا۔"

"میں گھر سے باہر کم ہی نکلتا ہوں اس لیے تم پر نظر نہیں پڑی ہوگی۔"

مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ گاہک نہیں ہے۔ دوستی کا میں قائل نہیں تھا اس لیے میری گرم جوشی، سرد مہری میں بدل گئی تھی۔ میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ بے رخی سے اس سے بات کروں۔ وہ مجھ سے پوچھے بغیر کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ میں اسے اٹھا تو نہیں سکتا تھا لیکن یہ تو کرسکتا تھا کہ کسی کام میں مصروف ہوجاؤں۔ میں نے مروت کو بالائے طاق رکھا اور کیسٹوں کو چیک کرنے میں مصروف ہوگیا۔ دکان پر رکھے ہوئے ڈیک فل رفتار سے بج رہے تھے۔ وہ نہ جانے کیا کیا بول رہا تھا۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس دوران میں ایک دو گاہک بھی آئے جنہیں میں نے بڑی خندہ پیشانی سے

نمٹایا۔ وہ ڈھیٹ بنا ابھی تک بیٹھا تھا۔ اب مجھے اس کی موجودگی سے غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ شخص کچھ دیر بعد اٹھ کر نہیں گیا تو میں اسے زبردستی اٹھادوں گا لیکن میں ایسا کر نہیں سکا اس لیے بھی کہ جب سے دکان کی تھی، میں بااخلاق ہوگیا تھا اور اس لیے بھی کہ کچھ دیر بعد وہ خود ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اچھا سلمان، اب میں چلتا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

اس نے اتنی بے تکلفی سے میرا نام لیا کہ میں دانت پیس کر رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ لوگوں کے پاس کتنا وقت ہوتا ہے۔ جان نہ پہچان چلے آتے ہیں ملنے کے لیے۔ اب آیا تو کہہ دوں گا کہ دکان پر مجھے کسی دوست کا آنا پسند نہیں ہے۔

دوسرے دن میں نے دکان کھولی ہی تھی کہ وہ پھر نازل ہوگیا اور اس بے تکلفی سے جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔

"یار، تم سے ایک مرتبہ کیا مل لیا۔ جی چاہتا ہے روز ملا جائے۔ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔"

"بھائی میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے کہ لوگوں سے ملتا پھروں۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو دکان پر آجاتا ہوں کہ تمہارے کام کا حرج بھی نہ ہو اور ملاقات بھی ہوجائے۔"

"اسلام آباد میں اتنے لڑکے ہیں۔ کسی کے پاس بھی جاسکتے ہو۔ یہاں کیوں چلے آتے ہو؟"

میرے منہ سے بہت سخت بات نکل گئی تھی لیکن وہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔

"پیارے، دل ملنے کی بات ہے۔ تم سے دل مل گیا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ میں دکان داری میں دوستی کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے اچھا نہیں لگتا گاہکوں کے علاوہ کوئی اور یہاں آئے۔"

"یہ تو اچھا اصول ہے پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ دکان بند کرنے کے بعد کہیں باہر ملا کریں گے۔"

"اتنا وقت کہاں بچتا ہے۔"

"وقت نکالنے سے نکلتا ہے۔ میرا گھر حاضر ہے۔ میری طرف آجایا کرو۔"

"دیکھا جائے گا۔"

میں نے بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا تھا حالانکہ اس کے گھر جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اگلے دو دنوں تک وہ میری دکان پر نہیں آیا۔ میں نے سوچا، جان چھوٹی لیکن ایک دن وہ پھر آگیا۔

"یار، تم آئے ہی نہیں۔ خیر، میں آگیا۔ گھر اس لیے نہیں آیا کہ تم نے کہا ہی نہیں تھا۔ ویسے میں آج خریدار بن کر بھی آیا ہوں۔ ایک کیسٹ چاہیے ہے۔ میری بہن ہے نسیمہ۔ اسے بہت شوق ہے۔ اسی نے منگائی ہے۔"

اس نے کیسٹ کا نام بتایا۔ میں نے کیسٹ نکال کر اسے دے دی۔ اس نے کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں اور چلا گیا۔

یہ تو طے تھا کہ وہ مجھ سے دوستی بڑھانا چاہتا ہے لیکن دوستی تو خود بخود ہوجاتی ہے۔ وہ جس بے صبری سے بڑھ رہا تھا، اس سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ اس دوستی کے پیچھے کچھ اور بھی ہے۔ یہ عقدہ بھی جلد ہی حل ہوگیا۔ ایک دن آیا تو نسیمہ اس کے ساتھ تھی۔ اسے خوب صورت لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ ہنسنے میں دانت اس طرح چمکتے تھے جیسے بجلی سی کوند جائے۔

"یہ میری بہن نسیمہ ہے۔"

"اور یہ میرے بھائی رمیز ہیں۔" نسیمہ نے کہا اور کھل

دھماکا

اب تک کی معلومہ تاریخِ انسانی میں سب سے بڑا قدرتی دھماکا جو شہاب ثاقب سے پیدا ہوا وہ روس کے علاقے سائبیریا میں ۳۰ جون ۱۹۰۸ء کو رونما ہوا تھا۔ اس دھماکے سے ایک ہزار مربع کلومیٹر کا علاقہ بری طرح متاثر ہوا تھا۔ یہ دھماکا اس قدر خوفناک تھا کہ ایک آدمی جو ساٹھ میل دور کھڑا تھا، وہ زمین پر گر پڑا اور دھماکے سے پیدا ہونے والی شاک ویو سے بے ہوش ہوگیا تھا اور اس واقعہ کو TUNGUSKA EVENT کہا جاتا ہے۔ اس دھماکے کی اصل وجہ ایک تیس میٹر چوڑی چٹان تھی جو فضا میں دس کلومیٹر اوپر بلندی میں پھٹی اور اس کے نتیجے میں جو تباہی پیدا ہوئی وہ دس میگاٹن کے ہائیڈروجن بم کے پھٹنے کے برابر تھی۔ اس زبردست دھماکے سے اردگرد تیس میل کا علاقہ برباد ہوگیا اور تمام درخت جھلس کر راکھ ہوگئے تھے۔ کیا عجب تُونے ہر اک ذرّے میں رکھے ہیں خواص۔ کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتران اسرار کا۔

محمد یونس بلوچ، جرمنی

کھلا کر ہنس پڑی۔
"یار' میں نے کہا اپنے دوست کی دکان ہے۔ تم خود چل کر اپنی پسند کی کیسٹس منتخب کرلو۔" رمیز نے کہا۔
اب کسی بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں شاید پہلی مرتبہ رمیز کی موجودگی میں مسکرایا تھا۔
"آپ کی اپنی دکان ہے۔ کہیے' کون سی کیسٹس نکال دوں۔"
نسیمہ نے ایک فہرست میری طرف بڑھادی۔ میں نے ایک نظر اس فہرست پر ڈالی اور اس کی مطلوبہ کیسٹس اس کے سامنے رکھ دیں۔
"بہت شوق ہے آپ کو میوزک کا؟"
"یوں سمجھئے کہ دیوانگی کی حد تک۔" اس نے کہا۔
"یہ تو بڑی خراب بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کچھ اور تو آپ کرتی ہی نہیں ہوں گی۔"
"جی نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے بی' ایس' سی کیا ہے۔"
رمیز سے بات کرتے ہوئے مجھے جتنی کوفت ہوتی تھی' نسیمہ سے بات کرتے ہوئے اتنی ہی خوشی ہو رہی تھی۔ موسیقی کے بارے میں اس کی معلومات بھی بہت تھیں اس لیے خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ رمیز کو شک نہ ہو' لہٰذا اس سے بھی باتیں کرنی پڑ رہی تھیں۔ پھر میں نے مزید دیر لگانے کے لیے کولڈ ڈرنک منگوالی۔
وہ بڑی بے حجاب لڑکی تھی۔ تھوڑی دیر میں اس طرح گھل مل گئی کہ غیریت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔
اٹھتے وقت اس نے بھی یہی تقاضا کیا کہ میں اس کے گھر آؤں۔ اس مرتبہ میں یہ نہیں کہہ سکا کہ دیکھا جائے گا بلکہ وعدہ کرلیا کہ آؤں گا۔
اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عام طور پر لڑکیاں اتنی جلد بے تکلف نہیں ہوتیں جبکہ میں صرف دکان دار نہیں تھا' اس کا محلے دار بھی تھا۔ مجھے اب یہ تشویش ہونے لگی تھی کہ اس کے گھرانے کو دیکھا جائے۔ کس قسم کے لوگ ہیں۔ یہ اندازہ گھر جا کر ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ کسی دن اس کے گھر جاؤں گا۔
وہ جس اپنائیت سے ملی تھی' اس کے بعد میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ ایک دن بھی ضائع کرتا۔ اسی دن شام کو میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچتے ہی میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوگیا کہ وہ ٹھیک لوگ نہیں ہیں۔ اس کے والد فارن آفس میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ شام کا وقت تھا اس لیے وہ بھی گھر پر ہی تھے۔ نہایت خوش دلی سے ملے۔ رمیز نے میرا تعارف اتنے اچھے الفاظ میں کرایا کہ میں اس کی دوستی کا قائل ہوگیا۔
میں نسیمہ کے لیے آیا تھا مگر وہی سامنے نہیں آرہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے بوریت شروع ہوگئی۔ میں نے چلنے کے لیے کہا لیکن نسیمہ کی امی کے اصرار پر بیٹھ گیا۔ یہ توقع بھی تھی کہ شاید نسیمہ آجائے۔ خدا نے میری دعا سن لی۔ نسیمہ چائے کی ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئی۔
"یہ سلمان ہیں۔ سامنے والے بلاک میں رہتے ہیں۔ رمیز کے دوست ہیں۔" نسیمہ کی امی نے میرا تعارف کرایا۔
نسیمہ ایسی بن گئی تھی جیسے آج پہلی مرتبہ مجھ سے مل رہی ہو۔
"آپ اپنے گھر والوں کو بھی لے آتے۔" نسیمہ نے کہا۔
"میرا اکیلا آنا آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔"
"ارے نہیں۔ آپ تو ناراض ہوگئے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اسلام آباد میں کسی سے ملتا تو ہے نہیں۔ آپ کے گھر والے آجاتے تو ہمیں مزید خوشی ہوتی۔"
"لے آؤں گا کسی روز۔ ویسے آپ پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ کسی روز آپ لوگ آجائیں۔"
وہ تو یہ سن کر چپ ہوگئی لیکن اس کی امی نے وعدہ کیا کہ وہ کسی روز نسیمہ کو لے کر ضرور آئیں گی۔
وہ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے ڈیڈی بھی چلے گئے۔
"بیٹا' تم کچھ خیال مت کرنا۔" اس کی امی نے ان کے جانے کے بعد کہا "میرے شوہر ذرا پردے کے معاملے میں سخت مزاج ہیں۔ زیادہ آزادی کو پسند نہیں کرتے اسی لیے نسیمہ کو میں نے بھیج دیا۔ آتے جاتے رہو گے تو غیریت کا احساس نہیں رہے گا۔"
"امی' یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ زیادہ آزادی کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔ ویسے بھی میں تو رمیز سے ملنے آیا تھا۔"
"اب تم آگئے ہو تو میرے بیٹے کی طرح ہو۔ اس گھر کے فرد ہو۔ آتے جاتے رہنا۔ اچھا۔"
"جی بہتر۔"
اس گھر کا سلیقہ اور شرافت دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ خاص طور سے اس بات سے کہ وہ لوگ مغرب پرست

نہیں تھے۔ آزادی بلکہ بے راہ روی کو ناپسند کرتے تھے۔
ان پابندیوں کو دیکھتے ہوئے نسیمہ کی بے حجابی مجھے عجیب سی لگی تھی۔ گھر پر اس کا انداز دوسرا تھا' دکان پر دوسرا۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ جوانی میں یہ خیال بہت جلد دل میں گھر بنالیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک ہی دن میں اس کی محبت میرے دل میں گھر کرگئی۔ اب یا تو وہ آتی یا میں اس کے گھر جاتا۔ اس کے گھر کا ماحول دیکھ کر اکیلے جانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے ایک دن تینوں بہنوں کو ساتھ لیا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ اب چونکہ بہنیں میرے ساتھ تھیں اس لیے نسیمہ کو ہمارے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے یہ بات نوٹ کی کہ جب بھی میری نظر نسیمہ سے ٹکراتی تھی وہ جھک کے مسکرادیتی تھی۔ یہ بات میرے لیے بے حد حوصلہ افزا تھی۔
میری ایک بہن جس کا نام عذرا ہے' سہیلیاں بنانے میں ماہر ہے۔ اس نے نسیمہ سے بھی فوراً دوستی گانٹھ لی۔
یہ دوستی تھوڑی ہی دیر میں گویا اتنی بڑھ گئی کہ عذرا کے کہنے پر نسیمہ اسی وقت ہمارے گھر چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ ہمیں چھوڑنے کے بہانے ہمارے گھر آئی۔ رمیز بھی ہمارے ساتھ ہی تھا کیونکہ اس سے دوستی اب میری مجبوری ہوگئی تھی۔
ان کے جانے کے بعد میری بہنوں نے مجھے گھیرلیا۔ خاص طور پر عذرا بہت بڑھ بڑھ کر بول رہی تھی۔
"بھائی جان' لڑکی تو اچھی ہے۔ کہو تو بات آگے بڑھائیں۔"
"پاگل ہوگئی ہے کیا۔ میں نے تو اس نظر سے اسے دیکھا بھی نہیں۔"
"اب یونہی تو ہمیں لے نہیں گئے تھے۔"
"وہ تو رمیز کی امی نے اصرار کیا تھا اس لیے تم لوگوں کو لے گیا تھا۔"
"انہوں نے کیوں اصرار کیا تھا؟"
"مجھے کیا خبر۔ پوچھو ان سے جا کر۔"
"اس کا مطلب ہے' انہوں نے بھی آپ کو پسند کرلیا ہے۔"
"تم لڑکیوں کو کوئی اور بات نہیں آتی؟" میں نے کہا۔ اور ان کے سوالوں سے بچنے کے لیے گھر سے نکل گیا۔
میرے دل میں جو وسوسہ پیدا ہوا تھا' بہنوں کی چھیڑ چھاڑ نے اسے تقویت دے دی۔ رات کو گھر لوٹ کر آیا تو نسیمہ کا خیال میرے ساتھ تھا۔
کبھی رمیز میری دوستی کا خواہاں تھا' اب میری باری تھی۔ وہ پہلے ہی میرے دام میں آچکا تھا۔ اس سے دوستی بڑھانا کون سا مشکل تھا۔ ہماری اکثر شامیں ساتھ گزرنے لگیں۔ وہ شام کو دکان پر آجاتا۔ دکان بند کرنے کے بعد یا تو اس کے گھر جا کر بیٹھ جاتے یا کسی ہوٹل کو آباد کرلیتے۔
اب اس کا گھر میرے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ میں دن میں بھی چلا جاتا تھا۔ اس کے ڈیڈی اور رمیز دونوں دفتر گئے ہوئے ہوتے۔ امی گھر پر ہوتیں۔ میں اور نسیمہ بیٹھ کر خوب باتیں کرتے تھے۔
ہماری محبت روز بہ روز پروان چڑھ رہی تھی۔ اب نسیمہ کا بیشتر وقت ہمارے ہی گھر گزرتا تھا۔ میری وجہ سے دونوں گھر ایک ہوگئے تھے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں چاہتا تھا میری امی اسے پسند کرنے لگیں اور میرے کہنے سے پہلے امی کا خیال اس کے لیے ہو جائے۔
امی نہ جانے کس وقت کا انتظار کر رہی تھیں اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہنوں سے کچھ کہہ کر میں اپنی بات نیچی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ میں نے نسیمہ سے بات کی۔
"تمہاری کوئی سہیلی ہے؟ بہت گہری سہیلی۔ جس سے تم دل کی ہر بات کہہ سکو۔" میں نے نسیمہ سے کہا۔
"ایک سہیلی ایسی ہے تو۔"
"اسے مجھ سے ملوادو۔"
"کیوں' کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے؟"
"یہ بات نہیں ہے۔ میں اسے اپنی امی کے پاس بھیجوں گا تاکہ وہ میری اور تمہاری محبت کی داستان انہیں سنا کر ہماری شادی کے لیے انہیں تیار کرے۔"
"تم خود کیوں نہیں کہہ دیتے؟"
"میری ہمت نہیں ہوتی۔ وہ پوچھیں گے تو بے شک کہہ دوں گا۔"
وہ تیار ہوگئی پھر اس نے جس لڑکی سے مجھے ملوایا' اسے دیکھ کر مجھے سوچنا پڑا کہ نسیمہ سے پہلے میں اس سے کیوں نہیں ملا۔ بے حد خوب صورت اور نہایت پُرمذاق لڑکی تھی۔ مجھے تو یہ ڈر ہونے لگا کہ اگر وہ امی کے پاس گئی تو کہیں امی اسی کے گھر رشتہ لے کر نہ پہنچ جائیں۔
اس لڑکی کا نام نیلم تھا اور یہ ایجوکیشن آفس میں کسی آفیسر کی سیکریٹری تھی۔ پہلے تو وہ ہماری محبت پر دیر تک ہنستی رہی حالانکہ یہ ہنسنے کی بات نہیں تھی پھر اس سے زیادہ وہ اس

بات پر ہنسی کہ اس کے ذریعے پیغام پہنچایا جائے گا۔

"پہلے زمانے میں ایسی عورتیں ہوا کرتی تھیں جو رشتے لگاتی تھیں۔ آپ لوگوں نے تو مجھے وہ عورت بنا دیا۔ بس اتنا فرق ہے کہ حسن و جمال کے بجائے عشق و محبت کے قصیدے سنانے پڑیں گے۔"

"آپ اپنی سہیلی کے لیے اتنا سا کام نہیں کر سکتیں؟"

"میں تو چاہتی تھی، اسے کوئی اچھا رشتہ ملے لیکن خیر، قسمت اس کی۔ یہ کام بھی کرنا ہی پڑے گا۔"

اب وہ ایک خاص منصوبے کے تحت نسیمہ کے ساتھ میرے گھر آنے لگی۔ چند روز کی ملاقاتوں کے بعد وہ امی سے گھل مل گئی پھر ایک دن یہ مژدہ اس نے مجھے سنا دیا کہ اس نے امی کے کان میں بات ڈال دی اور وہ تیار بھی ہیں۔ اس طرف سے فارغ ہونے کے بعد یہی بات اس نے نسیمہ کی والدہ سے بھی کی۔

امی نے مجھ سے تصدیق کی اور مجھے اپنی محبت کا اقرار کرنا پڑا۔ امی کو نسیمہ پہلے ہی پسند تھی لہٰذا ڈیڈی سے بات کرنے کے بعد وہ رشتہ لے کر نسیمہ کے گھر پہنچ گئیں۔ کوئی اعتراض اس طرف سے بھی نہیں ہوا بلکہ انہوں نے تو رسمی تکلف کا اظہار بھی نہیں کیا۔ شادی کی تیاری میں کچھ دیر لگتی اس لیے پہلے منگنی کرلی گئی۔

منگنی میں نیلم بھی شریک تھی، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میں اس کے دفتر بھی پہنچ گیا۔

"اس میں شکریے کی کون سی بات ہے۔ یہ تو میری سہیلی کا کام تھا۔" اس نے کہا۔

"کام تو میرا بھی تھا۔"

"اچھا جناب شکریہ قبول لیکن اب ہمیں بھول نہ جایئے گا۔ کبھی کبھی ملاقات ہوتی رہنی چاہیے۔"

"بالکل ہوگی۔ ابھی تو آپ سے ہزاروں کام پڑیں گے۔"

"اب مجھے عقل آگئی ہے۔ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں کروں گی۔"

"میں ایڈوانس رشوت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ پیش کیجئے۔"

"آیئے، آپ کو لنچ کرائیں۔"

دفتر جاتے ہوئے، میری دکان اس کے رستے میں پڑتی تھی۔ اس لیے آتے جاتے ہیلو، ہائے ہونے لگی۔ کبھی کبھی اس کے پاس وقت ہوتا تو دکان پر رک کر گپ شپ بھی کرلیتی تھی۔

میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی چمک دیکھنے لگا تھا لیکن ظاہر ہے ایک وقت میں دو لڑکیوں سے تو منگنی نہیں ہو سکتی۔

اب صورتِ حال یہ ہوگئی تھی کہ نسیمہ میری منگیتر تھی اور نیلم میری دوست۔

منگنی کے بعد نسیمہ کے گھر والوں نے اسے منع کردیا تھا کہ وہ مجھ سے نہ ملے اس لیے ایک مرتبہ پھر مجھے نیلم کی ضرورت پڑگئی تھی۔ نسیمہ سے ملاقات اسی کے توسط سے ہو سکتی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اپنے دفتر لے آتی تھی اور میں اس کے دفتر چلا جاتا تھا۔

اتنی قربت بڑھی تو نیلم سے بھی میری بے تکلفی بڑھتی گئی۔ اب وہ پابندی سے میری دکان پر آنے لگی تھی۔ اب مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ نسیمہ کو اپنے ساتھ لانے سے گریز کرنے لگی ہے۔

"نسیمہ سے ملے ہوئے دو دن ہوگئے ہیں۔" ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"آپ تو اس کے مجنوں بن گئے ہیں۔ بھئی، اب تو منگنی ہو ہی گئی ہے۔ ایک دن شادی بھی ہو جائے گی پھر ایسی بے تابی کیا ہے۔"

"ملاقات ہوتی رہے تو حرج بھی کیا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ اس کے گھر والوں کو شک ہوگیا ہے۔ اب وہ میرے ساتھ بھی اسے کہیں نہیں جانے دیتے پھر بھی کسی دن موقع دیکھ کر لے آؤں گی۔"

"عجیب دقیانوسی لوگ ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ دراصل آپ نے غلطی کی ہے ان لوگوں کو پرکھنے میں۔"

"تم تو اس کی قریبی سہیلی ہو۔ تم تو جانتی ہوگی۔"

"مجھ سے کیا آپ نے مشورہ کیا تھا جو میں آپ کو رائے دیتی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کیسے لوگ ہیں؟"

"آپ کے لائق نہیں ہیں۔"

مجھے اس کا یہ کہنا برا لگا تھا۔ خود وہ جتنی آزاد خیال تھی، اس کے مقابلے میں نسیمہ کہیں بہتر تھی۔ اس کی بے باکی میں بھی ایک قسم کی شرم تھی البتہ ایک بات مجھے ضرور کھٹکتی تھی۔ وہ یہ کہ اس کے بھائی نے خود مجھے اس سے متعارف کرایا تھا اور قریب آنے کا موقع دیا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے، رمیز کو ہماری محبت کا علم تھا لیکن اس نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔

ابھی ہماری منگنی کو بہ مشکل چھ یا سات ماہ گزرے تھے کہ ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ ان کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے میری شادی پر اصرار کیا۔

یہ شادی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ڈیڈی اسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی۔ ان حالات میں کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں تو سادگی سے شادی کرنے کے لیے تیار تھا لیکن بہنوں کے منہ لٹک گئے تھے۔ امی نے ڈرتے ڈرتے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ابھی نکاح کرلیا جائے اور ڈیڈی کے صحت یاب ہوتے ہی رخصتی کرلی جائے۔ میں بھی ڈیڈی کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ انکار نہ کرسکا۔ نسیمہ کے گھر والے بھی پس و پیش کے بعد مان گئے اور یوں نسیمہ سے میرا نکاح ہوگیا۔

نکاح کے بعد وہ قانونی طور پر میری بیوی تھی لیکن وہ لوگ عجیب تاریک خیال ثابت ہو رہے تھے۔ نکاح کے بعد بھی وہ اسے میرے ساتھ کہیں جانے کی اجازت دینے سے گریزاں تھے۔ اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا جب ڈیڈی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ میں اسپتال جا رہا تھا۔ میں نے سوچا، نسیمہ کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ میں اس کے گھر گیا اور اس کے والد سے نسیمہ کو اپنے ساتھ اسپتال لے جانے کے لیے کہا۔

"میاں، ابھی نکاح ہوا ہے، رخصتی نہیں ہوئی جو تم اسے کہیں ساتھ لے کر جا سکو۔"

"انکل، میں اسے اسپتال لے کر جا رہا ہوں۔ کہیں اور نہیں۔"

"آج اسپتال لے کر جا رہے ہو۔ میں نے اجازت دے دی تو کہیں اور بھی چلے جاؤ گے۔"

"ڈیڈی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔"

"ایسا ہی ہے تو میں اسے خود لے کر آجاؤں گا لیکن تمہارے ساتھ بھیجنا مناسب نہیں ہے۔"

ان کے اس دو ٹوک سوال پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن یہ وقت کسی بحث کا نہیں تھا۔ میں چپ چاپ وہاں سے اٹھا اور اسپتال پہنچ گیا۔

"نسیمہ کو بھی اپنے ساتھ لے آتے۔" ڈیڈی نے مجھے اکیلا دیکھ کر کہا۔

"اسے تیار ہونے میں دیر لگتی، اس لیے بھی اکیلا ہی چلا آیا۔ وہ اپنے ڈیڈی کے ساتھ آرہی ہوگی۔ میں اس سے کہتا ہوا آیا ہوں۔"

"یہ تو نے اچھا کیا کہ اسے بتا دیا۔ اب وہ آجائے گی۔ میری زندگی کا کیا بھروسا۔ تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ لوں بس یہی بہت ہے۔"

میں نے جان بوجھ کر انہیں اصل بات نہیں بتائی کہ دل کے مریض ہیں۔ سن کر تکلیف ہوگی لیکن دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اس کے باپ سے بات ضرور کروں گا۔

دروازہ کھلا اور نسیمہ اپنے ڈیڈی، امی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ اب تک مجھے اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنا اسے دیکھ کر آیا۔ مجھے شدت سے اپنی ذلت کا احساس ہوا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں ڈیڈی کی وجہ سے مجبور تھا کہ اپنا غصہ چھپا کر مسکراتا رہوں۔ میں اداکاری کرتا رہا اور ڈیڈی ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

اسپتال سے آنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر نسیمہ کے گھر پہنچ گیا۔ نسیمہ پر میرا حق تھا اور یہی حق جتانے میں یہاں آیا تھا لیکن اس کے ڈیڈی کی یہی ضد تھی کہ جب تک رخصتی نہیں ہو جاتی، وہ میرے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی۔

"انکل! وہ قانوناً میری بیوی ہے۔ نکاح ہی تو اصل چیز ہے اور وہ ہو چکا۔"

"کیا تم رخصتی کے بغیر ولیمہ کر سکتے ہو؟" اس کے ڈیڈی نے مجھ سے سوال کیا۔

"ولیمے کا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ تم یہاں آؤ۔ ہمارے سامنے بیٹھ کر نسیمہ سے باتیں کرو لیکن تم چاہو کہ اسے گھر لے جاؤ۔ یہ مجھے منظور نہیں ہوگا۔"

ان کی بات اگر جائز نہیں تو نامعقول بھی نہیں تھی۔ اس میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور تھا لیکن مجھے تو ضد سوار تھی۔ میں برابر یہ اصرار کرتا رہا کہ میں اسے لے کر جا سکتا ہوں۔

"تم ایسے ہی بضد ہو تو اپنے رشتے دار جمع کرلو اور نسیمہ کو رخصت کرکے لے جاؤ۔"

"آپ جانتے ہیں، ڈیڈی کس حالت میں ہیں۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میری طرف سے رخصتی کی پوری اجازت ہے۔"

وہ اجازت دے رہے تھے لیکن کچھ تو حالات کا تقاضا تھا اور کچھ میری ضد تھی کہ رخصتی کے بغیر میں اس کے ساتھ کیوں نہیں گھوم سکتا لہٰذا میں کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر چلا آیا۔

ڈیڈی کی حالت کبھی سنبھل جاتی تھی کبھی بگڑ جاتی تھی۔

اس پریشانی کے عالم میں نیلم برابر ڈیڈی کو دیکھنے اور مجھے تسلی دینے آرہی تھی۔ اس کی عزت میری نظروں میں بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ غیر ہوتے ہوئے بھی میری ڈھارس بندھا رہی تھی۔ میرا دھیان بٹانے کے لیے تفریح گاہوں میں لے کر جا رہی تھی۔ دوسری طرف میری منکوحہ تھی جو اسپتال آتی بھی تو ایسے وقت جب میں وہاں موجود نہ ہوتا۔

نیلم نہ ہوتی تو ممکن ہے میں اس موقع پر نسیمہ کی کمی کو شدت سے محسوس کرتا اور ممکن ہے اس سے ملنے کی کوئی راہ نکال لیتا لیکن نیلم کی ہر وقت کی قربت نے مجھے اس کی ضرورت محسوس نہ ہونے دی۔

نیلم نے تو حد ہی کردی تھی۔ وہ دفتر سے چھٹی لے کر میرے ساتھ ڈیڈی کی تیمار داری میں لگی ہوئی تھی۔ ایک موقع وہ بھی آیا جب اس نے میری مالی مدد بھی کی۔

نسیمہ کے والدین کئی مرتبہ ڈیڈی کو دیکھنے اسپتال آئے۔ جب ڈیڈی گھر آئے تو یہ لوگ گھر بھی آئے۔ نسیمہ بھی آئی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اندر سے اتنا ضدی ہوں۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ یہ لوگ رخصتی پر اتنے بضد ہیں تو میں بھی انہیں تماشا دکھاؤں گا۔ نسیمہ کو رخصت کرکے گھر نہیں لاؤں گا۔ نکاح تو ہو ہی گیا ہے۔ اب لٹکتی رہے۔

ڈیڈی کی طبیعت اب بظاہر بالکل ٹھیک ہوگئی تھی۔ امی کی خواہش تھی کہ اب نسیمہ بہو بن کر اس گھر میں آجائے۔ بہنوں کو بھی ارمان تھا کہ وہ اپنے ارمان نکالیں لیکن اب میں تیار نہیں تھا۔ مختلف بہانوں سے ٹالتا جا رہا تھا۔ نسیمہ کے گھر والوں کا اصرار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ صبح، شام میرے گھر کے چکر کاٹ رہے تھے۔

اب مجھے بھی ان کی حالتِ زار پر رحم آنے لگا تھا۔ ڈیڈی کی طبیعت اچانک پھر بگڑ گئی۔ ان پر دل کا دورہ پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔

ان کے انتقال نے تھوڑے دنوں کے لیے رخصتی کے مسئلے کو سب کے ذہنوں سے اوجھل کردیا۔

میں سمجھ رہا تھا۔ یہ بات بہت دنوں کے لیے ٹل گئی لیکن تقریباً ایک مہینے بعد امی نے مجھے بلایا۔

"بیٹا، غم کا علاج یہی ہے کہ اسے خوشی سے بدل لیا جائے۔ میں چاہتی ہوں اب نسیمہ کو گھر لے آؤں۔"

"امی، دنیا کیا کہے گی۔ ابھی تو میرے باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔"

"شادی صرف خوشی نہیں ہے، ایک بڑی نیکی بھی ہے۔ اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"ابھی تو آپ عدّت میں ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ بس میں بخاری صاحب سے کہتی ہوں کہ وہ رخصتی کا انتظام کرلیں۔"

"نہیں امی، ابھی نہیں۔"

"تو کیا زندگی بھر کسی کو بٹھائے رکھو گے۔ نکاح ہوچکا ہے۔ اب بُری بات ہے کسی کو سہارے میں رکھنا۔"

"آپ کی عدّت ختم ہوجائے پھر میں کچھ سوچوں گا۔" میں نے کہا اور امی کے پاس سے اٹھ کر چلا آیا۔

امی کی عدّت ختم ہونے میں تین مہینے باقی تھے۔ میں نے سوچا تھا، تین مہینے اور پریشان کرلوں۔ اس کے بعد نسیمہ کو بیاہ کرلے آؤں گا۔

ایک دن میں دکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیلم کا فون آیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"تم اسی وقت میرے دفتر آجاؤ۔"

"خیریت تو ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔"

"بات ہی ایسی ہے۔ تم آؤ تو سہی۔"

"کیا بات ہے نیلم؟"

"میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ تم جلدی آجاؤ۔"

میں نے دکان، ملازم پر چھوڑی اور اس کے دفتر پہنچ گیا۔

"نسیمہ کو رخصت کرکے کب گھر لا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ پوچھنے کے لیے بلایا ہے تم نے؟"

"جو بات میں تمہیں بتانے والی ہوں اس سوال کا اس سے گہرا تعلق ہے۔"

"امی کی عدّت ختم ہوجائے، اس کے بعد رخصتی بھی ہوجائے گی۔"

"ہاں جلدی کرلو کیونکہ اس کے بعد اسے کہیں اور بھی رخصت ہونا ہے۔"

"کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"نسیمہ اپنی رخصتی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی ہے کیونکہ اس کے فوراً بعد اسے طلاق کا مطالبہ بھی کرنا ہے۔"

"کیا بکواس ہے یار۔ وہ کیوں طلاق لینے لگی تھی؟"

"سلمان، میری بات غور سے سننا۔" اس نے کہا اور اس کے بعد جو کچھ بتایا وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے بہت تھا۔

اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔

"نسیمہ کی فیملی جب سوڈان میں تھی تو اس نے اطہر نام کے ایک پاکستانی لڑکے سے شادی کی تھی۔ شادی کو ابھی ایک

ہی سال ہوا تھا کہ کسی بات پر جھگڑا ہوا اور اطہر نے اسے طلاق دے دی۔ طلاق دینے کے بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ادھر نسیمہ کا غصہ بھی کم ہوا لیکن اب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ نسیمہ کہیں اور شادی کرے اور پھر اس سے طلاق لے کر اطہر سے شادی کرلے۔ اطہر اس پر بھی تیار تھا۔ نسیمہ کے والد کا ٹرانسفر ہو گیا اور وہ ان کے ساتھ پاکستان آگئی لیکن وہ اطہر سے یہ وعدہ کر آئی تھی کہ کسی سے شادی کرنے اور طلاق حاصل کرنے کے بعد وہ پھر اس کے پاس چلی آئے گی۔ اطہر کے خط اب بھی اس کے پاس آتے ہیں اور وہ باقاعدگی سے اُن کے جواب دیتی ہے۔ تم سے اس کی محبت محض ایک ڈھونگ تھی۔ تمہیں بے وقوف بنا کر وہ اپنے پہلے شوہر کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب تمہاری مرضی۔ بن جاؤ بے وقوف۔ لے آؤ اسے رخصت کر کے۔"

یہ ایسا انکشاف تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے مجھے یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ میں جہاں بیٹھا تھا اس کمرے کے در و دیوار گھوم رہے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔ کیا ضروری ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہی سچ ہو؟ اس خیال نے میری رگوں میں پھر سے حرارت دوڑا دی۔

"نیلم! کیا میں مان لوں کہ جو تم کہہ رہی ہو، وہ سچ ہے؟"

"تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تو وہ بات بتا دی جو مجھے معلوم ہوئی اور جو میرے نزدیک صحیح بھی ہے۔" اس نے کہا اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر میری کرسی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بڑی شفقت سے اپنے دونوں ہاتھ میرے دونوں کندھوں پر رکھ دیے۔

"سلمان! میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی؟"

"اگر یہ سچ تھا تو تم نے آج تک کیوں نہیں بتایا۔"

"مجھے خود ابھی معلوم ہوا ہے۔" اس نے کہا اور دوبارہ اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔

"میری ایک سہیلی سوڈان میں تھی۔ پچھلے ہفتے اچانک اس سے ملاقات ہو گئی۔ نسیمہ کا ذکر نکل آیا۔ تم سے اس کی شادی کا ذکر بھی آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ نسیمہ نے سوڈان میں شادی کرلی تھی۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میں اس لیے چپ رہی کہ اگر وہ دوسری شادی کر ہی رہی ہے تو اچھا ہے تمہیں معلوم نہ ہو۔

"میں نے تمہیں نہیں بتایا لیکن میں یہ جاننے کے لیے بے تاب ہو گئی کہ کیا یہ واقعی سچ ہے۔ نسیمہ سے پوچھتی تو وہ نہ صرف مجھے جھٹلا دیتی بلکہ شاید تعلقات ہی ختم ہو جاتے لیکن کھلنے والی بات تھی کہ نسیمہ کے کمرے سے مجھے ایک خط مل گیا جو اس کے سابق شوہر نے اسے لکھا تھا۔ لو، تم بھی دیکھ لو۔" اس نے وہ خط دراز سے نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ خط اپنے ہاتھوں میں لیا۔ کئی مرتبہ پڑھنے کی کوشش کی لیکن الفاظ گڈمڈ ہو گئے میں نے آنکھوں میں آیا ہوا پانی صاف کیا اور بڑی مشکل سے وہ خط پڑھنے کی کوشش کی۔

یہ خط واقعی اطہر کی طرف سے نسیمہ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ تم سلمان نام کے جس آدمی سے شادی کر رہی ہو، اس سے طلاق لینے کے بعد تم مجھ سے شادی کرلو گی لیکن ابھی تک تم نے کسی خط میں یہ نہیں لکھا کہ تم یہاں آؤ گی یا مجھے پاکستان آنا ہوگا۔ جلدی لکھو تاکہ میں اسی طرح کی تیاری کروں۔

"کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس نے طلاق نہیں دی یا تم بدل گئیں۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔

"رخصتی میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے۔ جلدی کرو یار۔

"اب بھی تمہارا

اطہر!"

"اب تو یقین آگیا؟"

"اتنا بڑا دھوکا!"

"یہ وقت جذبات کا نہیں۔ سمجھ داری سے کام لو۔" نیلم نے کہا۔

"اب تم دیکھنا۔ میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"کیا کرو گے؟"

"ایسا کروں گا کہ نہ وہ میری ہو گی نہ اطہر کی ہو سکے گی۔"

"کوئی ایسا قدم مت اٹھا لینا کہ قانون کے ہتھے چڑھ جاؤ۔"

"اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ رخصتی بھی نہیں ہونے دوں گا اور طلاق بھی نہیں دوں گا۔"

"یہ گناہ بھی اپنے سر کیوں لیتے ہو۔ طلاق دے کر قصہ پاک کرو۔"

"نیلم، تم اگر میری جگہ ہوتیں تو تم بھی وہی کرتیں جو اب میں کرنے والا ہوں۔"

وہ مجھے بہت دیر تک سمجھاتی رہی لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا سو کر چکا تھا۔

امی کی عدت جیسے ہی ختم ہوئی، انہوں نے نسیمہ کی رخصتی کی بات چھیڑ دی۔

"امی، آپ اب اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔ میں جب مناسب سمجھوں گا اسے بیاہ کر لے آؤں

گا۔"

"تیرا دماغ تو درست ہے۔ کسی کی بیٹی کو کیا ہمیشہ اس کے گھر بٹھا کر رکھے گا۔ بخاری صاحب کل بھی آئے تھے۔ بہت پریشان تھے۔"

"میں خود پریشان ہوں۔"

"میرے بچے! نسیمہ گھر میں آجائے گی تو تیری سب پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔" امی نے کہا "سوچ لو! مجھے کل تک جواب چاہیے ہے۔"

اس کے بعد ظاہر ہے امی کا اصرار بڑھتا ہی چلا گیا۔ میرے سسرال والے بھی دباؤ ڈال رہے تھے۔ تنگ آکر میں نے گھر سے باہر وقت گزارنا شروع کر دیا۔

وقت گزاری کے لیے نیلم موجود تھی۔ دن بھر دکان پر رہتا اور دکان بند کرنے کے بعد نیلم کے گھر پہنچ جاتا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی بھائی تھا نہیں۔ وہ خود کمانے والی تھی اس لیے پورے گھر پر اسی کا کنٹرول تھا۔ میرے آنے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہتے۔ میں اس وقت اپنے گھر پہنچتا جب سب سو چکے ہوتے۔ چھٹی کا پورا دن نیلم کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔

رخصتی کا معاملہ ایسا نہیں تھا کہ لوگ میری مصروفیت دیکھ کر اصرار کرنا ہی چھوڑ دیتے۔ مجھ پر مسلسل دباؤ بڑھتا جا رہا تھا اور ایک دن نسیمہ خود چل کر میری دکان پر آگئی۔

"ارے! آپ تو نہایت باپردہ خاندان کی ہیں۔ میرے ساتھ تک جانے کی آپ کو اجازت نہیں ہے اور اب اکیلی یہاں آگئیں۔"

"اچھا! تو مجھے اس بات کی سزا دے رہے ہیں آپ۔"

"ابھی سزا ملی ہی کہاں ہے۔"

"سلمان، خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجئے۔ میرے گھر والوں کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہیں۔ میں تو کل بھی آپ کی تھی آج بھی آپ کی ہوں۔"

میرے جی میں تو آیا کہ حقیقت سے پردہ اٹھا دوں۔ کہہ دوں کہ کل تو آپ کسی اور کی تھیں لیکن اس وقت میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ وہ آسانی سے مجھے جھٹلا سکتی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا۔

میں نے اسی وقت دکان ملازم کے حوالے کی اور نیلم کے دفتر پہنچ گیا۔

"اطہر کا وہ خط جو تمہارے پاس تھا، وہ خط مجھے چاہیے ہے۔"

"وہ تو میں نے اسی دن ضائع کر دیا تھا۔"

"یہ کیا غضب کر دیا۔ اسے تو سنبھال کر رکھنا تھا۔"

"کیوں سنبھال کر رکھتی۔ تمہیں دکھانے کے بعد میرے نزدیک اس کی اہمیت ہی ختم ہو گئی تھی۔"

"آج نسیمہ میری دکان پر آئی تھی۔ میں وہ خط اس کے منہ پر مار کے اس کی حقیقت اس پر ظاہر کرتا لیکن۔"

"کیوں خود کو کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ طلاق دے کر قصہ ختم کرو۔"

"اب تو یہی کرنا پڑے گا۔ اب اسے قائل کرنے کے لیے میرے پاس ثبوت ہی کیا ہے۔"

میں وہاں سے سیدھا نسیمہ کے گھر گیا۔ نسیمہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی لیکن اس کی یہ خوشی اس لمحے آنسوؤں میں ڈھل گئی جب میں نے اسی کے گھر میں بیٹھ کر اسے طلاق دی۔ وہ اپنا قصور پوچھتی رہ گئی لیکن میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔

گھر آکر میں نے امی کو بتایا۔ انہوں نے بھی یہی سوال کیا کہ اس غریب کا قصور کیا ہے لیکن انہیں بتا کر بھی میں کیا کرتا۔ جو مقصد میرا تھا وہ تو پورا ہو ہی چکا تھا۔

نسیمہ کو طلاق دینے کے بعد میں مکمل طور پر نیلم کا ہو کر رہ گیا تھا پھر ایک دن میں نے یہی طے کیا کہ نیلم سے شادی کرلوں۔ میں نے اپنا ارادہ اس پر ظاہر کیا اور میری توقع کے عین مطابق وہ تیار بھی ہو گئی۔

"یہی بات تو یہ ہے سلمان۔" اس نے کہا "... نسیمہ تمہارے لائق تھی ہی نہیں۔ جب میں نے، تمہیں دیکھا تھا یہی خیال آیا تھا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہونی چاہیے۔ میں تم سے محبت کرنے لگی تھی لیکن نسیمہ کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اب جبکہ حالات خود بخود میرے حق میں ہو گئے ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

اس نے اتنی احسان مندی سے میری حوصلہ افزائی کی کہ میرے دل پر اس کی محبت کا نقش اور بھی گہرا ہو گیا۔

میں نے نیلم کا ذکر امی سے کیا۔ انہیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی ہو گی کہ میں نے نسیمہ کو طلاق کیوں دے دی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں نے نیلم کی وجہ سے نسیمہ کو طلاق دی ہے۔ میری بہنیں بھی نسیمہ سے مانوس ہو گئی تھیں۔ انہیں نیلم پسند نہیں تھی لیکن میری ضد تھی اس لیے سب ہی کو تیار ہونا پڑا۔

نیلم سے میری شادی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے دونوں جہاں کی دولت میرے حصے میں آگئی۔

نیلم ملازمت کرتی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے گھر کی دیکھ بھال اس طرح کی کہ سب کو اس کے سلیقے اور خوش اخلاقی کا قائل ہونا پڑا۔

جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ سرکاری مکان تھا۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد ہمیں یہ مکان خالی کرنا تھا لیکن ہم کسی نہ کسی طرح ٹالتے چلے آرہے تھے۔ نیلم چونکہ سروس میں تھی اور اسے مکان ملا ہوا تھا لہٰذا نیلم کے اصرار کرنے پر ہم اس کے مکان میں منتقل ہوگئے۔

یہ ہمارا عارضی ٹھکانا تھا لیکن نیلم کی والدہ کے حُسنِ سلوک نے مجھے بے فکر کردیا اور وقت گزرتا رہا۔

اب محلہ بدل گیا تھا لہٰذا نسیمہ کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ کس حال میں ہے۔

دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے مجھے تین پیارے پیارے بچے عطا کیے جو نیلم اور میری محبت کی بڑی خوب صورت نشانی ہیں۔

قدرت کے کھیل بھی خوب ہوتے ہیں۔ نسیمہ سے میری شادی تو نہ ہوسکی لیکن وہ میرے چچا زاد بھائی کی بیوی بن گئی۔ یہ راز مجھ پر اس وقت کھلا جب میں ایک شادی میں شرکت کرنے کراچی گیا۔

اعجاز میرا چچا زاد بھائی ہے۔ ان لوگوں سے ہمارے تعلقات کبھی ٹھیک نہیں رہے تھے لہٰذا ان لوگوں نے ہمیں شادی میں بھی نہیں بلایا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہوسکا کہ اس کی شادی نسیمہ سے ہوئی ہے۔ بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ شادی ہوگئی ہے۔

میں کراچی ایک دوست کی شادی میں آیا تھا لیکن خاندانی رنجشوں کو بھلا کر میں اعجاز کی طرف بھی چلا گیا۔ یہ سمجھیے کہ قسمت نے مجھے وہاں پہنچا دیا۔ میری بھابی کی صورت میں جو عورت میرے سامنے آئی، وہ نسیمہ تھی۔ جس کی شادی کو اب پانچ سال ہوگئے تھے۔ ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ جو تعجب اسے دیکھ کر مجھے ہوا، اسی حیرت سے وہ گزر رہی تھی۔

میری حیرت بہت جلد غصے میں بدل گئی۔ اس عورت کے فریب دینے کے لیے میرا ہی خاندان رہ گیا ہے۔ کچھ کروں نہ کروں اسے شرمندہ تو ضرور کروں گا۔ اعجاز اس وقت گھر پر نہیں تھا، صرف چچی تھیں۔ ان کا دل ہماری طرف سے صاف نہیں تھا لہٰذا وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر اٹھ گئیں۔ نسیمہ نے بھی اٹھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک لیا۔

"کیا بات ہے، اطہر صاحب نے قبول کرنے سے انکار کردیا جو ابھی تک اس گھر میں بیٹھی ہو۔" میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ جھنجلا کر کھڑی ہوگئی "کون اطہر۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

"بہت خوب!" میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اپنے پہلے شوہر کو بھول گئیں جسے آپ سوڈان میں چھوڑ کر آئی ہیں۔ جس سے آپ دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھیں وہی اطہر۔"

"خدا کے لیے آواز نیچی رکھیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"غلط فہمی مجھے واقعی ہوگئی تھی لیکن نیلم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس نے آپ کے منصوبے سے مجھے بروقت آگاہ کردیا اور میں نے آپ کو طلاق دے دی۔"

"کیا کہا تھا آپ سے نیلم نے۔" وہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس وہ خط دکھایا تھا جو آپ کو اطہر نے لکھا تھا جس کے مطابق آپ کو جلد از جلد طلاق لے کر اس کے پاس جانا تھا۔"

"کیسا خط! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

پھر میں نے وہ تمام باتیں اختصار کے ساتھ اسے بتادیں جو نیلم نے مجھے بتائی تھیں۔

وہ دیوانوں کی طرح میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی وحشت بڑھتی جارہی تھی پھر وہ اٹھی اور اپنے دونوں بچوں کے سروں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے یہ دونوں بچے نصیب نہ ہوں اگر ان میں سے کوئی بات بھی سچ ہو۔ نیلم نے آپ کو حاصل کرنے کے لیے یہ چال کھیلی تھی اور وہ کامیاب ہوگئی۔ اس نے بالآخر آپ سے شادی کرلی۔"

کوئی عورت اپنے بچوں کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی اور پھر اس کی سچائی کا ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے ابھی تک اعجاز سے طلاق طلب نہیں کی تھی۔ اس کے لہجے میں اتنا اعتماد تھا کہ میرا سر چکرانے لگا۔

"کاش! آپ یہاں نہ آتے۔ میں نے آپ کو بے وفا سمجھ کر صبر کرلیا تھا لیکن آج معلوم ہوا کہ میری طرح آپ بھی مظلوم ہیں۔ ہماری قسمتوں میں یہی تھا۔ میں نیلم کو معاف کرتی ہوں کہ بہرحال اب وہ آپ کی بیوی بھی ہے اور شاید آپ کے بچوں کی ماں بھی ہو۔ ہوسکے تو یہاں آئندہ نہ آئیے گا۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں کسی کو بتائے بغیر ہی وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

نیلم نے میری محبت پر ڈاکا ڈالا تھا لیکن اس کے پیچھے اس کی بھی تو محبت تھی۔ بس یہی سوچ کر میں نے اسے معاف کردیا۔ کبھی ذکر نہیں کیا کہ میں نسیمہ سے ملا تھا۔

میں سُنا کرتا تھا کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے لیکن خود پر گزری تو کہنا پڑا "اس میں کیا شک ہے؟"

•••••

غصہ حرام

جناب مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ سرگزشت۔ کراچی

السلام علیکم

میں نے یہ کہانی جیل میں لکھی تھی اور یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے ضرور شائع کراؤں گی تاکہ میرے حالات سے دوسرے لوگ سبق لیں۔ بہت دن تک تو یہ سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اسے کہاں شائع کراؤں۔ پھر کئی اخباروں اور رسالوں میں بھیجا مگر کہیں سے کوئی معقول جواب نہ ملا۔ آخر میری ایک دوست نے سرگزشت کے بارے میں بتایا کہ اس میں سچی کہانیاں شائع ہوتی ہیں تو اب آپ کو روانہ کررہی ہوں۔ پلیز مایوس مت کیجیے گا۔

شکر گزار

ثمینہ۔ حیدر آباد

اس وقت میں سینٹرل جیل حیدر آباد میں ہوں۔

میری کہانی آج کے دور کا نوحہ ہے۔ ہمارے معاشرے کے ناسُور کی ایک جھلک ہے۔ بے مثل قدروں کی پامالی کی ایک کرب انگیز مثال ہے۔ میں اسے تحریر کرنا نہیں چاہتی تھی، لیکن جیل کے ماحول اور یہاں موجود خواتین کی باتیں سن سن کر حوصلہ ہوا اور میں اسے تحریر کرنے بیٹھ گئی۔

اس روز میں نے اپنے دیور کی آنکھوں میں پھر میل دیکھا، ہوس کے شعلے اس کی آنکھوں سے باہر آرہے تھے۔ وہ زبان سے کچھ کہے بغیر میری طرف بڑھ رہا تھا "کیا بات ہے ارسلان، تم کچھ کہتے کیوں نہیں" میں نے ہمت کرکے کہا۔ حالانکہ میں خود کو اندر سے ٹوٹا محسوس کررہی تھی۔

میں کمزور عورت نہیں ہوں۔ میں ارسلان جیسے مرد کا مقابلہ کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ میری شادی کو صرف ڈیڑھ سال ہوا تھا اور پھر میں نے ابھی کسی اولاد کو جنم نہیں دیا

تھا۔ جوانی کا جوش اور طاقت میرے اندر تھی۔ میرا شوہر عرفان مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں اپنے شوہر سے صرف چار سال چھوٹی ہوں اور ارسلان اپنے بھائی سے صرف تین سال چھوٹا اس لیے میری اور ارسلان کی عمر تقریباً ایک ہی تھی۔

ارسلان کی نیت میں فتور تھا۔ اس سے قبل بھی میں نے دو تین بار اس کی آنکھوں میں بہت کچھ دیکھا تھا، لیکن میں نے عرفان سے کہا نہیں۔ ارسلان مجھ سے اکثر بے ہودہ مذاق بھی کرتا تھا۔ اس پر میں نے اسے ٹوکا بھی تھا، لیکن اس نے مسکرا کر میرے کہے کو ٹال دیا تھا۔ اس روز گھر میں ارسلان اور میرے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا۔ عرفان صبح ہی کراچی کے لیے روانہ ہوئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ نو بجے رات تک واپس آئیں گے۔ میری ساس بھی شام تک آنے کا کہہ کر اپنی بیٹی کے گھر چلی گئی تھیں۔ سسر، میری شادی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی اور بات ارسلان سے کہتی اس نے آگے بڑھ کر میری کلائی پکڑ لی۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم" میں نے جھٹکے سے اپنی کلائی اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا "میں زیادہ بدتمیزی..."

"بہت زیادہ نیک بننے کی ضرورت نہیں ہے" ارسلان نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں تم کیسی ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا "کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

"وہی جو کچھ تم اقتدار کے ساتھ کرتی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ شادی کے بعد معلوم ہوا ورنہ تم میری بھابی بننے کے قابل ہی نہیں تھیں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے میں بھائی کو بھی بتا سکتا ہوں مگر میں خاموش صرف اس لیے ہوں کہ تم میرا کہنا مانو گی۔"

"اقتدار!" میں نے زیرِ لب کہا "اقتدار تو میرا بھائی ہے۔"

"بھائی" اس نے طنزیہ انداز میں کہا "میں جانتا ہوں وہ کیسا بھائی ہے۔"

"تم کیا جانتے ہو اس کے بارے میں؟"

"وہی سب کچھ جس کا علم صرف اسے اور تمہیں ہے" ارسلان نے کہا "تمہاری اس سے شادی ہونے والی تھی مگر اس نے انکار کر دیا۔ انکار بھی محض اس نے اس لیے کیا کہ وہ تمہارے کردار سے واقف تھا پھر بس اتفاق ہی سے میری ماں رشتہ لے کر پہنچی اور تمہاری ماں نے ہاں کر دی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ غلط ہے کہ شادی سے انکار اقتدار نے کیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور نہ میں اسے پسند کرتی تھی اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ تو اتنا ہی جھوٹ ہے جتنا یہ کہ کوئی کہے اس وقت رات ہو گئی ہے۔"

"دیکھو کلثوم!" اس نے میرا نام لے کر کہا "وقت ضائع مت کرو" کلثوم مجھے صرف عرفان کہتا تھا ورنہ میرا نام ثمینہ ہے۔

"میں تمہاری بھابی ہوں۔ میرا نام مت لو" میں نے تلخ لہجے میں کہا "اگر تم نے زیادہ مرد بننے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گی۔"

"یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو" اس نے مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی اور میں نے اسے دھکا دیا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی اس لیے وہ لڑکھڑا گیا اور میں دروازے کی طرف بھاگی۔ میں اصل میں دروازے سے باہر نکل کر شور مچانا چاہتی تھی مگر میرے پیچھے ہی ارسلان پہنچ گیا۔ دروازے کی اندر والی کنڈی اس نے بند کی ہوئی تھی۔ میں کنڈی گرا رہی تھی کہ ارسلان پہنچ گیا اور پھر غیر ارادی طور پر ہی میری لات گھوم گئی اور ارسلان بلبلا پڑا۔ اس کے بعد میں نے پھر پیر گھمایا۔ ارسلان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میں نے بھی اپنے اسکول کے دور میں جوڈو کراٹے کی تربیت لی ہوئی ہے۔ کسی ماہر سے تو میں مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن ارسلان جیسے کو خود سے دور رکھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ تین چار لاتوں ہی میں ارسلان ڈھیر ہو گیا۔

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو" میں نے اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم رشتے میں چھوٹے ہو اور جو رشتہ تمہارے اور میرے درمیان ہے وہ عزت اور تقدس کا رشتہ ہے۔ تمہارے ذہن میں کیسے آیا کہ تم اس رشتے کو پامال کر دو گے میری نظر میں عزت، جان سے زیادہ ہے۔ اب اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو تمہارے حق میں برا ہو گا پھر اب شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اس واقعے کا ذکر اپنے بھائی سے مت کرنا ورنہ مجھے تو صرف تم بے عزت کر سکو گے، میں تمہیں زندگی سے محروم کر دوں گی۔"

ارسلان مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور فرش سے اٹھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر مکان کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا مگر اس کم ظرف نے دوسرے روز ہنگامہ کر دیا۔ عرفان رات گیارہ بجے کراچی سے واپس آیا۔ رات خیریت ہی سے گزری اور

دوسرے روز صبح وہ دفتر گئے۔

دن کا ایک بجا تھا جب عرفان گھر میں داخل ہوا۔ وہ ابھی اطمینان سے بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ میری ساس نے ارسلان کو آواز دی اور پھر بولیں "اپنی بیوی کا کارنامہ تمہیں ارسلان سنائے گا۔"

میں کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھی کیونکہ ارسلان کمرے میں تھا۔

"یہ اس قابل نہیں کہ میں اسے بھابی کہہ سکوں" ارسلان نے میری طرف اشارہ کر کے کہا "میں نے امی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے کرتوت امی سے سنیں۔"

"کیا بات ہے ثمینہ؟" عرفان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری طرف توجہ سے دیکھ رہے تھے۔

"ارے یہ کیا جواب دے گی" میری ساس نے کہا "تو گھر میں نہیں تھا اس لیے میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا ورنہ یہ تو کسی شریف گھر میں ایک لمحہ رہنے کے لائق بھی نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہیں امی؟" عرفان نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

"پہلے آپ ان سے سن لیں" میں نے دبی دبی زبان میں کہا۔

"اس کا ایک بھائی ہے اقتدار!" میری ساس نے کہا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک کہانی سنائی کہ اقتدار گھر آیا تھا اور ارسلان نے ان دونوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا پھر اس سے پہلے کہ ارسلان اقتدار پر حملہ کرتا میں نے اسے گھر سے بھگا دیا۔ ارسلان نے عزت کی خاطر شور نہیں مچایا پھر جب میری ساس اپنی بیٹی کے گھر سے واپس آئی تو ارسلان نے انہیں سب کچھ بتا کر کہا کہ مجھے گھر سے نکال دیا جائے لیکن میری ساس نے عرفان کا انتظار کرنے کی صلاح دی اور مجھے گھر سے نہیں نکالا گیا۔

ارسلان نے اصرار کیا کہ عرفان مجھے فوراً طلاق دے اور گھر سے نکال دے۔

عرفان نے ارسلان کی بات سنی ان سنی کر کے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "ارسلان جھوٹ بول رہا ہے۔ اقتدار یہاں کبھی نہیں آیا" پھر میں نے ارسلان کی حرکت بتا کر کہا "یہ کم ظرف خود میری عزت لوٹنا چاہتا تھا اگر میں کراٹے کے چند ہاتھ لگا کر اسے بے بس نہیں کرتی تو ممکن ہے یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔"

"یہ جھوٹ بول رہی ہے" ارسلان نے کہا "جب میں دیگر کمروں میں اقتدار کو تلاش کر رہا تھا تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں چاہتا تو اس کے حملے کا جواب دے سکتا تھا۔ لیکن میں محلے کے لوگوں تک اس کا کارنامہ پہنچانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کا یار نکل بھاگا تھا۔"

"اپنی زبان درست رکھو" میں نے غصے میں بھرے لہجے میں کہا "اقتدار میرا بھائی ہے اور وہ یہاں نہیں آیا تھا۔"

"تم خود اپنا کردار درست نہیں رکھ سکی اور مجھ سے کہہ رہی ہو میں زبان درست رکھوں" ارسلان نے کہا۔

"اس بدذات سے بات مت کرو، اس کو گھر سے نکالو" میری ساس نے کہا۔

"لیکن امی، مجھے ثمینہ سے بات تو کرنے دو۔"

"تم کیا بات کرو گے اس سے، چور کبھی کہتا ہے کہ اس نے چوری کی۔"

"اقتدار سے شادی میں بھی میرا تعارف نہیں ہوا تھا" عرفان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ انہوں نے اپنی ماں کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"وہ اور اس کے گھر والے ہماری شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے" اس کے بعد میں نے بتایا کہ اقتدار اور میں کلاس فیلو رہے ہیں، لیکن ہمارے درمیان عشق و محبت کا کوئی چکر نہیں رہا۔ میرے گھر والوں کی خواہش تھی کہ اگر میری شادی اقتدار سے ہو جائے گی تو دونوں خاندان پھر قریب آجائیں گے، لیکن نہ اقتدار اس کے حق میں تھا اور نہ اس

کے گھر والے اُس طرح بات آگے نہیں بڑھی۔

عرفان میری باتیں بہت صبر و سکون سے سن رہا تھا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عرفان بہت قوتِ برداشت کا مالک ہے ورنہ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ دھکے دے کر گھر سے باہر کردیتا مگر ایسا نہیں ہوا۔ میری ساس اور دیور مجھے درمیان میں ٹوکتے رہے، لیکن میں نے اقتدار کے بارے میں سب کچھ بتادیا پھر میں نے یہ بھی بتادیا کہ اقتدار کے گھر والوں سے تقریباً دو ڈھائی سال سے رابطہ نہیں، اس لیے میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اقتدار کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔ میرا یہ کہنا ہی تھا کہ میری ساس نے مجھے مشتعل کرنے والے الفاظ استعمال کرنے شروع کیے اور میں برہم ہوگئی۔

"تم سب جانتی ہو کہ اقتدار کہاں ہے کیا کررہا ہے" ارسلان نے کہا "تم لاعلمی کا اظہار کرکے اپنے عاشق کو بچانا اور اپنے کردار کو صاف کرنا چاہتی ہو۔"

"دیکھو، تم لوگ حد سے بڑھ رہے ہو" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میری ساس نے مجھے بہت گندی گالی دی اور پھر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ بس پھر میرا ہاتھ ساس کی گردن پر پڑا، ارسلان نے مجھ پر حملہ کردیا۔ عرفان پر شاید سکتہ سا طاری ہوگیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ جب میں اور ارسلان الجھے ہوئے تھے تو اس نے تھانے فون کردیا۔ جب پولیس آئی تو میں ارسلان اور اپنی ساس کے درمیان کھڑی تھی اور صرف ارسلان گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ گمان مجھے یہی تھا کہ میری ساس اب اس دنیا میں نہیں رہی، لیکن تھانے پہنچنے کے بعد مجھے ایک سپاہی کی زبانی معلوم ہوا کہ میری ساس مری نہیں لیکن اس کی سانسیں رک رک کر چل رہی ہیں اور وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔

میرے گھر والوں کو اس سارے جھگڑے کا علم تین دن بعد ہوا۔ میں چاہتی تو تھانے سے اپنے گھر اطلاع پہنچا سکتی تھی، لیکن میں نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ ان دنوں میری اماں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ دل کی مریضہ تھیں اور دو ہفتے پہلے ہی ان پر دل کا دورہ پڑچکا تھا پھر جب انہیں علم ہوا اور گھر والے میری ضمانت کی کوشش کرہی رہے تھے کہ مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ یہ کیوں کر ہوسکا اس کی تفصیل میں، میں قطعی پڑنا نہیں چاہتی چونکہ میں جانتی ہوں کہ دشمن سے خیر کی توقع رکھنا بے وقوفی ہے۔

میں عرفان کے گھر سے تھانے اور تھانے سے جیل پہنچ گئی۔ اس درمیان عرفان کیا سوچتا رہا اور کیا کرتا رہا اس کا علم مجھے نہیں، لیکن میں یہ سوچتی رہی کہ اگر عرفان نہیں چاہتا تو میں جیل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میرے جیل پہنچنے کے بعد بھی میرے گھر والے میری ضمانت کرانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن میں جیل سے باہر اس وقت تک آنا نہیں چاہتی تھی جب تک میرے کردار پر لگائے گئے داغ صاف نہ ہوں اور عرفان میری طرف سے مطمئن نہ ہو۔ اس کے لیے میں تیار تھی کہ اگر مجھے دو سال بھی جیل رہنا پڑے تو میں رہوں گی۔

یہ بات تو جیل میں ایک ماہ گزرنے کے بعد ہی اچانک میری سمجھ میں آئی کہ اندر رہ کر میں کچھ نہیں کرسکوں گی۔ اس ایک ماہ میں میری ساس اسپتال سے باہر آگئی تھی۔ یہی نہیں ارسلان نے میرے گھر والوں سے کہا تھا کہ میں جیل سے باہر آئی تو وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میرے گھر والے میری ضمانت کی کوشش کررہے تھے، ان کی کوشش صرف میری وجہ سے سُست پڑگئی تھی پھر جب میں نے باہر آنے کا فیصلہ کیا تو تیسرے دن ہی میری ضمانت ہوگئی۔

"میرے دیور نے میری عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی" گھر آنے کے بعد میں نے اپنی امی سے کہا "بس مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اسے درگزر کردیا تھا۔ اگر میں ایسا نہیں کرتی تو وہ نہ اپنی ماں سے کچھ کہتا اور نہ میری ساس ہنگامہ کھڑا کرتی۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن اب کیا ہوگا" امی نے کہا "میں نے تیرے شوہر سے بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تو بے گناہ تھی تو پھر اس کی ماں پر حملہ کیوں کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ بہت تسلی سے بات کررہا تھا اور وہ بات کی تہ تک پہنچ ہی جاتا۔"

"میری ساس بہت غلط لفظ استعمال کررہی تھی اور بار بار میرے کردار پر حملے کررہی تھی پھر مجھے برداشت نہیں ہوا اور میں نے ایک ہاتھ۔۔۔"

"بس تو نے یہی غلط کیا" امی نے میری بات کاٹ کر کہا "اب بتا کہ... کیا کیا جائے۔"

"کوئی ایسی ترکیب کہ مجھ پر جو الزام ارسلان نے لگایا ہے، وہ غلط ثابت ہوجائے" میں نے پُرخیال انداز میں کہا "ارسلان نے محض اس لیے یہ سب کچھ کہا کہ میں نے اس کی خواہش کی تکمیل کا سامان نہیں کیا۔ وہ اتنا کمینہ ہے کہ میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میں اس کی بڑی بھابی ہوں۔ میرا مقام اس کی ماں کے برابر ہے، لیکن۔۔۔"

"کسی طرح عرفان کو یہ بات سمجھائی جائے۔"

"وہ نہیں سمجھیں گے" پھر میں ان سے ملاقات کہاں کروں گی" میں نے پُرخیال انداز میں کہا "کورٹ میں ان سے ملاقات ہوسکتی ہے، لیکن وہاں گفتگو کا موقع کہاں ملتا ہے۔"

"تم اس کے دفتر چلی جاؤ، وہ ابھی تمہارا شوہر ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے، عرفان نے مجھے ابھی طلاق نہیں دی" میں نے کہا "میری پیشی میں ابھی بارہ چودہ دن ہیں۔ میں اس دوران میں ان سے کسی طرح ملاقات کرلوں گی۔"

"کہو گی کیا؟"

"کہنا کیا ہے، انہیں حقیقت بتاؤں گی" میں نے کہا۔

اس کے بعد امی نے کوئی بات نہیں کی۔ تھوڑی دیر تک ہم دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی اور پھر میں اٹھ کر کمرے میں چلی گئی، کیونکہ میں آرام کرنا اور سوچنا چاہتی تھی۔ میں اپنی امی کے ہی زیادہ قریب تھی، لیکن میں امی کی طرح ٹھنڈا مزاج نہیں رکھتی تھی۔ قوتِ برداشت مجھ میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ جب میں چھوٹی تھی تب بھی اسکول میں ہم جماعت لڑکیوں سے میرے جھگڑے ہوتے تھے اور میں بعض اوقات مار کھا کر بھی گھر آتی تھی، لیکن اگلے دن اُس لڑکی کی پٹائی کرکے ہی گھر پہنچتی تھی۔ ہائی اسکول کے دور میں جب میں نے جوڈو کراٹے کے ایک تربیتی ادارے میں داخلہ لیا تو سب سے زیادہ شور امی نے کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں لڑتی جھگڑتی بہت ہوں اور اب میں لڑائی جھگڑے میں کسی لڑکی کے ہاتھ پاؤں توڑ دیا کروں گی اور گھر والے مصیبت کا شکار ہوں گے۔

امی کہتی رہیں اور میں اپنی تربیت مکمل کرتی رہی۔ گھر میں دیگر افراد نے چونکہ امی کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لیے میں روز تربیت گاہ جاتی رہی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ میرے ساتھ تھا۔ اس گروپ کی کئی لڑکیاں بہت تیز اور جوشیلی تھیں میرا تعلق بھی انہی لڑکیوں میں سے تھا۔ اس گروپ میں ایک لڑکی نیلی بھی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے چار سال بڑی تھی اور وہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے جوڈو کراٹے اور مارشل آرٹ کی ٹریننگ کررہی تھی۔ میں نے کبھی اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اس کے دشمن کون ہیں اور نہ اس نے بتایا تھا۔ جب میری شادی ہورہی تھی تو میں نے اسے بھی دعوت دی تھی۔ اس وقت نیلی نے شادی کی بہت مخالفت کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ تمام عمر شادی نہیں کرے گی کیونکہ شادی کا مطلب اس کے نزدیک یہ تھا کہ عورت اس طرح مرد کی حاکمیت قبول کرتی ہے اور تمام عمر اس کی محکوم بنی رہتی ہے اور اسے مردوں کی حاکمیت قبول نہیں تھی۔ اس مسئلے پر وہ کئی بار پہلے بھی مجھ سے بات کرچکی تھی، لیکن میں نے اس کی باتوں پر کوئی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اس کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں لیٹی نیلی اور اقتدار کے بارے میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔ ارسلان نے جو کچھ میرے ساتھ کیا تھا وہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ میں محکوم تھی اور وہ حاکم اُس نے اپنے قابلِ شرم رویے کا جواز مجھ پر ایک گھناؤنا الزام لگا کر پیدا کیا اور دوسرے حاکم یعنی "عرفان" نے مجھے پولیس کے حوالے کرکے اپنی حاکمیت کا اعلان کردیا۔ اب اگر میں عرفان سے مل کر اسے حقیقت بیان بھی کرتی تو انداز میرا محکوم عورت جیسا ہی ہوتا اور محکوم کی بات توجہ اور ہمدردی سے سننا حاکموں کی سرشت ہی میں شاید نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ نیلی سے مل کر مشورہ کیا جائے، پھر اس کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اس دوران میں، میں اقتدار سے بھی ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ گو ہمارے تعلقات اس کے گھر والوں سے اچھے نہیں تھے اور ہمارا ایک دوسرے کے گھر سے تعلق بالکل ختم ہوگیا تھا، لیکن پھر بھی اس سے ملاقات کی کوئی صورت مجھے نکالنی تھی۔

جیل سے ضمانت پر آنے کے تیسرے دن میں نیلی کے گھر پہنچی تھی۔ میرا خیال ہے میں کوئی دو ڈھائی سال بعد نیلی کے گھر پہنچی تھی اور مجھے توقع تھی کہ وہ گھر پر ہی مل جائے گی کیونکہ اس کی شادی ہونے اور سسرال جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک تو وہ خود شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے وہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھی اگر اتفاق سے اس کی شادی ہوگئی تھی تو اس کے والدین نے اپنے داماد کو اپنے ہی گھر میں رکھا ہوگا۔ یوں بھی وہ خاصا خوشحال گھرانا تھا۔ نیلی کے والد یوں تو پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہوچکے تھے لیکن وہ خاندانی زمیندار بھی تھے۔

نیلی گھر پر ہی مل گئی۔ میری دستک کے جواب میں وہی دروازے پر آئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا "ارے ثمینہ، یہ تم ہو۔"

"ہاں، اتفاق سے یہ میں ہی ہوں۔"

"میں تو سمجھ رہی تھی کہ شادی کے بعد تم نے مجھے فراموش کردیا۔"

"نہیں، انسان کو وقت پر دوست اور ہمدرد یاد آجاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم" نیلی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آؤ اندر چلو۔"

تھوڑی دیر بعد ہی میں نیلی کے بجے سجائے خوب صورت ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے قبل بھی میں یہاں اکثر بیٹھ چکی تھی، لیکن اس بار یہاں یہ تبدیلی ہو گئی تھی کہ پورے ڈرائنگ روم میں کوئی فوٹو، کوئی تصویر نہیں تھی۔

"میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں، پھر اطمینان سے بات کرتے ہیں۔"

نیلی اتنا کہہ کر چلی گئی اور میں ڈرائنگ روم کی ایک ایک چیز کو توجہ سے دیکھنے لگی پھر قدموں کی آہٹ پر ہی میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں نیلی کے والد ہاتھ میں پائپ لیے کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں میری ہی طرف تھیں۔ چند لمحوں بعد ہی ان کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

"میرے ڈیڈی نے تمہیں دیکھا ہوگا" نیلی نے میرے قریب آکر کہا۔

"ہاں تمہارے ڈیڈی آئے تھے لیکن۔۔۔"

"وہ تمہارے قریب نہیں آئے ہوں گے" نیلی نے میری بات کاٹ کر کہا "اور نہ ہی تمہارے سلام کا جواب دیا ہوگا" اس کے بعد نیلی نے سرسری انداز میں بتایا کہ اس کے ڈیڈی آج کل ذہنی طور پر کچھ پریشان ہیں۔ اس کی وجہ اس کی ممی کی بیماری ہے۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس کا گھر ان دنوں اسپتال بن گیا ہے صبح شام دو ڈاکٹر آتے ہیں اور رات آٹھ بجے کے بعد صبح نو بجے تک دو نرسوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔

"کیا ہوگیا تمہاری ممی کو؟"

"بہت کچھ ہوگیا۔ ویسے بظاہر وہ تندرست نظر آتی ہیں مگر کسی سے بات نہیں کرتیں۔ میرے خیال میں خاموشی ہی ان کی بیماری ہے۔"

"تمہارے ڈیڈی سے بھی بات نہیں کرتیں؟"

"نہیں۔ ڈیڈی کو دیکھ کر تو وہ آنکھیں بند کر لیتی ہیں۔"

"وجہ، وجہ کیا ہے؟"

پھر اس سے پہلے کہ نیلی کوئی جواب دیتی، ملازمہ ایک ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں شربت کے ساتھ کھانے کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ ملازمہ کو میں نے پہچان لیا۔ یہ بانو تھی۔ ایس پی صاحب کی پرانی ملازمہ، یہ بہار کی رہنے والی تھی۔ دبلی پتلی اور صحت مند، سارے گھر کا کام وہی کرتی تھی۔ رہتی بھی وہ گھر ہی میں تھی۔

بس ہر ماہ دو دن کی چھٹی کرتی تھی۔ اس کی بیٹی ٹنڈو آدم میں تھی وہ اس کے گھر جاتی اور دو دن وہاں گزار کر آتی تھی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد نیلی نے کہا "لو اب کھاتی اور پیتی جاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ تمہارے "حاکم" کے کیا حال چال ہیں اور اتنے دن بعد تمہیں میرا خیال کیسے آیا؟"

میں نے مختصر انداز میں اپنی کہانی سنا کر کہا "یہ بتاؤ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

نیلی چند لمحے سوچتی رہی اور پھر بولی "میرے خیال میں بات بگڑ گئی ہے۔"

"یہ تو میں سمجھ رہی ہوں" میں نے کہا "اگر کسی طرح عرفان نے یہ سمجھ بھی لیا کہ میں بے گناہ اور بے قصور ہوں تب بھی اس کے دل میں میل رہے گا اور بات کسی وقت بگڑ سکتی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے" نیلی نے کہا "اگر کسی طرح ارسلان حقیقت اگل دے تو پھر۔۔۔"

"وہ ایسا نہیں کرے گا" میں نے نیلی کی بات کاٹ کر کہا۔

"پھر اگر تم نے اقتدار اور عرفان کا سامنا کرا دیا اور اقتدار نے یہ کہہ بھی دیا کہ وہ تمہارے گھر آیا ہی نہیں تو عرفان اس پر یقین نہیں کرے گا۔ بہتر یہ ہے کہ تم اقتدار سے ملنے اور اسے یہ ساری باتیں بتانے کی کوشش ہی مت کرو۔ اسے درمیان میں لائے بغیر ہی معاملہ سلجھ جائے تو بہتر ہے۔"

"بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ کس طرح میرا کردار صاف ہوگا۔ میں نے بہت غور کیا پھر مجھے تمہارا خیال آیا اور میں یہاں چلی آئی۔"

"ارسلان کو کس طرح اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ حقیقت اپنے بھائی سے کہہ دے۔ صرف یہ کہہ دے کہ اس نے غلط بیانی کی تھی۔ گھر کوئی نہیں آیا تھا۔"

"یہ کام یوں مشکل ہے کہ ارسلان کبھی ایسا نہیں کرے گا۔"

"اسے زبردستی بھی تو اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔"

"نہیں، کوئی اور راستہ!"

ہم دونوں ایک گھنٹے سے زیادہ بات چیت کرتے رہے پھر یہ طے پایا کہ ارسلان کو کس طرح گھیر کر عرفان کے سامنے حقیقت کا اظہار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اس معاملے پر غور کرنے کے لیے نیلی نے ایک رات کا وقت طلب کیا پھر میں نیلی کے گھر سے اٹھنا چاہ رہی تھی کہ نیلی کے ڈیڈی ڈرائنگ روم میں آگئے "کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے پائپ کو لبوں سے ہٹا کر پوچھا۔

"آپ کے مطلب کی بات نہیں ہے ڈیڈی" نیلی نے نرم لہجے میں کہا "آپ کا وقت ضائع ہوگا۔"

"اس کی پروا مت کرو۔ جب سے تمہاری ممی بیمار پڑی ہیں، میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بہت ہے۔"

"میں سمجھی نہیں ڈیڈی!"

"میں نے فلسفہ بیان نہیں کیا۔ جو وقت میں تمہاری ممی کی تیمارداری میں صرف کر رہا ہوں، وہ ضائع ہی کر رہا ہوں۔"

میں نے سوچا عجیب آدمی ہیں لیکن میں نے کچھ کہا نہیں۔

"یہ میری دوست ثمینہ ہے۔"

"میں جانتا ہوں، آگے بولو" اتنا کہہ کر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد نہ چاہتے ہوئے ہمیں انہیں بتانا پڑا کہ مسئلہ کیا ہے۔ وہ ایک ایک بات غور سے نہ صرف سنتے رہے بلکہ درمیان، درمیان میں سوالات بھی کرتے رہے۔

تمام باتیں سننے کے بعد انہوں نے کہا "ارسلان مجرمانہ ذہن کا مالک ہے اور ایسے افراد سچ بولنے پر زبردستی ہی آمادہ ہوتے ہیں۔ اس پر زبردستی کی جا سکتی ہے، لیکن اس سے تمہاری ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے "بات زبردستی سے حل نہیں ہو سکتی پھر میرے شوہر نے جو کچھ کیا وہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ عرفان اپنے بھائی اور ماں کو سچا مانتا ہے۔"

"بات اصل میں یہی ہے، ورنہ تم پر کوئی مقدمہ نہیں بنتا اور نہ تم جیل جاتیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میرا وکیل کہہ رہا ہے کہ مجھے اس کیس میں سزا ہو سکتی ہے" میں نے کہا "مجھے سزا کی پروا نہیں لیکن عرفان کسی طرح یہ سمجھ لے کہ ان کا بھائی اور ماں جھوٹ بول رہے ہیں تو کیس ہی ختم ہو سکتا ہے۔"

"تمہارا دیور کرتا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں کرتا" میں نے زیر لب کہا "بھائی سرکاری ملازمت دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

نیلی کے ڈیڈی مجھ سے مختلف سوالات کرتے رہے اور پھر بولے "اگر تم کہو تو تمہارے دیور کو اندر کرا دیں، تھانے اور جیل میں چند روز گزار کر آجائے گا تو ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

"نہیں ڈیڈی، اس طرح تو جلتی پر تیل پڑ جائے گا" نیلی نے کہا "اگر آپ چاہیں تو عرفان سے ملاقات کریں۔ میں انہیں گھر پر بھی لا سکتی ہوں، یہاں ثمینہ بھی ہوگی اور آپ عرفان کو یہ بات سمجھانے اور بتانے کی کوشش کریں کہ ثمینہ بے گناہ ہے اور اصل گناہ گار ان کا بھائی ہے۔ جب اس کی دال نہیں گلی تو اس نے ایک جھوٹا الزام لگا کر۔۔۔"

"تم عرفان کو جانتی ہو؟" ڈیڈی نے نیلی کی بات کاٹ کر کہا۔

"نہیں، لیکن جان پہچان کرنے میں دیر نہیں لگے گی پھر ثمینہ مجھے اس کے دفتر تک پہنچا دے گی۔"

"یہ ٹھیک ہے، تم اسے یہاں تک لے آؤ" ڈیڈی نے کہا "توقع تو نہیں ہے کہ وہ ہماری بات مان جائے گا، لیکن کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

میں نے دوسرے دن کا وقت طے کیا، نیلی سے کہا کہ میں دس بجے صبح اس کے گھر پہنچوں گی اور اس کے ساتھ عرفان کے دفتر تک جاؤں گی۔ میرا پروگرام عرفان سے ملاقات کرنے کا نہیں تھا اگر نیلی مجھے اس سے دفتر ہی میں ملا دیتی تو میں انکار بھی نہیں کرتی۔ بہرحال نیلی اس سے میری دوست کی حیثیت سے ملاقات کرتی اور اسے اپنے گھر لانے کی کوشش کرتی۔

نیلی کے ساتھ ایک ڈیڑھ گھنٹا گزار کر میں اپنے گھر پہنچی، مجھے توقع نہیں تھی کہ نیلی یا اس کے ڈیڈی کے ذریعے میری بات بن جائے گی، لیکن اس کے گھر جانے، ان لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد ایک تو میرے دل کا بوجھ ہلکا سا ہوا تھا، دوسرے یہ بات بھی معلوم ہوئی تھی کہ مرد اس دور میں حاکم ہے، حاکم مرد سے کسی معاملے میں جیت جانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ حاکم جب ہٹ دھرمی پر آمادہ ہو جائے تو پھر بات بگڑتی ہی جاتی ہے۔ نیلی کے ڈیڈی بھی اپنی بیوی کے لیے ہی نہیں اپنی بیٹی کے لیے بھی حاکم تھے، ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی تھی انہوں نے اپنی بیوی کو بیمار ڈال دیا تھا اور اس کی خدمت پر ملازم رکھ چھوڑے تھے خود انہیں نہ اتنی فرصت تھی اور نہ ہمدردی کہ اپنی بیوی کی تیمارداری کریں۔ وہ اپنی بیٹی کو بھی ماں کے قریب جانے نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے نیلی کی شادی بھی نہیں کی تھی۔ اگر نیلی کے دل میں مردوں کے خلاف بہت کچھ بھرا ہوا تھا تو وہ اس کا دل صاف بھی کر سکتے تھے، اسے شادی پر آمادہ کر سکتے تھے، لیکن ایس پی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ نیلی کے پاس اب چند سال تھے اس کے بعد وہ کسی مرد کی حاکمیت قبول کرنے کے قابل ہی نہیں رہے گی، نہ شوہر نہ بچے، وہ بے اولاد ہی مر جائے گی۔ اگر میں اپنے مسئلے میں الجھی ہوئی نہ ہوتی تو نیلی کے بارے

میں کچھ سوچتی اور کچھ کرتی۔ ویسے میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ میرا مسئلہ طے ہو گیا تو نیلی کے بارے میں کچھ کروں گی۔

گھر پہنچ کر میں رات گئے تک اپنے ہی خیالات میں الجھی رہی اور پھر صبح دس بجے نیلی کے گھر پہنچی۔ نیلی کے ساتھ عرفان کے دفتر پہنچنے میں بھی ہمیں دیر نہیں لگی، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ عرفان دفتر ہی کے کام سے ایک ہفتے کے لیے پنجاب گیا ہوا ہے۔

"اب کیا کریں؟" میں نے نیلی سے کہا۔

"کرنا کیا ہے کہیں بیٹھ کر ٹھنڈا پیتے ہیں اور پھر گھر چلتے ہیں، آج تم دوپہر کا کھانا میرے گھر ہی کھانا۔"

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا، لیکن نیلی کے گھر دوپہر کا کھانا کھانے میں میں نے آمادگی ظاہر کی اور پھر ہم دونوں نے بجائے صدر میں ٹھنڈا پینے کے رکشا کیا اور نیلی کے گھر پہنچے گھر پر نیلی کے ڈیڈی تھے مگر انہوں نے ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ نیلی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود مکان کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ جب وہ آئی تو میں نے اس کی ذات سے متعلق گفتگو شروع کی۔

بڑی دیر تک وہ میری باتیں صبر و سکون سے سنتی رہی اور پھر اس نے کہا "تم سے دوبارہ ملاقات ہونے سے چند روز قبل میں نے سوچنا شروع کیا تھا کہ اپنا گھر بسا لوں، ماں، باپ آج ہیں کل نہیں رہیں گے، پھر میں کس کے سہارے زندگی گزاروں گی۔ بیماری کے بعد امی نے بھی زور دینا شروع کیا تھا کہ میں شادی کر لوں۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے آج نوکروں کے سہارے، زندگی گزار رہی ہے، میرے نہ ہونے کے بعد بھی اسی طرح گزر جائے گی اور اگر تمہارا ہونے والا شوہر ہمارے گھر رہنا پسند کرے تو اچھی بات ہو گی۔"

"پھر تم نے ممی سے کیا کہا تھا؟"

"میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنتی رہی تھی، کیوں کہ مجھے معلوم ہے اس دنیا میں لالچی نوجوان بہت ہیں، میرے پاس بہت کچھ ہے اور ماں باپ کے مرنے کے بعد یہ سب کچھ میرے شوہر کا ہو جائے گا اس لیے میرا ہاتھ کوئی بھی تھام سکتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو" میں نے کہا "اگر کسی نے تمہارا ہاتھ نہیں تھاما اور تم نے کسی کو اپنا ہاتھ تھامنے نہیں دیا تب بھی تمہارا سب کچھ ویسے بھی تباہ ہو جائے گا۔ اس لیے میرے خیال میں یہی بہتر ہے کہ تم کسی کو اپنا ہاتھ تھامنے دو۔ اس کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے اگر تم ماں بن گئیں تو یہ سب کچھ تمہاری اولاد کا بھی تو ہو سکتا ہے!"

"اولاد نہ ہوئی تو؟"

"یہ سوال بیکار ہے کیوں کہ کہتے ہیں، امید پر دنیا قائم ہے۔"

"دیکھو تمہاری شادی ہوئی، تم تو صاحبِ اولاد نہیں ہوئیں پھر!"

"میری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے، بعض اوقات تو عورت پانچ چھ سال میں ماں بنتی ہے۔"

"اور نہیں بھی تو بنتی ہے۔"

"ہاں ایسا بھی ہوتا ہے" میں نے کہا "مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کوئی ضروری نہیں کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو۔"

میں گفتگو کرتے ہوئے نیلی کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ نیلی پر میری باتوں کا مثبت اثر ہو رہا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی میں تھوڑی دیر نیلی کے ساتھ رہی، اس دوران میں بھی زیرِ بحث، نیلی، اس کی شادی اور اولاد ہی رہی "میرا خیال ہے، تم اب ایک ہفتے بعد ہی ادھر آؤ گی۔" نیلی نے کہا۔

"نہیں میری پیشی بھی ہے۔ میں اس سے نمٹنے کے بعد ہی تمہارے پاس آؤں گی، ممکن ہے پیشی والے روز ہی میں عرفان سے بات کرنے کی کوشش کروں!"

"ٹھیک ہے پہلے تم ہی بات کر لینا، کوشش کرو تو بہتر ہے۔"

نیلی کے گھر سے نکل کر میں نے رکشا روکا اور اپنی سسرال کی طرف روانہ ہوئی، میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اس سلسلے میں میرا ارادہ پڑوس کی ایک عورت سے ملنے کا بھی تھا، لیکن میری بدقسمتی کہ پڑوس کی عورت کے مکان میں تالا لگا ہوا تھا۔ میرے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ میں رکشا روک کر اور پردہ اٹھا کر اندر جا سکتی تھی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ گھر پہنچی تو امی لیٹی ہوئی تھیں اور انہیں بخار چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بعد رات گئے تک میں ان کی تیمارداری میں لگی رہی۔

○☆○

میرا مقدمہ چلتے ہوئے تین ماہ گزر گئے تھے۔ اب جو پیشی بھگتانے میں گئی تھی اس کے بارے میں میرے وکیل کا خیال تھا کہ یہ پیشی آخری ہو گی اس پیشی پر عدالت فیصلے کی تاریخ دے گی۔ یہ تین ماہ میں نے بہت کرب میں گزارے تھے۔ عرفان نے نیلی سے دوبار ملاقات تو کی تھی، لیکن اس کے گھر آنے اور میرے مسئلے پر بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک اس کی ماں کی صورتِ حال ٹھیک نہیں ہوتی وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔ نیلی ہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ عرفان کی ماں کو سانس لینے میں

تکلیف ہوتی ہے اور انہیں کئی بار آکسیجن لگ چکی ہے۔

مجھے عدالت میں بیٹھے بیٹھے گیارہ بج گئے تب کہیں عرفان اپنے وکیل کے ساتھ عدالت میں آئے۔ ان کے چہرے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ بعد میں دو باتیں ایک ساتھ میرے سامنے آئیں۔ ایک تو ان کے وکیل نے پیشی کے بعد میرے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا اور کہا "اسے گھر جا کر آپ اطمینان سے پڑھ لیں" دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ میری ساس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔

میں نے لفافہ لے کر اپنے پرس میں ڈال لیا۔ وکیل جب مجھے لفافہ دے رہا تھا اس وقت عرفان سامنے نہیں تھے۔ عدالت نے فیصلے کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا۔ جو صرف تین دن بعد کی تھی۔

عدالت سے باہر نکل کر میں نے رکشا روکا اور تھوڑی دیر بعد ہی گھر پہنچ گئی۔ میں نے اپنے وکیل سے بات کی تھی وہ زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ کیس جس انداز میں چلا تھا اس سے ان کا اندازہ تھا کہ مجھے سزا ہو جائے گی۔ ان کے خیال میں صفائی کے گواہ اچھے نہیں تھے "اگر آپ کو سزا ہو بھی گئی تو معمولی ہو گی" وکیل نے دبے دبے الفاظ ادا کیے تھے۔

میں نے خود بھی محسوس کیا کہ مجھے سزا ہو جائے گی۔ اللہ کا شکر یہ تھا کہ عرفان نے مجھ پر بدچلنی کا کیس نہیں چلایا تھا۔ مقدمہ یہ تھا کہ میں بدتمیز لڑنے جھگڑنے والی ہوں اور میں نے اپنی ساس اور دیور کو زدوکوب کیا۔ اس جھگڑے میں، میں نے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کر کے اپنی ساس کو ایسا مارا کہ وہ اسپتال پہنچ گئیں اور ڈاکٹروں نے دو دن کی کوشش کے بعد انہیں سانس ٹھیک طرح لینے اور بات کرنے کے قابل بنایا۔

گھر آ کر میں نے ماں کو تو یہی تسلی دی کہ میں بری ہو جاؤں گی پھر بات چیت کے دوران میں یہ اشارے بھی کرتی رہی کہ اگر سزا ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔ جب امی اٹھ کر کسی کام سے مکان کے اندرونی حصے میں گئیں تو میں نے پرس سے لفافہ نکال کر کھولا اور پھر ایک ہی نظر میں، میں نے پڑھ لیا کہ عرفان نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ اس طلاق نامے کے ساتھ مہر کا چیک بھی تھا۔ اس لفافے کو کھولنے کے بعد ہی میرا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ سارے گھر والوں کا خیال تھا کہ یہ طلاق صرف میرے غصے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں بات کو کسی طرح سلجھا بھی سکتی تھی، لیکن میں نے اپنی ماں جیسی ساس پر حملہ کر کے معاملے کو بگاڑ دیا۔ دیور نے الزام لگایا تھا اور ساس اس کا ساتھ دے رہی تھی تو کیا ہوا، شوہر کو تو میں کسی نہ کسی طرح یہی بات سمجھا سکتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی تھا کہ مجھے دیور کو معاف کرنے کے بجائے اس کی شکایت اپنے شوہر سے کر دینا چاہیے تھی اس طرح دیور کی ہمت ہی نہیں پڑتی کہ وہ پلٹ کر وار کر دے۔

میرے پاس الفاظ ہی نہیں تھے کہ میں گھر اور خاندان والوں کو جواب دیتی اور ان کا منہ بند کر دیتی۔ لوگ بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور میں سن رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور مستقبل کسی بھوت کی طرح میرے سامنے ناچ رہا تھا۔ میں مسلسل سوچ رہی تھی اب مجھے کون اپنائے گا۔ کیا میں تمام عمر بغیر جیون ساتھی بیٹھی رہوں گی۔ میں پڑھی لکھی تو ہوں، کہیں بھی ملازمت کر سکتی ہوں، لیکن کیا صرف سروس کرنے سے زندگی گزر جائے گی اور جو بدنامی کا داغ میرے دامن پر لگ گیا ہے، وہ کیسے صاف ہو گا۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ میں بدکردار تھی اس لیے شوہر نے طلاق دے دی۔

یہی سب سوچتے سوچتے تین دن گزر گئے۔ تیسرے روز صبح میں اپنے مقدر کا دوسرا فیصلہ سننے کورٹ پہنچی، میرا وکیل پہلے سے ہی کورٹ میں موجود تھا۔ میں نے وکیل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی، لیکن الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے کیوں کہ میں نے عرفان کو آتے دیکھ لیا تھا اور وہ ایسی حالت میں تھا کہ عام حالت میں، میں اس سے جا کر چمٹ جاتی۔

عرفان کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور وہ دو سپاہیوں کے درمیان چل رہا تھا۔ ایک افسر فائل اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، اللہ خیر کرے یہ کیا ہو گیا۔ میں نے زیرِ لب کہا عرفان نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پولیس والے عرفان کو لے کر ایک طرف بیٹھ گئے اور افسر کورٹ میں داخل ہو گیا۔ میں کن انکھیوں سے عرفان کی طرف دیکھ رہی تھی، عرفان بھی کبھی کبھی نظر بھر کر میری طرف دیکھ لیا کرتا۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا۔ کیوں کہ میرے نام کی آواز لگ گئی تھی۔

میں کورٹ میں داخل ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ہی تین ماہ دس دن کی سزا اٹھا کر کورٹ سے باہر آئی۔ عدالت نے جیسے ہی مجھے سزا سنائی ویسے ہی لیڈی کانسٹیبل نے مجھے بازو سے پکڑ لیا تھا۔ کورٹ سے باہر آتے ہوئے میں عرفان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ میں نے نیلی کو بھی دیکھ لیا جو تیز تیز چلتے ہوئے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" نیلی نے قریب آ کر پوچھا۔

"سزا ہو گئی، تین ماہ دس دن کی" میں نے ذرا تیز آواز میں کہا تاکہ عرفان بھی سن لے۔

"یہ تو بُرا ہوا!"

"اپنے ساتھ سب ہی کچھ بُرا ہو رہا ہے" میں نے دبی دبی زبان میں کہا اور نیلی کو عرفان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اشارہ کیا "معلوم کرو، یہ کیوں پکڑے گئے۔"

"ارے یہ تو تمہارا شوہر ہے۔"

"اب یہ میرا شوہر نہیں۔ اس نے تین دن قبل مجھے طلاق دے دی" میں نے کہا نیلی میرے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل میرے دونوں طرف تھیں اور مجھے وہ ایک طرف لے جا رہی تھیں۔ نیلی نے ان سے کہا کہ اگر آپ کو جلدی نہیں تو اس درخت کے نیچے بیٹھ جائیں، میں چائے اور کیک بھیجتی ہوں۔

"ٹھیک ہے ہم لوگ بیٹھتے ہیں، لیکن جلدی کرو" ان دونوں میں سے ایک نے کہا تھوڑی دیر بعد ہی چائے والا ہمارے قریب پہنچا اور اس نے چائے اور کیک ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے۔ امی بھی ہمارے قریب ہی بیٹھی تھیں وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں عرفان پولیس والوں کے درمیان بیٹھا تھا اور نیلی ان کے قریب پہنچ رہی تھی۔

نیلی کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ وہ عرفان سے گفتگو میں مصروف تھی۔ پولیس والیوں نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا "وہ آجائے تو پھر چلتے ہیں" میں نے نیلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس نے بہت دیر کر دی۔"

"چلتے ہیں آجائے گی" میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے نیلی کو عرفان کے قریب سے اٹھتے دیکھا۔

"چلو، اب اٹھ جاؤ" اس پولیس افسر نے کہا جو نیلی سے پہلے ہی ہمارے قریب پہنچ گیا تھا "کس کا انتظار ہے" اس نے سپاہیوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"چل رہے ہیں سر!" ایک لیڈی کانسٹیبل نے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

اس عرصے میں نیلی میرے قریب پہنچ گئی تھی اور اس نے سرگوشی کی "اُس نے ارسلان کو جان سے مار دیا" پھر بولی۔ "ثمینہ! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں" نیلی نے کہا "تمہیں طلاق دینے کے بعد اسے بس اتفاق ہی سے معلوم ہو گیا کہ اقتدار تو آٹھ ماہ پہلے سے نیلا گیا ہوا ہے پھر اس نے اس اطلاع کی تصدیق کی اور ارسلان سے پوچھا کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا۔ اس پر دونوں کی تکرار ہو گئی اور پھر بات اتنی بڑھی کہ ارسلان نے عرفان پر حملہ کر دیا مگر پھر ارسلان کا چاقو اسی کے سینے میں اتر گیا" نیلی میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی میں کسی روبوٹ کی طرح ہی آگے بڑھ رہی تھی "پھر عرفان خود تھانے پہنچ گیا اور آج پولیس اسے کورٹ لائی ہے۔ اس نے اقبالِ جرم تھانے ہی میں کر لیا ہے۔"

"میرے حوالے سے تھانے میں بات ہوئی کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"شاید، میں نے پوچھا نہیں" نیلی نے بتایا "دیکھو حالات نے کیسے کروٹ بدلی۔ میں تو آج تمہیں یہ خوشخبری سنانے آئی تھی کہ ایک ہفتے بعد ہی میری شادی ہونے والی ہے۔۔۔!" اُس نے مزید کہا "ایک غریب مزدور سے!" نیلی نے کہا "وہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے گھر میں رہنے پر تیار ہے، لیکن میں اس کے گھر رہنا چاہتی ہوں۔ شادی کے بعد میں تم سے ملنے اپنے شوہر کے ساتھ جیل آؤں گی۔ ویسے تم اس سزا کے خلاف اپیل کرنا۔"

"اب تو میں اُجڑ ہی گئی ہوں، باہر آکر کروں گی بھی کیا" میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد نیلی چلی گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ عرفان پہلے خود ہی اقتدار کے بارے میں معلوم کرتا تو حقیقت اس پر واضح ہو جاتی۔ اب تو اسے بھائی کے قتل کے الزام میں لمبی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ اگر پھانسی کی سزا ہو گئی تو کیا ہو گا۔ کچھ بھی ہو جائے، اب میری ذات سے اس کا کیا تعلق، یہ ویسے اچھا ہوا کہ میری ذات پر جو داغ لگا تھا، وہ صاف ہو گیا۔

عدالت سے جیل پہنچنے تک میں انہی خیالات میں کھوئی رہی۔ میرا خیال تھا کہ جیل میں رہ کر میں سب کچھ فراموش کر دوں گی، لیکن یہ ممکن نہیں ہوا۔

میں نے سزا کے خلاف اپیل نہیں کی۔ میری امی ہر ماہ مجھ سے ملاقات کے لیے جیل آتی ہیں۔ ان کی زبانی ہی مجھے معلوم ہوا کہ عرفان کی ماں کا انتقال ارسلان کے قتل کے ایک ہفتے بعد ہی ہو گیا اب عرفان کے گھر پر تالا پڑا ہے۔ میں نے بہت غور کیا کہ سزا کاٹ کر جب میں باہر آؤں گی تو عرفان سے جیل آکر ملاقات ضرور کروں گی مگر پھر میں نے ایک روز اس بارے میں غور کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اب میرا عرفان سے تعلق بھی کیا رہ گیا تھا۔ تعلق کے دروازے پر تو اس نے خود ہی طلاق کا تالا ڈال دیا تھا اور یہ تالا ایسا تالا ہے کہ نہ اسے کھولا جا سکتا ہے، نہ توڑا جا سکتا ہے۔

ویسے میں نے یہ فیصلہ ضرور کر لیا کہ عرفان کے بعد اب میری زندگی میں کوئی حاکم نہیں آئے گا۔ بغیر کسی حاکم کے بھی تو زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

•••••

کارِ دشوار

معراج صاحب، آداب

یقیناً مزاج بخیر ہوں گے۔ اس مرتبہ ایک اور دلچسپ قصّہ پیش خدمت ہے۔ ہمارے ایک واقف تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے، اب اس جہاں میں نہیں ہیں۔ یہ انھیں کا واقعہ ہے۔ انھیں ایک بچے کی ضرورت تھی، بس پھر جو کچھ ہوا بیان کر رہا ہوں۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

اللہ حافظ

منظر امام۔ کراچی

بعض اوقات حقیقی زندگی میں بھی ایسے دل چسپ واقعات ہوا کرتے ہیں کہ برسوں یاد آتے رہتے ہیں۔

یہ واقعہ میرے ایک جاننے والے کے ساتھ پیش آیا تھا۔

اس کہانی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ہمارے ضابطے اور قوانین وغیرہ ایسے مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں کہ سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے۔

"بے چارے مشرف صاحب کے ساتھ ایک بار ایسا ہی ایک واقعہ پیش آگیا۔

وہ ہمارے محلے ہی میں رہا کرتے تھے۔ سیدھے سادے آدمی تھے۔ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں جوان اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے والی اور اتفاق یہ کہ دونوں خاصی خوش شکل بھی تھیں۔

مشرف صاحب سے میری اچھی سلام دعا تھی۔ راہ چلتے ملاقات ہوتی تو ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیا کرتے۔

ایک دن مشرف صاحب نے میرے گھر کے دروازے پر

دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ کچھ الجھے الجھے ہوئے سے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔ "کیا بات ہے مشرف صاحب، خیریت تو ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، خیریت ہی ہے۔ بس ایک الجھن درپیش ہوگئی ہے۔"

"کیسی الجھن؟"

"بھئی، مجھے ایک بچے کی ضرورت ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"بچے کی؟" میں نے حیران ہوکر ان کی طرف دیکھا "کیوں، بچے کی ضرورت کیوں ہے؟"

"بھئی اس کی پرورش کرنی ہے۔"

"کیا ہوگیا ہے آپ کو؟" میں اور بھی حیران رہ گیا تھا "آپ کے گھر میں تو ماشاء اللہ دو بیٹیاں ہیں..... آپ لاولد تو نہیں ہیں۔ پھر آپ کو بچے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

"یہ ضرورت مجھے نہیں، میرے ایک عزیز کو ہے۔" انہوں نے بتایا "میاں بیوی جرمنی سے آئے ہوئے ہیں، لاولد ہیں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مشرف صاحب لیکن میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے کہا "میری تو خود ابھی شادی نہیں ہوئی اور نہ ہی میرے بچے ہیں ورنہ میں ایک آدھ بچہ آپ کے حوالے کردیتا۔"

"مذاق نہ کریں بھائی۔ بچے کا بندوبست کردیں، ان صاحب نے میری جان کھا رکھی ہے۔"

"آپ بھی کمال کررہے ہیں۔ خود سوچیں، میں کہاں سے بندوبست کرسکتا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے میرے ساتھ چلیں تو سہی۔ ایسے ہزاروں غریب خاندان ہوں گے جن میں کئی بچے ہوں گے اور وہ اپنے بچوں کی پرورش نہ کرپاتے ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگر ان سے ایک بچہ مانگ لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ وہ اس کے بہتر مستقبل کی خاطر انکار نہیں کریں گے۔"

"یہ آپ کا وہم ہے مشرف صاحب۔ والدین چاہے اپنی اولاد کو بھوکا رکھیں لیکن کسی اور کے حوالے کرنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔"

"ارے بھائی کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے۔ آپ چلیں تو سہی، ایسی سیکڑوں غریب بستیاں ہیں۔"

انہوں نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گاڑی بھی تھی۔ ہم اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے ایک کچی غریب آبادی میں پہنچ گئے۔ یہاں بچوں کی بہتات تھی۔ ہر طرف بچے ہی بچے کھیلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ غربت زدہ بچے، پریشان حال۔ جن کے جسموں پر ڈھنگ کے لباس بھی نہیں تھے۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں کام بن جائے گا" مشرف صاحب نے کہا "ہم باقاعدہ لکھا پڑھی کے ذریعے کسی بچے کو اڈاپٹ کریں گے۔"

ہم نے گاڑی ایک طرف روک دی اور گاڑی سے اتر کر بچوں کا جائزہ لینے لگے۔ بہت سے بچے تھے پھر ہمیں ایک بچہ دکھائی دیا۔ جس نے اپنی ایک چھوٹی بہن کو اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔

"کیوں نہ اس سے بات کی جائے" مشرف صاحب نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"کمال کرتے ہیں مشرف صاحب، اس سے کیا بات کرنی ہے؟" میں نے کہا۔

"اس سے اس کے گھر کے حالات تو معلوم ہوجائیں گے" مشرف صاحب نے اتنا کہہ کر اس لڑکے کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بچہ اپنی چھوٹی بہن کو گود میں اٹھائے ہمارے پاس آکر کھڑا ہوگیا تھا "بیٹے، نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"نعیم!" اس نے جواب دیا۔

"اچھا نعیم میاں، یہ بتاؤ تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"وہ کارخانے میں کام کرتے ہیں جی۔"

"تم کتنے بھائی بہن ہو؟" مشرف صاحب نے سوال کیا۔

"ہم چھ بہن بھائی ہیں" اس نے بتایا۔

مشرف صاحب نے فاتحانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ یہ کہہ رہے ہوں کہ دیکھا، ان کا اندازہ کتنا درست نکلا۔ اس قسم کے لوگوں کے یہاں اتنے ہی بچے ہوا کرتے ہیں۔ بے حساب اور انہیں سنبھالنا مشکل ہوجاتا ہے

"اچھا یہ بتاؤ بیٹے! تمہارا گھر کہاں ہے؟"

بچے نے بہت بے زاری کے عالم میں سامنے ایک کچے مکان کی طرف اشارہ کردیا۔ مشرف صاحب مجھے اپنے ساتھ اسی گھر کے دروازے تک لے آئے۔ دستک کے جواب میں ایک ایسے شخص نے دروازہ کھولا تھا جس نے لنگوٹی باندھ رکھی تھی "ہاں جی، کیا کام ہے؟" اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا "کس لیے آئے ہو؟"

"مجھے آپ کا بچہ چاہیے" مشرف صاحب گڑبڑا کر بول پڑے۔

"ہاں جی، لے جاؤ" اس نے بڑی بے نیازی سے کہا "پیسے کتنے دو گے؟"

میں اور مشرف صاحب دونوں اس کی یہ براہِ راست بات سن کر حیران رہ گئے تھے۔ نہ جانے کیسا شخص تھا جو اتنی آسانی سے اپنے بچے کو ہمارے حوالے کرنے کی بات کررہا تھا اور وہ بھی کچھ روپوں کے عوض۔

"ہاں جی، پیسوں کی بات کرو" اس نے پھر کہا۔

"بیس، بیس ہزار روپے۔" مشرف صاحب نے بتایا۔

"بیس ہزار!" یہ سن کر اس کی آنکھیں پھٹ آئی تھیں "یہ تم پورے سال کی تنخواہ بتارہے ہو یا ایک مہینے کی ہے؟"

"تنخواہ کیسی بھائی، میں تو تمہارے کسی بچے کو ہمیشہ کے لیے لینا چاہتا ہوں۔"

"کیا! ہمیشہ کے لیے، تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا؟"

"بھائی، بات یہ ہے کہ میں کسی بچے کو گود لینا چاہتا ہوں۔ وہ باہر ملک میں رہے گا۔ اس کی زندگی بن جائے گی۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا۔"

"کچھ بھی ہو جی، ہم اپنی اولاد تو نہیں دے سکتے۔"

"پھر ابھی جو اپنا بچہ حوالے کررہے تھے؟"

"وہ تو میرے بچے خراد کا کام جانتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کو ملازم رکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ میں نے سمجھا تم بھی ان ہی میں سے ہو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ہماری اولاد ہم سے چھیننے آئے ہو۔ چاہے کچھ بھی ہو، اولاد اولاد ہوتی ہے، چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اور ہم چپ چاپ وہاں سے بھاگ لیے۔

مجھے مشرف صاحب پر غصہ بھی آرہا تھا "دیکھ لیا آپ نے، کسی کی اولاد یوں ہی نہیں مل جاتی۔"

"تو پھر کیا کروں، جرمنی والے عزیز سے کیا کہوں؟"

"آپ انہیں منع ہی کردیں تو بہتر ہے۔"

"نہیں، تھوڑی سی کوشش اور کرلی جائے" انہوں نے کہا پھر بولے "یہاں بہت سے فلاحی ادارے بھی ہیں جہاں لاوارث بچے ہوا کرتے ہیں، ہم وہاں کوشش کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، آپ چلے جایئے گا۔"

"نہیں صاحب۔ آپ کو بھی چلنا ہوگا۔ آپ کی وجہ سے حوصلہ رہے گا" مشرف صاحب نے کہا "اور یہ تو ویسے بھی بہت ثواب کا کام ہے۔ یعنی ایک بے اولاد جوڑے کو اولاد مل جائے گی اور ایک لاوارث بچے کو والدین نصیب ہوجائیں گے۔"

"ہاں، ہے تو ثواب کا کام۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس ثواب کے لیے کون تیار ہوتا ہے۔"

بہرحال دوسری صبح مشرف صاحب پھر میرے دروازے پر موجود تھے اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑگیا۔ ایک رات میں انہوں نے ایسے کئی اداروں کی فہرست اور پتے وغیرہ نوٹ کرلیے تھے۔

ہم سب سے پہلے ایک قریبی ادارے کے دفتر پہنچ گئے۔ اس عمارت ہی سے خستہ حالی کا اظہار ہورہا تھا۔ گیٹ تو موجود تھا لیکن گیٹ پر کوئی چوکیدار وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔

احاطے میں کچھ بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ شاید وہی بے سہارا بچے تھے۔ ہم اس کمرے میں داخل ہوگئے جس کے دروازے پر منیجر کی تختی لگی ہوئی تھی۔

ایک ادھیڑ عمر منشی نما آدمی کسی حساب کتاب میں مصروف تھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا "جی فرمائیں۔"

"ہمیں ایک بچہ گود لینا ہے" مشرف صاحب نے براہِ راست بات کرلی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ ہم اسی لیے تو بیٹھے ہیں" اس نے چرب زبانی کے انداز سے کہا۔ پھر اس سے پہلے کہ ہم اسے مزید کوئی بات بتاتے، اس نے آوازیں دینی شروع کردیں "نسیم، نصیر، فرقان، آؤ ادھر آؤ۔"

ہم دونوں ہکا بکا دیکھتے رہ گئے۔ تین چار جوان جوان لڑکے کمرے میں آکر ایک طرف کھڑے ہوگئے تھے "لیں صاحب، آگئے بچے!" اس نے بچوں کی طرف اشارہ کیا "اب ان میں سے جس کو چاہئے گود لے لیں۔"

"کیا! ان جوان لڑکوں کو؟" مشرف صاحب نے حیرت اور جھلاہٹ سے کہا "یہ تو خود ہمیں گود لے سکتے ہیں۔ ہمیں تو بچہ چاہیے، بچہ۔ جس کی ہم باقاعدہ پرورش کرسکیں اور یہ پرورش شدہ ہیں۔"

"تو ایسا کہیں نا" منیجر نے برا سا منہ بنایا "نہیں جناب! ہمارے ادارے میں بچے نہیں ہوتے، سب اسی عمر کے لڑکے ہیں۔"

ہم وہاں سے بہت بور ہوکر واپس آئے تھے۔

دوسرا ادارہ واقعی چھوٹے بچوں کا تھا۔

پیارے پیارے سے معصوم بچے۔ جن کا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ وہ لاوارث بچے تھے جو مختلف جگہوں سے اٹھا کر اس ادارے میں لائے گئے تھے۔ "ہم آپ کو بچہ دے سکتے ہیں جناب" ادارے کے منیجر نے کہا "لیکن اس کے لیے ہماری کچھ شرائط بھی ہیں۔"

"چلیں، آپ شرائط بتادیں۔"

"آپ کو ضمانت دینی ہوگی۔ آپ کے گھر کے افراد کے رویے چیک کیے جائیں گے۔ یہ دیکھا جائے گا کہ آپ کے

مالی وسائل کیا ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی قانونی شرائط پوری کرنی ہوں گی۔ گارنٹی دینی ہوگی کہ آپ بچے کو تکلیف نہیں دیں گے۔ اس کی حفاظت کی جائے گی وغیرہ وغیرہ۔"

اس نے اتنی لمبی چوڑی شرائط بتادیں کہ بے چارے مشرف صاحب بددل اور پریشان ہو کر رہ گئے تھے پھر انہوں نے مجھ سے کہا "اس سے تو بہتر یہی ہے کہ وہ لوگ خالی ہاتھ واپس چلے جائیں۔ اب کون ان شرائط کی خانہ پُری کرتا رہے۔"

"شاید اسی لیے لوگ ایسے بچوں کو اڈاپٹ کرنے سے گھبرایا کرتے ہیں" میں نے کہا "اگر شرائط سیدھی سادی اور آسان ہوں تو شاید بچوں کو گود لینے کی شرح بھی بڑھ جائے۔"

"ہمارے ملک کی یہی بدقسمتی ہے کہ یہاں ہر کام میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کردی جاتی ہیں کہ لوگ پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال' اب یہاں تک آگئے ہیں تو چلیں' ان سے فارم لے کر محلے والوں کی گارنٹی لینے کی کوشش کرتے ہیں۔"

محلے والوں کا رویہ بھی بہت حوصلہ شکن تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ مشرف صاحب کو تو جانتے ہیں لیکن ان کے جرمنی والے عزیز کی گارنٹی نہیں لے سکتے۔ نہ جانے وہ کس مزاج کے ہوں۔

مشرف صاحب کے پاس اب صرف ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وہ کسی بچے کو اغوا کرلیں اور یہ کام ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ آدمی شریف تھے اس لیے وہ کوئی غیر قانونی راستہ اختیار نہیں کرسکتے تھے پھر میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جرمنی والے عزیز سے معذرت کرلیں۔ ان سے کہہ دیں کہ کسی بچے کا بندوبست کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

لیکن مشرف صاحب تو ان صاحب کو بچہ دلانے پر اُدھار کھائے ہوئے تھے اسی لیے دو چار دنوں کے بعد انہوں نے پھر مجھے پکڑلیا۔ اس بار وہ بہت پُرجوش دکھائی دے رہے تھے۔

"بھائی بن گیا کام" انہوں نے بتایا "بچے کا بندوبست ہوگیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟" مجھے بھی یہ سن کر حیرت ہوئی تھی۔

"یہاں ایک ادارہ ہے' جو نوزائیدہ بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ نوزائیدہ بچے جن کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ سنا ہے کہ وہ ادارہ بہت آسان شرائط پر بچے مہیا کردیتا ہے۔ اب آپ فوراً میرے ساتھ چلیں۔"

میں ان کے ساتھ ہولیا۔ واقعی ایک ادارہ موجود تھا۔ جہاں اس قسم کے بچے لائے جاتے تھے۔ ننھے معصوم بچے۔ جن کا قصور صرف یہ ہوتا تھا کہ ان کے والدین ان کے وجود کو قبول نہیں کرسکتے تھے اس لیے بوجھ کی طرح انہیں اتار کر پھینک دیتے تھے۔

وہاں کی شرائط بھی بہت آسان تھیں۔ دو چار دنوں کی بھاگ دوڑ اور لکھا پڑھی کے بعد ایک بچہ ہمیں مل بھی گیا تھا۔ مشرف صاحب بہت خوش خوش اس بچے کو اپنے گھر لے آئے۔

میں بھی یہ سوچ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ مشرف صاحب کی بھاگ دوڑ ختم ہوگئی ہے۔

اس کے بعد کئی دنوں تک مشرف صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی پھر ایک دن جب وہ راستے میں ملے تو میں نے ان سے دریافت کیا "مشرف صاحب' آپ کے جرمنی والے عزیز کا کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے' وہ واپس چلے گئے" انہوں نے بتایا۔

"چلیں' اب وہ لاوارث بچہ جرمنی میں پرورش پائے گا" میں نے کہا۔

"جرمنی میں نہیں جناب! وہ میرے یہاں پرورش پا رہا ہے" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولے۔

"آپ کے یہاں؟ وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ بے چارے اسے اپنے ساتھ جرمنی نہیں لے جاسکے" انہوں نے بتایا "یہاں ہر قسم کی کاغذی کارروائی مکمل ہوچکی تھی لیکن ان سے یہ کہا گیا کہ جس وقت وہ اپنی بیگم کے ساتھ پاکستان آئے تھے' اس وقت ان کی بیگم یا ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ان کی بیگم حاملہ ہیں اور صرف ایک ماہ کے اندر وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئیں اور بچہ چھ ماہ کا بھی ہوگیا۔ بس اس بنیاد پر اس بچے کو روک دیا گیا اور اب وہ میرے پاس ہے کیونکہ میں اب اسے کسی اور کے حوالے نہیں کرسکتا۔"

میں مشرف صاحب کی حالتِ زار پر افسوس کرتا ہوا اپنے گھر واپس آگیا۔ ہوسکتا ہے کہ میری اس کہانی میں کہانی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ لیکن یہ ایک المیہ ضرور ہے۔ اس نظام کا' جس نے ہمیں نیکی کرنے کے قابل بھی نہیں رہنے دیا ہے۔ اس شہر میں نہ جانے کتنے بے اولاد ہوں گے۔ جن کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ کسی ادارے سے کسی بچے کو لے کر اس کی پرورش کریں لیکن اس قسم کی رکاوٹیں ان کا راستہ روک لیتی ہوں گی اور وہ مجبور ہو کر رہ جاتے ہوں گے۔

کیا ہم نیکی اور بھلائی کے کاموں کے راستے کو آسان نہیں بنا سکتے؟

کمپلیکس

برادرم' السلام علیکم

یقیناً اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں گے۔

میں خیریت سے ہوں آپ کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں آپ نے جس راہ پر مجھے لگا دیا ہے اس کی وجہ سے بے کار زندگی میں کچھ دلچسپی کا عنصر پیدا ہوگیا ہے۔ زیر نظر کیس دو خاندانوں کی باہمی چپقلش کا ماجرا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

دعاگو

ڈی ایس پی (ر) عبدالحمید شاہ۔ سرگودھا

کہتے ہیں کہ فساد کی جڑ زر' زن اور زمین میں پوشیدہ ہے مگر میری ملازمت کا زیادہ تر تجربہ رہا ہے کہ جتنے جرائم اور فساد انسان پر انسان کی حکومت کی خواہش کراتی ہے' اتنے جرائم کسی اور جذبے کے زیرِ اثر نہیں ہوتے۔ خاص طور پر ملک کے دیہی علاقوں میں جہاں بدترین قسم کی وڈیرا شاہی ہے۔ جرائم کی اکثریت اسی نظام کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں۔ اختیارات کا نشہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ حاکم کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھوں کسی شخص کی جان جا رہی ہے۔ عزت تباہ ہو رہی ہے یا روزگار نشانہ بن رہا ہے۔

اس کے باوجود زر' زن اور زمین کے مقولے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زر کا مسئلہ عموماً قریبی رشتے داروں یا معاشی تعلق رکھنے والوں کے درمیان جنم لیتا ہے۔ خاندانوں میں شاذ ہی اس سلسلے میں تھانے کچہری کی نوبت آتی ہے البتہ جب معاملہ کاروباری ہو تو دونوں فریق اکثر عدالت پہنچ کر دم لیتے ہیں اور بعض اوقات چند ہزار روپے کے لیے لاکھوں لٹا دیتے ہیں۔ زن یعنی عورت کا مسئلہ بھی اگر

خاندان میں پیدا ہو تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ تھانے جائے بغیر گھر کی بات گھر میں طے کرلی جائے لیکن جب اس معاملے میں برادریاں ملوث ہوتی ہیں تو صحیح معنوں میں یہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ عورت کا معاملہ اتنا حساس ہوتا ہے کہ پوری برادری اپنے اختلافات بھول کر الگ کھڑی ہوتی ہے۔ ہتھیار نکل آتے ہیں اور اس قسم کی خبریں آئے دن اخباروں کی زینت بنتی ہیں کہ فلاں گاؤں میں سوئے افراد پر حملہ، اتنے ہلاک اور اتنے زخمی۔

دیگر جرائم کے معاملے میں جب ملزم گرفتار ہوتے ہیں یا تھانے لائے جاتے ہیں تو ان کی حالت خراب ہو رہی ہوتی ہے لیکن ان فسادات میں آنے والے سینہ تانے، مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں خون آلود ہتھیار یا رائفل وغیرہ ہوتی ہے اور ببانگِ دُہل اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی ناقص عقل کے مطابق اپنی لٹی ہوئی آبرو انہوں نے خون بہا کر واپس حاصل کرلی ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا اور پھانسی بھی ہوتی ہے تو یہ ہنسی خوشی پھانسی چڑھ جاتے ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ انصاف اور قانون سے ہٹ کر کوئی بھی کام کیا جائے اور بہ ظاہر وہ کتنا ہی مستحسن نظر آئے بالآخر اس کے نتائج آخر میں خراب ہی نکلتے ہیں۔ پہلے غیرت کے نام پر ہونے والے قتل میں سچ مچ غیرت کارفرما ہوتی تھی لیکن اب اسے اپنی دشمنیاں نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ مکروہ صورت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔

میں صبح تھانے پہنچا تو وہاں کی فضا سخت کشیدہ تھی۔ احاطے میں بیس پچیس افراد موجود تھے۔ یہ دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو خونی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ڈیل ڈول سے مجھے شبہ ہوا تھا۔ بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ دونوں ہی قریشی برادری کے دو خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے جیپ سے اترتے دیکھ کر دونوں طرف کے سرکردہ افراد میری طرف لپکے۔ انہوں نے بیک وقت بولنا شروع کردیا تھا۔ ظاہر ہے کسی ایک کی بات بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"خاموش!" میں نے انہیں ڈانٹا اور وہاں موجود اے ایس آئی سے پوچھا "یہ کیا مسئلہ ہے؟ اتنے افراد تھانے میں کیوں موجود ہیں۔"

اے ایس آئی مجھے ایک طرف لے گیا۔ "شاہ صاحب، معاملہ لڑکے اور لڑکی کا ہے۔ دونوں گھر سے فرار ہوگئے ہیں۔ یہ ان کے خاندان والے ہیں اور دونوں بہ ضد ہیں کہ ان کی طرف سے پرچہ کاٹا جائے۔"

"ان میں کچھ افراد مجھے جانے پہچانے لگ رہے ہیں۔"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ یہ سب قسائی ہیں۔ مین مارکیٹ میں گوشت کی جتنی دکانیں ہیں، سب ان ہی دو خاندانوں کی ہیں۔ یہ کاروباری حریف بھی ہیں۔"

"گویا دشمنی کے اسباب پرانے ہیں" میں نے سرہلایا۔ "لڑکے اور لڑکی کے فرار نے جلتی پر تیل چھڑکا ہے۔ بہرحال تم ایسا کرو کہ لڑکی اور لڑکے کے باپ یا سرپرست کو میرے پاس بھیجو اور باقی افراد کو یہیں روکو انہیں سمجھادو کہ تھانے میں دنگا فساد کیا تو سب کو اندر کردیں گے۔"

"آپ بے فکر رہیں، ویسے لڑکی کا باپ زندہ نہیں ہے۔ میں اس کے بڑے بھائی کو بھیج دیتا ہوں البتہ لڑکے کا باپ موجود ہے۔" اے ایس آئی نے کہا تو میں سرہلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں میرے سامنے تھے۔ لڑکی کے سب سے بڑے بھائی کا نام ہاشم تھا۔ اس کے پانچ بھائی اور تھے۔ ہاشم چالیس بیالیس سال کا تنومند شخص تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب تھا اور جسم شاندار البتہ اس کے چہرے سے سختی ٹپکتی تھی جو اس کے پیشے کا تقاضا تھا۔ اس نے خاصی گھنی مونچھیں بھی پال رکھی تھیں۔ لڑکے کا باپ ساٹھ کے پیٹے میں تھا مگر صحت اس کی بھی شاندار تھی۔ اس کی سیاہی مائل رنگت پر سرخ آنکھیں خاصی خوفناک لگ رہی تھیں اور وہ اس وقت ہاشم کو ہی گھور رہا تھا۔ جو جواباً اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ دونوں بیٹھیں اور مجھے بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟"

ہاشم اور لڑکے کا باپ رمضان بادلِ ناخواستہ میرے سامنے کرسیوں پر برابر بیٹھے تھے۔ پہلے ہاشم نے بولنا شروع کیا۔ "قسم اللہ کی، اپنی تو ناک کٹ گئی۔ وہ حرام جادی ایک بار ہاتھ آجائے تو کاٹ کر رکھ دوں" اس نے اپنے مزاج کے مطابق بات کی تھی۔

"تم تھانے میں بیٹھ کر دھمکی دے رہے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "ایسا نہ ہو کل کسی مصیبت میں پھنس جاؤ۔"

"سارا قصور اس حرامی منصور کا ہے" ہاشم بولا تو رمضان بھڑک اٹھا۔

"زبان سنبھال کر بات کر ہاشم ورنہ۔۔۔"

اس ورنہ کے بعد ان کے درمیان زبانی جنگ کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے کہ یہ جنگ ہاتھاپائی تک پہنچتی، میں نے حوالدار کو بلا کر کہا کہ ان دونوں کو لے جائے اور الگ الگ ان کا بیان لے۔ اس قسم کے لوگوں سے مجھے چڑ محسوس ہوتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ حوالدار کے سامنے انہوں نے کوئی فساد کیا تو وہ بلا تکلف ان کی چھترپرائی کردے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ دونوں حوالدار کے سامنے الجھے تو اس نے انہیں باری باری اچھی طرح باور کرادیا کہ یہ تھانہ ہے، ان کا گھر یا بازار نہیں۔ جہاں انہیں مست سانڈوں کی طرح سینگ لڑانے کی کھلی اجازت ہو۔ اس کے بعد انہوں نے شرافت سے اپنے بیانات لکھوائے۔ لڑکی کا نام عالیہ تھا اور لڑکا، وہی ذاتِ شریف منصور تھا جسے ہاشم نے حرامی کہا تھا۔ معاملہ وہی نوعمری کی جذباتی محبت کا تھا۔ لڑکی کالج میں پڑھتی تھی اور لڑکا یونیورسٹی میں۔ تعلیم نے انہیں ذہنی طور پر اپنے خاندان والوں سے دور اور ایک دوسرے سے قریب کردیا تھا۔ جہاں ایک سے بڑھ کر ایک ان پڑھ اور جاہل بھرا ہوا تھا۔ بچوں کو تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی اور ماں باپ کو پڑھانے سے۔ وہ بچے کو بچپن سے اپنے ساتھ لگانا بہتر سمجھتے تھے تاکہ بڑا ہونے تک وہ ماہر قصائی بن کر باپ کی جگہ یا نئی دکان سنبھال سکے۔ اسی ماحول میں کسی نے پانچ جماعتیں بھی پاس کرلیں تو سمجھیں بڑا تیر مار لیا۔ کمائی بے حساب تھی لیکن اسے استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ پیسے کا ان کے نزدیک سب سے بڑا مصرف یہی تھا کہ کھاپی لیا جائے اور پہن اوڑھ لیا جائے۔ عورتوں کو سونے میں پیلا ہونے کا شوق تھا۔ بیانات کے لُبِ لباب کے ساتھ حوالدار نے دو عدد خطوط مجھے دیے۔ جو بالترتیب لڑکی اور لڑکا فرار ہونے سے پہلے چھوڑ گئے۔ لڑکی کے خط میں لکھا تھا۔

"پیاری امی! آپ سب نے مل کر مجھے منصور سے دور کرنے کی پوری کوشش کرلی۔ آپ لوگ اس لاحاصل اور لایعنی دشمنی کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ کو ہماری خوشیوں سے زیادہ اپنی دشمنی عزیز ہے۔ آپ نے مجھے میرا حق دینے سے انکار کیا لہٰذا اب میں اپنے شرعی حق کے استعمال پر مجبور ہوں۔ میں گھر سے جارہی ہوں۔ میں بھاگ نہیں رہی۔ جلد میں منصور سے کورٹ میرج کرکے واپس آؤں گی۔ اب یہ آپ پر ہے کہ ہمارا کیسے استقبال کرتے ہیں۔
فقط آپ کی بیٹی عالیہ۔"

لڑکے نے اپنے خط میں لکھا تھا "ابا جی! میں یہ گھر چھوڑ کر جارہا ہوں۔ کیوں، یہ آپ جانتے ہیں۔ میں اور عالیہ جلد عدالت کے سامنے شادی کرلیں گے۔ ہم کوئی گناہ یا جرم نہیں کریں گے، صرف اپنا شرعی حق استعمال کریں گے۔ یہ میں اپنی ذمے داری پر کررہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو بری الذّمہ کرتا ہوں۔"

دونوں پڑھے لکھے تھے۔ لہٰذا بات کرنا جانتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ فریقِ ثانی معقول بات سننا یا سمجھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں ان لڑکا لڑکی کے گھر سے جانے کو معقول بات کہہ رہا ہوں مگر ان کے خطوط بتا رہے تھے کہ ان کے گھر والوں کے پاس ایک موقع تھا کہ وہ اس پرانی دشمنی کو ختم کرکے ایک نئے رشتے اور تعلق کی بنیاد رکھتے مگر انہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں اس موقع کو ضائع کردیا۔ بات خود بگاڑی تھی۔ خطوط سے صاف ظاہر تھا کہ عالیہ اور منصور مستقل طور پر گھر سے نہیں بھاگے تھے۔ وہ کورٹ میرج کرکے واپس آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ موقع ہوتا جب وہ بگڑی بات کو بنا سکتے تھے مگر ہنگامہ کرکے اور پھر تھانے آکر انہوں نے خود اپنی رسوائی کا بندوبست کرلیا تھا۔ میں نے پہلے منصور کے باپ کو بلایا۔

"شاہ صاحب! ہم مظلوم ہیں اور یہاں ہمارے ساتھ ظلم ہو رہا ہے... انصاف ملنے کے بجائے" اس نے آتے ہی شکایت کی۔

"رمضان قریشی! ہم پولیس والے صرف حقائق کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ جرائم اور ہنگامے ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ لڑکیاں ہر روز بھاگتی ہیں۔ ان کے گھر والے یقیناً جذباتی ہوتے ہیں لیکن تھانے آکر بدمعاشی کوئی نہیں دکھاتا۔ جب تک تم لوگوں کا رویہ ٹھیک رہے گا، میں بھی ٹھیک رہوں گا۔"

"حضور، ہم تو آپ کے خادم ہیں، آپ حکم تو کریں۔" اس کی موٹی عقل نے میری بات کا غلط مطلب نکالا تھا۔

"یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"حضور، میں اپنے لڑکے کی واپسی چاہتا ہوں۔ وہ حرافہ اسے ورغلا کر لے گئی ہے۔"

"وہ اس جرم میں برابر کا شریک ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا "اس نے خود خط میں اقرار کیا ہے۔"

"عورت تو بڑے بڑوں کی مت ماردیتی ہے" وہ بولا۔

"مجھے افسوس ہے رمضان، صورتِ حال مختلف ہے۔ جب کوئی لڑکا لڑکی گھر سے بھاگتے ہیں تو زیادہ قصوروار مرد تصور کیا جاتا ہے، سمجھے۔ میں منصور کے خلاف پرچہ کاٹنے پر مجبور ہوں۔ تم چاہو تو ان کے خلاف پرچہ لکھوادو۔"

اس نے رضامندی ظاہر کی۔ پرچہ کٹنے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ اس سے کچھ معلومات حاصل کرلوں۔

"یہ بتاؤ کہ منصور نے پہلی بار کب یہ ظاہر کیا کہ وہ عالیہ میں دلچسپی لے رہا ہے؟"

"دو سال پہلے" اس نے سوچ کر جواب دیا "تب سے وہ اپنی ماں کے پیچھے پڑا تھا کہ اس کا رشتہ عالیہ کے گھر لے کر جائیں۔"

"گویا یہ چکر کم سے کم دو سال پرانا ہے۔ تمہیں اس رشتے میں کیا برائی نظر آئی؟ کیا لڑکی بد صورت ہے، کردار کی خراب ہے یا اس میں کوئی اور خامی ہے؟"

"نہیں جی!" وہ کسی قدر تذبذب سے بولا "لڑکی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو منصور آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھتا مگر جی، خاندان بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہم دشمن کے گھر سے لڑکی لے آئیں۔"

"لڑکی تو نکل گئی، دشمنی کی وجہ کیا ہے؟"

"وہ بات یہ ہے کہ ہم ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ میرا مطلب ہے میں اور عالیہ کا باپ۔ جھگڑا ہمارے باپوں کے درمیان شروع ہوا تھا۔ میرا تایا، اللہ اس کی مغفرت کرے، بڑا لالچی اور کمینہ شخص تھا۔ دادا کے مرتے ہی اس نے مارکیٹ کی دکانوں پر قبضہ کرلیا۔ یہ ساری دکانیں دادا نے بنوائی تھیں۔ میرے باپ نے برادری کو بیچ میں ڈالا۔ وہ لڑائی جھگڑے والا شخص نہیں تھا۔ چاہتا تو بھائی کا گلا دبا کر اپنا حق نکلوا لیتا۔ اس کے چار جوان بیٹے تھے۔ برادری نے پنچایت بٹھائی مگر تایا نے پیسہ کھلا کر انہیں اپنے حق میں کرلیا۔ لہٰذا پنچایت نے فیصلہ دیا کہ آٹھ میں سے پانچ دکانیں تایا کی ہوں گی اور تین میرے باپ کی۔ یہ کھلی ناانصافی تھی مگر میرا باپ پنچایت کے فیصلے پر راضی تھا۔ اسے یہ فیصلہ قبول کرنا پڑا لیکن جی، ہم نے آج تک یہ فیصلہ قبول نہیں کیا۔ میں نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا جو ابھی تک چل رہا ہے۔"

"کب سے؟"

اس نے حساب لگایا "جی، بارہ سال تو ہو گئے۔"

مجھے یقین تھا کہ وہ عدالت کے فیصلے کے نتیجے میں ملنے والی جائداد کی مالیت سے کہیں زیادہ رقم اس مقدمے پر خرچ کر چکا ہوگا۔ اس سے کچھ اور سوالات کرکے میں نے اسے جانے دیا اور ہاشم کو طلب کیا۔ وہ خاصا مایوس نظر آرہا تھا۔ اس کے خیال میں، میں لڑکے والوں کی طرف داری کررہا تھا اس لیے میں نے پہلے لڑکے کے باپ کو بلایا تھا۔

"تمہیں کب پتا چلا کہ عالیہ گھر سے غائب ہے؟"

"جی صبح سویرے۔ ماں جی نماز کے لیے اٹھیں تو عالیہ کا بستر خالی تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے اٹھایا۔ میں نے پہلے گھر میں دیکھا پھر دوسرے بھائیوں کو بتایا۔ ہم نے پہلے آس پاس اور جاننے والوں میں دیکھا مگر عالیہ کہیں نہیں تھی۔ اتفاق سے کسی نے اس کا بستر پر رکھا تکیہ اٹھایا تو نیچے سے خط نکلا۔ خط پڑھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ عالیہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ میں فوراً منصور کے گھر پہنچا تو وہاں بھی ہنگامہ تھا۔ رمضان نے بتایا کہ اس کا بیٹا بھی غائب ہے۔ میں نے عالیہ کا خط اس کے منہ پر مارا اور اسے بتایا کہ اس کا کمینہ بیٹا عالیہ کو اغوا کرکے لے گیا ہے۔ اگر دوسرے لوگ بیچ بچاؤ نہ کرتے تو میں ایک آدھ قتل کردیتا۔" وہ اب کا ابل بھی نظر آرہا تھا۔ اور وہ مزاج کا بھی سخت تھا۔ موقع ایسا تھا کہ میں نے اسے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ اس کی غیرت کا جنازہ اٹھ رہا تھا اور اس کا اشتعال میں آنا لازمی تھا پھر بھی میں نے اسے سمجھایا۔

"دیکھو ہاشم۔ بات غصے میں آنے سے اور بگڑ جائے گی۔ اوّل تو شور شرابا کرکے تم نے خود دوسروں کو خود پر انگلیاں اٹھانے کا موقع دے دیا ہے۔ دوسرے عالیہ اغوا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنی مرضی سے، بہ رضا و رغبت گھر سے گئی ہے۔ لہٰذا صرف منصور یا اس کے گھر والوں کو قصوروار ٹھہرانا درست نہیں ہے۔"

"آپ تو ایسا کہیں گے" اس نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ "آپ شروع سے ان کمینوں کی سائڈ۔۔۔"

"ہاشم!" میں نے گرج کر کہا "میں آخری بار تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اب تم نے ایک بھی فضول لفظ منہ سے نکالا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں یہ سوچے بغیر تمہیں حوالات میں ڈال دوں گا کہ تم کس صدمے سے گزر رہے ہو۔"

تھانے میں ضابطے کی کارروائی مکمل کرکے میں نے دونوں پارٹیوں کو گھر جانے اور امن و سکون سے رہنے کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا کہ دونوں خاندان ایک ہی گلی میں آمنے سامنے آباد تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس صورتِ حال میں ذرا سی بات بھی چنگاری کی طرح بارود میں آگ لگا دے گی۔ لہٰذا میں نے دو سپاہیوں کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ گلی میں موجود رہیں اور کسی بھی متوقع تصادم کو روکیں۔ تھانے میں متعدد اہم معاملات زیرِ غور تھے۔ لہٰذا کچھ اہم فائلوں کو دیکھتے دیکھتے چار بج گئے۔ اسی اثنا میں تفتیش کے لیے جانے والا اے ایس آئی واپس آگیا تھا۔ اس نے تحریری رپورٹ دی جو میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا۔ میں نے یہ معاملہ کلی طور پر اس اے ایس آئی کے سپرد کردیا۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ سوائے مال بنانے کے لیکن میری بھی مجبوری تھی۔ میں اکیلا کتنے کیس دیکھ سکتا تھا۔ ان دنوں میں چوری کے ایک کیس پر کام کررہا تھا۔

دھماکا ان دنوں ہوا جب عالیہ کے بھائیوں نے اسے اور منصور کو ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے پرانے کراچی کے ایک متوسط سے ہوٹل میں کمرا لے رکھا اور ان کے خیال میں ان کے خاندان والے یا پولیس انہیں یہاں تلاش نہیں کرسکتی تھی۔ وہ گھر سے بھاگ کر اس ہوٹل میں مقیم تھے۔ اس قسم کے ہوٹل یہ پروا نہیں کرتے کہ مسافر کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ انہیں صرف کرائے سے مطلب تھا جو انہیں باقاعدگی سے مل رہا تھا۔ دونوں مفرور گھر سے جاتے ہوئے اچھی خاصی رقم لے گئے تھے اور اپنی عروسی خوشیوں میں انہیں قطعی احساس نہیں تھا کہ جب یہ رقم ختم ہوگی تو وہ کیا کریں گے۔ نوکری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عالیہ بی اے کررہی تھی اور منصور ایم ایس سی فزکس، دونوں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ظاہر ہے، ان کے ذہن میں بھی وہی خیالی پلاؤ نما منصوبے ہوں گے کہ منصور نوکری کرے گا اور وہ اپنا ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے جیسا کہ گھروں سے بھاگنے والے بنایا کرتے ہیں اور جب رقم ختم ہوجاتی ہو یا پولیس چھاپا مار کر گرفتار کرلیتی تو وہ حقائق کی دنیا میں آتے اور انہیں پتا چلتا کہ دنیا میں صرف پیار و محبت ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔

یہاں میں پولیس کی کوتاہی کا اعتراف کروں گا۔ جو کام عالیہ کے بھائیوں نے کرلیا۔ وہ پولیس بہت پہلے کرسکتی تھی۔ اگر وہ سنجیدگی سے انہیں تلاش کرتی لیکن پولیس نے صرف اتنا کیا کہ ان کے بارے میں رپورٹ، عالیہ اور منصور کی تصاویر دوسرے تھانوں میں بھیج کر مطمئن ہوگئی تھی۔ عالیہ کے بھائی ویسے تو پُرسکون تھے لیکن اندرونِ خانہ پوری طرح سرگرم تھے۔ ان کے وسیع تعلقات تھے۔ پوری قسائی برادری ان کی مدد کررہی تھی۔ ہوٹلوں میں گوشت سپلائی کا ٹھیکا بھی ان ہی کے پاس تھا۔ ان کا پتا چلا کر عالیہ کے چار بڑے بھائیوں نے رات کی تاریکی میں پوری منصوبہ بندی سے حملہ کیا۔ ان کے پاس کمرے کی چابی تک تھی۔ انہوں نے عالیہ اور منصور کے سنبھلنے سے پہلے انہیں جالیا۔ عالیہ کو انہوں نے باندھ کر بے بس کردیا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ یہی سلوک انہوں نے منصور کے ساتھ کیا اور پھر اس پر لاٹھیاں لے کر پل پڑے۔ وہ بے بس تھا اور منہ بند ہونے کی وجہ سے چیخ بھی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مار مار کر اسے بے ہوش کردیا اور شاید اپنی دانست میں اسے مار ہی ڈالا تھا پھر وہ بے ہوش عالیہ کو لے کر فرار ہوگئے۔ وہ شوہر کو لہولہان ہوتے دیکھ کر بے ہوش ہوگئی تھی۔

صبح ویٹر نے دروازہ کھلا دیکھا تو چونکا اور اندر بے حس و حرکت پڑے منصور کو دیکھ کر اس نے شور مچادیا۔ آن کی آن میں ہوٹل جمع ہوگیا۔ ہوٹل والوں کے خیال میں منصور مرچکا تھا مگر جب رسیاں کھولیں تو اس میں کسی قدر جان تھی۔ اسے فوری طور پر سول اسپتال لے جایا گیا اور آئی سی یو میں داخل کرلیا گیا۔ لاٹھیوں نے اس کا سر پھاڑ دیا تھا اور کئی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اس کی حالت نازک تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں کے پتے بھی درست لکھوائے تھے لہٰذا صدر تھانے کی پولیس کو ان کے گھر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ منصور کی ماں اور بہنیں اس کے زخمی ہونے کا سن کر رونے پیٹنے لگیں اور باپ اور بھائی بپھر اٹھے تھے۔ ان کے لیے یہ جاننا دشوار نہیں تھا کہ منصور کو کن لوگوں نے زخمی کیا تھا۔ پولیس کے جاتے ہی باپ تو اسپتال روانہ ہوگیا اور منصور کے بھائیوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ عالیہ کے بھائیوں پر چڑھائی کردی۔ دونوں طرف سے خوب لڑائی ہوئی۔ ہنگامے کی اطلاع تھانے پہنچی اور جب تک پولیس وہاں پہنچی۔۔۔ ان میں سے اکثر بری طرح زخمی ہوچکے تھے۔ زخمیوں کو اسپتال روانہ کرکے باقی افراد کو پولیس تھانے لے آئی اور انہوں نے حسبِ روایت جائے واردات پر پائے جانے والے ہر متعلقہ فرد کو گرفتار کرلیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان میں منصور کے بڑے بھائی کا سالا بھی تھا۔ جو ایک پیر سے معذور تھا۔ اس کا پیر گھٹنے کے نیچے سے زخمی تھا اور ڈاکٹروں نے اس کی ٹانگ کاٹ دی تھی۔ پولیس اسے بھی پکڑ لائی تھی حالانکہ وہ ہنگامے کی اطلاع پاکر۔۔۔ بیساکھی پر وہاں پہنچا تھا۔

میں نے گرفتاریاں کرنے والی پارٹی کے سربراہ اے ایس آئی کو جھاڑنے کا کام بعد پر ملتوی کیا اور پہلے گرفتار شدگان پر توجہ دی۔ ان میں عالیہ کے دو بھائی تھے۔ باقی تین اسپتال میں تھے۔ ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور باقی دو کو بھی شدید ضربات آئی تھیں۔ دوسری پارٹی کے چار بندے اسپتال پہنچے تھے اور باقی کو پولیس سمیٹ لائی تھی۔ ان میں منصور کا ایک بھائی بھی تھا۔ اس کے بڑے بھائی کو سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور اس کی حالت نازک تھی۔ مجھے احساس تھا کہ جس چیز کا مجھے خطرہ تھا وہی ہوا۔ شہر ہو یا دیہات جب معاملہ عورت ذات کا ہو تو ہم لوگوں کی عقل کی بتی یوں ہی فیوز ہوجاتی ہے۔

گرفتار شدگان بھی زخمی تھے لیکن معمولی۔ میں نے بلوے کا پرچہ کاٹ کر انہیں تھانے میں ڈال دیا۔ تفتیش کے لیے جانے والے اے ایس آئی نے ایک ہی کام کی بات

معلوم کی تھی کہ عالیہ گھر پر تھی۔ اس کے بعد صدر تھانے سے اطلاع ملی کہ آپ کا مطلوبہ بندہ سول اسپتال میں ہے، آکر مل جائیں... اس سے پہلے کہ وہ فوت ہوجائے، میں عجلت میں سول اسپتال پہنچا کیونکہ اب کیس عائلی سے زیادہ فوج داری کا ہوگیا تھا۔ پہلے ایک نامزد ملزم منصور شدید زخمی ہوا پھر مزید سات افراد زخمی ہوکر اسپتال پہنچے تھے اور ان میں سے ایک کی حالت نازک تھی مگر جب میں اسپتال پہنچا تو منصور کو آئی سی یو سے نکال کر جنرل وارڈ میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ اس کے سر کی چوٹ جتنی خطرناک نظر آتی تھی، اتنی شدید نہیں تھی البتہ اس کا بازو اور دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ دوسری ضربات تو بے شمار تھیں مگر وہ اب خطرے سے باہر تھا البتہ اس کے بڑے بھائی کے سر پر جو چوٹ آئی تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ واقعی خطرناک تھی اور اسے چوبیس گھنٹے کے اندر ہوش نہ آیا تو اس کے سر کا آپریشن کرنا پڑے گا۔

منصور ہوش میں تھا مگر اس کی حالت کے پیشِ نظر ڈاکٹر نے مجھے بہ مشکل چند سوال کرنے کی اجازت دی۔ میں نے پوچھا۔

"تم نے حملہ آوروں کو دیکھا تھا؟"

اس نے کچھ دیر سوچا پھر سر نفی میں ہلایا اور نقاہت سے بولا "انہوں نے چہرے چھپا رکھے تھے۔"

مجھے مایوسی ہوئی "اچھا تم نے کوئی اور خاص بات نوٹ کی۔ یا تمہیں محسوس ہوا کہ تم ان میں سے کسی کو جانتے ہو؟"

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ مجھے یقین تھا۔ حملہ آور عالیہ کے بھائی تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ عالیہ اپنے گھر پر موجود تھی۔ منصور نے ایک بار پھر نفی میں جواب دیا۔ واضح طور پر وہ اپنی بیوی کے بھائیوں کو بچا رہا تھا۔ میں نے ذرا غصے سے کہا۔

"تمہیں کچھ نہیں معلوم لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ تم پر حملے کی وجہ سے تمہارے بھائیوں اور عالیہ کے بھائیوں میں تصادم ہوا۔ جس میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ تمہارا بڑا بھائی منور شدید زخمی حالت میں اسی اسپتال میں ہے اور اس کی حالت نازک ہے۔ کیا تم اب بھی اپنی زبان بند رکھو گے؟"

اس کے چہرے پر کرب نمودار ہوا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر تیزی سے آگے بڑھا۔ "پلیز انسپکٹر! مریض کی کنڈیشن اب مزید تفتیش کی اجازت نہیں دیتی۔"

"یہ کب تک اس قابل ہوگا کہ تفصیلی بیان دے سکے؟"

"کچھ کہا نہیں جاسکتا کیونکہ درد سے بچانے کے لیے ہم نے اسے مسکن دواؤں کے زیرِ اثر رکھا ہے پھر بھی اڑتالیس گھنٹے ضرور لگیں گے۔"

میں نے اسپتال میں موجود دونوں طرف کے زخمیوں سے بیانات لیے۔ جس میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں تھی کہ ہنگامے اور مار کٹائی کا ذمے دار انہوں نے فریق مخالف کو ٹھہرایا تھا لیکن میرے خیال میں منصور کے بھائی زیادہ قصوروار تھے کیونکہ وہ عالیہ کے گھر پہنچے تھے۔ منصور کے بڑے بھائی منور کو ہوش نہیں تھا اور ڈاکٹروں کے مطابق وہ ہوش میں آبھی گیا تو خاصے عرصے کسی بیان کے قابل نہیں ہوگا۔ وہاں سے میں سیدھا عالیہ کے گھر پہنچا۔ جہاں اب صرف عورتیں تھیں کچھ بھائی اسپتال میں تھے تو باقی تھانے میں۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازہ عالیہ کی ماں نے کھولا۔ جو گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"تھانے دار! میرے بیٹے کیسے ہیں؟"

"یہ بات اسپتال یا تھانے سے پتا چلے گی" میں نے کہا۔

وہ مجھے اندر لے گئی۔ باہر سے غریب سا نظر آنے والا مکان اندر سے شاندار طریقے سے سجا ہوا تھا۔ خاص طور سے ڈرائنگ روم۔ وہاں آرائش کی بے شمار قیمتی اشیا تھیں۔ جو بدسلیقگی سے سجی تھیں۔ دولت سے سلیقہ بہرحال نہیں آتا۔ ہاں خریدا جاسکتا ہے لہٰذا اب بے شمار ایسے دولت مند جن کے پاس پیسہ ہے، انہوں نے انٹیریئر ڈیکوریشن کے ماہروں کی خدمات خریدلیں اور اپنے گھروں کو یوں سجالیا جیسے جدی پشتی دولت مندوں کے گھر ہوتے ہیں۔ مجھے اس شاندار ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس نے چائے کو کہا اور میرے منع کرنے کے باوجود اسنیکس بھی منگوالیے۔ اس دوران میں وہ دشمنوں کو کوستی رہی اور اپنے بیٹوں کی بے گناہی کا رونا روتی رہی۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئی، میں نے اس سے کہا۔

"مجھے عالیہ کا بیان لینا ہے، اسے بلائیں۔"

"عالیہ کا بیان۔ وہ کیوں تھانے دار بیٹے!" اس نے معصومیت سے کہا "اب تو وہ گھر آگئی ہے۔"

"بات یہ ہے ماں جی کہ بیان تو ہر صورت لینا ہوگا۔ چاہے وہ خود گھر آجائے یا ہم اسے گرفتار کرتے۔ معاملہ ہے پکی رپورٹ کا۔ اب وہ عدالت سے بری ہونے تک ملزم سمجھی جائے گی۔"

عورت بدحواس سی ہوگئی "پر اس کا قصور تھانے دار

صاحب؟"

مجھے ہنسی آرہی تھی۔ یہ عورت قانون تو ایک طرف رہا، زندگی کے عام معاملات کے بارے میں بھی بہت کم جانتی تھی لیکن میں نے سخت لہجے میں کہا "ماں جی، میرے پاس وقت کم ہے، آپ عالیہ کو بلائیں۔"

"عالیہ۔ بیٹا! بات یہ ہے کہ اس کی طبیعت صحیح نہیں ہے" اس نے واضح طور پر بہانہ کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اس کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

اسی لمحے ایک دوسری عورت اندر آئی۔ اس کے چہرے کے نقوش عالیہ کی ماں سے ملتے تھے۔ وہ ذرا سی کم موٹی تھی اور نسبتاً جوان تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ عالیہ کی بہن ہے۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے کس قدر مختلف تھی۔ بے شک وہ مروجہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا۔ چہرہ کتابی نہیں تھا لیکن مجموعی طور پر وہ بے حد پُرکشش لڑکی تھی۔ یہ سب مجھے اس کی تصویر سے پتا چلا تھا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں تھی کہ منصور اس پر مرمٹا تھا۔

"دیکھیں جی، ہماری پہلے ہی بہت بے عزتی ہوچکی ہے۔ بہتر ہوگا، آپ اس چکر کو یہیں ختم کردیں" عالیہ کی بہن نے بلاتمہید اکھڑ لہجے میں کہا۔

"تو اندر جا۔" عالیہ کی ماں نے اسے ڈانٹا۔

"نہیں ماں، تم خاموش رہو" اس نے ماں سے کہا پھر مجھ سے بولی "انسپکٹر صاحب! عالیہ بے وقوف لڑکی ہے۔ اس سے مل کر آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔"

"ہمیں کچھ معلوم ہوا یا نہیں، اس کا فیصلہ تم کیسے کرسکتی ہو۔ میں چاہوں تو اسے گرفتار کرکے بھی لے جاسکتا ہوں۔" میرے سخت لہجے پر اس عورت نے اپنا انداز بدل لیا اور لجاجت سے بولی کہ خدا کے لیے ہم پر رحم کریں۔ ہم پہلے ہی بہت دکھی ہیں۔

"مجھے اندازہ ہے لیکن اس سے قانون کے تقاضوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ مجھے بہرحال عالیہ کا بیان لینا ہے۔ میں صرف اس بات کا لحاظ کررہا ہوں کہ گھر میں کوئی اور مرد نہیں ہے ورنہ میں خود عالیہ تک جاسکتا ہوں۔"

دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر عالیہ کی بہن جھجکتے ہوئے بولی "بات یہ ہے انسپکٹر صاحب کہ ہمیں نہیں معلوم کہ عالیہ کہاں ہے؟"

"کیا مطلب وہ گھر پر نہیں ہے" میں نے حیرت سے کہا "میری اطلاع کے مطابق وہ آج صبح تک گھر پر ہی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ابھی کچھ دیر پہلے وہ اپنے کمرے سے غائب تھی۔ کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب نکل گئی اور کہاں گئی۔ ہم نے پورے محلے میں پتا کروالیا ہے۔"

میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ یہ مکار عورتیں سمجھ رہی تھیں کہ مجھے بے وقوف بنالیں گی۔ عالیہ کی گمشدگی کا بہانہ انہوں نے ابھی ابھی گھڑا تھا۔ جب یہ دیکھا کہ میں عالیہ سے ملنے پر بضد ہوں ورنہ وہ مجھے آتے ہی عالیہ کے غائب ہونے کے بارے میں بتاسکتی تھیں۔

"تم لوگوں نے کن کن گھروں سے معلوم کیا تھا؟"

"وہ جی منصور کے رشتے داروں کو چھوڑ کر باقی سب سے معلوم کرلیا ہے" عالیہ کی بہن نے ہوشیاری سے کہا۔

"چلو ابھی تصدیق ہوجاتی ہے کہ تم نے محلے والوں سے پوچھا ہے یا نہیں" میں اٹھ کھڑا ہوا تو دونوں ماں بیٹی کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ میں نے محلے میں پوچھا تو ان کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔

"انسپکٹر صاحب، ہماری بات سنیں" عالیہ کی بہن نے لجاجت سے کہا "میں نے غلط کہا تھا۔۔"

"کہ عالیہ گھر سے غائب ہے؟" میں نے اسے تحیر نظروں سے دیکھا۔

"نہیں عالیہ تو واقعی غائب ہے" وہ ڈھٹائی سے بولی "لیکن ہم نے محلے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ دیکھیں ناں، عزت کا معاملہ ہے۔"

"کون سی عزت!" میں نے طنز کیا "سب جانتے ہیں عالیہ گھر سے بھاگ چکی ہے۔ اب کون سی عزت رہ گئی جسے تم لوگ بچانے کی کوشش کررہے ہو۔ بی بی میرے ساتھ یہ مکروفریب نہیں چلے گا۔ اب میں خود گھر کی تلاشی لوں گا اور کسی نے رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کرلوں گا۔"

خلافِ توقع ان دونوں نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی اور اس کی وجہ بھی مجھے جلد معلوم ہوگئی۔ گھر کے تمام افراد کو ایک کمرے میں کرکے میں نے عالیہ کی بہن کے ہمراہ گھر کی تلاشی لی۔ عالیہ سچ مچ غائب تھی۔ اسے غالباً میری آمد کے ساتھ ہی کہیں روانہ کردیا گیا تھا۔ یہ اس کیس میں میری دوسری غلطی تھی۔ مجھے اندازہ کرلینا چاہیے تھا کہ عالیہ کا بیان اس کے بھائیوں کے خلاف اہم ترین ثبوت ہوگا اور وہ اسے پولیس کے سامنے بیان دینے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور عین ممکن ہے اسے گھر آتے ہی غائب کردیا گیا ہو۔

صدر پولیس نے ہوٹل میں جو تفتیش کی تھی اس کے مطابق کسی نے حملہ آوروں کو آتے نہیں دیکھا اور نہ ہی عالیہ اور منصور کے اردگرد کمروں میں موجود افراد نے کسی قسم کی آواز یا شور سنا۔ میرا ذاتی خیال تھا کہ لوگ گواہی کے ڈر سے آگے نہیں آئے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہوٹل میں مسلح حملہ آور داخل ہوں اور ہوٹل کے عملے کو علم نہ ہو یا برابر والے کمرے میں ایک شخص پر تشدد کیا جائے اور دوسرے افراد کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ صدر تھانے کی پولیس نائٹ ڈیوٹی کلرک کو اٹھا کر لے گئی تھی۔ وہ ساری رات تھانے میں رہا اور اس نے اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ شاید وہ سچا تھا۔ عین ممکن تھا کہ حملہ آوروں نے ہوٹل کے کسی اور فرد سے ملی بھگت کی ہو اور اس نے انہیں عقبی راستے سے اندر آنے کا موقع دیا ہو۔

میرا خیال تھا کہ عالیہ کو اس کے گھر والوں نے اپنے کسی رشتے دار یا جاننے والے کے گھر چھپا رکھا تھا۔ اس سے پولیس کا کام بڑھ گیا تھا۔ جب کوئی مطلوبہ شخص یوں غائب ہوجائے کہ اس کا کوئی سراغ نہ ملے تو پولیس مخبروں کو استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ پنجاب کی حد تک یہ نظام اتنا مؤثر ہے کہ وہاں اسّی فیصد وارداتوں کا سراغ ان مخبروں کی مدد سے ملتا ہے لیکن شہروں میں مخبروں کا کام مشکل ہوجاتا ہے۔ اوّل تو یہاں رازداری رکھنا آسان ہے کیونکہ کوئی کسی کی طرف دھیان نہیں دیتا اور نہ بلاوجہ ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔ دوسرے مخبر گھر کے باہر تو مؤثر رہتے ہیں لیکن گھروں کی خبر لانا ان کے لیے بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے تھانے کے ایک پرانے سپاہی خدا بخش کو طلب کیا جو "کے بی" کی عرفیت سے مشہور تھا۔ مخبری کے معاملے میں وہ سب سے ماہر بندہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس قسم کے کام کے لیے کون سا شخص موزوں ہے۔ میں نے اسے صورتِ حال بتائی تو وہ بولا "آپ فکر ہی نہ کریں سر جی!"

"کیا کروگے تم؟"

"ایک کٹنی ہے میری نظر میں لیکن وہ بہت لالچی ہے۔ ایک نمبر کی فراڈ عورت ہے۔ گھروں میں خوش قسمتی کے تعویذ اور جعلی پتھر بیچتی ہے۔"

"اسے بلاؤ۔ یہ ہمارا کام کرسکتی ہے" میں نے فوراً فیصلہ کرلیا۔

کے بی اسی شام بڑی بی کو پکڑلایا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو میں دنگ رہ گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں، میں نے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول مراۃ العروس پڑھا تھا۔ جس میں دو بہنوں کی کہانی بیان کی گئی تھی۔ ان میں بڑی بہن کو ایک بی جمن نام کی فراڈ عورت بے وقوف بناتی ہے جو چہرے سے بظاہر بے حد نیک اور خدا ترس لگتی ہے۔ اس عورت کا حلیہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے ناول میں پڑھا تھا۔ نورانی چہرہ، شفیق مسکراہٹ، سفید چادر اوڑھے، ہاتھ میں تسبیح۔

"تھانے دار بیٹا!" اس نے بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "تم نے مجھے یاد کیا ہے؟"

اس کی آواز میں اتنی نرمی اور شفقت تھی کہ میں اس کی حقیقت نہ جانتا تو دھوکا کھا جاتا۔ میں نے سختی سے کہا "کس کی اجازت سے بیٹھی ہو، کھڑی ہوجاؤ۔"

وہ سہم کر کھڑی ہوگئی "ناراض کیوں ہوتے ہو بیٹا!"

"اب مجھے بیٹا مت کہنا۔ میری ماں بہت نیک اور فرشتہ سیرت ہے۔ ان کے بعد میں نے بیٹا کہنے کا حق صرف اس جیسی عورتوں کو دیا ہے۔ تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں لگتا۔"

اس کے چہرے کے تاثرات اتنی تیزی سے بدلے کہ میں حیران رہ گیا۔ ساری نرمی اور شفقت پل بھر میں غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایک عجیب سی عیاری نے لے لی۔ اس نے اپنا میلا سا چشمہ اتار دیا۔ جس کے عقب میں اس کی آنکھوں کی مکاری چھپ جاتی تھی اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں بھی اکھڑپن تھا۔

"کہو تھانے دار سرکار! باندی کو کس لیے طلب کیا ہے؟"

اس کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ مجھے لگا جیسے اس کا تعلق کبھی نہ کبھی کوٹھے سے رہا تھا...... کوٹھے کی مخلوق الگ ہی پہچانی جاتی ہے۔ خاص طور سے ہم پولیس والے انہیں سات پردوں میں بھی شناخت کرلیتے ہیں کیونکہ ہم ان کا اصل روپ آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ میں نے پوچھ لیا۔

"تمہارا تعلق اس بازار سے بھی رہا ہے، مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔ میں تصدیق بھی کرواسکتا ہوں۔"

اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا "آپ کو کیسے پتا چلا سرکار؟"

میں ہنسا "ہم دور سے تمہیں پہچان لیتے ہیں۔"

"سرکار کی نظر کی داد دینا پڑے گی۔ بندی کا پچھلے بیس سال سے اب کوٹھے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس کے باوجود آپ نے جان لیا۔" اس نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

"میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ کوئی بھی ذرا غور کرے تو تمہیں فوراً پہچان لے گا۔ بہرحال میں نے تمہیں کسی اور ہی

کام سے بلایا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم گھر گھر گھوم پھر کر چیزیں بیچتی ہو۔" میں نے لفظ چیزیں پر زور دیا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا "خدا کی قسم سرکار۔ کسی نے جھوٹی اطلاع دی ہے۔ میں یہ دھندا ابھی چھوڑ چکی ہوں۔"

"یہ بھی چھوڑ دیا تو آج کل کیا کر رہی ہو؟"

اس نے آنکھیں چُراتے ہوئے کہا "سرکار، جانماز تسبیحیں اور طغرے بیچتی ہوں، مکّے مدینے کے۔"

"گویا مذہب کے نام پر لوگوں کو دھوکا دیتی ہو" میں نے تلخی سے کہا "اس سے تو بہتر تھا کہ تم کوٹھے پر ہی بیٹھی رہتیں۔"

وہ مسکرائی "سرکار۔ اس عمر میں، میں کوٹھے پر بیٹھنے والی مخلوق تو نہیں رہی۔ وہاں تو جوان جسموں کے خریدار آتے ہیں۔ مجھ بڈھی پھونس کو کون پوچھتا۔"

میں نے اپنا ذہن ٹھنڈا کیا کیونکہ مجھے اس کی مدد درکار تھی۔ میں ایک بڑی برائی کے خلاف چھوٹی برائی کی مدد لے رہا تھا۔

"سنو زیب النسا۔ میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ تم اس طریقے سے گھروں میں گھومتی رہتی ہو اور علاقے میں تمہاری اچھی جان پہچان ہوگی۔"

"خدا کے فضل سے آپ میرا نام لے کر دیکھیں۔" اس نے نخرے سے کہا "کوئی ناواقفیت کا اظہار کردے تو باندی اپنی چوٹی اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر سرکار کے قدموں میں ڈال دے گی۔"

"خوب! گویا تم ہمارا کام کر سکتی ہو" میں نے کہا اور اسے عالیہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے گھر سے غائب ہے اور مجھے یقین کی حد تک شبہ ہے کہ اس کے گھر والوں نے اسے کسی عزیز رشتے دار یا جاننے والے کے گھر چھپا دیا ہے۔

"آپ فکر ہی نہ کریں سرکار!" اس نے اعتماد سے کہا "صرف چوبیس گھنٹے دیں۔ بندی اس حرافہ کو آپ کے پاس لے آئے گی۔ ایک منٹ زیادہ ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

یہ عورت بلا کی چرب زبان تھی "اگر تم نے یہ کام کر لیا تو سمجھو، بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"بندی کو نام کی ضرورت نہیں ہے" اس نے چالاکی سے کہا "یہ بتایئے کہ انعام کیا ملے گا؟"

"انعام تمہاری توقع سے بڑھ کر ہوگا" میں نے کہا "لیکن یاد رہے کہ کام ہوشیاری سے ہونا چاہیے۔"

اگلے روز میں پھر اسپتال گیا۔ منصور کے بڑے بھائی کو ہوش آگیا تھا لیکن فی الوقت اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بیان دے سکتا۔ میں نے وہاں دیگر زخمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان سب کے خلاف بلوے اور قاتلانہ حملے کے الزام کے تحت ایف آئی آر کاٹ دی گئی تھی لیکن دونوں پارٹیوں نے ضمانت لے لی تھی۔ میں نے سوائے عالیہ کے دو بڑے بھائیوں کے، باقیوں کو ذاتی ضمانت پر چھوڑ دیا تھا۔ کیس خاصا مضبوط تھا۔ ہمیں گواہیاں بھی مل گئی تھیں۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد چالان عدالت میں پیش کردوں ورنہ ملزمان گواہوں پر اثرانداز ہو سکتے تھے۔ ایک تو وہ پیسے اور اثر رسوخ والے تھے۔ دوسرے گواہ بھی محلے کے تھے اگر وہ عدالت میں جا کر بیان بدل دیتے تو استغاثہ کمزور پڑ جاتا۔

میں نے زیب النسا کو کام پر لگا تو دیا تھا لیکن مجھے زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ عالیہ کو کھوج نکالے گی۔ عالیہ کا بیان کیس کا رخ بدل سکتا تھا۔ بے شک منصور اور عالیہ نے گھر سے بھاگ کر رسم و رواج کو پامال کیا تھا لیکن اس کے بھائیوں کو یہ حق نہیں تھا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لیتے۔ انہوں نے منصور کو مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ابھی بھی ان پر قاتلانہ حملے کی دفعہ لگ سکتی تھی اگر عالیہ ان کے خلاف بیان دیتی۔ سب سے اہم عالیہ کی ذات بلکہ اس کا بیان تھا اور وہ سامنے نہیں آرہی تھی۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد کھسیائی ہوئی زیب النسا میرے پاس آئی۔

"سرکار! کام بہت مشکل ہو گیا ہے۔ لڑکی اپنے کسی جاننے والے یا رشتے دار کے گھر نہیں ہے۔ آپ مجھے ایک دن اور دیں۔ خدا نے چاہا تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔"

"تم اسے دل جمعی سے تلاش کرو" میں نے اسے تسلی دی "وقت کی فکر مت کرو اور کامیابی ناکامی کی پروا بھی مت کرو۔ ناکامی کی صورت میں بھی تمہیں حقِ محنت ضرور ملے گا۔"

"آپ کا احسان، کرم نوازی سرکار!" وہ کھِل اٹھی "بندی کس زبان سے شکریہ ادا کرے" وہ جانے کے لیے اٹھی تھی پھر واپس آئی "سرکار! مجھے ایک بات معلوم ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ کے کام کی بھی ہے یا نہیں؟"

"تم بات بتاؤ۔ فیصلہ میں کروں گا کہ کام کی ہے یا نہیں۔ بعض اوقات بہت معمولی سی بات بھی کام آجاتی ہے" میں بولا۔

"سرکار! ابھی جب میں عالیہ کا پتا لگانے کی کوشش کر رہی تھی تو میں نے دونوں گھروں کی عورتوں کو ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے گھر جاتے دیکھا

تھا۔"

میں چونک اٹھا "تمہارا مطلب ہے، عالیہ اور منصور کے خاندان کی عورتیں آپس میں مل رہی ہیں؟"

"بالکل سرکار! اور حیرت کی بات ہے کہ ان کے انداز بھی دشمنوں جیسے نہیں ہیں۔ بہت سلوک سے ملتی ہیں اور پھر پُراسرار سرگوشیوں میں لگ جاتی ہیں۔ یہ ملاقاتیں عموماً رات کی تاریکی میں ہوتی ہیں۔"

"تم نے خاصی کام کی بات بتائی ہے۔ اب ایسا کرو کہ عالیہ کی تلاش کے ساتھ اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کرو کہ یہ عورتیں آپس میں کیوں مل رہی ہیں اور ان کے درمیان کیا باتیں ہو رہی ہیں۔"

"یہ کام بھی مشکل ہے لیکن آپ کے لیے کرلوں گی" اس نے گہری سانس لے کر کہا "سرکار! ہاتھ آج کل کچھ تنگ جا رہا ہے۔"

اس کا مطلب سمجھ کر میں نے جیب سے اسے بیس روپے نکال کر دیے۔ موجودہ لحاظ سے اس کی قدر میں دس گناہ اضافہ کرلیں۔ تب آٹا ایک روپے سیر تھا۔ زیب النسا نے مایوسی سے نوٹ تھامے "بندی تو کچھ زیادہ کی امید لے کر آئی تھی۔"

"اسے بھی بہت جانو، کیونکہ یہ میں اپنی تنخواہ سے دے رہا ہوں۔"

"سرکار! آپ بادشاہ لوگ ہو، آپ کو تنخواہ کی کیا ضرورت؟" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"زیب النسا! تم نے کالی بھیڑ والا محاورہ سنا ہوگا۔ اب پولیس میں کالی بھیڑیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ تم مجھے سفید بھیڑ سمجھ سکتی ہو۔"

اس نے ناقابلِ یقین نظروں سے مجھے دیکھا۔ غالباً اس کے نصف صدی کے تجربے میں چند ایک مواقع ہی ایسے آئے ہوں گے جب کسی پولیس والے نے رشوت لینے سے انکار کیا ہوگا ورنہ اسے تو وہ اپنی تنخواہ سے زیادہ حلال تصور کرتے ہیں۔ بادلِ ناخواستہ اس نے بیس روپے لیے اور چلی گئی۔ ابھی شاید اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ دو تین دفعہ تھانے آئے گی تو اسے میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔ خود تھانے والے اسے سمجھا دیں گے کہ یہ تھانے دار نہ خود کھاتا ہے اور نہ ہمیں کھانے دیتا ہے۔ میں جتنے تھانوں میں رہا، اکثریت کو میں نے اپنے خلاف پایا۔ وجہ وہی، نہ کھانا نہ کھانے دینا تھی۔

زیب النسا نے یہ بات واقعی کام کی بتائی تھی کہ دونوں خاندانوں کی عورتیں آپس میں مل رہی تھیں اور یہ میل جول خفیہ تھا۔ عالیہ کے چھ میں سے دو بھائی گھر پر تھے۔ اس کے علاوہ منصور کا باپ بھی اور ایک بھائی گھر پر تھا۔ کیا انہیں ان خفیہ مذاکرات کا علم نہیں ہوگا اور ان مذاکرات کا مقصد کیا تھا۔ کیا یہ عورتیں مردوں سے چھپ کر اس معاملے کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھیں اور جب یہ بات مردوں کے علم میں آئے گی تو کیا وہ ان کوششوں کو قبول کرلیں گے، جھگڑے کے بعد جس میں دونوں طرف سے خون بہا تھا، ان کے درمیان کشیدگی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ وہ زخموں کی وجہ سے مجبور تھے ورنہ یہ فساد کوئی اور رنگ بھی لا سکتا تھا۔

اس کیس کو میں اپنے معمول کے طریقے کار سے ہٹ کر حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا اسی وجہ سے میں نے دونوں طرف کے لوگوں کو شخصی ضمانت پر رہا کیا تھا۔ دراصل یہ دو خاندانوں کا نہیں، بلکہ دو گروہوں کا جھگڑا تھا۔ بے شک کام اور ذات کے اعتبار سے انہیں معاشرے میں اونچا مقام حاصل نہیں تھا لیکن ان کے اثر و رسوخ اور دولت مندی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ علاقے کے بے حد بااثر اور معزز افراد ان کے حامیوں میں سے تھے۔ خود میرے پاس اسسٹنٹ کمشنر کا فون آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ لڑکی کو بازیاب کرا کے اس کے گھر والوں کے حوالے کردوں۔ اسی طرح منصور کے کئی طرف داروں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ بعد میں ان ہی لوگوں کی ضمانت پر وہ رہا ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ اگرچہ یہ سگھڑ بیوی کے بارے میں کہا جاتا ہے لیکن یہ قسائیوں پر صادق آتا ہے۔ یہ صاحب لوگوں کا دل مٹھی میں کرنے کے لیے ان کے بنگلوں پر اچھے گوشت کے نذرانے بھجواتے ہیں۔ بہ وقتِ ضرورت اور خاص طور سے عید پر ان کے لیے قربانی کے جانور مہیا کرتے ہیں اور یوں اپنی پی آر بناتے ہیں۔ پولیس افسران اور کمشنرز سے لے کر ہیلتھ کے محکمے کے افسران تک ان کے نذرانوں سے فیض یاب ہوتے ہیں اور بہ وقتِ ضرورت ان کے کام آتے ہیں۔

چوبیس گھنٹے گزرنے کے باوجود زیب النسا کچھ بتانے سے قاصر تھی البتہ اس نے اتنی ضرور اطلاع دی کہ منصور اور عالیہ کے خاندان کی عورتوں میں کوئی خفیہ بات چیت ہو رہی تھی۔ وہ شاید صلح کا کوئی فارمولا وضع کر رہی تھیں۔ ظاہر ہے انہیں گوارا نہیں تھا کہ ایک ہو جانے والی بات پر ان کے گھر کے مرد کٹ مریں۔ وہ عورتیں مردوں سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ مجھے حیرت تھی حالانکہ اس طبقے کی

عورتیں اس قسم کے معاملوں میں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں اور معمولی باتوں پر اپنے مردوں کو اس قدر بھڑکا دیتی ہیں کہ وہ آمادۂ فساد ہو جاتے ہیں۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ صلح پولیس کے لیے نقصان دہ تھی کیونکہ دونوں فریق صلح پر آمادہ ہو جاتے تو بلوے کا کیس خود بخود کمزور پڑ جاتا اور مجھے اصل فکر منصور پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی تھی۔ ظاہر ہے اسے صلح کی کوئی خبر نہیں تھی اس کے باوجود وہ حملہ آوروں کے نام بتانے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے عالیہ کے بھائیوں سے پوچھا تھا کہ واردات والی رات وہ کہاں تھے تو ان کا جواب تھا کہ وہ اس رات گھر سے نہیں نکلے۔ ان کی عورتوں نے بھی اس کی تصدیق کی تھی کہ ان کے مرد رات کو گھر میں رہے تھے اور مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ سب رٹائے ہوئے بیان دے رہی تھیں۔

ایک ہفتے کی تفتیش کے نتیجے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ منصور پر رات گئے حملہ کرنے والے افراد ایک پک اپ میں آئے تھے۔ یہ ٹویوٹا ماڈل پک اپ تھی اور جس شخص نے اسے ہوٹل کے عقبی حصے میں ٹھہرے ہوئے اور اس میں سے چار افراد کو اتر کر ہوٹل میں جاتے دیکھا وہ ایک پارسی بوڑھا تھا جو سامنے والی بلڈنگ کی تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا اور بے خوابی کا مریض تھا۔ اس نے یہ منظر اپنی بالکونی سے دیکھا تھا۔ ظاہر ہے اس نے اس منظر کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کیونکہ راتوں میں اس قسم کی گاڑیاں سامان لے کر ہوٹل میں آتی رہتی تھیں۔ اس نے شبہ ظاہر کیا تھا کہ یہ گاڑی شاید گوشت سپلائی میں استعمال ہوتی تھی۔ اس سے اگلی صبح وہ پارسی بوڑھا اپنی بیٹی کے گھر کلفٹن چلا گیا اور جب ایک ہفتے بعد واپس آیا تو اتفاق سے اس کے لیے کھانا لے کر آنے والے ہوٹل کے ویٹر نے اسے حملے کے واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ چونک اٹھا اور پھر تاریخ معلوم کر کے اسے یقین ہو گیا کہ حملہ آور ٹویوٹا پک اپ میں آئے تھے۔ اس وقت گلی میں اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی اس لیے وہ ان کی صورتوں کو دیکھنے میں بھی کسی قدر کامیاب رہا۔ بدقسمتی سے اس کی دور کی نظر تھوڑی سی کمزور تھی اس لیے وہ ان کے خدوخال کے بارے میں تو نہیں بتا سکتا تھا لیکن وہ اتنا ضرور دیکھنے میں کامیاب رہا کہ ان چاروں افراد کے رنگ سیاہی مائل تھے اور وہ اچھے ڈیل ڈول کے مالک تھے۔

بدقسمتی سے کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔ جس پر حملہ ہوا تھا وہ حملہ آوروں کو شناخت کرنے سے انکاری تھا اور اس کی بیوی غائب تھی۔ بہت کم کیس ایسے تھے جن میں مجھے مجرموں کے بارے میں یقین کی حد تک شبہ تھا لیکن میں انہیں گرفتار کرنے یا ان کے خلاف کوئی گواہ یا ثبوت لانے سے قاصر تھا۔ بے شک وہ دوسرے کیس میں ملوث تھے لیکن ایک تو اس کیس میں زیادہ جان نہیں تھی۔ تصفیے کی صورت میں دونوں پارٹیاں بہ آسانی عدالت سے اپنے آدمیوں کو رہا کرا لیتیں۔ یا انہیں معمولی سزا اور جرمانے کا سامنا کرنا پڑتا۔ عام طور سے اس قسم کے کیس پولیس والوں کے لیے ذریعۂ آمدنی کا سبب بن جاتے ہیں۔ جب دونوں پارٹیاں پیسے والی ہوں اور صلح پر آمادہ نہ ہوں۔ وہ دونوں پارٹیوں کو بھڑکاتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی جیب گرم کرتے رہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں خود اس محکمے کا ایک فرد رہا اور میں نے ان برائیوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ حتی المقدور ان برائیوں کے خلاف لڑا بھی مگر افسوس میں ناکام ہی رہا۔

حالات میں ڈرامائی تبدیلی اس وقت آئی جب میں نے سنا کہ عالیہ کے دو بھائی جو اسپتال میں داخل تھے۔ اسپتال سے آنے کے بعد انہیں منصور کے گھر کی عورتیں اپنے گھر لے گئی تھیں اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ مکمل صحت یاب ہو کر ہی اپنے گھر جا سکتے تھے اور اس کے ایک ہفتے بعد جب منصور اور اس کا بڑا بھائی اسپتال سے ڈسچارج ہوئے تو انہیں عالیہ کے گھر والے لے گئے۔ بہ ظاہر یہ ناقابلِ یقین لگ رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ انہی اندرونِ خانہ مذاکرات کا نتیجہ تھا جو دونوں خاندانوں کی عورتوں کے درمیان ہوئے تھے۔ جس دن منصور اسپتال سے آیا، اسی روز عالیہ اس کے گھر آ گئی۔ یہ سب اطلاعات مجھے وہاں تعینات سپاہیوں سے مل رہی تھیں۔ عالیہ کی آمد کی اطلاع پاتے ہی میں منصور کے گھر جا پہنچا تھا۔

وہاں منصور کے باپ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

"جی انسپکٹر صاحب! پہلے تو یہ بتائیے کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

"کچھ نہیں۔ میں عالیہ بی بی سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ یہاں موجود ہے۔"

"وہ شروع سے یہاں موجود تھی" منصور کے باپ نے کہا تو میں دنگ رہ گیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ شروع سے یہاں موجود تھی اور تم نے پولیس سے یہ بات چھپائی؟"

"کسی نے پوچھا ہی نہیں تھا" وہ سادگی سے بولا۔

"حالانکہ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔"

"میں نہیں جانتا تھا۔ بیٹوں کی پریشانی نے مجھے کسی قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔"

میں کھول کر رہ گیا لیکن بے بس تھا۔ وہ لوگ اندر ہی اندر مل کر طے کر چکے تھے کہ پولیس کے سامنے کیا کہنا ہے اور واقعات کو کس طرح پیش کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عالیہ کہیں اور روپوش تھی اور یہ بوڑھا سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ یہی شخص کچھ عرصے پہلے اپنے بیٹوں کے زخمی ہونے پر کس طرح پاگل ہو رہا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجرموں کو سزا دلانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ تفصیل میں جانا بے کار ہے۔ قارئین! اب اس قسم کے واقعات کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جب فریقین کیس کو اپنے حق میں موڑنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"آپ عالیہ بی بی کو بلائیں۔"

وہ چوں چرا کیے بغیر جا کر عالیہ کو بلا لایا۔ وہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ خاندان کے دیگر افراد کے مقابلے میں وہ ایسی ہی تھی جیسے پتھروں کے درمیان کھلا خوش رنگ پھول۔ اس نے پھول دار سوتی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"تھانے دار صاحب۔ آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہ رہے ہیں؟" سلام کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"منصور پر حملے کے بعد سے تم کہاں تھیں؟" میں نے اچانک پوچھا لیکن وہ قطعی گھبرائے یا جھجکے بغیر بولی۔

"میں یہیں تھی۔ اپنے سسرال میں" اس نے لفظ سسرال پر زور دیا۔

"کیوں، جبکہ یہ لوگ تمہیں بہو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے؟"

"یہ پرانی بات تھی۔ اب یہ مجھے بہو تسلیم کر چکے ہیں۔"

"تمہیں معلوم تھا کہ پولیس تمہاری تلاش میں ہے پھر بھی تم نے ہم سے رابطہ نہیں کیا؟"

"مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ پولیس کو میری تلاش ہے اور اگر آپ کو میری تلاش تھی تو آپ یہاں کیوں نہیں آئے؟"

اس نے بہ ظاہر مجھے لاجواب کر دیا تھا۔ ظاہر ہے میرا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا تھا کہ وہ اپنے ہی سسرال میں ہو گی۔ جب کہ وہ یہاں تھی بھی نہیں۔ یقیناً اس نے یہ عرصہ کسی اور جگہ چھپ کر گزارا تھا اور جب عالیہ اور منصور کے گھر کی خواتین میں صلح ہو گئی تو وہ عالیہ کو سامنے لے آئے۔ میں ان بہ ظاہر ان پڑھ اور جاہل نظر آنے والی عورتوں کی چالاکی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جو مسئلہ ان کے مردوں سے اور جو کیس پولیس سے حل نہ ہو سکا تھا، وہ انہوں نے اپنی ذہانت سے ایسے چھپا لیا تھا کہ گھر کی عزت بھی بچ گئی تھی اور اس بات کا پورا امکان تھا کہ ان کے مرد بھی جیل جانے سے بچ جائیں کیونکہ فریقِ اول و فریقِ ثانی ایک ہو گئے تھے۔ اگر وہ آپس میں تصفیہ کر لیتے تو عدالت بھی جرم کی سنگینی کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی اور امکان یہی تھا کہ تمام افراد بری ہو جاتے۔

"تم مجھے بتاؤ کہ حملے کی رات کیا ہوا تھا؟" میں نے عالیہ سے پوچھا۔

اس نے بغیر جھجکے بولنا شروع کر دیا "مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا۔ میں سو رہی تھی کہ اچانک کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر آنکھوں پر کوئی کپڑا باندھ دیا۔ آخر میں میرے ہاتھ پیر باندھ دیے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ کمرے میں کوئی ہنگامہ ہو رہا ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم ہوا تھا، آنے والے منصور پر تشدد کر رہے تھے۔"

"تشدد نہیں، وہ اسے قتل کرنے کی کوشش کر رہے تھے" میں نے تصحیح کی "تو گویا تم نے حملہ آوروں میں سے کسی کو نہیں دیکھا؟"

"نہیں، میں کہاں سے دیکھتی، میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔"

"تم نے کسی قسم کی آواز تو سنی ہو گی۔ حملہ آوروں میں سے کوئی بولا ہو گا یا تم نے کسی اور طریقے سے شناخت کی؟"

اس نے پھر سر نفی میں ہلایا "نہیں۔ ان میں سے کسی نے آواز نہیں نکالی تھی اور میں کسی اور طریقے سے بھی کسی کو شناخت نہیں کر سکی۔"

"خیر بعد میں کیا ہوا؟" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ لڑکی نہایت ہوشیاری سے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

"ہنگامے کے بعد اچانک مجھے کسی نے اٹھایا اور اپنے شانے پر ڈال کر باہر لے آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہوٹل کے باہر کیسے آئے۔ انہوں نے مجھے کسی گاڑی میں ڈالا۔"

"کس قسم کی گاڑی میں؟"

"شاید وہ کوئی کار تھی" اس نے سوچ کر کہا۔ یہاں اس سے چوک ہو گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک چشم دید گواہ دیکھ چکا ہے کہ حملہ آور ایک ٹویوٹا پک اپ میں آئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی "گاڑی بہت دیر تک چلتی رہی پھر کسی نے مجھے

گاڑی روک کر نیچے اتارا اور گاڑی چلی گئی۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے ہوش رہی اور جب ہوش آیا تو میں یہیں تھی۔ منصور کے بارے میں معلوم ہوا تو میری طبیعت خراب ہو گئی تھی، کئی دن تک میں بیمار رہی۔"

"کہانی اچھی ہے" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "اور بنائی بھی اچھی طرح ہے لیکن بی بی، ہم پولیس والے ہیں۔ کرنے پر آئیں تو منٹوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں لیکن سچی بات ہے کہ مجھے تم لوگوں کی یہ سازش پسند آئی۔ اس سازش کے ذریعے دو خاندان ایک ہوں گے۔ دو دل مل جائیں گے اور دشمنی ختم ہو جائے گی۔"

"دو دلوں والی بات پر اس کے چہرے پر سرخی سی آ گئی۔ "شکریہ انسپکٹر صاحب!"

"ذرا یہ بتاؤ کہ دشمنی کی جڑ یعنی جائداد والے چکر کا کیا ہوگا؟"

"وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا ہے۔ اباجی۔ میرا مطلب ہے منصور کے والد، ایک دکان میرے بھائیوں کو دے دیں گے۔ اپنی مرضی کی اس کے بعد عدالت میں چلنے والا مقدمہ واپس لے لیا جائے گا۔"

"عدالت میں چلنے والے مقدمات تو فریقین کی رضامندی سے ختم ہو جاتے ہیں۔ تھانے میں درج پرچے کا کیا ہوگا؟"

"ہم اپنی ایف آئی آر بھی واپس لے لیں گے" اس نے اعتماد سے کہا۔

میں نے نفی میں سرہلایا "بی بی، اب یہ فوجداری مقدمہ ہے۔ اس میں دو بندے شدید طور پر زخمی ہوئے اور کئی بری طرح زخمی ہوئے تھے۔ کم از کم ہمیں عدالت میں چالان تو پیش کرنا ہی پڑے گا۔"

"انسپکٹر صاحب! اگر آپ تعاون کریں تو یہ معاملہ یہاں ختم ہو سکتا ہے۔" اس نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں ضرور کرتا" میں نے معذرت کی "لیکن بی بی، یہ بھی میری کوشش ہوگی کہ عدالت میں معاملہ ٹھیک ہو جائے اور پھر اس کیس کا عدالت تک جانا تمہارے مفاد میں ہوگا۔"

"میرے مفاد میں، کیسے جی؟"

میں نے اسے سمجھایا "دیکھو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور انسان کی نفسیات سمجھتا ہوں۔ انسان ہر جذبے کو ترک کر سکتا ہے سوائے دشمنی کے۔ کیونکہ یہ شیطانی جذبہ ہے جو اندر رہ کر آدمی کو اکساتا ہے۔ ابھی تم لوگوں کے مرد، تم عورتوں کے آگے اور حالات کے دباؤ سے مجبور ہو گئے ہیں اور وہ بہ ظاہر صلح پر آمادہ ہیں لیکن ان کے دلوں میں کیا ہے، یہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ ابھی ان پر سے دباؤ ہٹ جاتا ہے تو یہ نفس کے یا کسی خیرخواہ کے بہکاوے میں آ کر دشمنی کی آگ کو دوبارہ بھڑکا سکتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

اس نے سرہلا کر تصدیق کی تو میں نے آگے کہا "اس مقدمے کی صورت میں ان کے سروں پر تلوار لٹکتی رہے گی۔ اگر انہوں نے صلح اور امن کی راہ سے ہٹنے کی کوشش کی تو جیل ان کی منتظر رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ عدالت سے مقدمہ خارج ہونے تک تم دونوں کے خاندان آپس میں شیر و شکر ہو جائیں گے اور دشمنی میں وہ شدت نہیں رہے گی۔ رشتے ناتوں کی زنجیر انہیں مجبور کر دے گی کہ پرانی مخالفت بھول جائیں۔"

عالیہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے "میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں انسپکٹر صاحب!"

"شکریہ ادا کرنے کا بہت آسان طریقہ ہے، ایک کپ چائے!"

"میں ابھی لائی" وہ لپک کر اٹھی اور اندر چلی گئی۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ مقدمہ عدالت میں ایک سال چلا اور اس دوران میں عالیہ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی اور دونوں خاندان ایک ہو گئے تھے۔ بعد میں مزید رشتوں نے اس بندھن کو مضبوطی عطا کر دی تھی۔ میرے ریکارڈ میں یہ ایک ناکام کیس تھا۔ نہ میں ملزمان گرفتار کر سکا اور نہ عدالت سے کسی کو سزا ہوئی لیکن میرے نزدیک یہ میرے کامیاب ترین کیسز میں سے ایک تھا۔

△

شمارہ، ستمبر کی منتخب سچ کلامیاں

ہماری پیش کش ..... آپ کا چناؤ

اوّل : ماحول زدہ ..... ریحانہ افضال، کراچی

دوم : دوسری شادی .... آذر سعید، کراچی

سوم : مصلحت .... شازیہ سراج، کراچی